وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیراً
البقرة (٢٦٩)

جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

چودھویں جلد

علاقائی ادبیات مغربی پاکستان

(جلد دوم)

مدیرِ خصوصی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود

پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

طبع اول : ۱۹۷۱ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : پنجاب یونیورسٹی
ناشر : گروپ کیپٹن سید فیاض محمود
مطبع : زرین پرنٹنگ پریس ، ۴ بل روڈ - لاہور

پاکستان و ہند

کی

اِسلامی تہذیبؒ

کے

نام

پہلی جلد	مقدمہ	مصنف	سید فیاض محمود
دوسری جلد	(عربی ادب ۷۱۲ء - ۱۹۷۰ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر عبدالقیوم
تیسری جلد	(فارسی ادب ۱۰۰۰ء - ۱۵۲۶ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید مرزا
چوتھی جلد	(فارسی ادب ۱۵۲۶ء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی
پانچویں جلد	(فارسی ادب ۱۷۰۷ء - ۱۹۷۰ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر وزیر الحسن عابدی
چھٹی جلد	(اردو ادب ۱۷۱۲ء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید قریشی
ساتویں جلد	(اردو ادب ۱۷۰۷ء - ۱۸۰۳ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر سید وقار عظیم
آٹھویں جلد	(اردو ادب ۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
نویں جلد	(اردو ادب ۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر عابد بریلوی
دسویں جلد	(اردو ادب ۱۹۱۴ء - ۱۹۷۰ء)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
گیارھویں جلد	(بنگالی ادب ۔ اول)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
بارھویں جلد	(بنگالی ادب ۔ دوم)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
تیرھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان ۔ اول)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
چودھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان ۔ دوم)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
پندرھویں جلد	(علاقائی ادبیات ہند)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
سولھویں جلد	(خلاصہ جملہ جلد ہائے ادبیات در انگریزی)	مؤلف	سید فیاض محمود

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

علاقائی ادبیات مغربی پاکستان (جلد دوم)

فہرست

پیش لفظ

تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائرِ زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برِّصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادب سے مُراد یہاں ان خیالات و جذباتِ عالیہ کا مؤثّر اظہار ہے جن سے قلب و نظر کی جلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی بامعنی بنتی ہے۔ ایسے خیالات و تصوّرات جہاں ہمیں ادراک کی منتہیات کا راستہ دکھاتے ہیں وہاں رُوحانی تسکین کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے ایّام بھی روشن ہوتے ہیں اور ہمارے لمحات بامُراد۔ ادب میں مذہب، تصوّف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات، ہر چیز شامل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برِّصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرّت، اپنی فکر و نظر، اپنی اُمنگوں اور عزائم کو متجسّم کیا ہے، ان کے شاہپاروں اور ان کے مصنّفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دُنیا کو رُوشناس کرایا جائے۔ تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیب و ثقافت پر استوار ہے اور ہمیں اس بات کا مستقل احساس ہو جائے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتہ میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد علاء الدین صدیقی

(پروفیسر علاء الدّین صدّیقی مدیر اعلیٰ)

تعارف

مسلمانوں کو اس برِ صغیر میں آئے ہوئے سوا تیرہ سو سال ہو چکے ہیں یہ اس لئے درست ہے کہ مکران ۴۴ھ میں فتح ہو گیا تھا۔ اس طویل عرصے کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ دور جو سلطان محمود غزنوی کی فتوحات پر ختم ہوا۔ یہ کوئی پونے چار سو سال کی مدت ہے۔ اس عرصے میں برِ صغیر کے شمال مغربی علاقوں پر عربی زبان و ادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا۔ دوسرا دور کوئی پانچ سو سال کا ہے، جو غزنوی عہد اور "عہدِ سلاطین" پر مشتمل ہے۔ اس دور میں برِ صغیر "دار السلام" کہلایا اور تہذیبی طور پر ملتِ اسلامیہ کی عالمی وحدت کا رکن رہا۔ پانچ سو سالوں کے اس دور میں، جس کا آغاز محمود غزنوی کے ورود سے ہوتا ہے، فارسی ادب کا رواج ہوا اور فارسی زبان اظہار کا ذریعہ رہی۔ ویسے مغربی پاکستان کی سرزمین میں فارسی زبان اس عہد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی؛ بلکہ ملتان کے علاقے میں عام تکلمی زبان کی حیثیت[1] حاصل کر چکی تھی۔ پھر تیسرا دور مغلیہ عہد ہے، جو ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس میں ملتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند نئے تہذیبی اثرات سے روشناس ہوئی اور معاشرے میں فکری مد و جزر کارفرما رہا۔ اس دور میں افکار اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور اگرچہ اعتقادات میں ایک حد تک تزلزل کے آثار نمایاں ہونے لگے، لیکن تخریب اور انتشار کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پوری مدت میں فارسی

---

[1] دیکھئے، پانچویں صدی ہجری کے ابن صاعد اندلسی کی تالیف "طبقات الاسلام"

کی ادبی اقدار ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر تھیں ۔ اس کے بعد مغربی تہذیب، اس کے اصول زندگی اور اس کے معاشی، سماجی اور معاشرتی افکار کی اشاعت ہوئی ۔ چونکہ یہ دور نشر و اشاعت کا دور ہے، اور اس میں بعض وسائل فراہم ہونے سے تعلیم عوام تک پھیل گئی، اس لئے خیالات میں انقلاب پیدا ہونے لگا ۔ اس ذہنی انقلاب نے کئی نئی صورتیں اختیار کیں اور اس کے نتائج آجکل ہماری خانگی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں ۔ گذشتہ تین چار سو سال کی مدّت میں اردو، بنگلہ اور دیگر زبانوں اور بولیوں کا علاقائی ادب بھی فنّی پختگی کے ساتھ ساتھ حسنِ اظہار کا وصف پیدا کر چکا ہے ۔

ادب میں معاشرتی اور تعلیمی عوامل منعکس ہوتے ہیں ۔ زندگی کے تقاضے اظہار، احتجاج، طنز، شکایت، دعا یا الحاح کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ اس تاریخ ادبیات کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ زندگی کے ہر رخ، قلبِ انسانی کی ہر کیفیت، روحِ کائنات کے ہر پرتو میں ہم آہنگی نظر آئے اور مسلمانانِ برِ صغیر کی پوری زندگی اور ان کی تہذیب کا جامع عکس، ملّی وحدت کا مکمل ثبوت، ہر اس زبان اور اس کے ادب میں یقین آفریں انداز میں پیش ہو، جو یہاں بولی جاتی رہی ہے ۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم جس تہذیبی ورثے کے مالک ہیں، وہ کتنا پائیدار ہے اور اس میں کتنی توانائی اور استقامت موجود ہے ۔

اس تاریخ کی تدوین میں دو تین باتیں خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں ۔ اوّل یہ کہ کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح اور ہمدردانہ انداز سے محاسبہ نہ کیا جائے ۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگلہ، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلتی، شینا، بروشسکی، کھوار، ہندکو، سرائیکی، بلوچی اور براہوی، غرض ہر اس زبان کے معاشرتی اور فکری پس منظر کی نشاندہی کی جائے، جو پاکستان میں بولی گئی ہے یا بولی جاتی ہے، اور جو ادبی تخلیقات اس ماحول سے اُبھرتی ہیں، خواہ وہ ضرب الامثال ہوں یا لوک کہانیاں، گیت ہوں یا لوریاں، ان میں رزم، تصوّف، فکر اور عمیق جذبات کی ترجمانی ہو یا محض

تفنّنِ طبع کا سامان، سبھی کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ سے کر اپنی قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے۔ چنانچہ ہم نے زندگی کے ہر پہلو، زبان کے ہر انداز اور فکر کی ہر جہت کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ تاریخ کامل طور پر اور صحیح معنوں میں ہماری ثقافت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔

علاقائی ادبیات میں خاص طور پر لوک ادب کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ہم نے اسے ادبِ عالیہ کا ایک رکن تصور کیا ہے، اس لئے کہ ہر قوم کی ادبی تاریخ میں، لوک ادب ایک معنی خیز کردار ادا کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کی زندگیاں اسی ادب کی اقدار سے متاثر ہوتی ہیں، اور اسی کے کردار علامت بن کر اُن کے محرک بنتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ادبی تاریخ میں اس کا ذکر ضروری ہے۔

یہی حال ان مصنفین کا ہے، جو عام طور پر دوسرے درجے کے، یا بالفاظِ دیگر چھوٹے مصنف شمار ہوتے ہیں۔ یہ تو بدیہی امر ہے کہ کسی قوم کی رفعتِ فکر اور اسکی جذباتی بلندی صرف انہی مصنفین کے کلام یا تصانیف میں نظر آئے گی، جن کی نگاہ وسعت، بلندی اور گہرائی کے لحاظ سے روزمرّہ کے تجربات کے حدود میں مقیّد نہ ہو، اس لئے کہ چھوٹے شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نویس یا نثر لکھنے والے اپنے اپنے تجربے اور فنّی کوشش کے دائرے میں محدود اور محصور ہوتے ہیں۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ اس دائرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو، جن سے عام لوگوں کی زندگی عبارت ہوتی ہے، زیادہ توجہ سے قلم بند کرتے ہیں۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی مگر وہ روزمرّہ کے تقاضوں اور زندگی کے عام مشاغل اور قلبی واردات کے سطحی تاثرات کو صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعراء یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیبی تاریخ مرتب کرتے وقت ان چھوٹے اہلِ قلم کی تخلیقات کا جائزہ لینا بھی اسی قدر ضروری ہوتا ہے جتنا ادبی عظماء کا۔ چنانچہ اس تاریخ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و ہند کی پوری ادبی زندگی کی ترجمان بن گئی ہے۔

مذکورہ مطالب کے حصول کے لئے ہر ادب کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو سامنے لایا گیا ہے، تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کے تاثرات اور خیالاتِ عالیہ کی ہم عکاسی کر رہے ہیں، وہ اپنی اجتماعی زندگی کن ضوابط، کن پابندیوں اور کن اصولوں کے تحت بسر کرتے تھے۔ اس بنا پر اس تاریخ ادبیات کو در اصل ملّتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تہذیبی تاریخ تصوّر کرنا چاہیئے۔

سید فیاض محمود

گروپ کیپٹن سیّد فیاض محمود
مدیر عمومی

بلتی ادب

تمہید: بلتستان کو بلتی زبان میں بلتی یُل کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں بلتیوں کا وطن[1]۔ جس خطہ کو آج بلتستان کہا جاتا ہے، سابق ریاست جموں و کشمیر کا وہ شمالی علاقہ ہے، جو ہمیشہ مؤرخین اور بیرونی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔ پرانے مؤرخوں نے اس خطہ کو تبت خورد[2] لکھا ہے۔ اس کی پہلی وجہ اس کا محلِ وقوع ہے۔ اس لیے کہ یہ علاقہ کوہ قراقرم کے سربفلک سلسلوں کے درمیان واقع ہے، جو ۳۴ درجہ اور ۳۶ درجہ عرض البلد شمال اور ۷۵ درجہ و ۷۷ درجہ طول البلد میں محیط ہے۔ شمال میں اس کی حد بندی حزنگ اور نگر کا سلسلہ کرتا ہے۔ مشرق میں لداخ کی پہاڑیاں ہیں، جنوب میں کشمیر، وارڈوان اور ذاسکر ہے۔ مغرب میں گلگت اور استور ہے۔ الغرض یہ خطہ بہت سی بلند پہاڑیوں کے سلسلوں میں گھرا ہوا ہے۔ ان کی بعض چوٹیاں ۲۵۰۰۰ فٹ اور ۲۶۰۰۰ فٹ تک بلند ہیں اور سب سے اونچی چوٹی کے۔ ٹو(K2) کی بلندی ۲۸۰۰۰ فٹ سے زیادہ ہے۔ اسے بیرونی دنیا سے ملانے والے راستے ایسے درّوں سے گذرتے ہیں جو نہ صرف دشوار گذار ہیں، بلکہ سال میں چھ مہینے سے لے کر نو مہینے تک برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اس طرح جغرافیائی علیحدگی کے لحاظ سے بلتستان کوہ ہندوکش، قراقرم اور ہمالیہ کی پہاڑی ریاستوں چترال، نیپال، سکم اور بھوٹان کی صف میں گنا جا سکتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ یہ سر زمین جہاں راستے ناپید ہیں ہمیشہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔

محلِ وقوع: بلتستان کا محلِ وقوع یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس کے شمال مغرب میں ہنزہ کی ریاست ہے۔ عین شمال میں چین کا صوبہ سنکیانگ ہے۔ دیوز کی سطح مرتفع اور کشمیر کی وادی اس کے جنوب میں واقع ہیں۔ اس کے مشرق میں لداخ کی پہاڑیاں ہیں اور مغرب میں گلگت کی وادیاں۔

بلتستان کا رقبہ ۹۹۳۶ مربع میل ہے اور یہاں کی آبادی ۱،۳۳،۷۷۷ ہے (ایک لاکھ تینتیس ہزار اور سات سو ستتر)۔

---

(۱) سید عطا حسین کلیم: 'بلتستان کی شاعری'، ص ۱۸۔

(۲) Grierson, *Linguistic Survey of India*, Vol. III, Part I, Page 32.

قدرتی تقسیم : اس علاقے کے درمیان سے دریائے سندھ بہتا ہے ۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر کئی گاؤں آباد ہیں ۔ اس کے علاوہ اور بھی معاون دریا ہیں ، مثلاً شیوک (Shyok) شگار (Shigar) دراس (Dras) اور سورد (Surud) ، جو کرگل کے مقام پر جا ملتے ہیں ۔ برالدو (Braldo) اور بشر (Bashar) یہ دونوں چھوٹے دریا بڑے دریا سکار میں جا ملتے ہیں ۔ ھس (Hushe) اور سلطارو (Saltaro) (جو کہ عین کھپالو کے اوپر ہیں اور بلتستان کے زرخیز ترین حصے میں بہتے ہیں) ، دریائے شیوک (Shyok) میں جا ملتے ہیں۱ ۔

اس علاقہ میں کسی قسم کے مسلسل جنگلات نہیں ہیں ۔ البتہ دیودار اور صنوبر کے درخت کافی تعداد میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پیدا ہوتے ہیں ۔ دیہاتوں میں سڑک کے کناروں پر جہاں پانی زیادہ دستیاب ہے ، لمبے لمبے سایہ دار درخت ، بید کے درخت اور پھلوں کے درخت بہ آسانی اگائے جاسکتے ہیں ۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر جو کھیتی باڑی کے کام کے لیے موزوں نہیں ، زیرہ کے پودے اور بنفشہ کے پودے بکثرت اُگے ہیں ۔ اس کے علاوہ ایک خاص قسم کی خوبصورت گھاس بھی اُگتی ہے جسے لوگ کاٹ کر کام میں لاتے ہیں ۔ یہاں کی آب و ہوا ٹھنڈی اور خشک ہے ، بارش برائے نام ہوتی ہے ۔ دیہاتوں میں ذریعۂ آبپاشی برفباری ہے ۔ سکردو اور شگار دونوں شہروں میں دسمبر کے وسط سے مارچ کے وسط تک برفباری ہوتی ہے ۔ روندو (Rondu) کے علاوہ میں بہت برف پڑتی ہے ۔ سردی بھی شدید ہوتی ہے اور بیشتر دریاؤں کا پانی جم کر عام سڑک کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور دریا کے ناہموار کناروں کی نسبت ، جو عام طور پر شاہراہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ، جما ہوا دریا ایک ہموار اور بہتر راستہ بن جاتا ہے ۔ اور یہاں پر بہت سے ایسے دیہات بھی ہیں جن میں سورج کی شعاعیں روزانہ ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں پڑتیں ۔ بہار اور خزاں کے موسم میں موسم خوشگوار ہو جاتا ہے ۔ لیکن جولائی اور اگست میں دریائے سندھ کے کناروں پر واقع دیہاتوں میں گرمی اچھی خاصی ہوتی ہے اور بالخصوص سکردو کے ریتلے میدانوں اور روندو (Rondu) میں جو کہ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی ہے ، شدید گرمی پڑتی ہے ۔

بلتستان کے مختلف نام : بلتستان کے نام کے بارے میں بھی تضاد ہے ۔ مختلف ادوار میں مختلف تاریخ دانوں نے اس جگہ کو مختلف نام دیے ہیں ۔ اگرچہ اس ملک کا پہلا اور بنیادی نام بلتی ہے ۔ تاریخ میں یہی ملک مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے ۔ یونانی تاریخ دان اس کو بلتے (Byltae) بولتے ہیں ۔ جبکہ لداخ کے لوگ

(۱) *Imperial Gazetteer of India,* Vol. VI, New Edition, Pages 261—265.

ماقبل اسلام اسے سوری بتان (Suri Butan) کہتے تھے - یعنی خوبانی کی سر زمین۔ چینی سیاح ہیون سانگ (Hiuen Tsang) جو راجہ ہرش کے زمانے (۶۰۶ء - ۶۴۷ء) میں ہندوستان آیا ، اس کا نام پولولی (Polole) بتاتا ہے ۔ ایک صدی بعد اس کے لیے پولو اعظم کا نام بھی استعمال ہوا ۔ کچھ تاریخ دانوں نے اس کو بولر (Boler) کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے ۔ بولر کے علاقے میں کاشغر بالا ، ستج یاسین ، سیری اور سیری کول شامل ہیں۔ مارکو پولو بھی اس علاقہ کو بولر کہتا ہے ۔ اس کی مراد یہی مندرجہ بالا علاقہ تھا ۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہ بلتی کی چھوٹی سی ریاست چترال ، یاسین اور سیری کول تک پھیلی ہوئی تھی اور غالباً یہی وجہ بلتی کو بولر کہنے کی تھی ۔ اس علاقہ کا ''بلتی'' نام ۱۵۳۳ء میں مرزا حیدر کے حملے تک نہیں پڑا تھا ۔ مرزا حیدر نے جو کہ ایک بڑا تاریخ دان بھی تھا اپنی اہم تاریخ ''تاریخ رسیدی'' میں بلتستان کے بادشاہ کو چوپان بلتی لکھا ہے[1] ۔

تاریخ : آثار و قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کا علاقہ جسے تاتاری لوگ تبت خورد کہتے تھے ، زمانۂ قدیم میں تبت کے ماتحت تھا اور غالباً کشمیر کے تمام شمال مغربی علاقہ یعنی صوبۂ لداخ کی انتظامیہ کا ایک رکن تھا ۔ چنانچہ لوگوں کی طرز بود و ماند ، ان کا مذہب اور ان کے رسوم و عقائد تبتوں یعنی بدھ مت والوں کے سے تھے ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ جب بر صغیر کے شمال مغربی صوبے ہخا منشیوں نے فتح کر لیے تو وہ کشمیر کی طرف راغب ہوئے یا نہیں ، ان کے بعد سکندر اعظم کا حملہ ہوا ۔ مگر وہ کشمیر تک نہیں گیا ۔ اس کے بعد شمال مغربی علاقوں بلکہ نصف افغانستان کو بھی چندر گپت موریا نے فتح کر لیا اور ان کے بعد جب ساسانیوں نے وہ علاقے فتح کر لیے جو اب مغربی پاکستان میں ہیں تو یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ شمالی کشمیر کو اپنے دائرۂ اختیار میں لائے یا نہیں ۔ البتہ یہ بات قطعی اور واضح ہے کہ راجہ اشوک کے زمانے میں کشمیر موریا خاندان کے قبضے میں تھا ۔ مگر تاریخ سے اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ وسط ایشیا میں سکندر اعظم کے ورثا کا جسے ہند باختری کہا جاتا ہے کشمیر میں دخل تھا یا نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا عمل دخل ٹیکسلا کے گرد ضرور تھا اور ان کے ایک راجے می نیندر (۱۸۰-۱۶۰ ق م) کا عمل شمالی پنجاب میں ضرور تھا ، کیونکہ اس کا دارالسلطنت سیالکوٹ تھا ۔

ان کے بعد کشانیوں کا دور آیا ۔ ان کی سلطنت (۸۳۵–۸۶۲ء/۲۲۰–۲۴۸ھ) بہت وسیع و عریض تھی اور سطح مرتفع پامیر سے لے کر وسط ہندوستان تک اور باختر

(۱) Wazir Muhammad Ashraf Khan, *The Hinterland of Asia*, Page 103.

سے لے کر پٹنہ تک پھیلی ہوئی تھی ، اس لیے کشمیر کا سارا علاقہ کشان بادشاہوں ، خصوصیت سے راجہ کنشک کے ماتحت تھا اور یہاں کے رہنے والے اکثر و بیشتر بدھ مت کے پیرو بن چکے تھے ۔ گپت راجاؤں کے عہود میں کشمیر آزاد رہا اور راجہ ہرش اگرچہ بہت صاحب اقتدار تھا اور شاید چاہتا تو کشمیر کو اپنے قبضہ میں لا سکتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا ۔ اس سے پہلے یعنی (پانچویں صدی عیسوی میں) ہن قوم کی یلغار نے شمالی ہند کو تاراج کر دیا تھا ۔ ان کے سردار تورمن نے تمام شمال مغربی ہند کو بری طرح برباد کیا اور پھر گجرات میں اپنا مستقر بنایا ۔ جب اس کے مظالم کے خلاف راجا یشو دہرمن والئی مالوہ کی قیادت میں ہندو اتحادیوں نے اسے شکست دی تو اس کا بیٹا شمال کی طرف مراجعت کر گیا اور اس نے سیالکوٹ (ساکلا) کو اپنی راجدھانی بنایا ۔ اس کا نام مہر گل تھا اور یہ راجا بھی اپنے مظالم کی وجہ سے اتنا بدنام ہوا کہ پنجاب سے بھی اسے ہندوؤں نے بھگا دیا اور جو مہم اس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئی اس نے اسے شکست دے کر مجبور کیا کہ وہ کشمیر کی جانب فرار اختیار کرے ، لیکن اس نے یہیں وفات پائی ۔ ان سب باتوں کے باوجود مہرگل کا نام اب بھی سرحد میں عام ہے ۔

اس کے بعد ہندو راجا خود مختارانہ طور پر یہاں حکومت کرتے رہے ، مگر وادیٔ کشمیر کے شمال مشرق یا شمال مغربی علاقوں سے ان کا کوئی گہرا تعلق نہ تھا اور یہ علاقے جن میں لداخ ، بلتستان ، دردستان ، ہنزہ ، نگر اور گلگت شامل ہیں یا تو نیم خود مختار تھے یا برائے نام کشمیر کے مہاراجاؤں کے ماتحت تصور کیے جاتے تھے ۔ ان میں سے ایک راجا کا نام ہرش بھی تھا اور وہ اس قدر ظالم تھا کہ تاریخ اسے کشمیر کا نیرو کہتی ہے ۔ راج ترنگنی جس میں کشمیر کے ہندو عہود کا تذکرہ ملتا ہے ، کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی آبادی ہمیشہ سے امن پسند اور غیر جنگجویانہ خصائل کی حامل تھی ۔ اس لیے غالباً بہت سے راجا ظلم و تعدی کے عادی ہو گئے ۔

اسلام کا دور : خیال کیا جاتا ہے کہ ان علاقوں میں اسلام غالباً تیرھویں صدی میں پہنچا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کو اسلام سے روشناس کرانے والے مبلغ خراسان سے آئے تھے ۔ اس لیے بلتی تہذیب و تمدن ، موسیقی ، آداب مجلس ، نشست و برخاست اور رسم و رواج وغیرہ میں ایرانی رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے ۔ دو صدی سے زیادہ عرصہ تک مقامی سلاطین کشمیر پر قابض رہے ۔ مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ کے مطابق مقپون علی شیر خان انچن (۱۵۵۹ء-۱۶۳۳ء) کی بہن کی شادی شہنشاہ جہانگیر

سے ہوئی تھی ، اس تعلق سے بلتستان پر مغل اثرات کا دخل تعجب کی بات نہیں۔

اکبر نے کشمیر کو ۱۵۸۶ء میں مغلیہ سلطنت میں شامل کیا۔ بیگمات اور شہزادیاں گرمیوں کا موسم گزارنے کے لیے کشمیر ہی جایا کرتی تھیں[1] - پھر یہ خطہ کشمیر ۱۷۳۶ء کے قریب ابدالی سلطنت کا حصہ ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے اس کو فتح کر لیا۔ ۱۸۳۶ء میں انگریزوں نے پنجاب میں سکھوں پر فتح پانے کے بعد کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ ، جو جموں کا گورنر تھا پچھتر یا ۸۰ لاکھ روپوں کے عوض فروخت کر دیا۔ بعد ازاں ۱۹۴۸ء میں راجہ کرن سنگھ مہاراجہ کشمیر نے بھارت سے الحاق کر لیا۔

آخری دور کے بلتستانی تاجدار : بلتستان کا آخری تاجدار "رگیا لفو احمد شاہ مقپون ۱۸۰۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت بلتستان کے مختلف علاقوں ، کھرمنگ میں مقپون علی شیر خان ، رون یل میں مقپون علی خان ، خپولو میں یبگو یحییٰ خان شگر میں حیدر خان آماچہ ، استور (جسے بلتی زبان میں حصورہ کہتے ہیں) میں مہپوا جبار خان ، تولتی میں مقپون احمد خان اور کریس میں یبگو خرم خان حکمران تھے ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو رسوائے عالم بیع نامہ امرتسر کے بعد ڈوگرہ گلاب سنگھ کی طرف سے وزیر زور آور سنگھ اور لکھپت رائے نے لداخ اور بلتستان کی خود مختاری ختم کرنے کے لیے مندرجہ بالا امراء پر حملے کیے[2]" ، حریت پسند بلتستانیوں سے خونریز لڑائیاں بھی ہوئیں مگر بالآخر ڈوگرہ استبداد بلتستان پر مسلط ہوگیا۔

آزادی کی آخری کوشش : اس جنگ کے ایک سال بعد والئی شگر غازی حیدر خان حیدر نے ہم خیال لوگوں کو یک جا کر کے بلتستان کی آزادی کے لیے آخری قربانی پیش کی اور ایک قومی تحریک جاری کر کے ڈوگروں کے خلاف بغاوت کر دی۔ مگر ڈوگروں کی فوج تعداد میں زیادہ اور فوجی تربیت کی وجہ سے زیادہ منظم تھی اس لیے بلتستان کے اس انقلابی ہیرو کو پابند سلاسل کر کے جموں پہنچا دیا گیا اور اسے وہیں نظر بند کر دیا۔ ایام اسیری میں بھی غازی حیدر خان حیدر کی واحد آرزو بلتستان کی آزادی تھی۔[3]

سکھوں و ڈوگروں کا عہد : اس تحریک کو شکست اس وجہ سے بھی ہوئی کہ مسلمان راجے نا اتفاق کا شکار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی (۱۸۱۹ء—۱۸۴۶ء) اور ان کے وفادار گورنر جموں ، راجہ گلاب سنگھ

---

(1) Syed Fayyaz Mahmud, "The Story of Indo Pakistan," Page 109

(۲ اور ۳) سید عطا حسین کلیم : 'بلتستان کی شاعری' ، ص ۲۲-۳۲ -

کی ماتحتی میں ریاست جموں کی ڈوگرہ حکومت ملک گیری پر عمل کر رہی تھی اور ڈوگرہ جرنل زور آور سنگھ اسکردو کی مہم پر بھیجا جا چکا تھا۔ راجہ احمد شاہ والئی اسکردو ڈوگروں کے دھوکے میں آ کر اسیر ہوئے اور ان کے گھر کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ قلعہ اسکردو کے تمام سامان حرب پر ڈوگروں کا قبضہ ہوا۔ دوسرے سال جب زورآورسنگھ راجا کی مہم میں مارا گیا تو راجا احمد شاہ کے جانباز ساتھیوں کے زیر سرکردگی راجا حیدر خان والئے سگر نے بغاوت کا علم بلند کر کے بلتستان کو ڈوگرہ پنجہ استبداد سے ایک دفعہ پھر آزاد کروا لیا۔

فتح بلتستان : ۱۸۴۶ء کے بعد جب حیدر خان کی حکومت کا زمانہ بھی ختم ہو چکا تھا، گلاب سنگھ نے ایک فوج بلتستان کو بھیجی، جس نے بے خبری میں سکردو پر حملہ کر دیا اور قلعہ سکردو کو آگ لگا کر تباہ کر دیا گیا۔ قلعہ میں ایک مسجد بھی تھی جہاں محصورین کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ قلعہ میں بلتی فوجیوں کے علاوہ شہر کے معززین، عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ڈوگرہ تلوار کے دھارے سے کوئی نہ بچ سکا۔ قلعہ کے باہر جن اشخاص پر تعاون میں شریک ہونے کا شک گزرا ان کے سر گذرگاہوں پر لٹکا دیے گئے۔ الغرض وحشت اور بربریت کا یہ بھیانک مظاہرہ تاریخِ ڈوگرہ کا ایک ایسا واقعہ ہے جو عہد چنگیز کی یاد دلاتا ہے۔ حیدر خان بچ نکلے تھے لیکن خپلو میں اسیر کر لیے گئے۔ ان کے اسیر ہونے پر بلتیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور یہ علاقہ ایک سو آٹھ سال تک ڈوگرہ راج سے نجات حاصل نہ کر سکا۔

ڈوگرے چونکہ سرحدی اضلاع کو مفتوحہ علاقہ سمجھتے تھے اس لیے اپنے ایک سو آٹھ سال کے عہد حکومت میں مفتوح بلتیوں کو ظلم کا شکار بنانے اور ان کے حقوق پامال کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے۔ چند ایک مثالیں درج کی جاتی ہیں—

۱۔ بلتی جوانوں کو فوجی ملازمتوں سے قانوناً محروم کر دیا گیا۔

۲۔ ذرائع آمد و رفت کے لیے بیگار اور جبری محنت کا قانون کھڑا کر دیا جس کے تحت لوگ سرکاری ملازموں کے لیے مفت بار برداری کرنے اور پڑاؤ پر مفت راشن مہیا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ افسروں کے بیوی بچوں کو سکردو سے لداخ اور لداخ سے سرینگر تک اٹھا کر لے جاتے تھے۔

۳۔ بلتیوں کے لیے اعلیٰ سرکاری عہدے ممنوع تھے۔

۴۔ اسلحہ کے ایسے قوانین وضع کیے گئے کہ بلتی لوگ اپنے گھروں میں کسی قسم کا اسلحہ بمثل ایک چھرا تک بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

بیگار دور غلامی کی یادگار تھی۔ ڈوگرہ حکومت کے ملازمین اور افسروں کا سامان

اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور ان کو راشن مہیا کرنے اور پڑاؤ پر قیام کے دوران میں ملحقہ دیہات کے لوگ، بناسب آبادی کے لحاظ سے، سال میں دو دفعہ مقررہ ایام میں حاضر رہتے۔ ہر پڑاؤ پر پچاس قلی اور پانچ گھوڑوں کو تیار رکھنا لازمی ہوتا۔ غیر حاضری کی صورت میں اجتماعی جرمانہ کیا جاتا۔ وزیر وزارت جب لداخ سے اسکردو یا اسکردو سے لداخ جاتا تو اس کا بڑا ٹھاٹھ ہوتا۔ اس کے کتّے تک ڈولی میں بٹھا کر لے جائے جاتے۔ وزیر وزارت جس منزل (پڑاؤ) پر قیام کرتا، چولھا اس وقت تک نہ جلایا جاتا جب تک اس کے اہل کاروں کو پچاس سے سو روپے تک نذرانہ پیش نہ کیا جاتا۔ جسے عرف عام میں ''تھب ستد'' یعنی زرِ چولھا کہتے تھے۔

بلتستان کی سیاسی اہمیت: بلتستان کی سیاسی اہمیت یہ ہے کہ اپنی دور افتادگی کے باوجود، انقلابات زمانہ کا شکار ہوتا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ علاقہ بھی بیرونی حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا، یا تو براہ راست اس پر حملے ہوتے تھے یا اسے اردگرد کے علاقوں یعنی لداخ، تبت، گلگت، سنکیانگ اور کشمیر پر حملے کے لیے راستے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ذوالقدر خان المعروف زول چون سلطان ابو سعید خان والئی کاشغر، مرزا حیدر دوغلات اور سلطان شہاب الدین والئی کشمیر کے علاوہ کشمیر کے ایک حکمران نے بھی بلتستان پر حملہ کیا تھا۔ ان میں سے بعض حملہ آور ایسے بھی تھے جو آندھی کی طرح آئے اور بلتستان کے حصے میں تباہی و بربادی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان حملوں کا مختصر تذکرہ کشمیر کی تاریخوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

دنیا کی نظروں سے بلتستان کے اوجھل رہنے کی دوسری وجہ وہ صد سالہ ڈوگرہ دور ہے جسے مؤرخ بلتستان کا تاریک دور کہتے ہیں۔ سو فیصد مسلم آبادی کا یہ علاقہ خصوصیت کے ساتھ ڈوگرہ حکمرانوں کے نزدیک اس قابل نہ تھا کہ اس میں زرعی، اقتصادی یا معاشرتی حالات درست کرنے یا بہتر بنانے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ انیسویں صدی میں بلتی لوگ فقط حکام کی بالا دستی کا شکار ہی نہیں رہے بلکہ انہیں کسی قسم کے شہری یا سیاسی حقوق دینے کا سوال بھی پیدا نہ ہوا۔ حتیٰ کہ بیرونی دنیا کے سیاحوں یا دلچسپی لینے والے لوگوں پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ ان علاقوں میں نہ گھومیں، تاکہ دنیا کو ان علاقوں کی معاشرتی پستی کا حال معلوم نہ ہو جائے۔

سیاح اور ان کے بیانات: ان سب قیود اور پابندیوں کے باوجود بلتستان کا علاقہ قدیم زمانہ سے سیاحوں اور کوہ پیماؤں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ دشوار گذار راستوں

کے باوجود دنیا کے باہمت افراد نے اس علاقہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے کوششیں کی ہیں۔ کوہ قراقرم کے فلک بوس برفانی پہاڑوں میں سے گزرنے والے دریاؤں کے سلسلے بلتستان کو وسط ایشیاء سے جدا کرتے ہیں۔ دنیا کی مشہور برفانی چوٹی کے۔ ٹو جس کا جدید ترین نام باشہ بردم یا ماسہ بردم رکھا گیا ہے، اسی علاقہ میں واقع ہے۔ سیاحوں میں سب سے پہلے مغربی سیاح جی۔ ٹی۔ وگنی اور گوڈون آسٹن وغیرہ نے بلتستان پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے مگر آج ان سیاحوں کی تحریریں بھی دستیاب نہیں ہوتیں۔

آزادیٔ اکستان کے بعد ایک امریکی سکالر مسٹر جیمز پارلے کا نام ملتا ہے۔ اس نے بلتستان کا دورہ کیا۔ وہ بلتستان کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ جا کر لوگوں سے ملا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بلتستان کی تاریخ و ثقافت پر خاص چیزیں جمع کیں۔ مسٹر جیمز پارلے کی تحقیقات کے بعض حصے ایک امریکی رسالے میں دو تین قسطوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں مگر باوجود کوشش کے ہمیں یہ رسالے نہیں مل سکے۔

کشمیر کی تاریخ لکھنے والوں میں منشی حشمت اللہ خان لکھنوی بھی ہیں۔ انہوں نے بلتستان کی تاریخ و ثقافت پر کچھ مواد فراہم کیا ہے۔ اگرچہ منشی حشمت اللہ خان کی کاوشوں میں ڈوگروں کی ناواجب جنبہ داری اور حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر حقائق کو نظر انداز کرنے کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے[1]۔

معاشرت: بلتی ظاہرا شکل و صورت میں لداخیوں کے مشابہ ہیں۔ ان کا ناک نقشہ منگولوں سے ملتا ہے۔ ان کے گالوں کی ہڈیاں ابھرواں ہیں۔ آنکھیں کھنچی ہوئی اور لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ البتہ ناک لداخ کے بھوٹیوں (Bhotis) کی طرح چپٹی نہیں ہے اور نہ ان کا رنگ زرد ہے۔ لداخیوں اور بلتیوں میں تفریق کا باعث کچھ نہیں ہے سوائے ایک چوٹی کے، جو بلتیوں میں نہیں رکھی جاتی۔ بلتی قدرے زیادہ صحت مند قد آور اور زیادہ جسیم ہوتے ہیں۔ یہ بڑے صبر و تحمل والے ہیں اور خوش خلقی کے لیے مشہور ہیں۔ کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں۔ باوجود پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ قوم ہونے کے نہایت خوش مزاج اور اچھے دل کے ہیں۔ ان کا لباس مخمل کی ٹوپی، کوٹ، اونی پاجامہ اور خام کھال کے جوتے ہیں۔ جوتوں کو آرام دہ اور نرم بنانے کے لیے اندر نرم گھاس کی تہہ جما کر سی دیا جاتا ہے۔ سر کے بال کٹوا دیے جاتے ہیں، صرف تھوڑے سے بال سر کے پچھلے حصہ پر چھوڑ دیتے ہیں جن میں پھول وغیرہ لگا کر سنگھار کیا جاتا ہے۔

تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں بلتستان میں بھی لداخی لباس رائج تھا

---

(۱) سید عطا حسین کلیم: 'بلتستان کی شاعری'، ص ۱۵—۱۶، ۱۸۔

لیکن بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ بلتستان والوں نے اس لباس کو چھوڑ کر اسلامی لباس اختیار کر لیا ۔ جس میں گھیرے دار کرتا ، صدری اور شلوار نمایاں ہیں ، البتہ پگڑی اور کلاہ کا رواج نہیں ہوا ۔ یہ لوگ پٹو کی سفید ٹوپی جس کے نچلے حصے پر گول سا چکر ہوتا ہے پہنتے ہیں ، البتہ سردیوں میں سب لوگ اون کا دھسہ یا لوئی (شال) اوڑھ لیتے ہیں ۔ یہ استطاعت کے مطابق نرم یا کھردری اون کی ہوتی ہے اور یہ خانہ ساز ہوتی ہے یا دیہی دستکاری کا نمونہ ۔

بلتستان کے بہت سے لوگ تقسیم ہند و پاکستان سے پہلے شملہ ، مسوری ، نینی تال اور دوسرے سرد مقامات پر کام کرتے تھے ۔ ان لوگوں کی تعداد دس پندرہ ہزار تک ہوگی ۔ ان میں بعض ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے اور سڑکیں بنانے کے ٹھیکے لیتے تھے ۔ مگر زیادہ تر بلتستان کے لوگوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہی ہے ۔ اگرچہ زمین یہاں بہت کم ہے اور اس کو بیع یا رہن کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ۔ آبپاشی دریا یا چشموں کے پانی سے ہوتی ہے ۔ غلہ کا نرخ ہمیشہ فی روپیہ ۷ سے ۱۰ سیر پختہ تک رہا ۔ یہاں کے لوگ عموماً غریب ہیں اور تعلیم کا شوق بہت کم رکھتے ہیں ۔ اگر کھیتی باڑی ذریعہ آمدنی نہ ہو تو مالیہ ادا کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہو جائے ۔ بعض لوگوں کے پاس چھوٹی چھوٹی جاگیریں بطور معافی ملی ہوئی ہیں ۔ یہ اسکردو ، چنلو کرس اور شگر وغیرہ میں واقع ہیں ۔ بیشتر جاگیردار مسلمان شیعہ مذہب رکھتے ہیں ۔ ان کے علاوہ چنلو ، کرس اور شگر کی کچھ آبادی نور بخشی مذہب رکھتی ہے اور ان کا اعتقاد شیعہ اور سنی مذہب کے بین بین ہے ۔ اگر کسی سنی سے مباحثہ ہو تو اعتقادات شیعہ سے ثبوت لا کر اسکی تردید کرتے ہیں ، اور اگر کسی شیعہ سے مباحثہ ہو تو سنیوں کی کتاب سے مسئلے ڈھونڈ کر جواب پیش کر دیا جاتا ہے ۔ البتہ ابھی تک بلتی زبان میں دقیق علمی مسائل پر کتابیں نہیں لکھی گئیں ۔

محفلیں : بلتی زبان میں فارسی طرز پر لکھے ہوئے مرائی اور نوحہ جات اور دیگر مذہبی قصص کافی تعداد میں موجود ہیں ۔ چائے کا رواج یہاں عام ہے ۔ جہاں کسی نے چائے بنائی کچھ آدمی جمع ہو گئے ، اور مرثیہ خوانی شروع ہوئی ۔ ایک آدمی شروع کرتا ہے اور باقی لوگ اس کے ساتھ مل کر خوب اچھی طرح سے باآواز بلند مرثیہ پڑھنے لگتے ہیں ۔ ہر امام کے مولد ، وفات اور عید کے تہوار پر ماتم ہوتا ہے ۔ مگر خوشی اور غمی دونوں کا رنگ یکساں ہوتا ہے ۔ یعنی ہر دو موقع پر چائے پر لوگ جمع ہوتے ہیں اور بعد ازاں مرثیہ خوانی ہوتی ہے ۔ اسکردو میں ماتم سرائیں بہت ہیں اور وہاں کے لوگ سب کے سب شیعہ ہیں ۔ چنلو ، شگر اور کرس میں جامع مسجدیں بھی ہیں ۔[1]

---

(۱) مولوی محمد شفیع : فرقۂ نور بخشی ، اورینٹل کالج میگزین ، ص ۶۲ ، مئی ۱۹۲۵ء ۔

بلتی موسیقی : موسیقی جس طرح دوسرے علاقوں میں تقریبات کی جان ہوتی ہے ، اسی طرح بلتستان کی تقریبوں میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس وقت تمام بلتستان پر ''جدیدیت'' کے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ لباس ، خوراک ، آداب و اطوار ، شعر و شاعری ، موسیقی ، غرضکہ ہر چیز میں بلتستانیوں نے پرانی خصوصیات سے منہ موڑ لیا ہے اور ''جدیدیت'' کو ترقی سے مترادف کرتے ہوئے اپنی تہذیب کو بدلنے پر مصر ہیں۔ قدیم بلتی تہذیب و تمدن ، قومی روایات ، وضع داری وغیرہ کے لحاظ سے بلتستان میں خپولو کا علاقہ غنیمت ہے۔

بلتی راگ یعنی ''حریب'' تعداد میں تقریباً ساٹھ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ بلتی راگ یعنی '' حریب'' بھی ایرانی موسیقی سے متاثر ہیں۔ بلتی دھنوں میں ''غبیر سا غبیر چوں'' نامی دھن منفرد ہے۔ ایک طرح سے یہ دھن مشہور راگ ملہار کا الٹ ہے۔ کیونکہ عام طور پر مشہور ہے کہ اس بلتی دھن کے بجانے سے ضرور بارش تھم جاتی ہے۔ بلتی موسیقی کے مقبول ساز یہ ہیں۔ ڈھول ، بلتی طبلہ (جسے ڈامن کہتے ہیں) ، شہنائی ، بنسری (جس کی دو قسمیں ہیں۔ ''چک خلینگ'' اور ''زہان خلینگ'') کسنہ اور چنگ۔ بلتی طبلہ یعنی ڈامن نقارہ کی شکل میں تیار ہوتا ہے۔ مگر یہ جسامت میں نقارے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ طبلہ انگلیوں کی تھاپ سے بجتا ہے ، مگر اس بلتی طبلہ کو ایک ایک فٹ لمبی چھڑیوں سے بجایا جاتا ہے۔ اس خاص چھڑی کو بلتی زبان میں ''ڈان سی لنگ'' کہتے ہیں۔ یہ سب ساز بلتستان ہی میں تیار ہوتے ہیں۔

کھیلیں : پولو کا اہتمام علاقہ کا راجا کرتا ہے۔ علی الصبح راجا کے محل کے سامنے شہنائی اور دوسرے سازوں پر مخصوص دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ پہلے کوئی راگ یعنی حریب بجاتے ہیں پھر اسی حریب کے مطابق کوئی لوک گیت گاتے ہیں۔ لوک گیت کے بعد اسی گیت سے مطابقت رکھنے والی کسی غزل کی دھن چھیڑتے ہیں۔ اس رسم کو ''راتب'' کہتے ہیں۔[۱]

زراعت : بلتستان کی کاشتکاری اور زراعت کا دار و مدار ذرائع آب پاشی پر ہے۔ جہاں پانی کافی مل جاتا ہے وہاں اچھی فصل ہوتی ہے۔ زراعت کا تمام تر کام ، سوائے ہل چلانے کے ، یہاں کی عورتیں کرتی ہیں۔ صرف ہل مرد چلاتے ہیں۔ ہل لکڑی کے پرانی وضع کے ہوتے ہیں۔ زمین کا رقبہ بعض اوقات اتنا کم ہوتا ہے کہ بیلوں سے ہل چلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی اور مرد خود ہی بیل کی جگہ لگ کر ہل چلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مردوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ بیلوں اور دیگر

---

(۱) سید عطا حسین کلیم : 'بلتستان کی شاعری' ، ص ۳۲ تا ۳۸۔

مویشیوں کو چراگاہوں میں لے جا کر چرائیں اور پھر کھیتوں میں پانی پہنچانے والی نالیوں کی مرمت کریں ۔ مزید برآں یہ لوگ لداخ اور گلگت کے درمیان سامان لے جانے اور لانے کا کام بھی کرتے ہیں ۔ موسم بہار کی فصلوں میں جو چیزیں کاشت کی جاتی ہیں ان میں گندم ، جو ، مٹر ، لوبیا ، کنگنی اور شلغم قابل ذکر ہیں ۔ ان علاقوں کو چھوڑتے ہوئے جہاں برفباری زیادہ ہوتی ہے عموماً دو فصلیں پیدا کی جاتی ہیں ۔ زمین کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جن کی زمین سخت اور ناقابل کاشت ہے اور اتنی بلندی پر واقع ہے کہ پانی وہاں تک نہیں پہنچایا جا سکتا اس زمین کو ال آبای (Ulābi) کہتے ہیں، اور وہاں پر جنگلی گھاس وغیرہ اُگ آتی ہے ۔ اس کے برعکس بعض جگہ کی مٹی اس قدر نرم ہے کہ ہل چلانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی ۔ بعض جگہ جہاں برف نہیں پگھلتی وہاں مصنوعی طریقہ پر بھی کاشت کی جاتی ہے ۔ یعنی اس برف پر ہی مٹی چھڑک دی جاتی ہے اور اس پر بیج بویا جاتا ہے ۔ کچھ دیہاتوں میں اچھے تمباکو کی کاشت بھی کی جاتی ہے ۔

پھلوں کی فراوانی کے سبب بلستان کی معیشت کو بہت سہارا ملتا ہے ۔ خوبانی یہاں کثرت سے ہوتی ہے اور زیادہ تر کشمیر اور پنجاب کو بھیجی جاتی ہے ۔ خشک میوے اور مغزیات کی بہت مانگ ہے جس کے سبب تجّار پیشگی پیسے دے کر فصلیں خرید لیتے ہیں ۔ شہتوت یہاں کے لوگوں کی غذا کا ایک اہم جزو ہے ۔ یہاں سے منقیٰ بھی کثیر مقدار میں بیرون ملک بھیجی جاتی ہے ۔ لیچی ، عمدہ قسم کے انگور ، تربوز ، خربوزے ، ککڑی اور کھیرا بھی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ۔[۱]

تجارت و ذرائع آمد و رفت : چونکہ ذرائع آمد و رفت محدود ہیں اس لیے تجارت نسبتاً کم ہوتی ہے ۔ چائے ، چینی ، چاول اور کپڑا درآمد کیے جاتے ہیں ۔ لداخ سے نمک کی تجارت ہوتی ہے ۔ خوبانی ، خوبانی کا مغز اور منقیٰ کشمیر کو برآمد کیا جاتا ہے ۔ ہوا بازوں کی سیاہ واسکٹیں بھی یہیں تیار کی جاتی ہیں ۔ وادیٔ شگار میں رہر مورا (جو کہ ایک سبز پتھر ہے) نکلتا ہے ۔ اسکی پیالیاں اور طشتریاں بھی بنتی ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ پنجاب اور کشمیر میں تریاق کے طور پر اور آنکھوں کی بیماری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ ذرائع آمد و رفت غیر تسلی بخش ہیں ۔ البتہ اب سڑکوں کی تعمیر پر توجہ دی جا رہی ہے ۔ بلتستان سے آ کر جو راستے ملتے ہیں ، وہ کشمیر لداخ اور استور (Astor) سے آتے ہیں ۔ ایک اور راستہ بھی ہے جو کہ گلگت کو جاتا ہے اگرچہ یہ راستہ دشوار گذار ہے مگر اسے بھی لوگ استعمال کرتے ہیں ۔[۲]

---

(۱) Imperial Gazetteer of India, Volume VI, New Edition, pages 261-265.
(۲) Imperial Gazetteer of India, Volume VI New Edition, pages 261-265.

مذہب : بلتستان کی آبادی نسلی اعتبار سے منگولوں اور آریاؤں کا مرکب ہے۔ اسلام سے پہلے بلتستان والے بدھ مت کے پیرو تھے۔ اس سے پہلے دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے اور اس وقت کا مذہب بون چھوس کہلاتا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے قریب یہ علاقہ اسلام سے مشرف ہوا۔ اس وقت بلتستان کی آبادی سو فیصد مسلمان ہے جو نور بخشیہ امامیہ (مقلدین حضرت سید محمد نور بخش) اور شیعہ اثنا عشریہ پر مشتمل ہے۔

چونکہ یہاں کے بیشتر لوگ شیعہ ہیں اور ان کا اثر اور اقتدار یہاں زیادہ ہے، اس لیے مجالس عزا کا رواج بھی یہاں زیادہ ہے۔ دراصل مذہب نور بخشی کی مطابقت سنی مذہب کے ساتھ ہے۔ اور شیعہ مذہب امراء کا مذہب ہے، اس لیے نور بخشیوں کو ان کی ہر ایک مجلس میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ اور محرم کے علاوہ ہر جمعرات کو، بعض لوگوں کے ہاں گھروں پر اور بعض مسجدوں میں نماز عشاء کے بعد مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ اگرچہ نکاح سنت نبوی کے مطابق ہوتا ہے مگر بعض اوقات متعہ کو بھی جائز سمجھا جاتا ہے اور ہر بات میں ''یا علی مدد'' کہنے کا رواج عام ہے۔ یہ لوگ آئمہ کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔[1]

مناسب ہے کہ یہاں اس تحریک کا ذکر کیا جائے جس نے بلتیوں کے نظامِ فکر اور اعتقادات کو متاثر کیا۔ یہ نور بخشی تحریک ہے جو پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔

نور بخشی تحریک : ڈوگرہ عہد میں مذہب پر اس قسم کی بندشیں تھیں کہ اگر کوئی مسلمان بدھ مذہب اختیار کرے تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر کوئی بدھ مذہب رکھنے والا مسلمان یا عیسائی ہو جائے تو وہ پدرانہ جائداد سے محروم کر دیا جاتا۔

نور بخش تحریک کے بانی کا خاندان جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں خلیج فارس کے مغربی ساحل الاحسا (ایک علاقہ ہے) اور اسکے صدر مقام جس کا نام بھی یہی ہے، کا رہنے والا تھا۔ حضرت سید محمد نور بخش کے دادا عبداللہ کا مولد بھی یہی مقام ہے۔ سید موصوف کا نسب سترہ واسطوں سے حضرت موسیٰ کاظمؓ تک پہنچتا ہے۔ علامہ شوستری نے ایک قابل ذکر بات ان کے خاندان کے متعلق بتائی ہے کہ ان کے اجداد میں سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص صاحب حال رہا ہے۔ خواہ وہ مجذوب تھا یا سالک۔ حضرت سید محمد نور بخش ۱۳۹۲ء میں پیدا ہوئے، سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں علوم میں تبحر پیدا کیا۔ سید موصوف نے خواجہ اسحٰق

(۱) مولوی محمد شفیع : فرقہ نور بخشی، اورینٹل کالج میگزین، ص ۶۲، مئی ۱۹۱۵ء۔

ختلانی مرید سید علی ہمدانی سے بیعت کی۔ پیر نے اپنے ایک خواب کے بموجب ان کو نور بخش کا لقب دیا۔ حضرت سید محمد نور بخش سلطان شاہ رخ بن امیر تیمور کے عہد میں گذرے ہیں۔ انہیں سلطان شاہ رخ کی سرپرستی حاصل تھی اور اسی کے توسط سے وہ کشمیر میں تبلیغ کے لیے نکلے۔[۱]

نور بخشیہ عقائد کی اشاعت ختلان اور ایران سے کشمیر میں ہوئی۔ مرزا حیدر دوغلات صاحب تاریخ رشیدی پہلا مؤرخ ہے، جس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں جو حالات کشمیر کے لکھے ہیں ان سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ کشمیر میں جمہور اس وقت بھی سنّی مذہب کے پابند تھے۔ گو کچھ لوگ امامیہ اور نور بخشیہ عقائد رکھتے تھے اور ان تینوں فرقوں میں ہمیشہ باہمی تنازعہ رہتا تھا۔

محمد اعظم کشمیری نے 'واقعات کشمیر' میں (جو ۱۷۳۵ء اور ۱۷۴۷ء کے درمیان کی تصنیف ہے) اس فرقے کے حالات زیادہ تفصیل سے دیے ہیں۔ وہ حالات ہم ایک قلمی نسخہ سے لے کر درج کرتے ہیں:

''محمد اعظم کے بیان کے مطابق میر شمس عراق ظاہر آراستہ رکھتا تھا اور فصاحت بیان سے متصف اور علو اسراری سے واقف تھا۔ وہ دو مرتبہ کشمیر آیا۔ پہلی مرتبہ سلطان حسین میرزا شاہ خراسان کے سفیر کی حیثیت سے سلطان حسن شاہ کے دربار میں آیا اور آٹھ برس تک کشمیر میں ٹھہر کر لوگوں میں نور بخشیہ عقائد کی اشاعت کرتا رہا۔ شیخ اسمٰعیل کبروی ان ایام میں ترویج اسلام کے متعلق خاص طور پر کوشاں تھے۔ عراق نے ان سے ارادت خاص ظاہر کر کے ان کے مریدوں کو خفیہ خفیہ اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ سلطان حسین نے بالآخر عراق کو واپس بلوایا اور بقول مؤرخ اس کے خلق باطنی سے مطلع ہوکر اس کو نوکری سے معزول کیا۔ اس پر عراق نے پھر کشمیر کا رخ کیا اور ظاہر کیا کہ سید محمد نور بخش نے اس کو خلیفہ مقرر کیا ہے اور چونکہ شیخ اسمٰعیل کرس میں جا کر صحبت خلق سے کنارہ کش ہو بیٹھے تھے، اس لیے عراق نے میدان خالی پا کر ایک خانقاہ اور آستانہ بنوایا اور دھوم دھام سے اپنا کام شروع کیا۔ فتح شاہ اس وقت کشمیر میں حکمران تھا اور امراء میں سخت نزاعات جاری تھے۔ اس لیے اس نے حالات اپنے موافق پائے اور بالآخر چک قبیلہ کے سرداروں کو جو شاہی خاندان سے قرابت رکھتے تھے اور دربار کشمیر پر چھائے ہوئے تھے اس نے مرید کر لیا اور اس کے مبلغ

(۱) مولوی محمد شفیع: فرقۂ نور بخشی، اورینٹل کالج میگزین، ص ۴، ۵ فروری ۱۹۲۵ء۔

لداخ میں پہنچیے اور اس طرح نور بخشی اس علاقہ میں بھی پھیل گئے - عراق فوت ہوا تو
نازک شاہ کے عہد حکومت میں میرزا حیدر کشمیر پر مسلط ہوگیا - یہ دس برس
نور بخشیوں پر بہت سخت گزرے -

کشمیر کا علاقہ چونکہ ختلان سے قریب تھا اس لیے نور بخشیہ عقائد کی اشاعت
اس میں خوب ہوئی لیکن بظاہر ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی ان عقائد کی تبلیغ
ہوتی رہی - مثلاً اخبار الاخیار (دہلی ۱۸۶۳ء) ص ۲۱۱ پر شاہ جلال شیرازی کا ذکر ہے
جو اسیری کا مرید تھا -[1]

بڈلف کے اندازے کے مطابق ۱۸۸۰ء کے قریب بلتستان میں نور بخشیوں کی تعداد
بیس ہزار نفوس سے متجاوز تھی - ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں نور بخشیوں کو
شیعوں میں شامل کر دیا گیا - اس رپورٹ کی رو سے دونوں فرقوں کی مجموعی تعداد
لداخ میں ۴۷۰۳۴ نفوس تھی - لداخ کے ایک نامہ نگار نے نور بخشیوں کی تعداد
تقریباً بیس (۲۰) بتیس (۳۵) ہزار بتائی ہے -[2]

بلتی زبان : جو زبان یہاں بولی جاتی ہے اسے بلتی کہتے ہیں اور فارسی اور عربی کی
مقامی زبان سے آمیزش کے بعد وجود میں آئی ہے - یہ زبان لداخی زبان کے قریب تر
ہے - اس میں اور لداخی زبان میں بہت کم فرق ہے - چنانچہ بلتی اور لداخی ایک
دوسرے کی بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں - ان کا اپنا رسم الخط ہے - ان لوگوں
کا اپنا سن بھی ہے اور اپنے اوزان تک موجود ہیں - اس وقت بلتی زبان کے علاوہ
بلتستان کے کچھ دیہاتوں میں شینا زبان بھی بولی جاتی ہے ، جس میں علاقہ گلگتی ،
ریاستہائے ہنزہ و نگر شامل ہیں -

بلتی زبان پر مذہب کا اثر : بلتی زبان پر مذہب کا بہت گہرا اثر پڑا - بلتستان
میں اسلام کو پھیلانے میں ایرانی مبلغوں کا بڑا ہاتھ ہے - ۱۵۰۰ء سے ۱۵۹۰ء کے
دوران سید علی طوسی رحمۃ اللہ علیہ اور سید ناصر طوسی رحمۃ اللہ علیہ چینی ترکستان
سے زیل نورد کے راستے خپلو پہنچے اور بلتستان میں تبلیغ اسلام کرتے رہے - کچھ
عرصہ بعد سید میر مختار علیہ الرحمۃ اور سید میر یحییٰ علیہ الرحمۃ بھی چینی ترکستان
کے راستے بلتستان آئے اور انہوں نے بھی بلتستان کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کی -
علاقہ خپلو ، چھور بٹ ، کھرمنگ اور سکر کے اکثر سادات کرام سید مختار ہی کی
اولاد سے ہیں - انہی باہمت اور مخلص مبلغین کی تبلیغی کوششوں کی وجہ سے بلتستان

---

(۱) مولوی محمد شفیع : فرقہ نور بخشی ، اورینٹل کالج میگزین ، ص ۱۱ تا ۱۵ ، فروری ۱۹۲۵ء -
(۲) مولوی محمد شفیع : فرقہ نور بخشی ، اورینٹل کالج میگزین ، ص ۵۹ ، مئی ۱۹۲۵ -

میں اسلام پھیلا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند بلتیوں نے مبلّغینِ ایران سے حاصل کردہ ہر چیز کو قبول کر لیا اور اس طرح بلستنان والے فارسی اور عربی رسم الخط کو پسند کرنے لگے اور انہوں نے اپنی طرز بود و ماند بھی مشرق وسطیٰ کے لوگوں کی سی کر لی۔

ایرانی اثر کے تحت بلتستان کے شعراء نے فارسی زبان سے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ آج سے تقریباً ستر (۷۰) سال پہلے فارسی زبان کو بلتستان میں بہت عروج حاصل تھا۔ عربی زبان مذہبی تعلیم کے لیے مخصوص تھی۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تہذیبی مشاغل تک کے لیے فارسی زبان استعمال ہوتی تھی۔ چنانچہ ان اثرات کے تحت بلتی شعراء نے فارسی زبان کو بھی اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور آہستہ آہستہ بلتی زبان اور شاعری میں فارسی کے الفاظ بہت استعمال ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ فارسی اور بلتی کی آمیزش کے بعد کی زبان نے رواج پایا۔ فارسی گو شعراء میں سید عباس سگری کا مدحیہ کلام فارسی اور بلتی کی آمیزش کا بین ثبوت ہے۔ بلتستان کے فارسی گو شعراء میں راجا لطف علی خان عاشق کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس کے بعد خپلو کے یبگو حاتم کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ چونکہ تھوڑی بہت تعلیم کے بعد لوگ فارسی ادب و شاعری کی طرف توجہ دینے لگے، اس لیے لوک گیتوں کا رواج کم ہوتا گیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ لوک گیتوں کا زوال یہیں سے شروع ہوا۔[1]

بلتی ادب اور شاعری: بلتستان کے ادب میں سب سے پہلے ہم بلتی شاعری کا ذکر کریں گے۔ کیونکہ شعر و شاعری ایک ایسی صنف ہے جو کہ ہر علاقہ، ہر معاشرہ، ہر طبقہ الغرض ہر مقام در بس بس نظر آتی ہے۔ یہ کہنا کہ بلتی شاعری کی ابتداء کہاں اور کن حالات میں ہوئی، مشکل ہے۔ بلتی شاعری میں جملہ لوازم شعری ملتے ہیں۔ بلتستان کی قدیم شاعری کو ''رگبانگ خلو'' کہتے ہیں۔ یہ صنفِ سخن آج کل کی نظم معرّا کی طرح ردیف اور قافیے کی قید سے آزاد ہے اور یہی آج تک مروج و مقبول ہے۔ ''رگبانگ خلو'' یعنی لوک گیت کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی عشقیہ قصہ سادگی سے رنگینی میں بدل گیا، حقیقت پسندی نے تصنع اور تکلف کا لبادہ اوڑھ لیا، مذہبی رجحانات نے نعت، مراثی اور قصائد کو فروغ دیا اور اس طرح بلتی زبان فارسی اور عربی سے بہت متاثر ہوئی۔ مگر اس کے باوجود بلتی لوک گیتوں کی زبان ٹھیٹھ بلتی ہی رہی۔ چنانچہ ان گیتوں کا کوئی لفظ آج تک متروک نہیں ہوا۔

بلتی شعراء میں مرثیہ گو اور قصیدہ گو شعراء نے ہر دور میں نام پیدا کیا ہے۔ قصیدہ گوئی میں شعراء بلتستان کے ممدوح صرف رسول پاکؐ اور ان کی آل مطہر ہی

---

(۱) سید عطا حسین کلیم: 'بلتستان کی شاعری'، ص ۴۰ تا ۴۳۔

رہی ہیں۔ مذہب سے شدید وابستگی کی وجہ سے بلتستان کے شعراء نے دوسری اصنافِ سخن کی طرف توجہ نہ کی، کیونکہ وہ مرثیہ گوئی اور حضرت رسول پاکؐ اور اہلِ بیعت کرام کی مدح و منقبت کے سوا دوسری اصنافِ سخن مثلاً غزل گوئی وغیرہ کو معصیت سمجھتے رہے۔ اس لیے بلتی زبان میں بلند پایہ شاعروں کے ہاں غزلیں نایاب ہیں۔ راجا حسین علی خان محب اور راجہ مراد علی خان مراد کے ضخیم مجموعہ کلام میں صرف دو تین غزلیں ملتی ہیں۔ بلتی شعراء کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ متقدمین : متقدمین میں راجا حسن علی خان محب، راجا لطف علی خان عاشق، راجا امیر حیدر مخلص، راجا ملک حیدر بدل، غازی حیدر خان حیدر، راجا محمد علی خان ذاکر، کاچو مراد خان مراد اور کھرمنگ ہیں۔

۲۔ متوسطین : متوسطین میں خپولو کے راجا حاتم خان حاتم، جوہر علی جوہر، اخوند سلطان علی، ییگو اسفند یار خان، اسفند یار سگر کے بعد سید شاہ عباس اور راجا مراد علی خان مراد، اخوند محمد علی، سلطان خان سلطان، رستم علی ارستم ولی پا، منصور علی شاہ منصور، راجا محمد علی خان غریق، کاچو مظفر علی خان مظفر، اخوند حسین کومرا، اخوند خدا یار کوارود وغیرہ قابل ذکر ہیں[1]۔

بلتی شاعری میں رزمیہ یا ناصحانہ منظر ضرور ہوتا ہے لیکن بلتی شاعری میں ایسی چیزیں بکثرت ملتی ہیں جن میں محبوبہ نے اپنے محبوب کو مخاطب کیا ہے۔ بلتی شاعری کی ابتداء سینا اور دوسری علاقائی زبانوں کی طرح لوک گیتوں سے ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ضرب الامثال اس سے پہلے دور کی پیداوار ہوں مگر جس چیز نے فروغ حاصل کیا وہ لوک گیت تھے جو علاوہ عشق و عاشقی کے ان کے دیگر معاشرتی مشاغل یعنی شکار یا لڑائی سے بھی متعلق ہوتے تھے۔ بلتی لوگ، لوک گیت سے پیام رسانی کا کام بھی لیتے ہیں۔ بلتستان میں بسنے والے اس قسم کی پیام رسانی سے آج بھی واقف ہیں اور نہایت آسانی سے پیغام بھیجنے والے کے مافی الضمیر کو پا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر شکوۂ بیوفائی مقصود ہو تو سلام کے بعد شینگ کھن کو، منہ پی، خلو بطور تحفہ بھیجا جاتا ہے، مثلاً ایک قصہ ایک لوک گیت سے ہی وابستہ ہے وہ یہ کہ بیوفا عاشق اپنی محبوبہ سے اس کی جوانی ڈھلتے ہی آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ قاری کے ذہن میں اس اشارے ہی سے تمام قصہ سامنے آ جاتا ہے۔

---

(۱) سید عطا حسین کلیم : 'بلتستان کی شاعری'، ص ۴۰۔

ی طرح ''نیگ سپز ارزو'' بلتستان کا مقبول عام لوک گیت ہے۔ اس لوک گیت
ہ آرزو نامی عاشق صادق کی جانبازی کی داستان وابستہ ہے۔ بلتی زبان کے
ک گیت تاریخی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک گیت ''درد دل
یا ''شق ڈنگ چقپہ'' ہے۔ جو خپولو کے حکمران پنگور حاتم خان اعظم کی
کے تذکرے پر مستمل ہے اور یہ گیت تقریباً سترھویں صدی عیسوی کے واقعات
ہے۔

۔ موجودہ دور کے شعراء : ان میں فدا حسین نسیم بلتستانی، کاچو شجاعت
ن شجاع، خپولو اور راجا محمد علی شاہ صبا سگری قابل ذکر ہیں۔ سجاع کے
کلام کو بلتستان میں لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔

تستان کے مرثیہ گو شعراء میں راجا حسین علی خان محب کا مقام بہت
ہے۔ مرثیہ گوئی میں آپ کا مثل و نظیر بلتی شاعری میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔
یہ اردو مرثیہ گوئی میں میر انیس کو حاصل ہے وہی مقام بلتی میں حضرت
ا ہے۔ آپ کے کلام میں اس صنف سخن کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔
شی، انداز بیان، اثر انگیزی، زبان کی سلاست و روانی، اور حفظ مراتب کی سی
آپ کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔ محب علیہ الرحمہ نے مرثیے کے ایک ایک
، سوز و گداز، عظمت و جلالت، غیرت، خود داری، صبر و تحمل اور حسرت و آہ
سمو کر رکھ دی ہے۔ محب کی مرثیہ گوئی میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ
ہر شعر فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ راجا حسین علی خان محب
ی زبان میں مرثیہ گوئی کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے۔ حضرت محب اور
کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان مرثیوں کو پڑھنے کے لیے
نے ایسے ہر تازہ کلام کے ساتھ ایک مخصوص لے بھی وضع کی ہے۔

ب کی ایک غزل بہت مشہور ہے۔ یہ غزل سہ ماہی ''بلتستان'' میں مع ترجمہ
تھی۔ مدیر ''بلتستان'' نے اس غزل کے متعلق نوٹ میں لکھا ہے کہ ''راجا
علی خان محب جنہیں مرثیہ گوئی میں بلتی زبان میں میر انیس کا درجہ حاصل ہے،
کے آخری تاجدار مقپون احمد شاہ کے چھوٹے بیٹے تھے۔ آپ اپنے والد کے ساتھ
جوانی میں سقوط بلتستان کے بعد ڈوگرہ راجا کے اسیر کی حیثیت سے ۱۸۴۱ء میں
پہنچے اور مہاراجہ گلاب سنگھ نے انہیں سرینگر سے پچیس، تیس میل دور موضع
ں نظر بند رکھا۔ انہوں نے وہیں وفات پائی۔ ان کی اولاد اب تک موضع ترال
جود ہے۔ جن میں سے راجا لطف علی خان عاشق اور راجا محمد علی خان ذاکر

بڑے شاعر تھے ۔ محب کی اس مشہور غزل کے کچھ اشعار معہ ترجمہ بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

خپد گوئی کھنہ ژ ہر ہر ہر کہ بریبگ کھورین چی رنگ رنگ
سکور میذ وغی چھق بسونگ بیا سیہ سکنگے کھورے بسرنگ
سپنگ گنگ لگسونسہ بغ سے یہلونگ بھدین چسہ غنبہ گنگ
چھنڈ ول ۔ معفو بینگ ۔ بھوین چہ کھورین بیاسے کھدرنگ پرانگ

ان اشعار میں بہار کے آغاز کا دلکش منظر پیش کیا گیا ہے ، جب کہ بلتستان میں کوہ و وادی ، دست و صحرا ، رنگ رنگ کے پھولوں سے بھر جاتی ہے ۔ شاعر کہتا ہے ۔

(ترجمہ) : ''آغاز بہار میں کنار جو اور مرغزاروں میں حسینوں کی ٹولیاں دامنوں کو پھولوں سے بھرتی اور گلدستے بناتی نظر آتی ہیں ۔ یا دامن کوہ میں رنگا رنگ پہاڑی پھولوں سے بالوں کو سجاتی ہیں ۔''

مرثیہ گو شعراء میں محب کے بعد راجہ امیر حیدر مخلص کے مراثی بہت مقبول ہیں ۔ مخلص کے مرثیے سادگی ، سوز و گداز اور اثر انگیزی کے لیے مشہور ہیں ۔ مخلص کے مرثیوں کا طرز بھی مخصوص ہے ۔ چھوٹی بحر میں ان کا ایک مرثیہ بلتستان بھر میں بے حد مقبول ہوا ۔

بلتستان کے موجودہ شعراء میں فدا حسین شمیم کے مراثی ، بلتستان میں مقبول ہیں ۔ انہوں نے بلتی شاعری میں نئے تجربات کیے ۔ انہوں نے کلام اقبال کے منظوم تراجم کے لیے بھی بہت شہرت حاصل کی ہے ۔ نگر کے راجا محمد علی شاہ صبا بھی نہایت اچھے اور مقبول شاعر ہیں ۔ آپ نے متعدد غزلیں اور مدحیہ قصائد لکھیں ہیں ۔ آپ پولو کے نہایت اچھے کھلاڑی ہیں اور اس حیثیت سے بھی بلتستان میں آپ کی شہرت ہے ۔ اردو ، فارسی اور بلتی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں ۔

اس جوان سال شاعر نے جو اقبال کے کلام کے متعدد منظوم تراجم کیے ہیں ان میں بحر و قوافی میں کوئی تبدیلی نہیں کی ۔ بلتستانی شعرا کی نئی پود میں شمیم کا کلام بہت مقبول ہے اور ان کی غزلیں سارے علاقہ میں بڑے ذوق و شوق سے گائی جاتی ہیں ۔ بلتستانی شاعروں میں نظم کی طرف بھی پہلے شمیم ہی نے توجہ کی ہے ۔ قصائد ، مراثی ، نظم ، مثنوی اور غزل غرض تمام اصناف سخن پر شمیم نے طبع آزمائی کی ہے ۔ حضور سرور کائنات ؐ، حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت پر لکھی ہوئی اس کی مثنویاں تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہیں ۔ ذیل میں اس کے اردو ، فارسی اور بلتی کلام کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں ۔

اردو	کہہ رہا ہے داستان بیدردیٔ ایام کی کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقان پر
فارسی	الا اے خطہ کشمیر! ایں خواب گران تاکے بگلزارت مسلط صر صر و باد خزان تاکے
بلتی	گیود یہ لے س نن د رنگ کشمیر ژون لق کھٹ فقیر مید نا سنا ستروق یود لی زہر بد یا ابران صغیر!

محمد علی خان ذاکر بھی اس خاندان کا مشہور شاعر گذرا ہے ۔ ذاکر کے مرثیوں میں شاعرانہ نکتہ سنجیوں کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے ۔ چنانچہ سوز و گداز اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ذاکر کے مراثی محب اور مخلص کے مرثیوں سے ہم سری نہیں کر سکتے ۔

سید شاہ عباس کے مدحیہ قصائد بلتستان میں ہر جگہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں ۔ آپ کے تمام قصائد رواں بحروں میں ہیں ۔ کچھ قصائد ٹھیٹھ بلتی زبان میں بھی ہیں مگر بیشتر قصائد میں فارسی اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔

شگر کے راجا مراد علی خان مراد کے قصائد بھی بہت مقبول ہیں ۔ راجا مراد علی خان مراد نے قصائد اور مراثی میں پہلا شعر با الالتزام فارسی میں لکھا ہے ۔ آپ کا کلام خاص و عام میں بہت پسند کیا جاتا ہے ۔

دوسری زبانوں کی شاعری کے مطالعے نے بلتی نوجوانوں کے لیے تحقیق اور تقلید کے راستے کھول دیے ہیں ۔ اردو ، انگریزی اور پنجابی شاعری بلتی شاعری میں شامل ہو چکی ہیں ۔ پرانی بلتی شاعری صرف فارسی شاعری سے متاثر تھی یا بلتستان کے شعراء نے اردو زبان کے مرثیہ گو شاعروں کا تتبع کیا تھا ، مگر اب مختلف اصناف سخن میں تجربے کیے جا رہے ہیں ۔ بلتی نوجوان جموں و کشمیر کی آزاد گورنمنٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں ۔ البتہ یہ کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنی زبان اور ثقافت کی ترویج اور ترقی کے لیے وہ کام ابھی نہیں کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا ۔

شنا زبان و ادب

پہلا باب

شنوں کی قوم اور وطن

(الف) **قوم :** علم الاقوام کے ماہرین کی رائے ہے کہ شن(۱) قوم ۱۰۰۰ ق م سے دوسری صدی عیسوی تک مختلف ادوار میں اپنے آبائی وطن ''آریانم وائجو'' (آریہ دیسہ) سے نکل کر گروہوں کی شکل میں گلگت اور کوہستان سندھ میں وارد ہوتی رہی۔ زرتشتیوں اور ہندؤوں کی قدیم ترین متبرک کتب میں ''آریہ'' اور ''آریانم وائجو'' کے الفاظ ملتے ہیں۔ رگ وید میں لفظ ''آریہ'' قوم کے لیے استعمال ہوا ہے اور ''وندیداد''(۲) کے پہلے باب میں آہرمزد زرتشت کے سامنے زمین کی تخلیق کی روداد بیان کرتے وقت ان سولہ ملکوں کے نام لیتا ہے جنہیں اس نے تخلیق کیا تھا۔ ان میں سے پہلے ملک کا نام ''ایریانم وائجو'' ''آرینم سیمن'' بیان کیا ہے۔ جس کے معنی آرین بیج یا آرین قوم کا اصل وطن (آریہ دیسہ یا آریہ ورتہ) ہو سکتا ہے۔ یہ علاقہ اغلباً بلوطاغ اور مفطاغ سلسلہ کوہ کے ڈھلوانوں (وسط ایشیا) میں واقع تھا اور آریہ قوم کے مختلف گروہ یہیں سے نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں کو جاتے رہے۔ میکس مولر بھی اسی نظریے کی تائید کرتا ہے کہ ''ترک وطن کے وقت آریائی اقوام وسط ایشیا کی بلند وادیوں میں مقیم تھیں۔'' مشہور ماہرِ لسانیات گریئرسن(۳) کی رائے ہے کہ فارس کے کچھ باشندے ترک وطن کر کے جانبِ مشرق کوہ ہندوکش کے شمال میں پامیر پر قابض ہو گئے، جہاں سے وہ کوہ ہندوکش کو عبور کر کے ایک یا دو ریلوں میں اس ملک میں چلے آئے جسے آج ''دردستان'' کہا جاتا ہے۔ اس ملک میں ان لوگوں کے آباؤ اجداد پہلے آباد تھے، جو آج کل (ہنزہ اور نگر میں) بروشسکی زبان بولتے ہیں اور غالباً شمال مغربی ہندوستان کے ان باشندوں کی نسل سے ہیں جنہیں انڈو آرین حملہ آوروں کے پہلے ریلے نے یہاں دھکیل دیا تھا۔

شن قوم کے کئی قبیلے ہیں، جن میں مشہور قبائل بوٹے، مچوکے، ڈڑمے(۴) ملوے منکے وغیرہ ہیں۔ شنوں سے قبل ان اطراف میں یشکن قوم آباد تھی اور صدیوں تک اس

---

(۱) ماخوذ از ستھئن (Scythian)

(۲) مغربی پاکستان کی تاریخ حصہ اول صفحہ ۱۰۸۔

(۳) گریئرسن : لنگویسٹک سروے آف انڈیا، جلد ہشتم حصہ دوم ص ۲، ۳، ۱۰۔

(۴) اس قبیلے کے بارے میں دو روائیتیں ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق یہ ایک شن قبیلہ ہے اور دوسری روایت کے پیش نظر یہ ایک پٹھان قبیلہ ہے۔

ملک پر قابض رہی۔ لیکن بڑی خونریز جنگوں کے بعد سنوں نے یشکنوں پر فتح پا لی اور مفتوح قوم نے فاتح قوم کی تہذیب اور زبان کو قبول کر لیا۔ چنانچہ گریئرسن(۱) اس ضمن میں رقمطراز ہے کہ ''اس دشوار گزار ملک میں شمال سے آئے ہوئے حملہ آوروں کی زبان بلاشبہ قدیم باشندوں کی زبان سے اثر پذیر ہونے ہوئے اپنے منفرد انداز میں ایرانی اور ہندوستانی کے مابین الگ نشو و نما پاتی رہی''۔

(ب) **وطن :** اس وقت شنا بولنے والوں کا وطن گلگت، کوہستان سندھ (باغستان) ، وادئ گریز ، علاقہ دراس اور بلتستان کے کچھ دیہات بشمول علاقہ گلتری ، ریاستہائے ہنزہ و نگر کے چند دیہات اور سرحدی اضلاع پونیال ، گوپس اور اشقومن، علاقہ جات گلگت خاص ، چلاس اور استور پر مشتمل ہے۔ کوہستانِ سندھ باغستان میں داریل، تانگیر، جلکوٹ اور پالس کے علاقوں میں بھی شنا بولنے والے آباد ہیں۔ ان تمام علاقوں میں شن اور یشکن دونوں قومیں رہتی ہیں۔ لیکن ''شناکی(۲) '' خاص وہ علاقہ ہے جو پالس سے لے کر غور تک دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ پرانے زمانے میں شن قوم کے وطن کو ''شنالوک'' بھی کہا جاتا تھا۔

فرانسیسی محقق ڈاکٹر لیبان نے اپنی تصنیف ''تمدنِ ہند'' میں لکھا ہے کہ ''نسل میں یہ آریہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے قد بلند ، رنگ صاف اور چہرے بیضوی ہیں۔ یہاں باشندوں کے چار طبقات ہیں۔ ان میں پہلا درجہ ''اطاسن'' کا ہے جس کا ذکر مہابھارت اور منوشاستر میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا درجہ قوم ''یشکن'' ، تیسرا درجہ ''کرمین''(مزدور) اور چوتھا درجہ ''ڈوم'' کا ہے۔

(ج) **مورخین کے حوالے :** اگرچہ دور افتادگی کی وجہ سے گلگت کی تاریخ کے کچھ حصے پر ماضی کے دھندلکے پڑے ہوئے ہیں ، پھر بھی چند معزز مؤرخوں نے دنیا کے اس عجیب و غریب ملک کی نسبت اپنی کتابوں میں حوالے دیے ہیں۔

قدیم یونانی مورخ ہیروڈٹس (۳) (۴۸۵ - ۴۲۵ ق م) اور بطلیموس(۴) نے گلگت کو دریائے سندھ کے مغرب کی طرف بیان کیا ہے اور ''سناکی'' کے باشندوں کو ڈیڈیکاہ(۵) کہہ کر پکارا ہے۔

---

(۱) علیٰ ہٰذا القیاس اس قبیلے کا بھی یہی حال ہے۔ ان دونوں قبیلوں کو انگائی دڑیے اور انگائی منکے کہا جاتا ہے۔ یعنی آسانی قبیلہ دڑم خیل اور آسانی قبیلہ منک خیل۔ دراصل یہ قبیلہ عبرانی میں ''درمی'' کہلاتا تھا جو بگڑ کر مرور ایام کے بعد شنا میں ''دڑیے'' بن گیا۔

(۲) شن ، شنا کی کو غالباً یونانیوں نے Scythian and Scythia کہا ہے۔

(۳) Herodotus

(۴) Ptolemy

(۵) Dedicae

چینی سیاح زوار فاہیان اور ہیون ژوانگ نے اپنے سفرناموں ''فوکوکی'' اور ''سوکوکی'' میں گلگت ''یرژینی'' (سنسکرت یوگنی پتھو) مہاتما گوتم بدھ کی ایک معروف مورتی کا ذکر کیا ہے جو گلگت کرگاہ(۱) نالے میں واقع ہے۔ علاقہ داریل کا ذکر ''تھولیلو'' کے لفظ سے کیا ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے راستوں کی دشوار گزاری کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں استور کو اسورا اور چلاس کو شلتاس درج کیا ہے۔

محل وقوع : یہ ملک غربی ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش پہاڑوں کے درمیان شاداب اور سرسبز وادیوں پر مشتمل ہے اور ۳۵ تا ۳۸ عرض البلد اور ۷۰ تا ۷۶ طول البلد پر واقع ہے۔ مشہور دریائے سندھ شمال سے جنوب کی طرف نانگا پربت سے گھومتا ہوا بہتا ہے۔ اس دریا کو شنا میں اباسین (دریاؤں کا باپ) کہتے ہیں اور پونجی کے مقام سے قریب دو معاون دریا (دریائے استور اور دریائے گلگت) اس میں مل جاتے ہیں۔ دریائے گلگت کو (دریائے ہنزہ کے ملنے سے پہلے) شنا میں ''ہنساوی'' کہا جاتا ہے۔

اس ملک کی سرحدیں شمال مغرب میں افغانستان کے اضلاع واخان (بدخشاں) سے ملتی ہیں اور عین شمال کی طرف چینی ترکستان کا صوبہ سنکیانگ(۲) ہے۔ چترال اور دیگر قبائلی علاقے مغرب کی طرف واقع ہیں۔ بلتستان اور لداخ (ریاست کشمیر) جانبِ مشرق ہیں۔

معاشرہ

مذہبی اعتقادات : بعض قرائن و آثار سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں کے باشندوں کا (زرتشتی مذہب سے پہلے) مافوق الفطرت مخلوق پر اعتقاد تھا اور وہ ان سے نفع و نقصان کی قدرت منسوب کرتے تھے۔ وہ دنیا کو ''سرپ لوک'' اور عقبیٰ کو ''دیولوک'' کہتے تھے۔ پھر بلخ کے قرب کی وجہ سے زرتشتی مذہب کا یہاں دخل ہوا۔ ۱۰۰(۳) قبل مسیح میں بدھ مت اس ملک میں پھیل گیا۔ اشاعتِ اسلام سے پہلے یہاں مختلف علاقائی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی۔ مثلاً غور کے باشندے اشاعتِ اسلام سے پہلے تیبان دیوتا کو پوجتے تھے، جس کے گھوڑے کے نقوش پا ایک چٹان پر کندہ تھے اور اسپ تیبان کے نام سے مشہور تھے۔ چلاس کے قدیم باشندے ناران دیوتا کی پوجا کرتے تھے اور شمال (گویس) کے لوگ شیستم دیوتا کو مانتے تھے۔ بارھویں صدی عیسوی(۴) کے اوائل میں اس ملک میں اسلام کا ورود ہوا۔

---

(۱) اصلی لفظ ترکی میں خرگاہ ہے جو بگڑ کر کرگاہ ہوگیا ہے۔
(۲) ترک اسے سنجانگ بولتے ہیں۔
(۳) ملاحظہ ہو "TRIBES OF HINDU KUSH" مصنفہ میجر بڈلف۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۰
(۴) ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تصنیف ''کشمیر'' صفحہ ۷۷۔

مستین(۱) کی رائے کے مطابق بارھویں صدی عیسوی میں جب درد قبائل نے بدھ مت چھوڑ کر مذہب اسلام قبول کیا تو معاشرتی لحاظ سے یہاں بہت ترقی ہوئی۔ دراصل کشمیر میں رینچن شاہ(۲) کے مشرف بہ اسلام ہونے سے دو سو سال پہلے فطرت پرستی کی بجائے لوگوں نے خدا پرستی اختیار کر لی تھی۔ سابق تہواروں کی جگہ عیدین، میلاد اور محرم نے لے لی اور حکومت کی زبان فارسی ہوگئی، جو ڈوگروں کے عہد تک رہی۔ بعض لوگ ایرانی تہوار نو روز کو بھی ماننے لگے۔

روایت ہے کہ گلگت میں اسلام آذر جمشید کی فتح گلگت اور شری بدت گلگت کے آخری شاہ رئیس رع کی شکست کے بعد (غالباً ۱۱۲۰ع) میں پھیلنا شروع ہوا اور پھر چھ سید حضرات سید بریاولی(۳)، سید سلطان علی، سید شاہ ولی، سید افضل، سید اخوند اور سید ابراہیم کی تبلیغی کوششوں سے زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام کے دائرے میں شامل ہوتے چلے گئے۔ ان بزرگان دین کے مزار مختلف مقامات پر واقع ہیں اور آج بھی مرجع خلائق ہیں۔

تراخان رع کے عہد میں تاج مغل، بادشاہ بدخشان (جسے اسماعیلی مذہب کی اشاعت کا شوق تھا) نے چترال کی طرف سے ۱۳۲۰ع میں گلگت پر حملہ کیا۔ گلگت کے حکمران نے اسماعیلی مذہب اختیار کر کے تخت و تاج واپس حاصل کر لیا۔ لوگوں نے بھی تاج مغل کا مذہب اختیار کیا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے گلگت ایجنسی میں اسماعیلیوں کو مغلائی یا مولائی کہا جاتا تھا۔ گلگت خاص میں وہ اپنی فتح کی یادگار دامن کوہ پر چھوڑ گیا ہے۔ اسے ''مغلی چپ''(۴) کہا جاتا ہے۔

تاج مغل کے بعد بلتستان کے علی شیر خان انچن (۱۵۵۹ع تا ۱۶۳۳ع)، شیر شاہ، علی شاہ اور شاہ مراد (۱۷۴۱ع - ۱۷۶۰ع) نے گلگت پر تسلط جما لیا۔ بلتستان کے یہ سب حکمران مذہباً شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا خان رع (۱۵۶۵ع - ۱۶۰۰ع) نے بھی شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔

روایات و رسوم: اس معاشرے میں ایک پرانی روایت ہے کہ نیک ارواح مرنے کے بعد نانگا پربت یعنی دیامر کی چوٹی پر چلی جاتی ہیں اور وہاں ایک شیشے محل(۵) ہے جس میں پریاں رہتی ہیں۔ دیامر کی پریوں کی نسبت سوں میں عجیب روایات رائج تھیں۔ ایک روایت یہ بھی تھی کہ وہ کبھی کبھی انسان کو اٹھا کر اپنے پرستان میں لے جاتی ہیں۔

---

(۱) ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تصنیف ''کشمیر'' صفحہ ۷۷۔
(۲) رینچن شاہ نے ۱۳۲۰ع میں کشمیر میں اسلام قبول کیا تھا۔
(۳) سید بریا ولی کا مزار چترال میں ہے۔
(۴) مغلی برج۔ (۵) شل ٹیس کوٹ۔

رسم چھلی گن : زمانہ قدیم سے ''چھلی'' (بدم) اور بھوج پتر (درختوں کے چھلکے) کی دھونی جرائم کشی کے لیے استعمال کی جاتی ہے ۔ دلہا ، دلہن کو شادی کے موقع پر اور کھیتوں میں تخمریزی کے موقعہ پر کسان بیجوں وغیرہ کو دھونی دیتے ہیں اور اگر کوئی معزز مہمان گاؤں میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی ''چھلی'' کی دھونی دی جاتی ہے ۔ لیکن اس سے بعض مغربی مؤرخین کو مغالطہ ہوا کہ یہ درخت پرستی ہے ۔

(الف) **شئی پھیال :** بوقت تخمریزی و دیگر اہم تقریبات یہ رسم ادا کی جاتی ہے ۔ باریک چپاتیوں کے اوپر مکھن لگا کر براتیوں ، مہمانوں اور بزرگوں کو پیش کیا جاتا ہے اور اسے نیک سگون سمجھا جاتا ہے ۔

دوسری رسم ''ماری'' ہے ۔ کوئی آدمی جب اپنے قبیلے کے دور افتادہ لوگوں کے یہاں جائے یا کسی رشتہ دار عورت کے گھر مہمان ٹھہرے ، تو ملکی رسم کے مطابق میزبان عام طور پر بکرا ذبح کر کے خاطر تواضع کرتا تھا ۔

(ب) **رسم نوس** (جوب چراغ) : ہر سال دسمبر کے مہینے میں منائی جاتی ہے ۔ یہ رسم زرتشتی دور کی ایرانی رسم ''چہار شنبہ سوری'' سے ملتی جلتی ہے اور ہر سال موسم خزاں کے خاتمے پر سمبر کے مہینے میں اس طرح منائی جاتی تھی کہ رات کے وقت ہر گاؤں کے لوگ اپنے گاؤں کی حدود پر چٹور کھن کی طرف رخ کر کے جلتے ہوئے چراغ پھینک جایا کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ گلگت کے ظالم بادشاہ شری بدت کی روح کو دوبارہ گلگت آنے سے روک دیں گے ۔ سری بدت کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس کی روح چٹور کھن کے گلیشئر میں رہتی ہے اور وہ آگ سے ڈرتی ہے ۔ گلگت کے اس ظالم بادشاہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ انسانی بچوں کے گوشت پر پلتا تھا اور آگ کو دیکھ کر اس کی روح پگھلتی تھی ۔ کیونکہ اس کی زندگی کا راز برف میں مضمر تھا ۔

قدیم شنوں کے یہاں بارہ مہینوں کے علیحدہ نام موجود تھے ۔ سال کو سردی اور گرمی کی رو سے دو ادوار ''بئی'' اور ''سنی'' میں تقسیم کیا گیا تھا ۔ اسی طرح سال کے چار موسم باز نو (بہار) اوالو (موسم گرما) شرو (خزاں) اور یونو (موسم سرما) ہیں ۔

رقص و سرود : شنوں کی تہذیب میں گانے بجانے کا رواج تھا اور رقص و سرود کی محفلیں قائم کی جاتیں ۔ ڈھول ، ڈھول اور دف وغیرہ کا استعمال عام تھا ۔ اسلامی دور میں رباب اور ستار وغیرہ کا رواج بھی ہوا ۔

موسیقی اور رقص : موسیقی میں تیز سر والے گانے کو ''دنی ہرپ'' اور سست سُر والے گانے کو ''بوٹی ہرپ'' کہا جاتا تھا ۔

اقسام رقص : رقصوں میں ''تھپ نٹ'' (بورو) ''دریلی نٹ'' (نلوار ناچ) اور ''پتن''(۱) مشہور تھے -

تہوار : قدیم شنوں کے متبرک تہوار ''شنو ناو'' اور ''شنو بزنو'' تھے - شنو ناو بارہ روز تک جاری رہتا تھا - دعوتیں عام دی جاتی تھیں، جن میں عورتوں کا ناچ ہوتا تھا - اس موقعے پر بورو ناچ ناچا جاتا، جس میں مرد و زن مشترکہ طور پر ناچتے تھے - عورتیں درمیان میں دائرہ بناتی تھیں اور مرد اس دائرے کے گرد ناچتے تھے - ''شنو بزنو'' نو روز کے مترادف تھا - آمد بہار پر خوشی منائی جاتی تھی - یعنی یہ شنوں کا موسم بہار تھا -

قومی کھیلیں : پولو(۲) دراصل گلگت کا صدیوں سے قومی کھیل چلا آ رہا ہے اور ہر بڑے گاؤں میں پولو میدان ہوتا ہے - جسے ''شوارن'' کہا جاتا ہے - دوسرا کھیل ''بڑرا'' ہے - اس میں ایک ٹانگ اٹھا کر دوسرے کو ہاتھ سے دھکیلا جاتا ہے -

شادی بیاہ اور موت کی رسومات : شنوں کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں جنسی جذبات سے بالاتر ہونے کی اہلیت بھی تھی جسے وہ پاک عاشقی (۳) کہتے تھے، اور پاک عشق کے بعد شادی تک نوبت پہنچے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا - شن مرد یشکن عورت (یشکنوئے) کے ساتھ شادی کر سکتا تھا لیکن یشکن مرد کے لیے شن عورت (شنوئے) کے ساتھ شادی ممنوع تھی - شنوں میں رسمِ دختر فروشی رائج تھی جسے ''راپ'' کہا جاتا تھا - یہ مذموم رسم حال ہی میں ترک کی گئی ہے -

مختلف مقامات پر مرگھٹوں کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے شن لوگ اپنے مُردوں کو جلاتے تھے -

سیاسی پس منظر : شنوں کا قدیم ترین حکمران خاندان، جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے ''شاہ رئیس'' تھا - اس خاندان نے چترال سے لے کر کشمیر تک صدہا سال تک حکومت کی- کہا جاتا ہے کہ گلگت کا ظالم بادشاہ شری بدت اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا - آذر جمشید نے ۱۱۲۰ء میں گلگتیوں سے خفیہ ساز باز کر کے اسے شکست دی -

شنوں میں دوسرے مشہور خاندان تراخان نے بھی گلگت پر بہت مدت حکومت کی - اس خاندان کے دو افراد بڑے نامور گزرے ہیں - یعنی مرزا خان رع اور اس کی اقبال مند بیٹی

---

(۱) Kite dance

(۲) پولو دراصل تبتی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں گیند -

(۳) ملاحظہ ہو ''دی لینگویجز اینڈ ریسز آف دردستان'' مطبوعہ لاہور، گورنمنٹ سنٹرل بک ڈپو، ۱۸۷۷ء مصنفہ ڈاکٹر لیٹنر -

مرزا جواری ، جو گلگت کی تاریخ میں دوسری عورت ہے جس نے اپنے کمسن بیٹے حبیب خان کے نام سے گلگت پر حکومت کی ہے ۔ اس کے دورِ حکومت میں گلگت بہت خوشحال ہوگیا تھا ۔ گلگت قصبے کو سیراب کرنے والی نہر جواری ہی نے داریلیوں سے بنوائی تھی ۔ اسے لوگ احتراماً ''دادی جواری'' کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ اس خاندان کا آخری حکمران حبیب خان تھا جسے سلیمان شاہ خوشوقیہ نے ۱۸۲۵ء میں قتل کیا ۔ یہ وہی سلیمان شاہ چترالی مہتر ہے جس نے سید احمد بریلوی سے سکھوں کے خلاف خط و کتابت شروع کی تھی۔
''شنا بردیسی'' (شنوں کا عہد زریں) انہی دو حکمران خاندانوں کے عہد حکومت کو کہا جاتا ہے ۔ اس دور میں شنوں نے شمالی علاقوں میں چترال سے لے کر لداخ تک فتوحات پائی تھیں اور شنا زبان و ادب اور تہذیب کو بہت فروغ نصیب ہوا ۔ چنانچہ یہ عہد فارغ البالی اور خوشحالی کے لیے ضرب المثل کے طور پر ''سو ملکین رجی'' (سو ملک کا عہد حکومت) مشہور ہے ۔

۱۸۴۱ء میں خوشوقیہ خاندان کا مشہور بادشاہ غازی مہتر گوہر امان گلگت پر قابض ہوگیا ۔ اس کے چچا سلیمان شاہ نے شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کے ساتھ بذریعہ خط و کتابت نہ صرف مراسم ہی پیدا کیے ، بلکہ کشمیر میں سکھوں پر حملہ کرنے کے لیے وہ پونچھ تک اپنی افواج لے کر پہنچا تھا کہ اسے بالاکوٹ میں سکھوں کے ہاتھوں سید احمد کی شہادت کی خبر ملی اور اس نے مجبوراً اپنے لشکر کا رخ موڑ لیا ۔

۱۸۴۲ء میں سکھوں نے گلگت کو فتح کر لیا اور اسی عہد میں ''سرگن گلیت'' (سرسبز و شاداب وادی گلگت) کو بگاڑ کر سکھ غاصبوں نے ''گلگت'' میں تبدیل کر دیا ۔ اگرچہ شنا میں بدستور گلیت ہی مستعمل ہے ۔ لداخی اور بلتی بھی اس ملک کو آج تک گلیت ہی کہتے ہیں ۔

عہد نامہ امرتسر : ۱۸۴۶ء میں لارڈ ہارڈنگ اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین طے ہوا تھا کہ مہاراجہ گلاب سنگھ پچھتر یا اسّی لاکھ روپے نانک شاہی برطانوی حکومت کو ادا کرے گا ۔ جس کے عوض وہ تمام پہاڑی علاقہ اور کشمیر اس کے حوالہ کیا جائے گا جو دریائے سندھ کے مشرق میں اور دریائے راوی کے مغرب کی طرف واقع ہے ۔ گلگت ، ہنزہ ، نگر ، پونیال ، اشقومین اور گوپس جو دریائے سندھ کی مغرب کی طرف ہیں اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے ۔ اس لیے دریائے سندھ کے اس پار ڈوگروں نے جتنے حملے کیے وہ جارحانہ تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ غازی گوہر امان تا دمِ مرگ ڈوگروں کے خلاف لڑتا رہا ۔

۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۰ء کے عرصے میں غازی گوہر امان نے ڈوگروں کو گلگت سے نکال کر دریائے سندھ کے پار کشمیر کی طرف دھکیل دیا ۔ گوہر امان نے گلگتیوں کی متحدہ قومیت

کو مسطم کر کے ڈوگروں کو پیہم سکسنیں دیں۔ اس کی زندگی میں ڈوگروں نے گلگت کی طرف بڑھنے کی پھر جرأت نہ کی۔ لیکن جب ۱۸۶۰ء میں گوہر امان کا انتقال ہوگیا تو ڈوگرہ افواج نے گلگت کو فتح کر لیا اور گلگتیوں کی متحدہ قومیت کا شیرازہ بکھر گیا۔

۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۶ء تک ڈوگروں نے گلگت ، یاسین اور داریل پر پیہم جارحانہ حملے کیے۔ ۱۸۶۳ء میں مڈوری کوٹ کے مقام پر ڈوگرہ افواج نے یاسین کے معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ ۱۸۹۱ء میں کرنل ڈیورینڈ برٹش ایجنٹ نے افواج ریاست جموں و کشمیر کی مدد سے ہنزہ و نگر کو چند دنوں کی لڑائی کے بعد فتح کر لیا۔ چنانچہ صفدر علی خان آخری خود مختار تاجدار ہنزہ نے چینی ترکستان کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ اس کے بعد ریاستہائے ہنزہ و نگر کے لوگ (۱۹۴۷ء تک) برطانوی حکومت کی عملداری میں رہے۔ تاہم بظاہر ۱۶ اور ۲۱ تولہ طلا بطور سالانہ نذرانہ مہاراجہ کشمیر کو ادا کرتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں روسی خطرہ کے پیش نظر حکومت برطانیہ نے مہاراجہ سے ایک معاہدے کی رو سے ماسوا استور سب ڈویژن ، پوری سرحد گلگت کو ساٹھ سال کے طویل عرصے کے لیے اپنے انصرام میں لے لیا۔

۱۹۴۷ء کو یہ سرحدی صوبہ دوبارہ مہاراجہ کو واپس مل گیا۔ لیکن یکم اگست کو معاہدہ خود بخود ختم ہوگیا۔ مہاراجہ نے وہاں پر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کو گورنر مقرر کر دیا۔ گلگت کے عوام نے یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو غلامی کے خلاف کامیاب جدوجہد کر کے اس گورنر کو گرفتار کر لیا اور ڈوگرہ افواج کو شکست فاش دے کر ملک کو آزاد کرا لیا اور حکومت پاکستان سے مدد اور انتظام ملک سنبھالنے کی درخواست کر دی ، جسے منظور کرکے مرکزی حکومت پاکستان نے وہاں ایک پولیٹیکل ایجنٹ بھیج دیا جس نے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو انصرام ملک سنبھال لیا۔ تب سے شمالی علاقوں کا انتظام مرکزی حکومت پاکستان کے ہاتھوں میں ہے۔

دوسرا باب

شنا زبان کا لسانی جائزہ

شنا زبان کشمیری کی طرح آریائی زبانوں کے داردی (۱) خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ دراصل یہ اس قوم کی زبان تھی جسے شن کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ زبان صدیوں کے میل جول سے شنوں (ستھینوں) اور یشکنوں (یہوچیوں) کی مشترکہ زبان بن گئی، اور اب اس میں دوسری قوموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھنے کی وجہ سے ان گنت غیر ملکی الفاظ داخل ہو چکے ہیں۔ یہ زبان تقریباً تمام گلگت ایجنسی میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اسے وہاں کی لنگوا فرانکا یعنی بین الاقوامی زبان (۲) سمجھنا چاہیے۔

سنسکرت، شنا، کشمیری اور دیگر داردی زبانوں سے مرکب ہے۔ جیسا کہ ذیل میں مندرج شنا اور سنسکرت کے مشترک الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

سنا	سنسکرت	اردو	سنا	سنسکرت	اردو
گھوم	گھوم	گندم	شرو	شرو	خزاں
یو	یو	جو	سرپ	سرپ	سانپ
اسٹ	اشٹ	آٹھ	چٹی	چٹی	عورت
استھان	استھان	استھان	مبور	میور	مور
نرمل	نرمل	خالص	آزوقہ	آزوقہ	کلچہ کی قسم کی تلی ہوئی خمیری روٹی -
اواجو	اواجو	ہاں ، جناب			
مکھ	مکھ	منہ			
ڈوم	ڈوم	ڈوم	جیبھ	جیبھ	زبان
اری	اکشی	آنکھ	ایک	ایک	ایک
شنگ	شنگ	سینگ	جار	جار	عاشق
مہیش	مہینس	بھینس	نارو	تارو	ستارہ
سوری	سوری	سورج	گرام	گرام	گاؤں

اس قسم کے سینکڑوں الفاظ جو شنا اور سنسکرت میں مشترک ہیں شنا کی روزمرہ میں شامل ہیں۔ ان کا اندراج یہاں ممکن نہیں۔

---

(۱) کشمیری شنا کی بیٹی ہے۔
(۲) اسے پساچہ بھی کہا گیا ہے۔

دراصل شنا سرحدِ چترال سے لے کر کشمیر تک ایک وسیع رقبے میں بولی جاتی ہے اور یہ ان قدیم باشندوں کی زبان ہے جو شمال سے آکر اس ملک میں آباد ہوئے تھے - برعکس اس کے سنسکرت کسی خاص ملک کے باشندوں کی زبان نہیں تھی - یہ اس ویدک زبان سے نکلی ہے جس میں آریاؤں کے قدیم مذہبی خیالات کا اظہار ہوا - برہمنوں نے ہندوستان میں علمی اغراض و مذہبی مقاصد کے لیے اسے استعمال کیا اور رفتہ رفتہ یہ اتنی صاف ہوگئی کہ اعلیٰ درجہ کی ادبی زبان بن گئی - ہوسکتا ہے کہ یہ شنا اور دیگر داردی خاندان کی آریائی زبانوں سے مرکب ہو - سنسکرت کے معنی ہی مصفا ہیں -

بروشسکی کے اثرات شنا پر : شنا زبان میں بروشسکی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے - مندرجہ ذیل مشترک الفاظ سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے :—

شنا	بروشسکی	اردو	شنا	بروشسکی	اردو
آشاتو	آشاتو	کمزور	بلہ	بلہ	بولو
سمجھ	سمجھ	فکر	سوگری	سوگری	ناسپاتی
جوئی	جوئی	خوبانی	بونک	بونک	بانسری
برنک	برنگ	برسہ	ٹوٹنگ	ٹوٹنک	اندھیرا ، تاریک
در	در	حد	ہروی	ہری	زینہ
موبو	موبو	مغز	ربون	ربون	مالک
گورو	گورو	بھورا	گلس	گلس	بہار

اسی طرح بلتی زبان کے الفاظ بھی کثیر تعداد میں شنا میں داخل ہوتے رہے ہیں - چند مشترک الفاظ درجِ ذیل ہیں -

شنا	بلتی	اردو	شنا	بلتی	اردو
غون	غون	خربوزہ	جسی	حتی	چپاتی
شملک	سملک	سبھی	اسجو	اسجو	راجکماری
شغزن ، شوارن	شغرن	پولو میدان	جو	جو	جناب
بھرے مرے	بھرے مرے	بہ مشکل	برنکفا	برنگفا	نمبردار
مولو	مولو	سلغم	زی زی	زی زی	والدہ ، ماں (احتراماً)
تھلچری	تھلچری	خاکستر			

شنا ، عربی ، فارسی

عربی اور شنا میں کوئی لسانیاتی ربط نہیں ہے - شنا آریائی زبان ہے اور عربی سامی ، پھر بھی حیرت کا مقام ہے کہ چند ایک عربی الفاظ اشاعتِ اسلام سے ماقبل عہد میں شنا زبان میں

شامل ہو چکے تھے - مثلاً الفاظ رع اور الا - قدیم مصری زبان میں بادشاہ کو ''رع'' کہا جاتا تھا اور زمین پر سورج دیوتا کا نمائندہ سمجھ کر اس کی اطاعت کی جاتی تھی - شنا میں بھی راجے کو رع کہا جاتا ہے اور اس سے مخاطب ہوتے وقت پرانے زمانے میں ''سوری'' (سورج) کہہ کر لوگ ہمکلام ہوتے تھے - لفظ الا بھی اپنے اصلی معنوں میں شنا میں بولا جاتا ہے - مثلاً الا بال! (اے لڑکے) - یہ لفظ فارسی میں بھی اسی طرح مستعمل ہے - مثلاً :-

الا اے شمس تبریزی چرا مستی دریں عالم
بجز مستی و مدہوشی دگر چیزے نمی بینم

بارھویں صدی میں ورود اسلام : ساتویں صدی (۶۷۰ع) میں بدخشاں تک اسلام پہنچ چکا تھا - ۱۲۰۰ع میں گلگت میں اسلام کا ورود ہوا تو اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر ہونے لگے - بودھی اور سنسکرت رسم الخط کی بجائے فارسی رسم الخط(۱) کا رواج ہوا - عربی اور فارسی الفاظ شنا زبان میں داخل ہوئے - مثلاً اللہ ، رسولؐ ، خدا ، حور فرشتہ ، جنت ، کافر ، دوزخ ، قرآن ، مسافر ، افطار ، روزہ ، وضو ، قبلہ ، زیارت ، گلاب ، شراب ، قلم ، کاغذ ، فجر ، نوروز ، عید ، تکبیر ، باغ ، نگار ، سنسار اور رباب وغیرہ -

اشاعتِ اسلام کے بعد اصنافِ سخن میں تبدیلی ہوئی - بلکہ کہا جاتا ہے کہ باضابطہ شاعری مسلمانوں کے دور سے شروع ہوئی - حمدِ الٰہی ، نعتِ رسولؐ ، رزمیہ ، غزل ، مرثیہ اور نظم ، تمام اصنافِ سخن کا آغاز اسلامی دور سے ہوا -

۱۸۶۶ء سے انگریزی زبان و ادب کے اثرات شنا پر پڑنے لگے - بہت سے انگریزی الفاظ ، مثلاً :- بوٹ ، کوٹ ، سگار ، سوٹ وغیرہ داخلِ زبان ہوئے - اسی طرح باہر کی دنیا کا شنا معاشرہ پر اثر بھی ہونے لگا -

انگریز محققین اور مؤرخین نے تصانیف کے ذریعے سے شنا زبان ، شن قوم اور وطن کو بیرونی دنیا سے روشناس کیا - سب سے پہلی کتاب جو انیسویں صدی میں شنا زبان و ادب کے متعلق لکھی گئی وہ ڈاکٹر لائٹنر(۲) کی مشہور تصنیف ''ریسز اینڈ لینگوئجز آف دردستان'' تھی - لائٹنر نے ۱۸۶۶ء میں شنا ، شن اور شناکی کے بجائے دردی ، درد اور دردستان کے عجیب و غریب الفاظ وضع کیے - وہ اس تمام سرحدی علاقے کے لیے جو ایک طرف کاغان

---

(۱) دیگر زبانوں کی طرح شنا میں ایسی آوازیں ہیں جنہیں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مخصوص حرف کی ضرورت ہے - مثلاً خود لفظ شنا کو لیجیے ش اور ڑ کے درمیانی تلفظ سے ادا ہوتا ہے اسی طرح ''مروڑ'' بمعنی طلاکش ، زاکن (گدھا) اور ''ثا'' (تالیاں) باقی اصوات اردو رسم الخط کے حروف میں بخوبی ادا ہوتی ہیں -

(۲) ڈاکٹر لائٹنر (Dr. Leitner)

دردستان کی اقوام اور اس کی زبانیں (Races and Languages of Dardistan)

سے شروع ہو کر چترال کی آخری سرحد تک پہنچتا ہے اور دوسری طرف امب سے لے کر ہنزہ کی آخری حد پر ختم ہوتا ہے ، لفظ درد سان استعمال کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ سکندر اعظم کے حملے کے بعد سے اس وقت تک اس تمام ملک کے کلچر ، تمدن اور مذہب میں یگانگت پائی جاتی ہے ۔ لیکن یہ بات خلاف حقائق ہے اور ڈیورینڈ نے بھی اپنی تصنیف ''دی میکنگ آف اے فرانٹیئر'' میں اس کی تردید کی ہے ۔

شنا ادب قبل از اسلام دور میں: ۱۹۳۸ء میں نوپورہ گلگت کی کھدائی سے برآمدہ قلمی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ ۸۷۸ع میں گلگت کے بدھ بادشاہ نندا دیوا کے حکم سے اس کے سہادیورا کے بیٹے وسدا نے بدھوں کی ضخیم مذہبی کتاب سنگھاستترا کو نقل کیا ۔ یہ سب سے پہلی دستیاب شدہ قلمی دستاویز تھی ، جو اس وقت بھارتی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کے قبضے میں ہے ۔ اس کا رسم الخط بودھی سنسکرت ہے ۔ البتہ زبان کے بارے میں کوئی قطعی علم نہیں ۔

اگرچہ اس علاقے کے قدیم تاریخی ادوار کے حالات تاریکی میں ہیں ، لیکن کہیں کہیں کتبوں پر کندہ عبارتوں سے کچھ روشنی پڑتی ہے ۔ جیسا کہ جابون (پونیال) کی چٹان پر کندہ چینی عبارت سے یہاں کے قدیم زمانے کے حالات معلوم ہوتے ہیں ۔

قبل از اسلام دور کی شاعری کی اصناف : شنا شاعری کی ابتدا لوک گیتوں سے ہوئی ہے اور اس کے قدیم عامیانہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اوزان چینی سے ملتے جلتے ہیں ، مثلاً گیتوں کے اوزان قائم کرتے وقت چینی وزن ''ننلئے ننلئے ننلئے'' کا شروع میں پڑھنا ۔

قدیم شاعر کھمیٹو دانیال : معروف روایات کے مطابق شنا زبان کا قدیم ترین شاعر کھمیٹو دانیال ہوا ہے ۔ عام روایات کے مطابق یہ بات مشہور ہے کہ وہ ایک ''دانیال'' (کاہن) تھا جس کی طرف کئی ایک پیش گوئیاں بھی منسوب ہیں ۔ قبل از اسلام کے اس شاعر نے موجودہ دور کے بارے میں کئی اشارے کیے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب آسمان کی طرف پرواز کرنے کے لیے شاہراہیں کھل جائیں گی اور پہاڑوں کے اوپر سے چلنے کی بجائے لوگ دریاؤں کے کنارے پر چلیں گے ۔ نیز عوام کو اتنا آرام نصیب ہوگا کہ ہاتھوں پر بال اگنے لگیں گے ۔

کھمیٹو کے بارے میں تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ چھبروٹ (ریاست نگر) کا باشندہ تھا ۔ جہاں اس کے خاندان کے افراد آج بھی آباد ہیں ۔

اصناف سخن : قدیم شنا شاعری زیادہ تر ''برانگی گائی'' ، ''چینہ گائی'' اور ''دروز گائی'' پر مشتمل ہوا کرتی تھی ۔ ''برانگی گائی'' وہ گیت ہوتے تھے جو اکثر شادی بیاہ کے موقع پر

گائے جاتے۔ مثلاً:

نکھستلی کــوارین کسوئی نکھستلی کے کھــرنلی
نکھتلی مالین گــوٹیجــو ، نکھتلی کے کھرنــلی
نیروڑ رین بــرائے ، نیرو بھیں رونک بــوجے
نیرو زویــن شیڈائی ، نیرو بھیں رونک بــوجے

ترجمہ: اے دختر شہباز! آبھی جا، اپنے باپ کے کاشانے سے آبھی جا
اے آبشار کی پری! نہ رو ، تیرا رنگ روپ پھیکا پڑھ جائے گا
اے اپنے بھائی کی لاڈلی ! نہ رو ، تیرا رنگ ماند پڑ جائے گا

''چنہ گائی'' وہ نغماتِ محبت ہیں جو خوشی کے مواقع پر گائے جاتے ہیں۔
مثلاً ماں اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے گاتی ہے:

بیون گبہ پالو ، لچھار تارد   اش نو دز گبہ سو یوم آلو
خــدائین بھل تئے بــوتا !

ترجمہ: اے میرے لختِ جگر!
اے میرے ستارۂ سحر!
آج کا دن تجھے مبارک ہو
اور خدا کی برکتیں تجھ پر نازل ہوں۔

شکاری گیت(۱): قدیم شنا شاعری میں ہمیں شکاریوں کے گیت کثرت سے ملتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مکالمہ ایک مشہور شکاری گیت کا ترجمہ ہے۔ اس گیت کا عنوان ہے ''کل آئی گبہ چھال''۔ اس میں اختصار اور المیہ عناصر کی دلاویز آمیزش ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

میمنا : ماں! وہ دیکھو ایک شکاری پہاڑ کے اوپر نظر آ رہا ہے۔
کیل بکری: نہیں ، وہ تو ایک مینار ہے۔
میمنا : یہ آواز تو بندوق کی معلوم ہوتی ہے۔
کیل بکری: نہیں ، یہ تو بادل گرجنے کی آواز ہے۔
ممنا : آپ کے جسم پر یہ خون کے دھبے کیسے ہیں۔
کیل بکری: نہیں ، یہ خون کے دھبے نہیں ہیں۔ میں صبح ایک لال رنگ والی گھاس پر لیٹی تھی۔
میمنا : آپ کی ٹانگیں کیوں لڑکھڑا رہی ہیں۔
کیل بکری: اچھا میرے لخت جگر ، میں تجھ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتی ہوں اور تجھے

---

(۱) ایسے گیتوں کو انگریزی میں ''ہنٹنگ سانگز'' (Hunting Songs) کہتے ہیں۔

نیلگوں آسمان والے اور پہاڑ کی دوسری طرف رہنے والے
میرے بڑے سنگوں والے ماموں کے سپرد کرتی ہوں۔

ایک قدیم قومی گیت :

سامی ساہ سٹنگس مٹوجو　　　ملے جو سے ڈولے دبں
ے ررے سری کوئی بجے　　　دسوم دسوم ڈر کے دیں

ترجمہ : سامی شاہ سٹنگ کے صحن میں طیور جھجھاتے ہیں
اور ادھر ادھر اڑتے ہیں۔
ان کے جھچہانے کی کون پرواہ کرتا ہے
ایسے پرندوں کی جو ایک شاخ سے دوسری پر
پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑتے ہیں۔

دراصل کہا جاتا ہے کہ سموں کے ایک بڑے لیڈر کی بیوی نے طنزاً ان درباری عورتوں سے یہ شعر کہے تھے جو اس کے خاوند کے دل کو لبھانا چاہتی تھیں۔

محاورات : دیگر آریائی زبانوں کی طرح شنا میں بھی بعض پر معنی محاورے پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے چند محاورات درج ذیل ہیں :

اردو محاورے	شنا محاورے
مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے	ہنری ہنری او نئرے گوں گئی
منہ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں	انرئے درن نس ڈنڑے او س نس
دودھیل گائے کی لات بھی سہہ لی جاتی ہے	دوب دئے گاویں نشٹ گہ سٹی
چادر کو دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ	حولی ر کے دا سےھر نھا
آسمان کا تھوکا منہ پر......	اجے پھری تھو تھگا تو موم مکھیٹ
آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا	چکی جونکھے چوکیٹٹ
لکیر کا فقیر	دے تھو حوٹو

بجھو نی (بجھارتیں) :

مس کا کاٹس رے پا۔ دس تھا۔

ترجمہ : میرے بھائی کے تین پاؤں ہیں۔ پہچان لو۔ اس بجھارت کا حل یہ ہے کہ ایک آدمی کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں اور اس کی چھڑی تیسری ٹانگ۔

مموں دادوں ڈم دیولوک دئیں سرب لوک، بجھا۔

ترجمہ : میرے دادا کا جسم دوزخ میں ہے اور اس کی داڑھی اس دنیا میں ہے۔
اس بجھارت کا حل ہے ''مولی''۔

ٹوٹنگ گوٹیجو روئی نکھائی :

ترجمہ : تاریکی سے بلا نکلتی ہے - یعنی نیام سے تلوار نکلتی ہے -

میں دادیں سیشا جاہگار لو پنو -

ترجمہ : میری دادی کے سر پر آگ جل رہی ہے - بجھارت کا حل ہے ''حقہ'' -

شنا زبان کی کہاوتیں (ضرب الامثال) :

لاوا ڈیم نھے اپ جوں لنگ بلی—— بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو زیادہ چیز حاصل کرنے کی تمنا میں کم چیز سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے -

اس بھیم نو آنمز یا وئے بوجے ، نے تھم نھو پھائی موس :—

مرا دردیست اندر دل اگــر گویم زبان سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

دی دے بز کھا - بیٹی دے کر بیٹے کو مارو - یعنی جب دشمن قابو میں نہ آتا تو اسے قدیم زمانے میں شن لوگ داماد بنا کر اپنے بس میں کر لیتے تھے -

اچھے نوں دور ہو نو دور——آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل
ایک ہتھ گی ترپ نہ بین——ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی
لوئی دانوئے نہ ارزنی ، نھر چورکر——انار کھٹے ہیں

کسریں شلوک(۱) : شنا میں قصص کو ''شلوک'' یعنی حکایات اور کہانیوں کو ''چغے'' کہا جاتا ہے - قدیم قصوں میں افسانوی بادشاہ ''کسر'' کے محیرالعقول کارناموں کے افسانے اور گلگت کے ظالم بادشاہ شری بدت(۱) کا قصہ (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) اور کہانیوں میں شکاریوں ، دیووں اور پریوں کی کہانیاں سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں جو شنا اور اردو میں اب تک ضبط تحریر میں نہیں آئیں - اگرچہ جرمن ، انگریزی اور اطالوی زبانوں میں غیر ملکی ادیبوں نے ان کے تراجم کر کے اپنے افسانوی لٹریچر میں اضافہ کیا ہے -

شنا ادب مسلم دور میں
(۱۱۲۰ء — ۱۸۴۲ء)

شنا میں باضابطہ شاعری مسلمانوں کے دور حکومت میں شروع ہوئی - فارسی طرز پر شعر کہنے کا آغاز بھی شنوں اور یشکنوں نے مسلم دور میں شروع کیا - نظم ، رزمیہ ، غزل اور

---

(۱) دراصل ''گسر ساگا'' ہے - گسر خان ۶۰۰ء میں منگولیا کا ایک اولوالعزم بادشاہ گزرا ہے جس نے منگولیا سے لے کر تبت تک اپنے بارے میں مافوق الفطرت انسان ہونے کی نسبت قصے کہانیاں پھیلائی تھیں - غالباً یہی قصے لداخ ، گلگت اور بلتستان میں پھیل گئے -

قطعہ کے نمونے ہمیں اسی دور میں ملتے ہیں ۔
(الف) رزمیہ : مندرجہ ذیل اشعار ایک تاریخی واقعہ کی نسبت ایک رزمیہ نظم کا جزو ہیں
جو سترھویں صدی عیسوی میں مہپونوں کی فتح گلگت پر گریزی نام شاعر
نے لکھے تھے :

سیر ساہ علی ساہ ، فومیگہ جونگ
کاؤں کولو سنگ پھوٹے ، سرسو نثر و تھریگا
خاں مہپون کھرچھمو گرین بوش پھوٹے
سر سو نثر و تھریگا "

ترجمہ : شیر ساہ ، علی ساہ تم پر کیوں نہ فدا ہوں
کہ تم نے نسیبی وادیوں کو سر کیا ۔
اے مہپون خاں تم نے دریائے گلگت پر
پل باندھ کر ملک کو فتح کیا ۔

اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ پرانے سورماؤں کے تاریخی کارناموں کو اکثر رزمیہ نظموں کی صورت میں سراہا جاتا تھا ۔

(ب) قطعہ : مرزا جواری! شکرین پھیپال
تس درو دنیا سنگ پتھریگے
ابی خان جالو
لامئی تھے لچھار تارو
نکھتسو ، نکھسو

ترجمہ : اے مرزا خان رع کی بیٹی جواری !
تو ایک ساغر عشرت سے زیادہ نہیں
اگرچہ تیرے حسن سے ایک دنیا روشن ہے ۔
اے میرے کم سن بیٹے حبیب خاں ،
تجھ پر قربان ہونے کی بجائے تجھے بھینٹ
چڑھا چکی ہوں ۔
وہ دیکھ تیرا ستارۂ زوال نمودار ہو رہا ہے ۔

(ج) : ۱۱۲۰ء میں شری بدت کے قصر شاہی کو آذر جمشید کے حکم سے مسمار کیا گیا ۔
اس پر خوطو کے کہے ہوئے اشعار سے اس وقت کے ماحول اور سیاسی حالات پر
روشنی پڑتی ہے ۔

کورو نتو شری گہ بدت جو کورو
دیم سنگھئی خوطو کورو
ناچیمری کیلی گی تھئی رعکے پھل تھیم
ژیکے نو نوشا شوملیگا
دیم سنگھئی خوطو کورو
ناچمیری کیلی گی تھئی رعکے پھل تھیم

ترجمہ : شری بدت نے کہا کہ میری فطرت سخت ہے
میں نے کہا کہ میں خوطو تجھ سے زیادہ سخت ہوں
دیکھ اے ملعون خاندان کے آدمی!
اس لوہے کے بیلچے سے میں خوطو دم سنگھ دہمان کا بیٹا
تیرے قصر شاہی کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔

(د) تشبیہات : شنا نیچرل شاعری کا ذخیرہ — اردو شاعری کی طرح نادر تشبیہات سے مالا مال ہے ۔ چند تشبیہات کا یہاں درج کرنا شنا شاعری کے اندازِ فکر کو سمجھنے کے لیے از بس ضروری ہے ۔

شنا تشابیہ :

نیزین یون	چودھویں کا چاند ، محبوبہ
کنرین بٹی	بیر کی شاخِ نودمیدہ ، محبوبہ
جل بے سوری(۱)	ابھرتا ہوا سورج ، با اقبال شخص
لچھار تارو(۲)	نجم السحر
خرامشین شوٹی	مورنی کی سی گردن ، معشوق کی نازک گردن
خراژین(۳)	خراد کی سی ، صراحی دار گردن
بازین اچھے	معشوق کی خوبصورت آنکھیں
آژئی ژلو	آنکھ کی پتلی ، پیاری اولاد
سروڈم	سرو قد محبوبہ

(۱-۲) جل بے سوری (ابھرتا ہوا سورج) نامور تاریخی اشخاص کو ''لچھار تارو'' (نجم السحر) سے تشبیہ دی جاتی ہے ۔ مثلاً —
علم شیریں لو علی شیر لچھاو تارو گہہ جل بے سوری
(۳) مثلاً — توم یارین روہو گلو بند ولیم تو خراژین تارو گہہ جل بے سوری زیزی
تو یارو روہو گلو بند ولیمتو خراژین سوتج بار بار بوژی دیم سیک
ترجمہ : اے کاش میں اپنی محبوبہ کے گلے کا ہار ہوتا
تو اس کی صراحی دار گردن کو
بار بار چومنے کا مجھے موقع ملتا ۔

مذہبی شاعری
(۱۸۴۲ء - ۱۹۴۷ء)

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سنا شاعری نے زیادہ تر توجہ مذہبی شاعری یعنی دعا، مناجات، حمدِ الٰہی، مدح، نعتِ رسول ؐ، قصائد، نوحہ جات اور مرثیوں کی طرف منعطف کی ۔ جن اشعار میں سنی اور شیعہ عقائد کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایسے معتدل انداز میں ہیں کہ ایک دوسرے کے جذبات مجروح نہیں ہوتے ۔ اس دور کے مشہور شاعر محمد رضا نگر ، اخوند مہربان ، وزیر احمد خان احمد ، صمد خان اور خلیفہ رحمت ملنگ گذرے ہیں ۔ ان میں سے خلیفہ ملنگ دورِ جدید کے شعرائے گلگت میں بھی بڑا شاعر مانا جاتا ہے ۔ اب ان شعراء کے کلام کے اقتباسات مع تراجم اور مختصر حالاتِ زندگی درج کیے جاتے ہیں ۔

محمد رضا : محمد رضا ریاست نگر کے رہنے والے تھے اور یہ اپنی شنا دعائیہ نظموں کے لیے مشہور ہیں ۔ نصف صدی سے ان کی بعض دعائیہ نظمیں اسکولوں میں پڑھائی جاتی رہی ہیں ۔ آپ کی مندرجہ ذیل دعائیہ نظم کو قبول عام کا درجہ حاصل ہے ۔

جیبھ گی خدا دار سکر تھیم	سس گی تو واری سجدہ دیم
تھگی تو جو روزی بجھیم	اللہ سو رحمٰن الرحیم
پیغمبر بر حق ہنو	او شافع امت ہنو
بویا نالی تھیم نٹ نا اللہ	جسی، سو اللہ العلیم
جا کیک عمر سو درا یورگئی	جا کنک جوانی مسی ایئرگئی
پیری سے ولی نئس در گبنئی	دس سنت دے اللہ الرحیم
زیری فاطمہ خیر النساء	مئی تو جل جو جو نافدا
نے آموس آشانی حالی جو	رضا غلام بن تھیں قدیم
بٹی(۱) دئی جہ بیلہ بوجا واں	لو کے ٹوکے بوڑا جوجہ واں
اسکونی لو گے بو جا واں	نس رز پناہ کھری یا کریم
اوٹیس کھایورے عمر گئی	نورنی بھنرے سو مر گئی
شدت گہ ہمت لائے نے مجے	دس سنت دے یا فتح العلیم

ترجمہ : میں زبان سے خدا کا شکریہ ادا کروں گا
اور سر سے اے خدا تیرے آگے سجدہ بجا لاؤں گا

---

(۱) آخیر زمانے کے انقلابات کی نسبت پیشین گوئی کی ہے جو درست نکلی ہے ۔ رضا کے ان دو شعروں کو شنا زبان میں ضرب المثل کا درجہ دیا جا چکا ہے اور وہ زبان زد خاص و عام ہیں ۔

تجھ ہی سے روزی کے لیے دستِ طلب دراز کروں گا
اے اللہ تو مہربان اور رحم کرنیوالا ہے۔
پیغمبرِ ؑ خدا برحق ہے۔ وہی شافع محشر ہے۔
تجھ ہی سے سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ تو علم والا ہے
میری کچھ عمر تو بچپن میں گذری اور کچھ جوانی کی مستی میں ،
اب بوڑھاپے نے آن گھیرا ہے ، تو ہی طاقت دے۔
اے رحم کرنے والے اللہ ! اے مادر فاطمہ ! تو سب عورتوں سے نیک ہے۔
میری جان تجھ پر فدا ہو۔ مجھ اس ناتواں کے حال کو مت بھولنا ،
کیونکہ رضا آپ کا پرانا غلام ہے۔
بھاری پتھر پانی کی سطح پر تیریں گے اور ہلکے برتن پانی میں ڈوب جائیں گے۔
اپنے بیگانے ہوں گے۔ اے کریم تو مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔
پت جھڑ کے موسم کے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح عمر گذر گئی
اور خوبصورت پھول کی طرح گر کر خاک میں مل گئی۔
طاقت اور ہمت کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔
اے فتح دینے والے اور جاننے والے تو طاقت بخش!

محمد رضا نے دینی اور اخلاقی موضوعات پر شعر کہے ہیں۔ ذیل میں اس کی ایک طویل نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے :—

گنہگار تو ہوں ہو صفت رس خدائی — مچار نے نھے نیر جـہ دنیائی بلائی
سنئی نفس گھہ شیطان سےنا کو تو وادی — خبر آ کـو دوزخـی او عـذابی
سنک نے ہو عمرئی کھورئی بٹ ٹھپنگ بئی — دنیاتی ہلال سے وفا کونی پنس تھئی
جوانی بـزد نٹ بھنر سے بہار بھئی — سمون ہوڑی دئی انسقالی شرو سے
نو کالوس ہمر کھو جا والئی ماز گہ دیزی — نی سورس او تھال دوجا رانی بڑے نے
قانی نش بوجی ، سوری بورئی دشٹے — نے جیل سے سفر تھئی سومئی حالولیٹ
اکو مست نھے نے سوانی راتی واری — غفور الرحیم سے ژ کئے نو تو واری

ترجمہ : اے گنہگار شخص! اٹھ خدا کی تعریف کر
دنیا کی بلاؤں میں مبتلا ہو کر خوابِ غفلت کی نیند سویا نہ کر
تیرا نفس اور شیطان تیرے لیے جال بن رہے ہیں۔
تو اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے مطلع کر

غفلت نہ کر تیری عمر کی دیوار کا سنگ بنیاد گرنے والا ہے۔
عروس جہاں میں وفاداری کہاں ملے گی۔
جوانی ۔ موسم بہار میں پھول کھلتے ہیں
خزاں میں پتے جھڑتے ہیں
ہر سال تیری عمر کے مہینے اور دن کم ہوتے جا رہے ہیں
اور سورج غروب ہوتے وقت ڈھلتا جاتا ہے۔
بالآخر سورج مغرب میں جا کر ڈوب جاتا ہے اور جان خاکی گھر کی طرف سفر کرتی ہے
تو مست ہو کر رات بھر نہ سویا کر۔
کیا تو دیکھتا نہیں کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا تیری طرف رہا ہے!

وزیر احمد خان: سندھی زبان کے جن شعراء نے اس دور میں حمد الٰہی کہی ہے، ان میں اسور کے خاندانی وزیر، وزیر احمد خان احمد (۱۸۶۹ع-۱۹۳۶ع) سرفہرست تھے۔ وہ ایک متشرع انسان ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی و عربی کے عالم بھی تھے اور اپنے ملک میں عالی نسبی اور علم و فضل کی وجہ سے بصد نگاہِ احترام دیکھے جاتے تھے۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے اور شنا زبان میں حمدِ الٰہی کہا کرتے تھے۔

حمد الٰہی (۱)

حمد و ثنا سو خدا جـا	درود زینـا مصطفٰے جـا
سو ایس خبر الـورا جـا	تھہ نظر مـہ شرمندہ جـا
یـار اول ، یار غـار ہنـو	بـا عمر عثمان گہ یـار ہنو
تھم صف عباس حمزہ جا	تھہ نظر مہ سـرمندہ جـا
پنجتن خاصاں حـق ہنـے	بائے امامے سے برحق ہنـے
. . . .	تھہ نظر مـہ شرمندہ جـا
اخـر محشرین نـود یـزرو	بٹـے امت بـا نبیـانی
پھبریں وائن تھیں لوا جا	تھہ نظر مـہ شرمندہ جـا

گناہ تھگاس خطا تھگاس عمر بٹی بیہودہ گئی
بخسس تھے انواحمد جا تھہ نظر مہ شرمندہ جا

ترجمہ: پہلے خدا کی حمد اور ثنا بیان کرو

(۱) اسی زمین میں کسی چلاسی شاعر نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

پھر محمد مصطفیٰ پر درود بھیجو، جو ہمارا خیر الوریٰ ہے۔
اے خدا! اپنے اس شرمندہ بندے پر رحم کر۔
یارِ اول یارِ غار (صدیق رض) ہے
عمر رض اور عثمان رض بھی پیغمبر ص کے یاروں میں سے ہیں۔
میں عباس رض اور حمزہ رض کی تعریف کرتا ہوں۔
اے خدا! اس شرمندہ بندے پر نظر کرم کر
پنجتن خاصانِ حق ہیں۔ بارہ امام بھی برحق ہیں۔
.... اے خدا اپنے اس سرمندہ بندے پر نظر کرم کر۔
قیامت کے دن سب امتیں اپنے نبیوں کے ہمراہ
تیرے جھنڈے تلے چلی آئیں گی۔
اے خدا! اپنے اس شرمندہ بندے پر نظر کرم کر۔
میں نے گناہ کیا اور مجھ سے خطا سرزد ہوئی
اور میری تمام عمر رائیگاں گئی۔
بالآخر اس احمد کو بخش دے۔
اے خدا! اپنے اس شرمندہ بندے پر نظر کرم کر!

اخوند مہربان: آپ اس دور کے سنا زبان کے مشہور مرثیہ، نوحہ اور قصیدہ گو شاعر گزرے ہیں۔ آپ خاص گلگت قصبے کے رہنے والے تھے۔ آپ نے عید نو روز، مدح، چند نوحے اور کچھ مرثیے لکھے ہیں۔ جنہیں ان کے بیٹے اکبر حسین نے روئے گلدستہ مہربان کی صورت میں شائع کروا دیا ہے۔ آپ ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲ رجب ۱۳۰۰ھ بمقام گلگت پیدا ہوئے اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو وفات پائی۔

عید نو روز پر آپ نے ایک طویل نظم لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار نمونے کے طور پر درجِ ذیل ہیں:

عید نو روز

نــو روز عید مشہور ہنو — حــدیث گـہ قــرآن ینرو
آشــنائی صفت اخــبار رو — او دیز گـہ نــو روز ہنو
خدائی اس الستیں(۱) ریز رو — پیــان گینگــو روح جــو
جــن و ملک انسان جــو — او دیــز گہ نــو روز ہنو

(۱) الست بربکم۔ قالو۔ بلیٰ کی طرف اشارہ ہے۔

ترجمہ : عید نو روز مشہور ہے -
حدیث اور قرآن دونوں میں اس کا ذکر ہے -
جس دن کی اٹھارہ صفتیں لکھی گئی ہیں وہ نو روز کا دن ہے -
خدا نے ارواح ، جن و ملک و انسان سے
جس روز عہد لیا تھا وہ دن نو روز تھا -

مدح(۱)

دل سے گوا دیں توحید ح | روح سے گوا دن رسلج ص
دم سے گوا دیں معارج | سسک ہو یوم الجزا
ہو سے گوا دیں عدلج | سو سے گوا دین امامج
ای بوئنر اولی بن یسوح | سافع اسئی سبر خدا
ماہ ربیع الاول سرد | رئے ستائی بونگو دیزرو
رسول جا لودیز ہو | عالم ر نورش روسنا

ترجمہ : ہاں اللہ کی واحدانیت پر گواہی دیتی ہے اور روح رسالت پر گواہ ہے
جسم محشر پر گواہی دیتا ہے کہ بے شک روز جزا ہے -
دل عدل پر گواہی دیتا ہے ، دماغ امامت پر گواہی دیتا ہے -
یہ پانچ اہلِ تشیعہ کے اعتقادات ہیں - ہمارا سافع سبرِ خدا ہے -
ماہ ربیع الاول کی سترہ تاریخ کو وہ رسول ص پیدا ہوئے
جس کے نور سے عالم روشن ہوا -

شنا شاعری کا دور جدید
(۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۶ء)

یہ دور شنا زبان و ادب کے لیے ہر لحاظ سے عہد آفریں ترقی کا دور ہے - خلیفہ رحمت نے اپنے شنا کے کلام کو 'گلزار سلنگ' کی صورت میں شائع کیا - پیر نصیرالدین نے مناجاتیں چھپوا لیں - اصناف سخن میں ترانے کی صنف کا اضافہ ہوا - شنا شاعری میں نئے نئے رجحانات ابھرنے لگے - آزادیِ وطن اور سرفروشانِ وطن کے گیت گائے گئے -

مقالہ نگار کے زیر اہتمام پولیٹیکل ایجنٹ گلگت مسٹر اجلاس حسین کی صدارت میں شنا کا ایک مشاعرہ سرکاری طور پر منعقد کیا گیا - جس میں شنا زبان کے مشہور شعرا نے حصہ لیا اور انہیں انعام و اکرام سے نوارا گیا -

---

(۱) یہ ایک بڑی طویل مدح ہے ، جس کے چند اشعار بطور نمونہ یہاں درج کیے جاتے ہیں -

ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان اور آزاد کشمیر پر حملہ کیا تو دیگر پنجابی، سندھی، پشتو اور اردو شعراء کی طرح شنا زبان کے شاعروں نے بھارت کے غاصبانہ عزائم کی پرزور مذمت کی اور ولولہ انگیز نظمیں لکھ کر قوم کے لہو کو گرمایا۔

دور جدید کے شعراء : اس دور کے شاعروں میں سے فضل الرحمٰن عالمگیر، عبداللہ، ماسٹر غلام نبی وفا بگروٹی، راجہ شجاعت علی خاں اور عبداللہ قابل ذکر ہیں۔ عبداللہ اُس حراموش علاقے کا باشندہ ہے جو سربفلک پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کی شاعری کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں اپنے ماحول سے ایسی نادر تشبیہات لیتا ہے جن سے بیان میں ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ذیل کے شعروں میں عبداللہ نے محبوبہ کے رخصت ہونے کے بعد کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

مئی گل اندام لائی دورے وار بوجیے
پنزے(۱) یـو نی شری بورے وار بوجیے
بلے جیک بھور دے گملے وار بوجیے
کـسم بخنیں پیو بـاغمے وار بـوجیے

ترجمہ : وہ حد نظر تک محبوبہ کو دیکھ لیتا ہے
پھر اس کو محبوبہ کا نظر سے غائب ہونا
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ پندرھویں(۲) کے چاند کا غروب ہونا۔
اس کی دنیائے دل پر اسی طرح اندھیرا چھا جاتا ہے،
جس طرح چاند چھپ جانے کے بعد دنیا پر تاریکی چھا جاتی ہے
اور محبوبہ کا جانا ایسا نظر آتا ہے
جیسا کہ رام چکور کا کسی دور گلیشر کی طرف پرواز کرنا۔

گلگت کی طرح پہاڑی ملکوں میں پرندے سرشام ہی اپنے دور گھونسلوں کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ جن کے بعد شام کی تاریکی چھا جاتی ہے۔

ماسٹر غلام نبی وفا : دور جدید کے شنا شاعروں میں ایک اور ممتاز شاعر ماسٹر غلام نبی وفا بگروٹی ہے جو ۲۹ فروری ۱۹۳۸ء کو تھیوٹ گاؤں علاقہ بگروٹ میں برگوشی نامی ایک شخص کے گھر میں پیدا ہوا اور اس وقت گلگت ایجنسی کے محکمۂ تعلیم میں مدرس کے فرائض ادا کر رہا ہے۔ جو خصوصیت کلام اُسے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ محبت کا اظہار عورت کی زبان سے ہے جس میں وہ محبوب کے ہجر میں اپنے دلی جذبات کو بیان کرتی ہے۔ شنا شاعری میں فارسی اور عربی شاعری کے برعکس اظہار محبت مرد اور

(۱-۲) شنا شاعری میں چودھویں کے چاند کے بجائے پندرھویں کا چاند مستعمل ہے۔

عورت دونوں کی زبان سے کرایا جاتا ہے ۔ جیسا کہ وفاؔ کے ان شعروں سے مترشح ہوتا ہے :

ما یــوں ! زنبکبس نوم حا کوری بالو ، ناسجن دیزگی کالو
مئی نلو طوطا ! بھر دن وہ درگسئی خبر گنو کٹ کنے آلو
اچھــے بھئی بــونٹ ســو ناســوک مس دو بــالیس
گلســری گلاب نــوم کھــوئنر مس ســوک دو بــالیس

دنیا تی عم نو مئی ہمئر ہن جمع ، نہ بھے دنیا تج طمع
مئی خبر ســو نا گسکا بھئی بھوبر دنیا نــر یارندا ســوہنا
دنیا برسنک ہن بھئی ما یوں سانکر نوس ، بہاری کھن ہن
ساگــور بھوبرے ســو لائی بھونملن ،
اوڑر بھو نا یم مئی نرگس بھوبر نوس

ترجمہ : اے میرے محبوب مجھے میں نے اپنے سر کے بالوں کا تحفہ دیا
تیری جدائی میں مجھے دن برس نظر آ رہا ہے ۔
اے میرے نیلے طوطے تو اڑے اڑے
اپنی محبوبہ کی خبر لینے کیوں نہیں آیا
میں نے تیرے لیے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کی ہیں ،
پھر بھی میں تجھے دیکھ نہ سکی ۔
اے میرے محبوب مجھے تجھ سے نہ شکوہ ہے ، لیکن پھر بھی
میں تجھے بھول نہ سکی
اور سرخ گلاب کو میں اپنی ٹوپی میں لگا کر پہن نہ سکی ۔

ترجمہ : دنیا کا غم تو میرے دل میں جمع ہے ۔
دنیا سے تو کوئی طمع نہ رکھ
تو نے میری خبر تک نہ لی کہ آیا تیری ، محبوبہ دنیا میں ہے یا زندان میں ۔
دنیا میں ہر طرف اجالا ہے لیکن اک تیری محبوبہ غم کے اندھیرے میں ہے ۔
بہار کا موسم ہے اور باغ میں کئی قسم کے پھول کھل چکے ہیں ۔
میں تجھے ان پھولوں میں تلاش کرتی پھرتی ہوں ۔
لیکن میرا محبوب پھول مجھے نہیں ملتا ۔

اس قسم کی شاعری عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اور اس میں ہندی و چینی شاعری کی طرح ماحول کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔

فضل الرحمٰن عالمگیر : پونیال کا ایک نوجوان گریجویٹ ہے جو گلہ پور کے ایک گاؤں میں ۲۷ اگست ۱۹۳۳ء کو ایک شن گھرانے میں پیدا ہوا اور محکمہ تعمیرات و شارعات میں ٹھیکہ دار ہے۔ وہ زیادہ تر ترانے لکھتا ہے اور علامہ اقبالؒ کے اشعار کو شنا زبان کے حسین سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ ''مرد مجاہد سے خطاب'' کے عنوان سے بھارت کے ساتھ جنگ کے ایام میں اس نے ایک ترانہ لکھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

ترانہ

رچھالو پاکستانئی	او بھالی شانئی مجاہد
پسرے جوہر ایمانئی	آلون رفت تھئی امتحانئی
تکبیرئی نعرہ دو جو	ہر قدم موزوٹ سر و جو
دشمنئ مفے بھوٹو جو	ظالمانوں نوم نیو جو
اقبالئی تو شاہین ہن	تھئی ز دیئر آسمان زمین ہن
تھئی تھیر فتح مبین ہن	دین اسلامئی تو امین ہن
غزامو منئی عارت ہن	تھ جہاد توٹ اجازت ہن
بوٹے جو برنی عبادت ہن	وہ قدمے موژو جنت ہن
ہر ایک ہیئر تھئی عزت ہن	ہر زبان اثر تھی صفت ہن
جہ سدا زی تھیں صورت ہن	جہ چنالی تھی عاوت ہن
ہر مجلسیئر تھئی قصہ بئی	ہر تعریفک تھئی حصہ بئی
کھس عجب تھئی دیدبہ بئی	قیامت بوسنگ زندہ بئی

ترجمہ : پاکستان کی حفاظت کرنے والے اے مجاہد!
تیری کتنی اونچی شان ہے اپنے ایمان کا جوہر دکھا دے۔
تیرے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔
نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے ہر ایک قدم آگے بڑھاتے چلو
دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے، ظالموں کے نام و نشان مٹاتے ہوئے۔
تو اقبالؒ کا شاہین ہے۔ تیری زد میں آسمان و زمین ہیں۔
تیرے ہاتھوں میں فتحِ مبین ہے تو دینِ اسلام کا امین ہے۔
غزا کرنا مومن کی عادت میں داخل ہے۔

جہاد کی تجھے اجازت دی جاتی ہے - یہ سب سے افضل عبادت ہے -
قدم آگے بڑھا کہ وہاں تیرے لیے جنت ہے -
ہر دل میں تیری عزت ہے - ہر زبان میں تیری تعریف ہے -
کیسی خوبصورت تیری صورت ہے اور کیسی پیاری تیری عادت ہے -
ہر ایک مجلس میں تیرا قصہ بیان ہوگا - ہر تعریف میں تیرا حصہ ہوگا -
تاآخر عجب تیرا دبدبہ ہوگا - تو تا قیامت زندہ رہے گا -

منظوم شنا تراجم رباعیات اقبال :

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر   حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے   اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

منظوم ترجمہ :

ہئیر کھس زیک بھے مہرگہ وفا تھ   خــدائی راز جــو بے آشنا تــھ
کے سئی نصیب انر یوئی ٹک تھگانو   اے سیٹ علی شا کئی شت عطا تھ

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق   کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی ســرمایہ محراب و منبر   کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

منظوم ترجمہ :

خدائی عشق لمل ہــر صوررنئی   کرے مجلسر بئی ، کرے جنگلر بئی
کرے نو وعظ تھو جا منبریر بئی   کرے علئی سکل ایئر خیــربز بئی

خلیفہ رحمت ملنگ جان : خلیفہ رحمت ملنگ ، شنا زبان کا عظیم ترین شاعر ہے - وہ ۱۸۷۹ء میں علاقہ پونیال کے صدر مقام چھیر قلعہ میں اسماعیلیوں کے ایک مقامی خلیفہ خاندان میں پیدا ہوا - عنفوان شباب ہی میں اسے یورمس نامی پونیال کی ایک دیہاتی دوشیزہ سے انتہائی محبت ہوگئی - ملنگ نے اس کے ساتھ شادی کرنی چاہی لیکن وہ اس کے حاصل کرنے میں ناکام رہا - کیونکہ ملنگ کی شادی پہلے ہی اپنی چچا زاد بہن کے ساتھ ہو چکی تھی - یورمس سے شادی کرنے میں ناکامی پر وہ برافروختہ ہوا اور ترک وطن کا ارادہ کر بیٹھا - لیکن سابق گورنر پونیال راجہ انور خان کے سمجھانے پر وہ ایسا کرنے سے باز رہا - ادھر یورمس کو بھی ملنگ سے عشق ہو گیا تھا اور اگرچہ اس کی شادی کسی اور شخص سے ہوئی تھی لیکن وہ اس کے عشق میں گھل کر جاں بحق ہوئی - اس سانحۂ عظیم کے بعد تمام عمر ملنگ یورمس کے عشق میں جذباتِ محبت میں ڈوبے ہوئے شعر کہتا رہا - تاہم کبھی کبھی وہ دوسرے موضوعات پر بھی

لکھ لیتا تھا۔ لیکن در اصل اس کا مرکزی موضوع سخن یورمس کا عشق ہی رہا۔

اخترشیرانی اور ملنگ کا تقابلی مطالعہ : شنا زبان کے دورِ حاضرہ کے عظیم ترین شاعر خلیفہ ملنگ اور اردو کے مشہور شاعر اختر شیرانی کی شخصیت اور اسلوب میں کچھ یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ ان دونوں شاعروں کے خیالات و حالات زندگی بھی ایک دوسرے کے مماثل معلوم ہوتے ہیں ۔ وہی نغمہ سنجی و بادہ نوشی ، وہی خمار و کیف و مستی اور وہی عورت کے عشق میں وارفتگی ۔ اگر اختر کے نغمات شیریں کا مرکزی موضوع سلمیٰ ہے تو ملنگ کے جذبات کی دیوی اور اس کے اشعار کا محور یورمس ہے ۔ ان دونوں شاعروں کے کیف آور نغمے نصف صدی سے پنجاب اور گلگت کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں اور کہ و مہ سے دادِ تحسین لے رہے ہیں ۔ سلمیٰ اور یورمس دو جیتی جاگتی محبوبائیں ہیں جن سے اختر اور ملنگ کو والہانہ محبت ہے ۔ سلمیٰ کی تعریف میں اختر اپنے ایک اردو سانیٹ میں یوں رطب اللسان ہے :—

بہار حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگین سے سنوارا ہے
بہشت رنگ و بو کا نو سراسر اک نظارا ہے
تیری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ

اب اپنے محبوب کے لیے ملنگ کے جذبات ملاحظہ فرمایے :-

پاکیزہ ہسن یونیجو — گلاپ شرم تھیں مکھیجو
چنالی میں جبلجو — لائے شیلی بلبلیجو

کسی اور مقام پر ملنگ نگارِ دلنشین کی رعنائیوں کو یوں بیان کرتا ہے :-

بھئی ہتھئی ہسن گلاسیس — شوٹی تھیگین تھئی خاراشیس
مکھیں ادرنگ گلاپیں — ہیو تھیں عرق شرابیں

ترجمہ : تیرے ہاتھ مرمریں ہیں تو تیری گردن خراد کی سی ۔
چہرے کا رنگ گلاپ (گلاب) کا سا ہے ،
تو تیرا دل عرق شراب کی طرح سرخ فام ہے ۔

ساموں تھے اک رنگ سانتھ — روبرو بین پھنیرے سانتھ
میں جیل نش بدن سانتھ — ہمیش بوجین یورمس سانتھ

ترجمہ : جب تو ایک رنگ کا لباس پہن کر
پھولوں کے سامنے آ نکلتی ہے تو میری جان بدن میں نہیں رہتی ۔
یہ تو ویسے بھی ہمیشہ یورمس کے ساتھ رہتی ہے ۔

اختر شیرانی کہتے ہیں :-

میرا بس ہو تو اختر میں انہیں کا ہو جاؤں
ہمیشہ کے لیے ان حسین پردوں میں سو جاؤں

ملنگ بھی دیگر شعراء کی طرح فلک کج رفتار کا شکوہ کرتا ہے اور وقت اور ماحول کا رونا روتا ہے ۔ چنانچہ وہ یوں شکوہ سنج ہوتا ہے

قلم ساس کاغدے ساتھ   خیال توجیں یورسیے سانتھ
فلک حسد ملنگ سانتھ   ظلم بھس ہزار رنگے سانتھ

ترجمہ : یوں تو کہنے کو میں کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہوں ،
لیکن میرے خیال کا محور تو دوریس ہے ۔
فلک ناہنجار ملنگ سے حسد کر رہا ہے
اور ستم ڈھا رہا ہے ۔

ملنگ کے ان اشعار کو قبول عام کا ایسا درجہ حاصل ہو چکا ہے کہ گلگت میں شاید ہی کوئی خوش مزاج نوجوان ہو جس کے لبوں پر یہ اشعار نہ ہوں ۔

ناکامی عشق اور ناسازگار حالات سے متاثر ہو کر ملنگ یوں کہتا ہے

نے توجن کردم مقصودر   آخر نس بھٹی لوح محفوظر
جیل ریل دنیائی دوروز   عمر بجن مٹی افسوسر

ترجمہ : حصول مقصد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی
شاید قسمت میں لکھا ہی نہیں
دنیا کی بے وفائی پر رونا آتا ہے ۔
میری عمر یونہی حسرت میں گزر رہی ہے ۔

ملنگ کے فلسفیانہ افکار : اگر ہم ملنگ کے فلسفیانہ اشعار کو ان تمام حسین نغموں سے جو اس نے دوریس کے عشق و محبت کی آگ میں جل کر کہے ہیں الگ کر کے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ملنگ دراصل ایک فلسفی شاعر ہے ، مثلاً اس حقیقت کو کہ انسان کے دکھ اور سکھ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں ، یوں بیان کرتا ہے

نی گڑ بڑی تو آدمے سانتھ الن   بیس دوریٹ گہان تھونیس
نی مٹی کیجھی توم جیلے سانتھ الن

ترجمہ: زندگی کے نشیب و فراز کا سلسلہ نو ازل سے چلا آتا ہے۔
ہم دور دراز کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔
دراصل اچھائی یا برائی آدمی کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔
وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

دنیا ترکھوں تھے نھونیں   تھے بیار تھے مری بونیس
بے نے مرے نھے رونیس   شرمندہ بے تسو کھری اونیس

ترجمہ: ہم دنیا میں محنت مشقت کرکے دولت جمع کر لیتے ہیں۔
مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ
ادھر ہم نے دولت اکٹھی کر لی ادھر موت نے آن گھیرا۔
حالت نزع میں ہم گڑگڑا کر، اے خدا!
تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ مہلت ملے۔
لیکن موت کا وقت معین ہوتا ہے۔
اس لیے اپنے تمام گناہوں کے ساتھ شرمندہ
تیرے حضور بالآخر پیش ہونا پڑتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ملنگ شنا زبان کا سب سے بلند پایہ اور مقبول ترین شاعر ہے اور اس کی مقبولیت کا سکّہ تمام اطرافِ گلگت میں چلتا ہے۔ اس کے کلام میں ترنم، روانی اور جذبات کی حسین آمیزش دلوں کو موہ لیتی ہے۔

کتابیات

اس مقالے کی تحریر میں دیگر معلوماتی ذرائع کے علاوہ مندرجہ ذیل علمی، ادبی اور تاریخی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

اصحاب کہف مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد، سنگ میل پبلیکیشنز، شاہ عالمی گیٹ، لاہور۔

گرامر آف دی شنا لنگویج
از ٹی گراہم بیلی ڈی لٹ
مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی
لندن ۱۹۲۴ء

Grammar of the Shina Language by
T. Grahame Bailey, D. Litt.,
London Published by Royal Society
74, Grovenor, St. W.I., 1924.

دی پساچہ لنگولیجز آف نارتھ ویسٹرن انڈیا
مصنفہ جی۔ اے گریئرسن،
مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۰۶ء

The Pisaca Language of North
Western India by G. A. Greirson,
Published by Royal Asiatic Society,
London 1906.

ٹرائبز آف دی ہندوکش مصنفہ
کرنل بڈلف، کلکتہ ۱۸۸۰ء

Tribes of the Hindu Kush by
Col. G. Biddulph, Calcutta, 1180.

Songs and Customs by Dr. Leitner, Imperial and Asiatic Quarterly Review, 1893.	سانگز اینڈ کسٹمز مصنفہ ڈاکٹر لائٹنر ، امپیریل اینڈ ایشیاٹک سہ ماہی ریویو، ۱۸۹۳ء
Linguistic Survey of India, Volume III, Part II.	لنگوسٹک سروے آف انڈیا ، جلد سوم ، پارٹ سیکنڈ ،
Specimens of the Dardic languages by Sir Gegory Abraham Greirson, Calcutta, 1919.	سپیسیمن آف دی داردک لنگویجز ، مؤلفہ سر جارج ابراہم گریئرسن ، کلکتہ ۱۹۱۹ء
Gilgiti Phonetics by Col. Lorimer.	گلگتی فونیٹکس مصنفہ کرنل لاریمر ۱۹۲۴ء

مغربی پاکستان کی تاریخ جلد اوّل مصنفہ رشید اختر ندوی ، مرکزی اردو بورڈ ،
۳۶ ، جی گلبرگ - لاہور

گلزار ملک مصنفہ حلیمہ رحمت ملک ، میر برادرز تاجران کتب بازار ، راولپنڈی

The Hinterland of Asia, Gilgit and Baltistan. by Wazir Muhammad Ashraf Khan Printed by Feroz Sons, Harding Road, Rawalpindi.	دی ہنٹر لینڈ آف ایشیا گلگت اینڈ بلتستان ، مصنفہ وزیر محمد اشرف خان ، فیروز سنز ، ہارڈنگ روڈ ، راولپنڈی ۱۹۶۳ء

تاریخی مطالعے (گلگت و بلتستان) مصنفہ وزیر محمد اشرف خان (مقالہ نویس) (غیر مطبوعہ)

مولوی سید علی بلگرامی مطبوعہ مقبول اکیڈیمی
تمدن ہند مصنفہ ڈاکٹر گستاؤلی بان مترجمہ
لاہور ۱۹۶۲ء
قصائد و نوحہ جات مصنفہ
آخوند مہربان ، ۱۹۶۳ء

Language and Races of Daridstan, by Dr. G.W. Leitner, Published in Lahore, 1877.	لنگویجز اینڈ ریسز آف دردستان ، مصنفہ ڈاکٹر لائٹنر ، ۱۸۷۷ء
The Making of a Frontier by A.G. Durand, late British Agent in Gilgit.	دی میکنگ آف اے فرانٹیئر مصنفہ ڈیورینڈ

بروشسکی زبان و ادب

پہلا باب

سیاسی، معاشرتی، فکری اور تہذیبی پس منظر

(الف) سیاسی پس منظر: ریاست ہنزہ کوہستان قراقرم کے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے۔ یہ وادی شرقاً غرباً ایک سو میل سے کچھ زیادہ لمبی اور شمالاً جنوباً نصف سے لے کر دو میل تک چوڑی ہے۔ اس کے مشرق میں چینی ترکستان کی حدود یارقند، سریقول اور کاشغر ہیں۔ جنوب میں ریاستہائے نگر، استور اور کشمیر واقع ہیں۔ جنوب مشرق میں بلتستان اور لداخ کے علاقے ہیں۔ شمال میں روسی حدود کے پامیر بیضائی گنبد، تاشقند اور افغانستان کے پامیر منارہ اور وخان ہیں۔ اور مغرب میں اشلوکن و وخان افغانستان کے علاقے واقع ہیں۔

ہنزہ کے لوگوں کو یہ روایت بہت عزیز ہے کہ ہنزہ کے قدیم باشندے سکندر اعظم کے ان تین سپاہیوں کی اولاد ہیں جن کو سکندر نے دریائے جیحوں کے کنارے کے علاقوں کی مہم کے دوران بیمار پڑ جانے کی وجہ سے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ یوں شاہی خاندان کے افراد اپنی شکل و شباہت اور مزاج کے اعتبار سے یہاں کے عوام سے مختلف بھی ہیں۔ شاید یہ صحیح ہو کہ کسی زمانے میں یہ لوگ ایران سے آ کر یہاں آباد ہوگئے تھے[1]۔ ان کے سردار کا نام مغول تیتم تھا۔ اس کی اولاد عرصہ دراز تک چترال سے لے کر وخان، بدخشاں، ہنزہ، استور، داریل اور تانگیر میں حکومت کرتی رہی۔ یہ لوگ رئیسانِ گلگت کے نام سے معروف ہوگئے۔

رئیسانِ گلگت کے بعد شری بدت نامی ایک حکمران ہوا ہے۔ یہ شخص رئیسانِ گلگت کے آخری حکمران کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ روایت ہے کہ یہ شخص معصوم بچوں کی صورت میں مالیہ وصول کیا کرتا تھا۔ اس کے ظلم کی وجہ سے گرد و نواح میں سرکشی کی لہر دوڑ گئی اور ہنزہ میں مغول تیتم کی اولاد خود مختار ہوگئی۔ یہ قبیلہ سرکشں تھپ کوینٹس (Thapkuyants) کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی عرصے میں آذر جمشید نامی شہزادہ بلتستان سے گلگت آیا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کی مدد سے شری بدت کو قتل کر کے اسے اپنا حکمران بنا لیا۔ شری بدت کے متعلق مشہور تھا

---

1. Barbara Mons, "High Road to Hunza", p. 90.

کہ وہ کسی اوزار وغیرہ سے قتل نہیں کیا جا سکتا ، لہٰذا ان لوگوں نے اس کی لڑکی نور بخت کو ساتھ ملا لیا اور اس کے ذریعے سے اس کی موت کا راز پا کر اسے زندہ جلا ڈالا ۔ آذر جمشید اور نور بخت کے ملاپ سے ایک لڑکا پیدا ہوا جو بعد میں یہاں کا حکمران بنا ۔ یہ بچہ چونکہ آذر جمشید اور نور بخت کے خفیہ ملاپ کا نتیجہ تھا ، اس لیے اس کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا گیا ۔ اس کا نام سو ملک تھا ۔ اس کی شادی کامگار ملک حکمران گریز کے خاندان میں ہوئی ۔ کہا جاتا ہے کہ رشتہ منظور کرتے وقت کامگار ملک نے یہ بیت پڑھا ؎

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز

لیکن تاریخی طور پر یہ بات ثابت نہیں ہوئی ۔

سو ملک کے تین بیٹے تھے ۔ بڑے کا نام شاہ ملک تھا جو راجگان گلگت کا مورثِ اعلیٰ تھا ۔ یہ ملک زرین ساخ اور خرسم یا خریا کے نام سے بھی معروف ہے ۔ روایت ہے کہ اس کے سر پر سونے کے دو سینگ تھے اور دونوں پاؤں گدھے کی طرح سم دار تھے ۔ دوسرا بیٹا مہر ملک اور تیسرا زیگ ملک کے نام سے مشہور ہوا ۔ یہ دونوں بھائی شاہ ملک کے زمانے میں گلگت میں سکونت رکھتے تھے ۔ ہنزہ میں مغول بیتم حکمران تھے جن کی مالیہ جمع کر کے شاہ ملک کو گلگت بھیجا کرتے تھے ۔

مہر ملک کے بعد اس کا بیٹا صاحب خان ، پھر اس کا فرزند دولت شاہ اور دولت شاہ کا بیٹا شاہ ملک ثانی حکمران ہوئے ۔ شاہ ملک ثانی نے بلتستان کی ایک خاتون مسماۃ حشتم بیگم سے شادی کی ، جس سے تین لڑکے پیدا ہوئے ، جو اپنے بزرگوں کی طرح کبھی گلگت اور کبھی التت میں قیام کرتے تھے ۔ ایک بار جب یہ تینوں بھائی التت میں قیام پذیر تھے تو کسر نامی ایک شخص لداخ سے ہنزہ میں وارد ہوا اور یہاں قابض ہو گیا ۔ حشتم بیگم کی اولاد فرار پر مجبور ہوئی ۔ اس خاندان کا ایک فرد لالی تھم نامی گلگت کی طرف اپنے نکچدی بھائی راجہ چلیس خان کے پاس چلا گیا ۔ جس نے اپنی بہن سے اس کی شادی کر دی اور اس کی اولاد میں سے دو توام بچے گرگس اور مغلٹ اپنے ماموں طرہ خان کی قرعہ اندازی سے علی الترتیب ہنزہ اور نگر کے حاکم بنے ۔ ایک روز شکار کے بہانے مغلٹ کے رضائی باپ مغل بیگ نے گرگس کو تیر مار کر قتل کر ڈالا اور ہنزہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگا ، لیکن گرگس کے وزیر ٹبو نے مغل بیگ کو قتل کر کے اس کا بدلہ لے لیا ۔ چونکہ گرگس کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لیے یہاں کے لوگوں نے وزیر ٹبو کی مدد سے حشتم بیگم کی نسل سے جو کسر لداخی کے خوف سے مفرور ہوگئے تھے شاہ خان نامی پیر مرد کو ڈھونڈ نکالا اور گرگس کی بیٹی

نور بی بی سے اس کا نکاح کر کے اسے تخت پر بٹھا دیا ۔ یہ لوگ اس کو آسانی حاکم تصور کرتے تھے اور اپنی اصطلاح میں اسے عیاشولُم عیاشو (Ayashulum Ayasho) کہتے تھے ۔ بعدمیں یہ خاندان عیاش کُتس (Ayash Kuts) ہی کے نام سے مشہور ہوا ۔

شاہ خان عرف عیاشو کے لڑکے مایوری تھم جس نے کہ مغول تیم کی اولاد کے ہاں پرورش پائی تھی ، جب اقتدار سنبھالا تو اپنے آپ کو طاقتور قبیلوں کی وجہ سے بے بس پایا ۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے قبیلہ مغول کی اولاد سے جو تھپکوینتس (Thapkuyants) کے نام سے معروف تھی ، چھٹکارا پانے کی تدبیر کی ۔ چنانچہ اس نے دوسرے دونوں قبائل 'بہا جائنگ' اور 'حسین کودسں' کو ساتھ ملا لیا اور قبیلہ تھپکوینتس جو اس وقت نالہ شیٹ بورمیں متوطّن تھا ، کو تھوننگ کی تقریب منانے کے لیے بلتت میں دعوت دی اور اس موقع پر اس کے سب افراد کو قتل کر ڈالا ۔ اس کے بعد مایوری تھم راجگانِ گلگت کی تہدید سے بے خوف ہو کر درواز کی طرف بڑھا ، جہاں کے والی نے اپنی بیٹی شاہ بیگم کی شادی اس سے کر دی ۔ شاہ بیگم کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جو عیاسو ثانی کے نام سے مشہور ہوا ۔

عیاشو ثانی اپنے باپ کے بعد ہنزہ کا حکمران بنا ۔ اس نے بلتستان کے راجہ ابدال خان کی بیٹی شاہ خاتون سے شادی کی ۔ اس کے جہیز میں ایک بندوق دی گئی جس پر سن ۱۰۳۹ع / ۹۳۶ھ کندہ ہے ۔ یہ بندوق راجگان ہنزہ کے توشہ خانہ میں آج بھی موجود ہے ۔ اسی اثنا میں ہنزہ میں تمام فصلوں کی بالیں سیاہ ہوگئیں اور قحط پڑ گیا تو لوگوں نے اسے تھپ کوینتس کے خاندان کے بے گناہ افراد کے خون کا نتیجہ خیال کیا اور اس خاندان کے کسی فرد کی تلاش شروع ہوئی ۔ آخر درم چھرم نامی ایک بچہ چپروٹ میں پایا گیا جو اپنی ماں کے ساتھ یہاں رہتا تھا ۔ اتفاق سے بچہ کی ماں اپنے سسرال آئی ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہ دونوں قتل ہونے سے محفوظ رہ گئے تھے ۔ اہلِ ہنزہ نے اس بچے کو تمام موروثی اراضیات و مراعات لوٹا دیں اور بالغ ہونے پر گنش خاندان میں اس کی شادی کر دی ، جس سے سات لڑکے پیدا ہوئے اور ان سے سات قبیلے بنے ۔ ایک قبیلہ جو تھرا کوٹس کہلاتا ہے ، کے افراد ریاست ہنزہ کے منصبِ وزارت پر فائز ہوتے آئے ہیں اور چند ایک حکومتِ پاکستان کے تحت اچھے اچھے عہدوں پر متعیّن ہیں ۔

شاہ خاتون کے ساتھ بلتستان کے دستکار بھی ہنزہ آئے جنھوں نے یہاں التت اور بلتت میں محلّات تعمیر کیے ۔ التت قلعہ کے ایک برج کی چوکھٹ پر سن ۱۰۴۸ع / ۹۰۵ھ لکھا ہوا ہے ۔ جسے اس قلعہ کا سنِ تعمیر ہی سمجھنا چاہیے ۔ شاہ خاتون کے بطن سے بھی سات لڑکے پیدا ہوئے ۔ ان میں سے پانچ باپ کے بعد ، یکے بعد دیگرے حکمران

ہوئے ۔ پانچویں بیٹے شہزادہ سلیم کے زمانے میں ہنزہ اور چین کے درمیان اچھے تعلقات پیدا ہوگئے اور خود سلیم نے ترکستان اور یارقند کا سفر بھی کیا اور یارقند میں ایک قطعہ زمین بھی حاصل کیا ۔ چھٹے اور ساتویں شہزادہ مہری تھم اور سلطان نے ہنزہ کی حکومت دو حصوں میں بانٹ لی لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے نگر پر قبضہ کر لیا ۔ اس طرح مہری تھم نگر اور سلطان ہنزہ کا حاکم بنا ۔

سلطان کے بعد اس کے دو بیٹے علی خان الف اور شاہ عباس عرف شبوس بلنت میں حکومت کرنے لگے ۔ کچھ مدت بعد شاہ عباس نے علی خان کو قتل کر دیا اور بلتت ، الف اور گنس اس کے زیر نگیں آ گئے ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شہ بیگ تخت پر بیٹھا لیکن ابھی اس نے چند سال ہی حکومت کی تھی کہ ایک شخص شاہ خان ولد حیدر خان نے اسے قتل کر ڈالا اور خود تخت پر قابض ہوگیا ۔ شہ بیگ کا لڑکا خسرو بھاگ کر داریل میں پناہ گزین ہوا ۔ کچھ ہی عرصے بعد شاہ خان کا انتقال ہوگیا اور اس کا نابالغ لڑکا غلام نصیر بہ سرپرستی وزیر دودار مسند نشین ہوا ۔ جب خسرو کو پتہ چلا کہ ہنزہ میں شہ بیگ کا نابالغ لڑکا حکمران ہے تو وہ چند ساتھی کی معیت میں ہنزہ آیا اور غلام نصیر کو قتل کر کے یہاں قابض ہوگیا ۔ یہ واقعہ ۱۷۵۴ع کا ہے ۔ تیس سال کے بعد جب خسرو بوڑھا ہوگیا تھا اس کے ایک لڑکے سمی مرزا نے اسے پتھر مار کر ہلاک کر ڈالا اور خود ۱۷۸۴ع میں حکمران بن بیٹھا ۔ مرزا ایک کاہل الوجود اور نا اہل شخص تھا ۔ اس کے عہد میں کئی بار خشک سالی بھی ہوئی ۔ اس لیے لوگ اس سے بیزار ہوگئے اور انہوں نے اس کے جلاوطن بھائی سلیم خان (سلیم خان باپ کی موت کے بعد گلگت میں اپنے خالہ زاد بھائی غوری تھم خان کے پاس جلاوطنی کی زندگی گذار رہا تھا) کو ہنزہ آنے کی دعوت دی ۔ سلیم خان نے ہنزہ پر چڑھائی کر کے مرزا کو قتل کر ڈالا اور ۱۷۹۰ع میں میر ہنزہ بنا ۔ یہ شخص ایک مدبّر اور بیدار مغز حکمران تھا ۔ اس نے اپنے دانشمند وزیر بونو کی تجویز سے حیدر آباد ، علی آباد اور احمد آباد کی بنجر اراضی کو قابل کاشت بنایا ۔ یہ شخص روزانہ دربار بھی کیا کرتا تھا ۔ اس نے چونتیس (۳۴) سال حکومت کی ۔

سلیم خان کی وفات (۱۸۲۴ع) پر اس کے دونوں بیٹوں محمد امین خان اور غضنفر علی خان کے درمیان جانشینی کے لیے جھگڑا ہوا ۔ چونکہ غضنفر کی پارٹی مضبوط تھی اس لیے غضنفر تخت نشین ہوا اور اس نے محمد امین کو زہر دلوا دیا ۔ اس کے زمانے میں مہاراجہ کشمیر کے ساتھ ہرومن کی مشہور لڑائی ہوئی ۔ اس لڑائی میں فتح جنگ نامی توپ سلیم خان کے ہاتھ لگی جو اس نے مہاراجہ کشمیر کو چیروٹ کے عوض واپس دے

دی۔ غضنفر خان نے ۱۸۶۳ع میں وفات پائی۔ اس کے پانچ بیٹوں میں جانشینی کے لیے جنگ ہوئی جس میں میر غزان خان کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے دوسرے بھائیوں کو قتل یا جلاوطن کر دیا۔ غضنفر کی کئی بیویاں تھیں جن سے چھ لڑکے اور بہت سی لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک بیٹے صفدر علی نے محمد دارا بیگ وزیر سے مل کر ۱۸۸۶ع میں اس کو قتل کر ڈالا اور علی الترتیب حکومت اور وزارت کے منصب سنبھالے۔ صفدر علی نے تخت نشین ہوتے ہی بارہ محصولات معاف کر دئیے۔ چونکہ یہ قدم اس نے اپنے وزیر دارا بیگ عرف داروکی ایما پر کیا تھا اس لیے یہ وزیر بہت سخی مشہور ہوا۔

۱۸۸۹ع میں ایک روسی نمائندہ جس کا نام طورم گرامچی تھا ہنزہ آیا اور صفدر علی سے روسی حکومت کی تابعداری اور خیر سگالی کی گفت و شنید کی، مگر ناکام رہا۔ البتہ اسی سال کرنل ڈیورنڈ برٹش ایجنٹ گلگت بھی ہنزہ و نگر آیا اور اُس نے میر آف ہنزہ سے برطانیہ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا وعدہ لے لیا اور دسمبر کے مہینے میں گلگت میں منعقد ہونے والے سالانہ جلسہ میں سرکت کی دعوت دی، جہاں میر ہنزہ اور دوسرے عہدیداروں کے سالانہ وظائف مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۱ع میں نگر کے میر آذر خان اور میر صفدر علی نے مل کر غوری تھم خان اور ودیگ ملک پسران راجہ ظافر خان کو قتل کر ڈالا۔ تھم خان چونکہ مہاراجہ کشمیر کا خیر خواہ تھا اس لیے وہ اس کے قتل سے ناراض ہوا۔ دوسرے معاہدے کے مطابق جب برٹش ایجنٹ گلگت نے سر جارج میکانٹنی جنرل کونسل مقیم کاشغر کے نام خط براہِ ہنزہ بھیجا تو میرِ ہنزہ نے جانے نہ دیا اور اُسے واپس کر دیا جس پر مہاراجہ کشمیر کی فوجیں ہنزہ پر حملہ آور ہوئیں۔ ٹھول کے مقام پر ہنزہ اور نگر کی متحدہ فوجوں نے ان کا مقابلہ کیا آخر ۱۹ دن کی جنگ کے بعد پسپا ہونے پر مجبور ہوگئیں اور مہاراجہ کشمیر کی افواج ڈاکٹر رابرٹسن ومیز سمتھ کی سرپرستی میں دسمبر ۱۸۹۱ع میں ریاست نگر میں داخل ہوئیں۔ لیکن صفدر علی اور آذر خان درۂ منتکہ پار کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ کپتان اسٹوارٹ بحیثیت اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ہنزہ بمقام نبال باغ اقامت پذیر ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد سوائے چند سپاہیوں کے تمام افواج واپس چلی گئیں۔ ہنزہ کی نمائندگی محمد رضا بیگ اور نگر کی سکندر خان کرتے تھے۔ دو ماہ کے بعد یہ نمائندے راجہ پونیال سمیت جس نے اس لڑائی میں ہنزہ اور نگر کا ساتھ دیا تھا کلکتہ میں وائسرائے ہند سے ملے۔ حسب مراتب پہلے محمد رضا بیگ پھر سکندر خان اور اس کے بعد محمد اکبر خان کی ملاقات ہوئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی خواہش کے مطابق کہ ہنزہ و نگر کے راجگان کو واپس بلایا جائے، کرنیل ڈیورنڈ برٹش ایجنٹ گلگت نے میر صفدر علی خان اور آذر خان سے خط و کتابت کی مگر میر صغیر علی خان

واپس آنے پر رضامند نہ ہوا ، بلکہ روس اور چین کی حکومتوں سے مدد حاصل کرنے میں کوشاں رہا ۔ البتہ آذرخان اپنے تمام رفقا کے ساتھ مہاراجہ کشمیر کے پاس آ گیا جہاں مہاراجہ نے ان کے گزارے کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا ۔

اس صورت حال کے پیش نظر صفدر علی نے اپنے سوتیلے بھائی محمد نظیم خان کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے ہنزہ بھیجا ، جسے ہمایوں بیگ نے وہیں روک لیا اور ان کے اہل و عیال کو بھی یہیں لے آیا ۔ صفدر علی کو چینی حکومت نے یارقند میں ہمیشہ کے لیے نظر بند کر دیا ۔

۱۴ اپریل ۱۸۹۲ء کو گلگت کے سالانہ جلسہ میں محمد نظیم خان کو موروثی میرِ ہنزہ اور ہمایوں بیگ کو موروثی وزیرِ ہنزہ تسلیم کیا گیا ۔ اسی طرح راجہ ظافر خان عرف ظافر کو میرِ نگر تسلیم کیا گیا لیکن ظافر کے مفلوج ہونے کی وجہ سے اس کے لڑکے سکندر خان کو سربراہ بنایا گیا ۔ مہاراجہ کشمیر کی طرف سے ان کو سندیں عطا کی گئیں اور وائسرائے ہند کی منظوری سے ان کو بالکل خود مختار ریاستوں کا درجہ دے دیا گیا ۔ محمد نظیم خان کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا اور اس کے بعد اس کا لڑکا محمد غزن خان جانشین ہوا ۔ ۱۹۴۵ء میں کثرت شراب نوشی کی وجہ سے محمد غزن خان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ انتقال کر گیا اور اس کے بڑے فرزند محمد جمال خان جانشین مقرر ہوئے ۔ برصغیر کی تقسیم پر انگریزوں نے گلگت ایجنسی کے وہ علاقے جو ساٹھ سال کے اجارہ پر حاصل کیے تھے ، مہاراجہ کشمیر کے حوالے کر دئیے ۔ چنانچہ مہاراجہ کشمیر کی طرف سے بریگیڈیر گھنسارا سنگھ بحیثیت گورنر صوبۂ گلگت بذریعہ ہوائی جہاز گلگت میں اترا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ۔ لیکن ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو کمانڈانٹ گلگت سکاؤٹس ، میجر براؤن اور ماتحت افسروں نے گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر لیا اور گلگت کا الحاق پاکستان سے ہو گیا ۔ جلد ہی حکومتِ پاکستان کا نمائندہ سردار عالم خان بحیثیت پولیٹیکل ایجنٹ گلگت پہنچ گیا اور اس نے انتظامیہ کو سنبھال لیا ۔ والیان ہنزہ نے بھی پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا ۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۸ء میں جناب لیاقت علی خان کی دعوت پر والیانِ ہنزہ و نگر اور گورنر پونیال گلگت سے کراچی پہنچے ، جہاں ان کے سابقہ حقوق اور مراعات کے تحفظ کا یقین دلایا گیا ۔

میر محمد جمال والئی ریاست ہنزہ حلیم الطبع ، محنتی اور مخلص انسان ہیں ۔ وہ اپنے مذہبی پیشوا اور حکومتِ پاکستان کے تعاون سے ریاست کے عوام کے لیے روزگار کے مواقع ، تعلیمی سہولتیں اور نقل و حمل کے ذرائع کو وسعت دینے میں کوشاں ہیں ۔ حکومتِ پاکستان نے انہی خدمات کے اعتراف میں ان کو ہلالِ پاکستان کے خطاب سے نوازا ہے ۔

(ب) معاشرتی اور تہذیبی پس منظر: ریاست ہنزہ کے باشندے مختلف قبیلوں کی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مختلف اوقات میں دور و نزدیک سے آ کر یہاں آباد ہوتے رہے۔ ان میں تاتاری مغول ، تاتاری ہن ، بلتستانی بلتی ، وخانی وخی اور قندوزی ، بدخشانی ، کرغز ، داربل ، تانگیر کی شین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بروشسکی زبان بولنے کی وجہ سے سب بروشو (Burusho) کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ محنتی ، جفاکش اور دیانت دار ہوتے ہیں اور اپنے نسلی امتیاز کی بجائے پیشے اور طبقاتی تقسیم کے اعتبار سے پہچانے جاتے ہیں۔

طبقاتی تقسیم : حکمران طبقہ وہ ہے جو موجودہ حکمران میر محمد جمال خان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خاندان تقریباً پانچ سو سال سے ہنزہ پر حکمران چلا آتا ہے۔ امیر کا چناؤ ہمیشہ اسی خاندان سے ہوتا ہے۔

دوسرا طبقہ وزراء کا ہے جو موجودہ وزیر سعد اللہ بیگ تاتاری مغل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ ہنزہ کے بانیوں میں سے ہیں اور حکمرانِ ہنزہ سے قبل حکمرانِ گلگت کے عہد میں یہاں کی نیابت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ ہنزہ کے رئیس مانے جاتے تھے۔ موجودہ حکمران طبقے کے ابتدائے اقتدار ہی سے یہ خاندان موروثی طور پر وزارت کے منصب پر فائز چلا آتا ہے۔

تیسرا طبقہ اکابرین ملک کہلاتا ہے۔ یہ اکابرین ریاست کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں مشورے دیتے ہیں اور متعدد خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی لوگ لڑائی کے موقع پر عہدے داروں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ بروشسکی میں اس طبقے کو کرپاتنگ (Kurpating) کہتے ہیں۔

چوتھا طبقہ بار (Bar) کہلاتا تھا۔ انہیں مدت سے عسکری فرائض سونپے گئے تھے۔ اس کا کام قدیم زمانے میں لداخ اور ہمسایہ ملکوں کے راستوں کو لوٹ مار سے محفوظ رکھنے والے سپاہیوں کا تھا۔ راستے محفوظ ہو جانے کے بعد اس طبقے کی ضرورت نہیں رہی۔

پانچواں طبقہ سدرشو (Sadarsho) کہلاتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ سپاہ گری کی خدمت کے علاوہ حکمران طبقے کے لوگوں کی کار بیگاری ، جسے یہ لوگ رجاکی (Rajaki) کہتے ہیں ، بھی کرتے تھے ، جو اب قریباً ختم ہو گئی ہے۔

چھٹا طبقہ باربرداروں پر مشتمل تھا۔ ان کا کام بوجھ اٹھانا ، طلا کشی کرنا اور بڑے زمینداروں کی خدمت بجا لانا تھا۔ حکمرانوں کے کھیتوں کی رہنمائی کرنے کے علاوہ اکابرین ملک کی بھی رہنمائی ان کے ذمے تھی۔ ہر ایک کبیر کے لئے ایک دو دہقان آئینی طور پر مقرر ہوتے تھے اور ان کی اجرت مقرر تھی۔ میر محمد غزان خان ثانی(۱۹۳۸ء—۱۹۴۵ء)

کے دور اقتدار میں اس قانون کو ختم کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ اس رسم کا رواج ختم ہونے لگا ، حتیٰ کہ موجودہ میر صاحب کے عہد میں بالکل مفقود ہو گیا -

ساتویں طبقہ میں ایسے مجرم مرد اور عورتیں آتی تھیں جن کو ناقابلِ معافی جرم کی پاداش میں قید کی سزا دی جاتی - ان کو غلام تصور کیا جاتا تھا اور یہ لوگ تھانگم (Thangum) کہلاتے - ان سے شاہی قلعہ میں آب کشی ، جاروب کشی ، ہیزم کشی اور ڈاؤ تائی کی خدمات لی جاتیں - انگریزی تسلط کی ابتدا سے اس رواج کا انسداد ہونے لگا اور آخر میر عزاں خان کے زمانے میں یہ رواج مکمل طور پر نابود ہو گیا -

آٹھویں طبقے میں ہنر مند لوگ آتے ہیں - ان کو بروشسکی میں بریچو (Bricho) کہا جاتا ہے - یہ بھی ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے ان میں کوئی بلتی ہے ، تو کوئی وخانی اور کوئی شین نسل سے ہے - البتہ یہ لوگ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہیں - قدیم زمانے میں طبقاتی طور پر سب سے نچلے درجے میں آتے تھے اس لئے کہ یہ لوگ مروّجہ اصولوں کے مطابق حلال و حرام کے تصور کا احترام نہیں کرتے تھے اور بیویوں کو بلا مہر و طلاق رکھ لیتے اور چھوڑ دیتے تھے - اب یہ لوگ اسے روحانی پیشوا حاضر امام کی پیروی کی بدولت مومن کہلاتے ہیں اور ان کے گاؤں کو بریشل (Berishal) یعنی مومن آباد کہا جاتا ہے -

ہنزہ میں بھی دوسری اقوام کی طرح مختلف تہذیبی اثرات پائے جاتے ہیں - ان میں ترکستانی ، چینی ، روسی ، بدخشانی اور تاجی تہذیبوں اور شین اقوام کے اثرات کا سراغ ملتا ہے - ہنزہ کے قدیم باشندوں کے لباس کا پتہ نہیں چل سکا ، البتہ چار پانچ سو سال پہلے سے یہ لوگ شقہ اور پاپوش پہنے آ رہے ہیں - ابتدا میں شقہ کی آستین اتنی لمبی نہیں ہوتی تھی - کُرتا نہیں پہنا جاتا تھا بلکہ شقہ کے اوپر اون یا بالوں کا کمر بند باندھ لیا جاتا - مردوں کے پاجامے کھلے ہوتے - عورتیں لمبے اونی کرتے پہنتیں - مرد اور عورت دونوں سر پر لمبے بال رکھتے - دونوں ایک ہی قسم کی بے ڈول ٹوپی پہنتے - میر محمد نظیم خان (۱۸۹۲ع — ۱۹۳۸ع) کے عہد تک اس قسم کی ٹوپیاں بوڑھی عورتیں پہنا کرتی تھیں - مذہبی اثرات کے زیر اثر جسم کی مکمل ستر پوشی کے لئے گلے اور آستینوں والا کُرتا پہنا جانے لگا جسے خراسانی یا درویشانہ کُرتا کہا جاتا تھا - ترکستانی اور بدخشانی تہذیبوں کے اثر سے چپن اور پوستین بھی استعمال ہونے لگا - حکمران اور امراء کا طبقہ پوستین جسے اچھوک کہتے استعمال کرتا -

کھانے کے برتن چوبیں ہوتے - چھوٹے چھوٹے چمچ اور بڑے بڑے ظروف بھی بید کے درخت کی لکڑی سے بنائے جاتے - پھر انگریزوں کی آمد سے رفتہ رفتہ پیتل اور لوہے کے برتن

استعمال میں آ گئے البتہ چینی کے برتن بہت کم استعمال کئے جاتے۔

ہنزہ میں ایک نرم قسم کا پتھر پایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگ اس سے دیگ اور دیگچے بناتے، جن کو بلوش (Balosh) کہا جاتا۔ ان میں انگور کی شراب بھی رکھی جاتی تھی۔ قدیم زمانے میں یہ دیگچے ترکستان، بدخشان اور اندجان سے یہاں آتے جو 'چیدن' اور 'چاتے جوش' بھی کہلاتے۔ پھر کشمیر سے پیتل کے چھوٹے بڑے دیگچے اور سماوار بھی آنے لگے۔

انگریزوں کی آمد تک آلات کشا ورزی بھی سب کے سب چوبیں تھے۔ ہل، بال، پھل اور بیلچے خوبانی کی لکڑی سے تیار کئے جاتے۔ کدال یا کلینک کے لیے مارخور کے سینگ سے کام لیا جاتا۔ جبل اور مار توڑ نے انگریزوں کی آمد کے بعد رواج پایا۔ بالٹی اور لوٹے کا کام سخت و نرم کدو سے لیا جاتا۔ بید کے درخت کی چھوٹی چھوٹی شاخوں سے ٹوکریاں بناتے جن میں بھوسہ، مٹی، پتھر اور کھاد وغیرہ رکھی جاتی۔ اس کے علاوہ ایسی ٹوکریاں بھی بنائی جاتیں جن میں سوکھی خوبانیاں رکھتے۔ ان کو غوٹول (Gutul) اور کھر (Khur) کہا جاتا تھا۔

ان لوگوں کے مجلسی آداب قدیم مشرقی اطوار پر مبنی ہیں۔ عمر اور رتبہ کے لحاظ سے بڑوں کو منکسرانہ طریقے سے آداب کہتے، ہاتھ پیر چومتے اور ایک دوسرے کو آگے بٹھاتے اور طعام و نوش کی پیش کش کرتے ہیں۔ سوار اتر کر آداب بجا لاتے ہیں۔ دوسری اقوام کی طرح قدیم زمانے میں ان کے کھانے بھی مختصر ہوتے۔ بود و باش، لباس اور کھانوں میں تکلّف انگریزوں کے اثر سے آیا۔ غریب طبقہ کی خوراک ترمبہ یعنی برو (Baru) اور میٹھی یعنی شکر کس (Sikar Kuts) اور سوکھی خوبانیوں کے پانی یعنی چھموس (Chamus) اور بیوٹھسل (Bayutshil) یعنی مٹی سے مقطر کئے ہوئے نمکین پانی اور سوکھی ترکاریوں مثلاً کدو، گاجر، کرم وغیرہ پر مشتمل ہے۔ آلو انگریزوں کی آمد کے ساتھ بوئے جانے لگے۔

ہنزہ کے باشندے قدیم الایام سے زراعت پیشہ ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ ڈھلوان ہے، اس لئے جہاں ممکن ہو سکتا ہے دیواریں بنا کر زمین کو ہموار کر لیتے ہیں اور گیہوں، جو اور ترمبہ کاشت کرتے ہیں۔ ناہموار زمین پر پھل دار درخت لگا دیتے ہیں۔ یہاں سیب انگور، آڑو، ناشپاتی اور توت کے پھل پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے قطعات سے مویشیوں کے لیے چراگاہوں کا کام لیا جاتا ہے۔ ہر زمیندار مویشی ضرور رکھتا ہے۔ مویشیوں میں گائے، بیل، بھیڑ، بکری، گدھا اور سواری کے لیے گھوڑا، باربرداری کے لئے اونٹ اور خچر عہد قدیم سے پائے جاتے ہیں۔

ہنرمندوں میں اُونی پٹیاں بنانے اور پلاس بننے والے جولاہے عہد قدیم سے موجود ہیں۔ البتہ جدید ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں لوہار، بڑھئی اور سنار بھی ہنر مند پیشہ وروں میں شامل ہو گئے ہیں۔

عسکری نظام : یہاں عہد قدیم میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی (جیسا کہ قدیم زمانے میں ہوتا تھا) قبیلوں کے سرداروں کی قیادت میں لسکری جمع رہتے، جن کو دشمن کی مدافعت کے لیے تیار کیا جاتا۔ ان کی تربیت کے دو مقام تھے، ایک حکمرانوں کا دربار اور دوسرا تجربہ کار "معمروں کی مجلس سمہیہ"، جہاں آزمودہ کار بہادر جمع ہوتے اور ان کو فن سپہ گری کے طریقے سکھاتے۔

دفاعی امور میں اعلیٰ طبقوں کے افراد کے ذمے ہوتے۔ ان میں دوسرے طبقے کے لوگ سامان جنگ کی نقل و حمل پر مامور تھے۔ دشمن کا پتہ لگانے اور خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے لسکر کے آگے ایک دو افراد روانہ کئے جاتے۔ یہ لوگ آٹھویں طبقہ سے تعلق رکھتے۔ سپہ سالار کو سردار کے لقب سے مخاطب کیا جاتا۔ سردار ہمیشہ حکمران خاندان کا کوئی فرد ہوتا جو یا تو وزیر یا اس کا بیٹا ہی ہوتا۔ لسکریوں کے لیے کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی۔ لڑائی کے اختتام پر انہیں مال غنیمت سے حصہ دیا جاتا۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر تمام افراد میں تقسیم کر دیا جاتا۔ غلام بنانے کی یہ رسم میر نظم خاں کے عہد (١٨٩٢ء-١٩٣٨ء) میں ختم کر دی گئی۔ نمایاں بہادری دکھانے والوں کو ہتھیاروں مثلاً گھوڑا، تلوار یا بندوق اور زمین کی صورت میں انعامات دیئے جاتے۔ اگر کوئی ادنیٰ طبقہ کا فرد جوانمردی کا اساری جوہر دکھاتا تو اسے بالائی طبقے میں شامل کر لیا جاتا تھا۔

طرز حکومت اور اعیان ملک : پچھلے چھ سو سالوں سے ایک ہی خاندان ہنزہ پر حکمران چلا آ رہا ہے۔ میر کا انتخاب اسی خاندان سے ہوتا ہے۔ اگرچہ میر کو شخصی حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہیں لیکن پھر بھی یہاں ہمیشہ سے پنچائتی نظام رائج رہا ہے۔ پنچائت کے ارکان دیہوں کے مختلف قبیلوں سے لیے جاتے ہیں جنہیں بروشسکی میں اویم (Uyum) کہتے ہیں۔ سربیچ کے لیے لذا کو (Kadako) کا نام رائج ہے۔ یہ ارکان اکابرین ملک، جن کا کام لوگوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حکومت کو مشورے دینا ہے، سے لیے جاتے ہیں۔

وزیر کے بعد ایک عہدہ نائب وزیر کا ہوتا ہے، جسے 'برنگفہ' کہتے ہیں، (برنگفہ در اصل برنکیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنی آدھا کے ہوتے ہیں) یہ وزیر ہنزہ کے طبقہ دوم اور سوم جو علی الترتیب موجودہ وزیر سعد اللہ بیگ کے خاندان کے افراد اور اکابرین ملک پر مشتمل ہیں، سے لیا جاتا ہے۔ اسے نائب وزیر ہی سمجھنا چاہئیے۔

چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کا تصفیہ برادری کی سطح پر ہی کر لیا جاتا ہے۔ لیکن فریقین میں سے اگر کوئی مطمئن نہ ہو تو معاملہ گاؤں کی پنچائت کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اگر فیصلہ تسلی بخش نہ ہوا ہو تو پھر 'ترنگفہ' یعنی آدھے وزیر کے پاس مقدمہ لے جایا جاتا ہے اور اگر یہ وزیر بھی فریقین کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے تو پھر وزیر اور اس کے بعد میرِ ہنزہ کے پاس مقدمہ پیش کیا جاتا ہے۔ میر اعیان و اکابرین کی موجودگی میں بیانات سننے کے بعد ان سے مشورہ لیتے ہیں اور پھر فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں، جو حتمی ہوتا ہے۔ فیصلہ کرنے میں التوا سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ ایک سطح پر ایک ہی پیشی پر فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔ جس کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے اسے نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ نذرانہ طبقاتی بنیاد پر مقرر کیا جاتا ہے۔ سب سے ادنیٰ طبقہ بار برداروں کا ہے، جسے کاربو (Carbu) کہتے ہیں۔ نذرانہ ایک سیر گھی سے لے کر ایک بھیڑ تک مقرر ہے۔

ملک کے دوسرے عہدے یا مناصب: ریاست ہنزہ میں عہد قدیم سے مندرجہ بالا عہدے پائے جاتے ہیں :—

۱۔ **فراش معروف بہ فراج** : یہ عہدہ مشیر مالیات کا ہے۔ اس کے ذمے مالیہ اور محصولات کا حساب رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ حکمران خاندان کے خورد و نوش کا انتظام کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ پرانے زمانے میں اس عہدے کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن میر سلم خان ثانی (۱۷۹۰ء—۱۸۲۴ء) کے زمانے میں جب امین اور اس کے بعد اس کے بیٹے سگی خان نے اپنی قابلیت سے اس کام کو خوش اسلوبی سے سر انجام دیا تو اس عہدے کو توقیر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ میر محمد نظیم خان کے عہد میں اس عہدے کے فرائض میں رد و بدل کیا گیا۔

۲۔ **یرقہ** : اس کا کام شاہی اراضی پر کام کرنے والے افراد کی نگرانی کرنا تھا۔ اراضی کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور ہر حصے پر ایک یرقہ نگران مقرر کر دیا جاتا۔ نگرانی کے علاوہ یرقہ کے ذمے ہر قسم کا اناج فراہم کرنا بھی ہوتا۔ تمام شاہی مویشیوں کی دیکھ بھال بھی یہی کرتا۔ میر محمد نظم کے عہد میں تمام اراضی کاشتکاروں کو لگان پر دے دی گئی تو یہ عہدہ ختم ہو گیا۔

۳۔ **دیوان بیگی** : قدیم ایام میں لداخ کے راستے یارقند اور کشمیر کے درمیان سفر کرنے والوں کو لوٹ لیا جاتا۔ لوٹ کے اس مال کی بڑتال اور دیکھ بھال کرنے والوں کو دیوان بیگی کہا جاتا تھا۔ چونکہ لوٹ مار کو جائز سمجھنے اور ناجائز طور پر دوسروں کے مال و دولت پر قبضہ کر لینے کا زمانہ گزر چکا ہے اس لیے اب یہ عہدہ باقی نہیں رہا۔

۴- **وکیل :** یہ عہدے دار مہاراجہ جموں و کشمیر سے سالانہ زرِ سوغات کے عوض تحائف لایا کرتا تھا۔ میر ہنزہ مہاراجہ جموں و کشمیر کو دوستی کی علامت کے طور پر سالانہ زر پیش کیا کرتا تھا، جسے زرِ سوغات کہا جاتا تھا۔ جب انگریزوں نے گلگت ایجنسی پر اجارہ حاصل کر لیا تو یہ رسم ختم ہو گئی جس کے ساتھ ہی یہ عہدہ بھی ختم کر دیا گیا۔

۵- **ایلچی :** قدیم زمانے میں جب موجودہ حکمران کے مورثِ اعلیٰ نے خاقانِ چین سے رابطہ پیدا کیا تو یارقند اور کاسغر کے دوطے (گورنر) سے سالانہ زرِ سوغات کے عوض مقررہ تحائف لانے والے کو ایلچی کہا جاتا تھا۔ یہ عہدہ اربابِ گوجال کے لئے مخصوص تھا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ عہدہ ختم کر دیا گیا۔

۶- **ٹیلپانچی :** ایلچی کی طرح یہ لفظ بھی ترکی ہے۔ اسے سالانہ محصول وصول کرنے والے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا کام ہر سال سرنھول جا کر ٹلاف نشینوں سے معروہ تحائف مثلاً نمدہ، بحنہ اور جبل و اسپ وصول کر کے ہنزہ لانا تھا۔ انگریزوں کے آخری ایام میں یہ عہدہ ختم کیا گیا۔

۷- **پیپا** (Pipa) **:** یہ عہدے دار اوسط طبقہ کے لوگوں میں سے لیا جاتا۔ اس کے ذمے ریاست کے ادنیٰ لوگوں سے کوئلہ جمع کروانا، پتھروں سے سیسہ نکلوانا، زمین سے گندھک حاصل کرنا اور پھر اس سے بارود تیار کروانا تھا۔ لڑائی کے وقت گولہ بارود مہیا کرنا بھی اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ یہ عہدہ بھی اب مفقود ہو چکا ہے۔

۸- **محرم :** میرانِ ہنزہ کے دربار میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کام میر ہنزہ کے پیغامات دوسرے عہدیداراں تک پہنچانا یا پھر فریادی و طلبگار کی میر تک راہنمائی کرنا ہے۔ یہ اصحاب محرم کہلاتے ہیں۔

۹- **بساول :** یہ ترکی نام ہے اور ہنزہ میں دربار میں کھانا تقسیم کرنے والے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۰- **غول چیں یا گل چیں :** ان کی ذمہ داری شاہی محل کے افراد کے لیے الگ الگ کھانا تیار کروانے کی ہے۔

۱۱- **اسیری :** حکمران طبقہ کے دورانِ سفر خصوصاً دورۂ گوجال کے وقت کھانے تیار کروانا اس کا کام ہے۔

۱۲- **میر شکار :** اس کی اب ضرورت نہیں رہی۔ میر غضنفر خان کے زمانے میں باز پالنے کا دستور قائم کیا گیا تھا جو میر نظیم خان کے عہد تک جاری رہا۔

باز رانی کے لیے آموختہ اصحاب کو مقرر کیا جاتا تھا ۔ اس زمانے میں اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ۔

۱۳۔ **شبانی :** چراگاہوں کی حفاظت کے علاوہ میر صاحب کے محل پر ذبح کیے جانے والے جانوروں کی حفاظت کے لیے دو آدمی مقرر ہوتے ہیں ، ان کو ذبح کیے ہوئے جانوروں کی اوجڑی معاوضے کے طور پر دی جاتی ہے ۔

۱۴۔ **آلات حرب :** قدیم زمانے میں تیر و کمان استعمال ہوتا تھا ۔ بعد میں ڈھال تلوار اور فتیلہ دار بندوقیں بھی پائی جانے لگیں۔ ڈھال اور تلواریں اکثر ترکستان اور بدخشاں سے آتی تھیں۔ پھر سکھوں کے قتل و غارت کے بعد گجراتی ساخت کی تلواریں ہنزہ میں عام ہو گئیں۔ فتیلے والی بندوقیں ، ختن ، توقند ، تاسقند ، کاشغر اور یارقند سے آتی تھیں۔

چھوٹی توپ جسے زنبور کہا جاتا تھا ، سریقول کے الف بیگ نے اپنے بھانجے سلیم خان عرف باپو کی ولادت پر میر غزانخان کو تحفتاً بھیجی تھی جو میر غزانخان اول کے زمانے میں بدخشاں سے آدمینہ نامی کاریگر کو بلوا کر ہنزہ میں تیار کروائی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہنزہ میں موجود سونے کے تمام ظروف اور عورتوں کے زیورات کے عوض یہ ایک توپ بنی تھی جسے مہاراجہ ، ہنزہ پر قبضہ کے بعد گلگت لے گیا ۔ یہ توپ اب بھی گلگت ایجنسی باغ میں محفوظ ہے ۔

۱۸۷۳ء میں کپتان بڈلف نے میر غزانخان کو ایک چھرہ دار بندوق تحفہ کے طور پر دی جو اس نے ہمایوں بیگ کو انعام میں دے دی ۔ صفدر علی کے زمانہ میں چند دنبالہ پُر بندوقیں روس سے ہنزہ کو ملی تھیں ۔

رسم و رواج : ہنزہ میں زمانہ قدیم سے مختلف مواقع اور تقاریب کے سلسلے میں جو رسم و رواج پائے جاتے ہیں ان سے یہاں کی تہذیب کی مکمل عکاسی ہوتی ہے ۔ یہ رسم و رواج مندرجہ ذیل ہیں :—

۱۔ **ولادت :** جب کسی کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کے پڑوس اور برادری کے مرد اس کے مکان کی چھت پر جمع ہو کر اپنی اپنی بندوقیں فضا میں چھوڑتے ہیں ۔ مبارکبادی اور خوشی کے اظہار کا یہ ایک طریقہ ہے ۔ عورتیں الگ طور پر مبارک دینے آتی ہیں ۔ زچہ کے والدین زچہ اور نومولود کے لیے مقررہ کپڑے لے کر آتے ہیں ۔ جب لڑکا ایک مہینہ یا چالیس دن کا ہو جاتا ہے تو پھر لڑکی کے والدین اپنی برادری

کے ساتھ کھانے ، تحائف ، کچھ گیہوں اور گھی لے کر لڑکے والوں کے ہاں آتے ہیں۔
لڑکی کی پیدائش پر بندوقیں نہیں چلائی جاتیں ، البتہ باقی رسوم اسی طرح ادا ہوتی ہیں ۔

ایک ہفتہ کے بعد بچے کو گہوارہ میں لٹایا جاتا ہے اور اسی دن اس کا نام بھی رکھا جاتا ہے۔ گہوارہ میں لٹانے کی رسم میر غزانخان کے دور میں شروع ہوئی۔ اس کا آغاز اس کے وزیر اسد اللہ بیگ نے اپنے نواسہ شکر اللہ بیگ کی ولادت سے کیا۔

۲۔ شادی : قدیم زمانے میں شادیوں کے لیے دن مخصوص تھے۔ سال کے اختتام پر ماہ جدی (ایرانی سال کا مہینہ) کے آخری دنوں یعنی دسمبر کی پندرہ سے بیس تک کی تاریخوں میں سارے ملک میں شادیاں کرنے کا دستور تھا۔ اس وقت اپنے قبیلے میں شادی کرنا مکروہ سمجھا جاتا تھا اس لیے ممنوع بھی تھا۔ اب دستور بدل چکا ہے۔ لوگ آپس میں شادیاں کرتے ہیں اور اس کی ممانعت بھی نہیں رہی۔

جب کوئی شخص کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کسی عزیز کے ذریعہ اس کے والدین سے رشتے کے لیے گفت و شنید ہوتی ہے۔ منظوری کے بعد ایک دن دعا خوانی کی جاتی ہے اور اس دن لڑکے کے والدین کی طرف سے لڑکی کے لیے کچھ کپڑے بھیجے جاتے ہیں۔ پھر شادیوں کے لیے مخصوص دنوں میں شادی کرنا قرار پاتا ہے۔

شادی کے روز دلہا کو نہلا کر پگڑی اور سہرا باندھتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار یا کلہاڑی جیسا اوزار جسے گانگ فری (Gangfuri) کہا جاتا ہے دیتے ہیں۔ اس کے بعد مہمانوں کی روٹی ، گوشت اور دیسی نمکین خلوا جسے شربت کہتے ہیں ، سے تواضع کی جاتی ہے۔ ولیمہ میں انگور کی شراب بھی پیش کی جاتی ہے ، پھر دولہا کو ناچ کی محفل کے لیے مجلس دربار میں پہنچاتے ہیں۔ راستے میں حاکموں ، اپنے بزرگوں اور دوسرے بہادروں کے گیت گائے جاتے ہیں۔ دربار میں دولہا سب براتیوں سے الگ ناچتا ہے۔ سورج چھپتے ہی بارات دلہن کے گھر روانہ ہو جاتی ہے۔ برات میں ٦ سے ١٢ افراد تک شامل ہو سکتے ہیں اور دلہن کے گھر ٩ سے ١٦ آدمی مدعو کیے جا سکتے ہیں۔ نکاح کے دوسرے روز دلہن روٹی بنانے اور دولہا بکانے کی رسم ادا کرتے ہیں۔

نکاح کے وقت حق مہر ضرور مقرر ہوتا ہے مگر اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکے کو دو بھیڑیں بطور محصول دینی پڑتی ہیں۔ ایک میر صاحب اور دوسری وزیر ترنگفہ کو۔ لڑکی کو دو ایک سیر گھی یا اپنا سقہ دینا پڑتا ہے۔ دلہن کا یہ شقہ ریاست کے قیدیوں یا غلاموں کو دیا جاتا ہے۔ موجودہ میر صاحب نے یہ محصولات لینے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ البتہ مہر کی رقم ان کے امام حاضر کے ارشاد کے مطابق بڑھا دی گئی ہے۔

۳- **موت کی رسمیں :** عام رواج کے مطابق پڑوسی اور برادری کے لوگ مرنے والے کے گھر جمع ہوتے ہیں۔ مرد خاموش رہ کر ان کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں، البتہ عورتیں مرثیہ خوانی کے ساتھ ماتم کرتی ہیں۔ قبر کے چاروں طرف مضبوط دیواریں بناتے ہیں۔ ان کے اوپر پتھروں کی سلیں رکھ دیتے ہیں۔ پائنتی کا رخ کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ میت کو اسی راستے سے قبر میں اتارتے ہیں اور پھر اس کو بھی بند کر دیتے ہیں۔ جنازے کے ساتھ مرد صلواۃ پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ نماز جنازہ کے بعد میت کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ قریبی رشتہ دار اور احباب متوفّی کے ورثا کے ساتھ واپس ان کے گھر آتے ہیں۔ جہاں قرآن خوانی کے بعد برادری کی طرف سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔ متوفّی کے گھر تین دن تک کھانا نہیں پکتا، بلکہ عزیز و اقارب کے ہاں سے آتا ہے۔ تیسرے روز قبر کے تعویذ پر لپائی کی جاتی ہے اور تحمید و تمجید کے ساتھ صلواۃ پڑھتے ہوئے ایک چراغ جلایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے چراغ کے نام سے ایک جانور ذبح کیا جاتا ہے۔

سات روز تک، دور و نزدیک سے اپنے اور بیگانے سبھی ماتم پرسی کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ساتویں روز غم دفعی کے لیے کچھ نیاز بانٹی جاتی ہے۔

قدیم زمانے میں میت کے تیسرے روز بہت زیادہ خرچ کیا جاتا اور ساتویں دن گائے یا بیل کو ذبح کرکے خیرات کے طور پر کھانا کھلایا جاتا۔ بعض متموّل لوگ ساتویں یا چالیسویں دن متوفّی کے نام پر مسجد، مینار یا کنواں تعمیر کرواتے اور خیرات کے نام پر ضیافت بھی کرتے۔ اب یہ رسمیں بہت حد تک مختصر ہو گئی ہیں۔

تہوار : ریاست ہنزہ کے لوگ بہت سے تہوار مناتے ہیں۔ خالص اسلامی تہواروں مثلاً عیدین، شب برات اور شب قدر کے علاوہ عید غدیر (جو صرف شیعہ فرقہ سے مخصوص ہے) کو چھوڑ کر یہاں صرف ان تہواروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس ریاست کے عوام و خواص سے مخصوص ہیں، جنہیں دیسی تہوار کہا جاتا ہے اور جن سے یہاں کے رہنے والوں کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔

۱- **تھموشلنگ :** ریاست ہنزہ میں ایک نہایت ظالم حکمران گزرا ہے، جسے شری بدت کہتے تھے۔ یہ شخص مالبہ میں انسانی بچوں کو بھی ہتھیا لیا کرتا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے زندہ جلا ڈالا۔ یہ تہوار اسی خوشی کو تازہ کرنے کے لیے ہر سال ماہ جدی میں منایا جاتا ہے۔ اس روز تمام چھوٹے اور بڑے صبح کاذب کے وقت سوکھی لکڑیوں کو آگ لگا کر جسے بروشسکی میں تالینو (Taleno)

کہا جاتا ہے، ہاتھوں میں بھالے قلعہ کے باہر ایک جگہ جمع ہونے لگتے ہیں اور یہاں آ کر برسا کر اس کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ پھر اس ڈھیر کے پاس کھڑے ہو کر ایک گیت گاتے ہیں۔

اس کے بعد میر صاحب کے محل میں ایک پر تکلف دعوت دی جاتی ہے۔ اس دعوت میں موسیقی گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ گیت شینا زبان میں ہوتے ہیں۔ ان گیتوں میں حکمرانوں کے سلسلہ ہائے نسب اور بہادروں کی بہادری بیان کی جاتی ہے۔

ہنزہ کے لوگ موسم سرما میں گوشت کھانے کے لیے ایک جانور پالتے ہیں۔ اس جانور کو بھی اسی روز ذبح کیا جاتا ہے۔ اس جانور کو بروشسکی میں یشایئس (Yushayas) اور شینا میں نسالو (Nasalo) کہا جاتا ہے۔ اس دن لوگ ایک دوسرے کو دعوت پر مدعو کرتے ہیں۔ خصوصاً نو بیاہتا جوڑوں کی دعوتیں کی جاتیں ہیں۔ پرانے زمانے میں حکمران موجودہ وزیر کے گھر مدعو ہونے کو ایک نیک شگون سمجھتے تھے۔ اسی طرح اس دن کسی نیک آدمی کے گھر پر مدعو ہونے کو بھی سال نو کے لیے فالِ نیک خیال کیا جاتا تھا۔

۲-**گروکس :** ماہ جدی کی ۲۱ اور ۲۲ تاریخوں کو منایا جاتا ہے۔ اس دن ان جانوروں کے سری پائے نکالے جاتے ہیں جو موسم سرما کے لیے ذبح کیے جاتے ہیں۔ داماد اور بیٹوں کو دعوت پر بلایا جاتا ہے اور اس دن یہ جاننے کے لیے کہ بکریاں گھابن ہو گئی ہیں یا نہیں ان کے تھنوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔

۳-**بوفو :** بوفو کے معنی ہیں بیج بکھیرنا۔ یہ رسم ماہ دلو کی پندرہ تاریخ یعنی فروری کی ۵ یا ۶ تاریخ کو ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کی ادائگی کے سلسلے میں میر صاحب دو تین روز قبل بلتت سے التت پہنچتے ہیں، جہاں یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ بوفو کی شام التت میں آخری ناچ ہوتا ہے جسے یہاں کی اصطلاح میں آپی تسو اناث (Api Tsho Enat) کہا جاتا ہے۔ یہ ناچ بلتی ناچتے ہیں اور ان ہی سے مختص ہے اور ان کی تہذیبی علامت بھی ہے۔ اسی شام قدیم بانیانِ ہنزہ کے قبیلے کے چند افراد بلتت سے بوفو کی رسم میں شامل ہونے کے لیے التت جاتے ہیں، جہاں دوسرے شعبہ کے لوگ بھی ان کے شریکِ کار بن جاتے ہیں۔ اب میر صاحب کی طرف سے اس رسم کے اخراجات تفویض ہوتے ہیں۔

بوفو کے دن علی الصبح ہنزہ کے وزیر صاحب دوسرے عہدیداروں کی معیّت میں گھوڑے، تیر کمان اور چوگان لیے بلتت سے التت پہنچتے ہیں۔ پھر پولو گراؤنڈ میں گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں اور اس کے بعد یہ لوگ میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں جہاں ان کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد جلوس کی تیاری کی

جاتی ہے ۔ تمام اکابرین و معززینِ ریاست اس مکان میں جہاں بوفو کی رسم ادا کرنے والوں کی مجلس ہوتی ہے ، جمع ہو جاتے ہیں ۔ جب جلوس کا وقت قریب آتا ہے تو میر صاحب شاہی لباس زیب تن کیے تشریف لاتے ہیں ۔ پھر کچھ رسومات ادا کی جاتی ہیں اور بکھیرنے کے لیے جو کا بیج لیے جلوس چل پڑتا ہے ۔ جلوس میں شامل سب لوگوں کے ہاتھوں میں بید کی شاخیں اور ان کے سر پر ٹوپیوں میں سنبل کے پھول لگے ہوتے ہیں ۔ میر صاحب گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ۔ جلوس آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھیت کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے تو میر صاحب گھوڑے پر سے اترتے ہیں ۔ کچھ دور پیدل چلتے ہیں اور پھر ایک جگہ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ یہاں ایک خاص ترتیب کا کھانا تقسیم ہوتا ہے ۔ اس کے بعد لوہار تیروں کے پیکان لاتے ہیں ، دوسرے ہنر مند تیر پیش کرتے ہیں ۔ ایک ہنر مند چوگان اور گیند پیش کرتا ہے ۔ سنار سونے اور چاندی کے بنے ہوئے بین نشان پیش کرتے ہیں ۔ اس رسم کے بعد سب لوگ بیج بکھیرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ بوفو کی رسم کا ضامن رئیس میر صاحب کے ہاتھوں میں بیج ڈالتا ہے اور اس کے اوپر سبز دھاگے سے بندھا ہوا چاول کے دانے کے برابر سونا رکھ دیتا ہے ۔ پھر اس رسم کے شریک ضامن اپنے ہاتھوں میں کچھ بیج لے کر چند مخصوص کلمات ادا کر کے بیج بکھیرنے کا اشارہ کرتے ہیں ۔ پہلے بیج قبلہ رخ پھینکا جاتا ہے ۔ پھر دو بار یہی عمل دہرایا جاتا ہے ۔ دوسری اور تیسری بار علی الترتیب سرخ اور کالے دھاگے میں بندھا ہوا سونا رکھ کر مختلف اطراف میں بیج پھینکا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ایک مقررہ آدمی بیلوں کو ہل میں جوت کر حاضر کر دیتا ہے اور دستور کے مطابق قدیم بانیان ہنزہ کے خاندان کے وارث جو کہ موجودہ وزیر ہیں ، کے ہاتھ میں ہل دے دیتا ہے ۔ وہ ہل چلانے کے بعد میر صاحب کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں ۔ میر صاحب دو ایک مرتبہ ہل چلاتے ہیں اور بیج بونے کی یہ رسم ختم ہو جاتی ہے ۔ اب کھیلیں شروع ہوتی ہیں ۔ لوگ پولو گراؤنڈ میں جمع ہو جاتے ہیں جہاں ایک مقررہ شخص میر صاحب کے ایماء پر گھوڑے پر سوار ہو کر ، ہاتھ میں گیند اور چوگان لیے گراؤنڈ کے ایک سرے تک جاتا ہے اور پھر گھوڑا دوڑاتا گیند پھینکتا ہوا دوسرے سرے تک جاتا ہے ۔ اگر گیند گول کے اندر سے گزر جائے تو اس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ سال نو میں زیادہ تر لڑکے پیدا ہوں گے ورنہ لڑکیاں پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے ۔

اس کے بعد شاہی کھیلیں شروع ہوتی ہیں ۔ سونے چاندی کے زیورات سے سجے ہوئے شاہی گھوڑے میر صاحب کی فرمائش پر باری باری دوڑائے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد تیر اندازی ،

نیزہ بازی ، نشانہ بازی اور آخر میں پولو کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ نشانہ بازی میں جیتنے والوں کو ساروں کے پسں کردہ سونے کے نشانات انعام میں دئیے جاتے ہیں۔ اگر نشانہ بازی میں کوئی بھی کامیاب نہ ہو تو پھر یہ نشانات باجہ بجانے والوں کو دے دئیے جاتے ہیں۔

پولو کا کھیل یہاں کا قدیم کھیل ہے اور پچھلے چند سالوں سے بہت مقبول ہو رہا ہے۔ بوفو کی رسم کے بعد لوگ کھیتی باڑی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس رسم کی ادائیگی سے پہلے کسی کو کانٹا تک کاٹنے تک کی اجازت نہیں ہوتی۔

۴۔ **نو روز:** ہنزہ اور نگر کے لوگ چونکہ اسماعیلی شیعہ ہیں اس لیے وہ حضرت علیؓ کے یومِ امامت کی نسبت سے یکم ماہ حمل کو نو روز کا تہوار مناتے ہیں۔ اس روز میر صاحب تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اکابرین کو خلعت سے نوازتے ہیں اور ایک پُر تکلف دعوت کا اہتمام فرماتے ہیں۔ عوام اس دن 'ہلہ' پکاتے ہیں جسے بچے خوب مزے سے کھاتے ہیں۔ عورتیں باغوں میں جھولے جھولتی ہیں۔ پولو گراؤنڈ میں ناچ ہوتا ہے۔ میر صاحب کے حکم سے ترنگفان اور دوسرے سب عہدیداران اپنے مراتب کی ترتیب سے ناچتے ہیں۔ ناچ کی اس ترتیب کو سب لوگ اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔

حسبِ دستور شاہی گھوڑوں کو باری باری دوڑایا جاتا ہے۔ بندوق بازی، تیر اندازی، نیزہ بازی اور آخر میں پولو کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں کے اختتام پر میر صاحب انعامات تقسیم کرتے ہیں۔

کبھی کبھی نو روز کے دن کاہن کو جسے بروشسکی میں بٹن (Bitan) کہتے ہیں نچایا جاتا۔ یہ کاہن پیش گوئیاں کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں دو مشہور کاہن گزرے ہیں جن کا نام شن کوکور (Shan Kukur) اور ہوکے ماموں (Huke Mamu) ہیں۔ ان کی پیش گوئیاں اب تک مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ میر غزانخان اور صفدر علی کے زمانے میں، بٹن فلاسو، میر محمد نظیم خان کے عہد میں بٹن گلو (Bitan Gulo) اور ایک ہندو عورت، مشہور کاہن ہوئے ہیں۔

۵۔ **شکامٹنگ:** یہ تہوار نو روز کے ایک ماہ بعد جب کہ سارے کھیت سرسبز ہو جاتے ہیں اور درختوں کی شاخوں پر پتیاں پھوٹنے لگتی ہیں تو یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ لوگ گھروں میں دیسی کلچے جنہیں 'کیچی کچالی' (Kechi Kichali) کہا جاتا ہے، بنا کر باغوں میں چلے جاتے ہیں اور وہاں درختوں کے نیچے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔

۶۔ **گنانی:** یہ رسم جو کے کھیت پکنے پر ماہ سرطان کی پندرہ یا بیس تاریخ کو ادا کی جاتی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے سے میر صاحب کے درِ دولت پر باجے بجائے جاتے ہیں۔

مقررہ تاریخ کو لوگ میر صاحب کے قلعہ میں یہ رسم ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ حاضرین کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ولی عہد کشپور مقررہ لوگوں کے ساتھ کھیت سے جَو کے خوشے توڑ کر لاتے ہیں۔ پھر ان خوشوں کو آگ پر جلا کر ان سے دانے نکالے جاتے ہیں اور لسّی میں ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اسے گنانی کہتے ہیں۔

گنانی کھانے کے دوسرے روز ناچ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس میں کاہن کو بھی نچایا جاتا ہے۔ معزّزین کے گھروں سے ایک قسم کی روٹی جسے یہ لوگ بروس شپک (Brouce Shipak) کہتے ہیں، دربار میں لائی جاتی ہے جسے میر صاحب کی طرف سے دی گئی ضیافت میں شامل کیا جاتا ہے۔

گنانی کی رسم ادا کرنے کے بعد لوگوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ جو کی فصل کاٹیں، کھلیان بنائیں اور فصل گھر لے جائیں۔

۷۔ **پیاقمر:** یہ تہوار گنانی کے ایک ہفتہ بعد منایا جاتا ہے۔ پیاقمر دراصل پیغمبر کا بگڑا ہوا لفظ ہے اور اس سے مراد عید میلاد کی تقریب ہے، جو قمری مہینوں سے لاعلمی کی وجہ سے اس دن منائی جاتی ہے جو کہ رسولؐ اللہ کا یوم ولادت نہیں۔ چونکہ اب یہ روایت مستحکم ہو چکی ہے اس لیے اسے بدلہ نہیں گیا۔

۸۔ **دھوم نکھالی:** یہ تہوار موسم خزاں کے اختتام پر اس وقت منایا جاتا تھا جب تمام فصلیں کٹ چکتیں اور اناج لوگوں کے گھروں میں پہنچ جاتا۔ دوسرے تہواروں کے برعکس یہ تہوار گھروں کی چھتوں پر منایا جاتا تھا۔ شام کے وقت تمام لوگ اپنی بندوقیں اور تیر کمان لے کر اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ جاتے اور شام کے اندھیرے میں بندوقیں چلاتے اور تیروں سے آسمان کی طرف آگ کے شعلے پھینکتے۔ دراصل یہ تہوار اس خوشی کا اظہار تھا جو لوگوں کو سال بھر کے لیے اناج جمع کر لینے کے بعد اطمینان کی صورت میں ملتی تھی۔ آج کل یہ تہوار نہیں منایا جاتا۔

تعلیمی حالت: ریاست ہنزہ میں تعلیم کی باقاعدہ ابتداء انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی جب کہ یہاں ایک پرائمری سکول قائم کیا گیا۔ اس سے پہلے ریاست میں تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ البتہ باہر سے آنے والے تعلیم یافتہ لوگ حکمران کی اجازت سے دو ایک افراد کو کچھ لکھنا پڑھنا سکھا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ حکمران خاندانوں کے وہ افراد جن کو وراثت کے جھگڑوں کے نتیجے میں ریاست بدر ہونا پڑتا تھا اور کچھ ایسے لوگ جو تجارت یا دوسرے اسباب کی بناء پر بدخشاں اور بلتستان جاتے

تھے ، وہ وہاں تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لیتے تھے ۔ مگر ریاست میں واپس آنے کے بعد ان لوگوں کو یہاں کسی کو پڑھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی ۔

لیکن جب بیسویں صدی میں اسماعیلی نظامِ زندگی کو منظم طور پر یہاں رائج کر دیا گیا تو اس کی اشاعت کے پیش نظر تعلیمی ضروریات کا احساس بھی پیدا ہوا اور ۱۹۴۶ع میں آغا خان سوم کی ذاتی دلچسپی اور مالی اعانت سے یہاں دو پرائمری سکول ، ''ڈائمنڈ جوبلی سکولز'' اور ایک میر صاحب کی ذاتی کوشش سے بلتت میں بین جماعتوں کا مڈل سکول ''ہز رائل ہائی نس پرنس آغا خان ڈائمنڈ جوبلی مڈل سکول'' کے ناموں سے جاری ہوئے ۔ اسی زمانے میں ہنزہ کے علاوہ جماعتی تحریک کے تحت گلگت ایجنسی کے پولیٹیکل علاقہ جات ، پونیال ، یاسین ، کوہ غذر اور اسلوکن میں بھی سکول کھولے گئے ۔

۱۹۴۷ع میں سنٹرل جماعت خانہ گلگت میں گرد و نواح کے اسماعیلی طلبہ کے لیے ہز رائل ہائی نس پرنس آغا خان ڈائمنڈ جوبلی بورڈنگ ہاؤس قائم کیا گیا اور اب شاہ کریم الحسینی ہوسٹل کے نام سے ایک اور ہوسٹل زیرِ تعمیر ہے ۔

قیام پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان نے بھی یہاں متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے ۔ ان اداروں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ دوسرے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں ۔

ان تعلیمی سہولتوں کے نتیجے میں یہاں کا ہر بچہ تعلیم حاصل کر رہا ہے ۔ کئی ایک نوجوان نو پاکستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔

(ج) فکری پس منظر : ہنزہ کے باشندوں کی قدیم تہذیب و تمدن اور روایات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ بتوں کو حاجت روا اور نجات دہندہ سمجھتے تھے اور پاکستان و ہند کی دوسری قدیم اقوام کی طرح ان کی پوجا کرتے تھے ۔ ان کے نام پر نذرانے پیش کرتے تھے اور اپنے مُردوں کو جلاتے تھے ۔ مُردوں کو جلانے کے مقامات کے نام جنہیں بروشسکی میں جائی میجنگ (Juymicing) کہتے ہیں اب بھی موجود ہیں ۔

ہنزہ میں جن بتوں کی پوجا ہوتی تھی ان کے نام یہ ہیں، سہلا بوئن (Sahala Boyin)، ہلا بوئن (Hala Boyn) اور تھول بوئن (Thol Boyn) ۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ایسے جانوروں کی پرستش بھی کرتے تھے جن کو بویو (Boyo) کہا جاتا ۔ بویو ایک غیر پالتو جانور تھا جو کتے کے پلے سے بہت مشابہت رکھتا تھا ۔ اس جانور کی پیدائش کے متعلق لوگوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ جب کوئی پجاری کسی خود رو درخت

جس کو انگریزی میں جونیپر (Juniper) کہتے ہیں ' کے نیچے دودھ اور تیل کی نذر پیش کرتا تو یہ اس درخت کی جڑوں میں سے پیدا ہوتا ۔ اگر بویو پیدا ہوکر اس دودھ اور تیل کو چاٹ لیتا تو سمجھتے کہ نذر قبول ہوگئی ورنہ خیال کیا جاتا کہ 'بویو' ناراض ہے ۔

اس کے علاوہ ہنزہ میں کچھ ایسے حکمران بھی گزرے ہیں جن کے متعلق لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ مافوق الفطرت خصوصیات کے حامل تھے ۔ مثلاً اوّلین رئیسانِ گلگت میں سے شاہ رئیس کو ایک شخص شری بدت نے قتل کر دیا اور حکمران بن بیٹھا ۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی اوزار سے قتل نہیں ہوسکتا تھا ۔ یہ شخص بہت ظالم تھا ۔ مالیہ میں انسانی بچے بھی وصول کیا کرتا تھا ، اس لیے کہ اسے انسانی دودھ سے پلے ہوئے گوشت کا ذائقہ بہت پسند تھا ، چنانچہ لوگوں نے اس کے ان انسانیت سوز مظالم سے نجات پانے کے لیے تدبیر نکالی اور اس کی بیٹی نور بخت کی مدد سے اس کی موت کا راز معلوم کر کے اسے جلا کر مار ڈالا ۔ ہنزہ کے لوگ اس سے چھٹکارا پانے کی خوشی کی یاد تازہ کرنے کے لیے آج بھی ''تھموشلنگ'' کا تہوار مناتے ہیں ۔

اسی طرح نور بخت کے پوتے شاہ ملک کے متعلق بھی مشہور ہے کہ اس کے سر پر دو سونے کے سینگ تھے اور دونوں پاؤں گدھے کی طرح سم دار تھے ۔ تاہم حکمرانوں سے ایسی خصوصیات وابستہ ہونے کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ ہنزہ کے لوگ ان کو ایک مطلق العنان حکمرانوں سے زیادہ درجہ دیتے تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی شاہ ملک نے اپنے بھائی میر ملک کے کہنے پر گلگت میں ایک مسجد تعمیر کی جو مسجدِ میر ملک کہلاتی ہے اور آج بھی کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے غلبہ پا لینے کے باوجود اسلام کی تبلیغ کا کام بہت بعد میں شروع ہوا ۔ کیونکہ ۱۸۰۷ء سے پہلے تک تو اس علاقے میں قرآن کریم نہیں پہنچا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ بیگ کا بیٹا خسرو خان مذکورہ سن میں تخت نشین ہوا تو اس وقت قرآن کریم کا ایک نسخہ یہاں لایا گیا ۔ چونکہ انیسویں صدی کے آخر تک کوئی تعلیمی بندوبست نہیں تھا اس لیے لوگ اسلامی عقائد اور نظامِ فکر سے پوری طرح آگاہ نہ ہوسکے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب کے اثرات ختم ہوجانے کے باوجود یہاں کئی معمّر لوگوں کے نام سکھی یا ہندوانہ ہیں ۔ مثلاً ہری سنگھ ، چھار سنگھ ، بیالسنگھ ، کھسنک ، جوسنگھ ، ممو سنگھ ، مو سنگھ ،

ہو سنگھ ، میل سنگھ ، گل سنگھ ، زبو اور ہوبار اور عورتوں کے شلی بائی ، میری بائی اور شادوں ، کنوری وغیرہ ۔

تبلیغ کے سلسلہ میں جو علماء یہاں تشریف لائے ان میں اکثریت اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج یہاں کی قریباً تمام آبادی اسماعیلی عقاید ہی کی پیرو ہے ۔ سب سے پہلا اسماعیلی مبلغ راجگان گلگت جلس خان اور ترا خان کے زمانے میں حملہ آور ہوا تھا ۔ اس کا نام تاج مغل ہے اور وہ ترکستان یا بدخشاں کا حکمران تھا ۔ اس نے گلگت اور اس کے گرد و نواح پر قبضہ کر کے یہاں کے حکمرانوں اور عوام کو اسماعیلی مسلک اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ۔ اس کی یادگار کے طور پر اس نے کوہسار جوٹیال گلگت میں ایک برج تعمیر کروایا جو آج تک تاج مغل یادگار برج یا مغل برج کے ناموں سے موسوم ہے ۔ چونکہ ہنزہ اور نگر بھی گلگت کے ماتحت تھے اس لیے یہاں کے عوام اور حکمرانوں نے بھی یہی عقیدہ اپنا لیا ۔ چند پشتوں تک راجگان گلگت اسی عقیدہ کے پیرو رہے لیکن تبلیغ اور اشاعت کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اثر کم ہوتا گیا حتیٰ کہ جب میرزا خان حکمران گلگت نے اپنی بیٹی جواہر خاتون عرف داری جوادی کی شادی بلتستان میں کی تو ساتھ ہی ان کا مذہب اثناء عشری بھی قبول کر لیا ۔ اسی طرح عیاسو ولد مہوری تھم والئی ہنزہ نے جب مسمات شاہ خاتون بنت ابدالی خان والئی سکردو یا سگر سے شادی کی تو ہنزہ کے لوگ بھی اثناء عشری ہو گئے (یہاں یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ دونوں لڑکیاں گلگت اور ہنزہ میں اپنا ہی عقیدہ ساتھ لائیں) اور ایک عرصے تک یہاں کے باشندے اپنی زندگی کے معمولات میں اسی عقیدہ سے راہنمائی حاصل کرتے رہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ جہاں تبلیغ اور راہنمائی کے لیے کوئی معقول انتظام نہ ہو وہاں مخلوط قسم کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں ۔ یہی حال یہاں کے باشندوں کا ہوا ۔ یہاں بھی ایک مخلوط عقیدہ رائج ہو گیا جس میں بت پرستی ، اسماعیلی اور اثناء عشری عناصر شامل تھے ۔

اس صورت حال میں جب کہ میر سلیم خان ابن خسرو یہاں حکمران تھا ، بدخشاں سے شاہ اردبیل سہرابی ہنزہ وارد ہوا تو میر سلیم خان اس کے اثر سے اسماعیلی عقیدہ کی طرف مائل ہو گیا ۔ اس کے بعد سید حسین ابن شاہ اردبیل سہرابی اور سید غلام علی شاہ ابن سید حسین وغیرہ جب متعدد بار تبلیغ کے سلسلے میں یہاں آتے رہے تو ان کی مساعی سے یہاں کے بہت سے لوگوں نے اسماعیلی عقائد کو اپنا لیا ۔

اس کے بعد میر غضنفر کے عہد (۱۸۲۴ع — ۱۸۶۳ع) میں پیر سید یاقوت شاہ عرف شاہ پرتوی شاہ زیباک اپنے امام کے دربارِ ایران سے تبلیغ کی غرض سے یہاں آئے

اور ان کے اثر سے میر غضنفر خان اور تمام اہالیان ہنزہ نے اسماعیلی عقائد کو اپنا لیا۔ شاہ یاقوت کے بعد سے یہاں باقاعدہ تبلیغی سلسلہ قائم ہوگیا۔ ان کے بعد ان کے فرزندان شاہ عبدالرحیم اور شاہ عبدالحمید اور شہزادہ لیث بن عبدالرحیم اور ان کے بیٹے پیر شاہ ابو المعانی ہنزہ میں اسماعیلی فرقے کے معلّم رہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے باشندوں میں یہی عقیدہ راسخ ہوگیا۔

میر غضنفر کے عہد (۱۸۲۴ع — ۱۸۶۳ع) میں پیر سید یاقوت شاہ اور اس کی اولاد نے یہاں تبلیغ کا سلسلہ سروع کیا۔ یہ سلسلہ دراصل حکیم ناصر خسرو کے سلسلۂ تبلیغ کا حصہ تھا۔ حکیم ناصر خسرو، مستنصر باللہ (م — ۱۰۹۴ع) کے عہد میں فاطمیینِ مصر کی دارالمجالس کے شعبۂ دارالحکمت میں منصب دار تھے اور مازندران و خراسان میں اسماعیلی نظامِ فکر کی تبلیغ پر مامور تھے۔ لیکن عباسیوں کی مخالفت کی وجہ سے بدخشاں میں مقیم ہوگئے تھے۔

بارش کے لیے دعائیں اور تعویذ لکھنے کا رواج بھی عام ملتا ہے اور یہ کام ان کے حکمران کیا کرتے تھے۔ ان میں میر سلیم خان اور غضنفر خان کے تعویذ اور دعائیں مستجاب ہونے کی شہرت آج بھی پائی جاتی ہے۔

انگریزوں کی آمد کے ساتھ ایک شخص منشی سید محمد لاہوری، اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنسی کے دفتر ہنزہ میں ملازم ہوکر آیا۔ یہ سنّی عقیدہ رکھتا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے اور قرأت سیکھنے کی تعلیم دی اور ساتھ ہی لوگوں کو سنّی عقیدہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش بھی کی، مگر محمد رضا بیگ کی موجودگی میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔

ہنزہ کی طبعی اور لسانی تقسیم: ہنزہ کی وادی قدرتی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے اور تینوں حصوں کی زبان مختلف ہے —

۱- **مغربی حصہ:** اس حصے میں شین قوم آباد ہے جس کی زبان شینا ہے جسے یہاں کی اصطلاح میں شیناکی (Sinaki) کہا جاتا ہے۔

۲- **مشرقی حصہ:** یہ حصہ تین وادیوں مسگار، جیورس اور شمسال پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کی زبان، 'وخیکوار' ہے جو بروشسکی میں گوئسکی کہلاتی ہے۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان کیا تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب گلگت کے مقام پر ایک وخانی باشندہ 'پر قتلوغ' ایک عرصے تک حکمران رہا تو اس کی زبان اس جگہ اس قدر اثر انداز ہوئی کہ آج یہاں کے باشندوں کی

زبان 'وخنکوار' ہی کہلاتی ہے۔ پھر جہاں بسنے والے لوگ سب کے سب وخانی نہیں ہیں ' بلکہ ان میں سین اور بروسو اقوام سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب وخیکوار ہی بولتے ہیں۔

۳۔ **درمیانی حصہ :** یہ حصہ مرتضیٰ آباد سے عطا آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں حیدرآباد، بلتت، گنش اور التت شامل ہیں۔ اس حصے کی زبان بروشسکی ہے۔

شنا، وخنکوار اور بروسسکی کے علاوہ ریاست ہنزہ میں ایک اور زبان بھی بولی جاتی ہے۔ جسے بریسکی (Beriski) کہتے ہیں۔ یہ ساز بجانے والے پیشہ وروں کی زبان ہے اور یہ لوگ ریاست کے صرف ایک ہی گاؤں میں آباد ہیں اور یہ زبان صرف اسی گاؤں میں ہی بولی جاتی ہے۔ خیال ہے کہ ان ساز بجانے والوں کے بزرگوں نے یہ زبان وضع کی تھی اور اس بستی کے لوگ اسے اب تک اپنائے ہوئے ہیں۔ اس میں شینا، گوجری اور پنجابی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ممکن ہے ان کے آباؤ اجداد پنجاب سے یہاں کی طرف بلائے گئے ہوں یا خود ہی تلاشِ معاش میں وہاں پہنچ گئے ہوں۔

دوسرا باب

بروشسکی زبان اور اس کا ادب

(الف) بروشسکی زبان کی ابتداء اور ارتقاء : بروشسکی زبان کی پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ ماہرینِ لسانیات اس زبان کے بارے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔ جن محقّقین نے اس کی اصل کے بارے میں بحث کی ہے ذیل میں ان کے خیالات سے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :—

۱۔ ''بروشسکی زبان بولنے والے ایک وقت میں دردی خاندان کی زبانوں کے قریباً تمام علاقے یا پھر اس کے بڑے حصے پر قابض تھے۔[۱]''

۲۔ ''ہنزہ اور نگر میں دو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔[۲]''

۳۔ ''ہنزہ اور نگرمیں بولی جانے والی دونوں زبانیں ایک دوسری کے مماثل ہیں[۳]''۔

۴۔ ''نگر کے لوگ اپنی زبان کو 'یشکند' کہتے ہیں[۴]۔''

۵۔ ''ایک زبان جو کبھی بہت بڑے حصے پر حاوی تھی آہستہ آہستہ چھوٹے سے چھوٹے حصے میں محدود ہوگئی اور ایسی جگہ پناہ لینے پر مجبور کر دی گئی جہاں اس پر دوسری زبانوں کا اثر نہیں ہو سکتا[۵]۔''

۶۔ ''یہ خطہ ایک عجیب زبان کا جزیرہ دکھائی دیتا ہے جو کہ ہند یوروپی ، بتّی اور دری زبانوں کے گروہوں کے سنگھم پر واقع ہے لیکن اس کا رشتہ ان میں سے کسی سے بھی نہیں۔ بروشسکی ساری ریاست ہنزہ میں نہیں بولی جاتی بلکہ اس کے صرف وسطی حصے میں ہی بولی جاتی ہے[۶]۔''

مندرجہ بالا اقتباسات سے اس بات کا تصفیہ نہیں ہوتا کہ یہ زبان ہنزہ کے اصل باشندوں کی زبان ہے یا کوئی فاتح قوم اسے اپنے ساتھ لائی تھی ، اس لیے کہ حکمران خاندان کے افراد اپنے رنگ روپ اور مزاج کے اعتبار سے یہاں کے عوام سے بالکل مختلف ہیں[۷]۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ اس زبان نے اسی خطے میں وجود پایا اور یہ

(۱) گریئرسن۔ (۲) گریئرسن۔
(۳) لائٹنر (۴) مسٹر کونوے
(۵) Colonel Lorimer, "Brushuski Language."
(۶) Barbara Mons, "High Road to Hunza."
(۷) *Ibid.*, p. 90.

یہاں تک ہی محدود رہی۔ البتہ مختلف تہذیبوں کے اثرات سے اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے۔ مثلاً ہندی زبان کے الفاظ سنگھ (سر) سندھ (دریا) دکھ سکھ اور چٹیل وغیرہ، ترکی کے الفاظ مثلاً یساول (چوبدار یا ہرکارہ) قراول (فوجی رہ دگاہ یا چیک پوسٹ) تسوں (دمبی یا فوجی) یورت (ملک یا رعیت) ایلبان (سالانہ محصول) ٹبلچی (قاصد) توغ (جھنڈا جو درختوں پر لگایا جاتا ہے) عربی، مثلاً سمہ اور مسموم کا بگڑا ہوا مسمو جو ایک ڈوپٹہ کے لیے مستعمل ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کھوار (چترالی) زبان کے الفاظ مثلاً سرای (نان جوین) پچملی (وہ انعام جو کسی کو کوئی نمایاں کام کرنے پر دیا جاتا ہے) اور شنیا زبان کے محاورات ضرب الامثال، کاہنوں کی پیشن گوئیاں، راجاؤں کے شجرہ ہائے نسب، بہادروں کی شمشیر زنی کے واقعات کا بیان اور شادی بیاہ کے گیت اور لوریاں بھی بروشسکی بولنے والے اسی طرح گاتے ہیں جس طرح شینا میں گائی جاتی ہیں۔[1]

اب اردو اور انگریزی کی تعلیم کی وجہ سے ان زبانوں کے الفاظ، محاورے اور جملے تک، بھی بروشسکی زبان میں بے تکلف استعمال ہونے لگے ہیں۔ جس سے قدیم بروشسکی زبان کی صورت بہت حد تک بدل چکی ہے اور ایک مخلوط زبان وجود میں آ رہی ہے۔

(ب) لوک ادب : کسی علاقے کا لوک ادب وہاں کے باشندوں کی اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہذا رات کو کھانا کھانے کے بعد چند افراد کا ایک جگہ بیٹھ کر کہانی کہنا اور سننا۔ ان کی تفریح طبع کے لیے ہی نہیں بلکہ معلومات عامہ اور اخلاقی درس و تدریس کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہنزہ میں بھی رات کو کھانے کے بعد دیے کی روشنی میں کہانی کہنے اور سننے کا رواج عام تھا۔ ان لوگوں میں کہانی سننے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ”کسی کے دیے کے پاس بیٹھنا“ محاورے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہنزہ کے علاقے گلوانگ کے ایک باشندے بیگ علی نے یہ بات بڑے دکھ سے کہی کہ ”سب لوگ میرے دیے کے قریب آ جاتے اور انسانی، اخلاق اور نیکی کی باتیں سنتے۔ یہ میرے بد بچے بدوں کے دیے کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں“[2]۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بروشسکی زبان کی متعدد کہانیاں فرضی کرداروں پر مبنی نہیں بلکہ ان کے کردار یہاں کی روائتی تاریخ کے کردار ہیں جن کا تعلق یہاں کے عوام اور ان کے حکمرانوں سے ہے۔ اس طرح یہ کردار

1. Barbara Mons, "High Road to Hunza," p. 90.
2. Lt.-Col. D. L. R. Loriner, The Burushaskı Language Vol. II. P. N. VII.

ایک خاص ماحول میں سننے والے لوگوں کے اعمال کا عکس پیش کرتے ہیں۔
ان کہانیاں کو ہم مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کر سکتے ہیں:—
۱۔ وہ کہانیاں جو سیاسی واقعات یا حکمران طبقہ سے متعلق ہیں۔
۲۔ جو یہاں کے باشندوں کے اجتماعی اعمال پر مبنی ہیں۔
۳۔ جو انفرادی کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں۔
۴۔ جن میں مافوق الفطرت عناصر کا ذکر ہے۔ اور
۵۔ وہ کہانیاں جو دوسرے علاقوں سے متعلق ہیں اور یہاں رائج ہیں۔

پہلے حصے سے متعلق دو نمایاں کہانیاں مختصراً پیش کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کے حکمران ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے بادشاہوں کی طرح مافوق الفطرت عناصر کی مدد کے مرہونِ منت نہیں تھے، بلکہ خود ان میں ایسی ہی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔

۱۔ شری بدت کی کہانی

پرانے وقتوں میں گلگت میں شاہ رئیس نامی ایک حکمران تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے سر میں ایک سونے کا سینگ تھا جس کا علم صرف اس کے بال سنوارنے والے ملازم کو ہی تھا۔ چونکہ حاکم ہر قیمت پر اس بات کو راز میں رکھنا چاہتا تھا، اس لیے ملازم کو اس راز کو چھپانے میں بڑی ذہنی اُلجھن کا شکار ہونا پڑا۔ اس طرح پریشان ہو کر وہ بیمار پڑ گیا اور اسے دست آنے لگے۔ آخر اس ذہنی پریشانی سے خلاصی پانے کے لیے اس نے جنگل کا رخ کیا۔ زمین میں ایک گھڑا کھودا اور اس میں منہ رکھ کر چلایا کہ بادشاہ کے سر پر سونے کا ایک سینگ ہے اور گھڑا بند کر کے واپس لوٹ آیا۔

اس وقت ایک لڑکی گلہ چرا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک آدمی آیا اور اسے ایک چغہ اور دھاگہ دیا۔ مرمت کرنے سے یہ چغہ اور زیادہ پھٹ گیا اور دھاگہ سلامت رہا۔ اُس لڑکی نے پہچان لیا کہ وہ شخص شری بدت ہے۔ شری بدت اس کو کہہ کر غائب ہو گیا کہ وہ اس کے اچھے سلوک کا بدلہ چکا دے گا۔ کیونکہ بقول اس کے وہ گلگت کا حاکم بننے والا تھا۔

اس کے بعد وہ شاہ رئیس کے اصطبل میں چھپ جاتا ہے اور جب گھوڑوں کو اخروٹوں کا چارہ ڈالا جاتا ہے تو وہ کھا جاتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ گھوڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ آخر ایک روز سائیس شری بدت کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شری بدت کہتا ہے کہ شاہ رئیس اگر حاکم ہے

تو کیا وہ اخروٹ بھی نہیں کھا سکتا اور غائب ہو جاتا ہے ۔ سائیس یہ بات شاہ رئیس کو بتاتا ہے ۔ ان دنوں بھی غائب کی باتیں معلوم کرنے کے لیے بیٹن نچوائے جاتے تھے، لہٰذا شاہ رئیس انہیں بلا کر نچواتا ہے ۔ یہ لوگ جوہل (ممکن ہے درخت کا نام ہو) کی بنی ہوئی بانسریوں کی آواز پر ناچتے ہیں ۔ اتفاق سے اس ناچ کے لیے جو بانسریاں آئیں وہ اس جگہ سے لائی گئی تھیں، جہاں پر ملازم نے راز اُگلا تھا ۔ اب جب ان کو بجایا گیا تو ان سے یہ آواز نکلی ہے کہ ''بادشاہ کے سر پر سونے کا ایک سینگ ہے'' شری بدت بھی وہاں آ جاتا ہے اور اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے ۔ شاہ رئیس ناراض ہو کر اپنا خنجر سری بدت کی طرف پھینکتا ہے ۔ سری بدت اسی خنجر سے شاہ رئیس کا خاتمہ کر کے خود حاکم بن جاتا ہے اور بھیڑیں چرانے والی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے جس سے نور بخت نامی لڑکی پیدا ہوتی ہے ۔

اس کہانی کا باقی حصہ اس مقالے کے پہلے حصے میں جہاں یہاں کے سیاسی حالات لکھے گئے ہیں، بیان ہوا ہے جو مختصراً یہ ہے کہ سری بدت بہت ظالم حکمران تھا ۔ مالیے میں انسانی بچے تک وصول کیا کرتا تھا، جن کا گوشت اسے بہت پسند تھا ۔ لوگوں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کی لڑکی نور بخت کی مدد سے اسے آگ میں جلا ڈالا ۔ اس لیے کہ سری بدت کی موت کا راز یہی تھا کہ وہ کسی اوزار سے نہیں مر سکتا تھا ۔ تاریخی حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے، لیکن کہانی آگے بڑھتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سری بدت آگ سے بھی بچ کر غائب ہو جاتا ہے اور ہنزل کے علاقے میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہاں ایک آدمی ہل چلا رہا ہوتا ہے جس سے وہ پانی مانگتا ہے ۔ کسان کے یہ کہنے پر کہ پانی نہیں ہے، سری بدت اسے بد دعا دیتا ہے کہ اگر اس نے پانی دے دیا ہوتا تو اس کے لیے بہت مفید ہوتا مگر اب اس کے بعد اس جگہ پر تین مکانوں سے زیادہ کبھی بھی آبادی نہیں ہوگی، اور غائب ہو جاتا ہے ۔ کہانی کا باقی حصہ حاضر جمشید، جو کہ سری بدت کو نور بخت کی مدد سے مار کر یہاں کا حاکم بن جاتا ہے، کے متعلق ہے ۔ لہٰذا نظر انداز کیا جاتا ہے ۔

۲۔ ٹاپکنٹس اور درامٹنگ

یہ دوسری کہانی درامٹنگ نسل کے لوگوں کی اصل کے متعلق ہے، جو یوں ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداءً ٹاپکنٹس بلتت میں، حسین کونس التت میں اور ہا چیٹنگ گنیشی میں رہا کرتے تھے ۔ اس زمانے میں بہت ہی تھوڑی تعداد میں بلتت میں درامٹنگ آباد تھے ۔ نلہ جو کہ حسن آباد کے عقب میں ہے اس وقت بہت آباد تھا، بہت گرم تھا اور تب یہاں کوئی گلیشر بھی نہ تھا ۔ یہاں سے اندر کی طرف ششپر تک آبادی تھی

اور ٹاپکنٹس وہاں رہتے تھے۔ وہ بہت مغرور ہوگئے تھے، ماں باپ کو بابا اور ززّی کے ناموں سے پکارتے تھے۔

اس پس منظر کے بعد کہانی کا آغاز ہوتا ہے کہ آنشو مایوری تھم .س نے کہ ٹاپکنٹس کے گھر میں پرورش پائی تھی ان کی حرکات سے تنگ آ کر ہا چیٹنگ اور حسین کوس سے مشورہ کر کے دھوکے سے ان کو دعوت میں بلاتا ہے اور جب وہ شراب کے نشے میں مدہوش ہوتے ہیں سب کو قتل کرا دیتا ہے۔ اور پھر ان کی سب عورتوں کو بھی تہہ تیغ کر کے لاشوں کو پانی کا رخ موڑ کر بہا دیا جاتا ہے۔ قضائے الٰہی کہ جب اگلے سال یہ لوگ فصل اگاتے ہیں تو پکنے پر اس کی بالیاں سیاہ پڑ جاتی ہیں اور اس طرح ہر سال فصل خراب ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ لوگ مفلس ہو جاتے ہیں۔ آخر بٹن نچوائے جاتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ ان پر یہ مصیبت ٹاپکنٹس پر ظلم کرنے کی وجہ سے آئی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ یہ لوگ ٹاپکنٹس میں سے کوئی بچہ ڈھونڈھ کر لائیں اور اس کے ہاتھوں سے کھیتوں میں بیج ڈلوائیں تو فصل بیماری سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

اتفاق سے اس خاندان کی ایک حاملہ عورت بچہ جننے کے لئے اس وقت میکے آئی ہوئی تھی جب ان پر ظلم کیا گیا تھا۔ اس طرح ایک بچہ قتل ہونے سے بچ جاتا ہے۔ اس کا نام چودرم چورم ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس بچے کو ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور حفاظت سے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ جوان ہونے پر اس لڑکے چورم کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس گھر میں چاہے جا کر اپنے لیے بیوی کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس آزادی کے باوجود وہ ان لوگوں سے گھبراتا ہے اور ڈرتے ہوئے ایک لڑکی بلوکی نامی کو اس کی رضامندی سے ایک غار میں لے جاتا ہے اور پھر یہ دونوں یہیں رہنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ہاں پانچ لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دن چورم جب کہ فصل بونے کا موسم ہوتا ہے اپنے دو بڑے بیٹوں کو بلا کر کہتا ہے کہ التر میں ان کے رشتہ داروں کے بیل چر رہے ہیں جا کر ان کو یہاں لے آؤ، وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کے بعد چورم اپنے لڑکوں سے مشورہ کرتا ہے کہ ان کے رشتہ دار برے آدمی ہیں، ممکن ہے وہ یہاں آئیں اور انہیں نقصان پہنچائیں، لہٰذا لڑکوں کو چاہیے کہ وہ ہل چلاتے وقت یہ کہتے رہیں کہ ”میں اپنی ماں کے بھائیوں کے بیلوں کے قربان۔ میں اپنی ماں کے بھائیوں کے شاہینوں کے قربان۔“ وہ ایسا ہی کرتے ہیں اور جب ہا چیٹنگ کے لوگ اپنے بیلوں کی تلاش میں یہاں آتے ہیں تو یہ جان کر حیران ہوتے ہیں کہ وہ بلوکی اور چورم کے بچے ہیں۔ پھر ان سے غار میں رہنے کی وجہ پوچھتے ہیں۔ وہ بتاتے

ہیں کہ وہ ان کے ڈر سے وہاں رہ رہے تھے - بہر حال یہ لوگ انہیں پا کر خوش ہوتے ہیں انہیں گسس واپس لاتے ہیں اور اس خوشی میں ایک ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں - بلتت میں آباد درامشنگ اسی چورم کی اولاد سے ہیں -

مندرجہ بالا دو کہانیاں جن کرداروں کے گرد گھومتی ہیں وہ یہاں کی سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں - اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ یہاں کی سیاسی تاریخ انہی روایات پر مبنی ہو؟ جس طرح ان کہانیوں میں قتل کے واقعات کا اعادہ ہوتا ہے، اسی طرح ہنزہ کی تاریخ قتل و غارت کی ایک مسلسل داستان ہے - شاید ہی کوئی حکمران ایسا ہوگا جو اپنی طبعی موت مرا ہو ورنہ ایک کو دوسرے نے طاقت یا دھوکے سے قتل ہی کیا اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں صفدر علی کے بر سر اقتدار آنے پر ختم ہوا -

اب ہنزہ کے باشندوں کے اجتماعی یعنی قبائل کے آپس کے تعلقات کے سلسلے میں ایک کہانی پیش کی جاتی ہے -

۳- کھروکنٹس اور ہما چیٹنگ

کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں التر کی چراگاہ ہما چیٹنگ کے لوگوں کی ملکیت تھی - ایک سڑک بلتت کے اوپر سے ہو کر دراسنگ کے راستے التر کو جاتی تھی اور اس سڑک کی وجہ سے زمین کا کافی نقصان ہو رہا تھا - بلتت کے لوگ ہما چیٹنگ سے کچھ کہتے ڈرتے تھے، اس لیے کہ ان دنوں ہما چیٹنگ بہت طاقتور تھے -

کھروکنٹس نے ایک تدبیر سوچی اور ساداوں کا بودی نامی عورت جو کہ ان میں بیاہی تھی، دراسنگ کے قریب راستے میں بٹھا دی اور اسے سمجھا دیا کہ جونہی ہما چیٹنگ اس کے قریب پہنچیں وہ ان کے آگے گر کر شور کرنا شروع کر دے کہ ہما چیٹنگ نے اس پر ہاتھ ڈالا ہے - یہ عورت ایسا ہی کرتی ہے - ادھر سے کھروکنٹس آجاتے ہیں جو اس مقصد کے لیے پاس ہی چھپے ہوتے ہیں اور ان کو پکڑ لیتے ہیں - اس کے بعد بلتت کے چاروں قبیلوں کے فیصلے کے بعد انہیں جرمانے کے طور پر التر کی چراگاہ سے محروم کر دیا جاتا ہے -

اس کے بعد کھروکنٹس، درامیٹنگ اور براتالنگ مشترکہ طور پر اس چراگاہ کو استعمال کرتے رہے ہیں - چند سالوں کے بعد یہاں کے حاکم اس پر قبضہ کر لیتے ہیں اور مدت تک یہ چراگاہ انہی کے قبضے میں رہتی ہے -

اس طرح کی کہانیاں بہت تھوڑی ہیں - زیادہ تر قتل و خون کے واقعات ہی کی حامل ہیں - پیار و محبت اور گہرے دوستانہ تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کو قتل

کر دینا معمولی بات سمجھا جاتا رہا ہے۔ اب دو گہرے دوستوں کی کہانی سنئے۔ یہ کہانی داستانِ امیر حمزہ سے لی گئی ہے۔

۴۔ بزورِ جمہور اور الکاش وزیر

کباد مدائن کا بادساہ تھا اور الکاش اس کا وزیر۔ الکاش کا ایک دوست تھا، بخت جمال۔ بخت جمال جب بادشاہ کو سلام کرنے جاتا تو پہلے اپنے دوست الکاش وزیر سے ضرور ملتا۔ اس کی سادی جامس حکیم کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ یہ حکیم بہت بڑا عالم تھا۔ اس کے پاس ایک کتاب تھی ''جامس نامہ'' جو اس نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دی۔ بخت جمال نے اس کتاب کو پڑھوانے کی کوشس کی مگر ناکام رہا اور کتاب کو بھول گیا۔

ایک دن الکاش وزیر نے بخت جمال سے کہا کہ بخت جمال کی موت کا دن قریب آ گیا ہے اور موت سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بخت جمال چالیس دن تک کے لیے اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے، نہ کسی کی صورت دیکھے اور نہ کسی سے بات کرے۔ بخت جمال ایسا ہی کرتا ہے۔ الکاش وزیر جیسے کہ اپنے دوست سے بہت پیار تھا ایک ایک دن گنا رہتا ہے۔ ادھر کمرے میں بند بخت جمال بھی ایک کھڑکی میں سے جہاں کہ اس کی بیوی کھانا رکھ دیتی تھی اٹھا کر کھا لیتا اور دنوں کی گنتی کرتا رہتا۔ چالیسویں دن الکاش وزیر بخت جمال کو کمرے سے باہر نکالتا ہے۔ اتفاق سے دونوں کی گنتی میں ایک دن کی غلطی پیدا ہو جاتی ہے جس کا دونوں میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ بہر حال دونوں باہر گھومنے جاتے ہیں اور الکاش وزیر بخت جمال کو اکیلا چھوڑ کر گھر آ جاتا ہے۔ بخت جمال گھومتے گھومتے ایک غار میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اسے ایک خزانہ ملتا ہے مگر الکاس وزیر پہلے سے اس راز سے واقف ہوتا ہے۔ بخت جمال آ کر الکاش وزیر کو بتاتا ہے۔ الکاش وزیر یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب اس خزانے میں اس کا ایک حصہ دار پیدا ہو گیا ہے، اسے غار میں لے جا کر مار ڈالتا ہے۔ بخت جمال مرنے سے پہلے اس سے وعدہ لیتا ہے کہ وہ دس سونے کے سکّے جا کر اس کی بیوی کو دے دیگا اور اسے جھوٹی تسلی کے لیے کہہ دے گا کہ اس کا خاوند روزی کمانے ایک دوسرے ملک میں چلا گیا ہے۔

کچھ دیر کے بعد بخت جمال کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ بڑا ہوتا ہے تو غیر معمولی طور پر ذہین نکلتا ہے۔ اپنے باپ کی کتاب ''جامس نامہ'' پڑھتا ہے تو اس میں اس کے باپ کی موت کا راز اور اس کا بدلہ لینے کا طریقہ بھی درج ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لڑکا جس کا نام میر علی رکھا گیا تھا اپنے باپ اور الکاش وزیر کے جرم کا

راز فاش کر کے الکاش وزیر کو اسی مقام پر جہاں اس کا باپ قتل ہوا تھا ، بادشاہ کے حکم سے مروا دیتا ہے۔ اس کی ذہانت سے متاثر ہوکر بادشاہ اس کو اپنا وزیر بنا لیتا ہے۔ اس کا نام بزرو جمہور (بزر جمہر) ہوتا ہے۔

ان کہانیوں کے علاوہ بہت سی ایسی کہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں وفاداری ، احسان مندی ، دوسروں کے لیے خطرات مول لینا اور مکاری اور فریب کے افعال پر قدرت کی طرف سے سزا پانے کے سبق آموز واقعات کا بیان پایا جاتا ہے۔ البتہ عشق و محبت کی داستانیں مفقود ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شادی کے سلسلے میں ان کے ہاں کوئی خیر رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔

کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جو اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ آس پاس یعنی پاکستان و ہند کے دوسرے علاقوں یا دیگر ملکوں مثلاً ایران و روم سے یہاں پہنچ گئی ہیں۔ روم کا غریب آدمی اور شاہ ایران ' خاموش شہزادی ' شہزادہ بہرام ، شہر بانو اور سفید دیو ' اسی قسم کی کہانیاں ہیں۔ فاصلے اور وقت کے ساتھ ان میں کچھ تبدیلیاں بھی آ گئی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں بچوں کی کتابوں میں جو کہانی 'چمن کا طوطا' کے نام سے بیان کی گئی ہے وہ ہندوستان میں ''متھرا کے طوطے'' کی کہانی ہے۔

بہت سی کہانیاں پاکستان و ہند کے علاقوں میں مشہور جن بھوتوں کی کہانیوں سے مشابہ ہیں۔ مثلاً سہاب قیصر ، موہوم دادو ، کیپس کا بلاس ، ہندی کی دادی ، کولیو لسکر اور ڈنکا لائس ، ترسیل کا گدھا ، بھوں اور سیریں بیرائی ، بولیو جونیپر ، آنشو ملک اور ڈیرائنسل بانٹ (جس کے متعلق محمد شاہ نامی آدمی کا کہنا ہے کہ وہ خود کافی عرصہ تک جادوگروں کے لیے گوشت کے حصے کیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ یہ جادوگر مُردوں کو اس کے پاس لاتے اور ان کے حصے کرنے کو کہتے۔ جس جگہ بیٹھ کر وہ حصے کیا کرتا تھا وہ پتھر اب بھی موجود ہے اور اس کا نام بلاس چوننگ ہے) کی کہانیاں جن میں محیر العقول کارنامے ، ماورائی مخلوق کا نیک اور بہادر لوگوں کی نیکی اور بہادری سے متاثر ہوکر انسانی شکل میں مددگار و ہمدرد بن جانا ، ہر آڑے وقت میں ان کے کام آنا ، پھر کسی علاقے کے افراد کا مشترک طور پر بد روحوں کے ظلم کا شکار ہو جانا ، یعنی رات کے وقت اکیلے کسان یا پہریدار کو کھا جانا اور لوگوں کا کسی عامل یا بہادر آدمی کی مدد سے ان سے چھٹکارہ پانے وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان کہانیوں کو ہم انسان کے مختلف النوّع اعمال کا علامتی اظہار کہہ سکتے ہیں۔

کہانیوں کے برعکس یہاں کے لوک گیتوں میں عشق و محبت کے جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ایک گیت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں وصل سے محروم ، فراق کی

آگ میں جلنے والے دو دلوں کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے - دیکھئے بیان کی سادگی اور جذبات کے بے ساختہ اظہار نے کرداروں کے ماحول کی کتنی واضح تصویر پیش کی ہے -

گیت

ویر لوک : میری قسمت میں ایک دور دراز کا سفر ہے
اے میرے زخم مندمل کرنے والے !
میں اپنے تعویذ بھلا آیا ہوں
خدا کرے میرے لیے وہ جنازے کی خیرات ہوں -

پیولا لوک : تم اپنے آپ کو برا بھلا کیوں کہتے ہو
انہیں جنازے کی خیرات کہہ کر!
خدا کرے میرا یہ احمق شوہر مر جائے -
ہائے ! اس نے تجھے بھٹی میں جلا ڈالا
جب علاقے میں شاہین آ جائے
تو ستر کے لیے امن کی صورت کوئی نہیں رہتی -
اگر میرے اور تیرے درمیان دوستی ہوئی
تو پھر ملک میں بدامنی نہیں ہوگی
تمہارا یہ حال کیوں ہے ؟
اے میرے خوبصورت زلفوں والے محبوب !
کیا میری اس بیماری ماں نے
مجھے تیرے لیے نہیں جنا تھا ؟

ویر لوک : اوہ — مجھے پیٹھ کے درمیان گولی کا زخم ہوا ہے
کہیں بھی مجھے گولی کے زخم کا علاج نہیں مل سکا اور افسوس اب میری موت یقینی ہے !
ہائے پیارا آفتاب جو عشّاق کو دیکھا کرتا ہے ، جا چکا ہے -
ہائے میرے ابّا ! تاریک رات جو عشاق کے دلوں کو جلاتی ہے ، آ گئی

پیولا لوک : ہائے میرے والدین نے ، لوگ کہتے ہیں ، مجھے ایک مرد کو دے دیا ہے -
میرے پیارے — کیا ایسا ضرور ہوگا کہ
وہ میرے موتیوں جیسے اعضاء ، کو توڑ پھوڑ ڈالے گا -

ویر لوک : میں نے کہا — میں پریوں کی وادی کی راہ جاؤں گا -
جب راہ کھو بیٹھا تو ہوا کے پراسرار طوفان نے مجھے گھیر لیا -

میرے دوست — پراسرار طوفان کا کیا علاج ہو سکتا ہے!

امیکس لوک : شاید سوئی پری کے بال علاج ثابت ہو سکیں۔

پیولا لوک : اگر مجھے یہ خبر ملے کہ میرا محبوب آ گیا ہے (تو)
میں اس کے لیے اپنے بال کٹوا دوں گی تاکہ اس کی راہ صاف کی جائے۔
اگر میرے محبوب کے لیے میرے بال چھوٹے ہوں تو اپنا دراز جسم اس
کے لیے کرسی کے طور پر رکھوں گی۔
میرے محبوب دوست ، دنیا کے قیمتی ورثے ،
(کیا میں تمہاری ہو سکتی ہوں)

ویر لوک : اگر میری معشوقہ میرے متعلق پوچھے تو کہنا وہ سخت کمزور ہے
پیولا لوک لگاتار رونے کی وجہ سے میں اندھی ہو گئی ہوں
ہائے تجھے کس قدر لمبا سفر طے کرنا پڑا
اے میرے محبوب! خدا کرے میں تیرے نام پر قربان ہو جاؤں!

محاورات : زندگی کی بنیادی سچائیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ انہی کے بار بار اعادے سے محاورات وجود پاتے ہیں اور ہر زبان کا سرمایہ سمجھے جاتے ہیں ، اس لیے کہ ان سے زندگی کے حقائق کے دو ٹوک اظہار اور سبق آموزی میں ان سے مدد لی جاتی ہے۔ زبان اور پیرایۂ بیان ، بولنے والوں کے تجربات زندگی اور عمل و ردّعمل سے ان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ ہم یہاں بروسسکی زبان کے چند ایسے محاورات کا ترجمہ دیتے ہیں جن سے ان کے بولنے والوں کے مزاج اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے —

۱۔ **یار کا تیر پتھر کا نشان**

یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی کسی دوسرے کی چیز کو اس طرح بے دردی اور لاپروائی سے استعمال کرتا ہے کہ اس کا ستیاناس ہو کر رہ جاتا ہے۔

۲۔ **بیٹھنے کی ایک شرم ، کھڑے ہونے کی سو شرم**

یعنی آدمی میں کسی کام کے کرنے کی ہمت نہ ہو تو تھوڑی سی شرمندگی کو ضرور اٹھانی پڑتی ہے لیکن اگر آدمی اس کام کے کرنے کا تہیّہ کر کے اٹھ کھڑا ہو اور نہ کر سکے تو بہت زیادہ شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

۳۔ **ڈھول کو دیکھ کر ناچ کرنا۔**

یعنی جیسا دیس ویسا بھیس۔

۴۔ **دریا کو چھوٹا نہ سمجھ اور بادشاہ کو کبھی نابختہ نہ جان**

اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں بڑھنے والی ہیں۔ دریا کی طغیانی اور بادشاہ کی عمر۔

۵- کوئی خدمت کرے ، کوئی اپنے گھر میں بیٹھا اپنی تعریف کرے۔
۶- بیل کی کوشش ، خدا کی مدد
۷- چلنے والے بیل پر ڈنڈا
یعنی محنتی آدمی ہمیشہ کام کے بوجھ تلے دبا دیا جاتا ہے۔
۸- اگر تمہاری اپنے ہمسائے کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی تو ایک بکری خرید لو۔
۹- اگر تمہارے باپ کے سر پر قرضہ نہیں تو کسی سے عاریتاً بندوق لے لو۔
یعنی بندوق خراب ہونے یا ٹوٹنے کی صورت میں باپ خود بخود مقروض ہو جائے گا۔
۱۰- حاکم کو تو مالیے سے واسطہ ہے نہ کہ کسانوں کی جان سے۔
۱۱- پاؤں کی انگلی پتھر سے لگے تو ہاتھ کی انگلی منہ میں جاتی ہے۔
۱۲- جان جائے پر بکرا نہ جائے۔
۱۳- بیل کو ذبح کر کے گھوڑے پر بوجھ۔
۱۴- پیسہ پتھر توڑتا ہے۔

(ج) تحریری ادب : چونکہ بیسویں صدی عیسوی کے ربع دوم سے پہلے تک ریاست ہنزہ میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا ، لہٰذا یہاں کے باسندوں کی اکثریت لکھنے پڑھنے سے محروم تھی۔ اس لیے چند قلمی تحریروں کے سوا باقی کچھ محفوظ نہ رہ سکا۔ اس سلسلے میں جو قدیم ترین کلام ہمیں ملتا ہے وہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کے شاعر کشپور جمال خان ابن میر سلیم خان کا ہے اور وہ بھی فارسی زبان کا ایک قطعہ ہے جس کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بروشسکی زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ جب تک کسی شاعر کا پورا کلام نظر کے سامنے نہ ہو اور یہ نہ پتہ چل سکے کہ اس نے زندگی کے کن مسائل اور معاشرے کی کون سی قدروں کو اپنی شعری تخلیقات کا موضوع بنایا ہے ، اس کے متعلق کوئی حتّمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس لیے کہ ادھورا مطالعہ ادھورے نتائج ہی کا حامل ہوتا ہے ، بلکہ بعض اوقات تو اس کی بناء پر حقیقت کے بالکل برعکس نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ قطعہ جمال خان کے انداز بیان اور فکری ساخت کے ایک پہلو کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔ اس میں غریب الوطنی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ شاعر نے اپنے وطن میں رہنے والے کو گلِ صد برگ اور غریب الوطن کو نہالِ بے برگ سے تشبیہہ دے کر کتنے دل نشین اور شگفتہ انداز میں بے وطنی میں پیش آنے والی تکالیف کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

آدم بوطن چوں گل صد برگ بود
بیروں ز وطن نہال بے برگ بود

یاراں پرسند در غریبی چوں است
حقا کہ غریبی بتر از مرگ بود

اس قطعہ میں جذبے کی جو سچائی پائی جاتی ہے وہ شاعر کے ذاتی تجربے کی مرہونِ منت ہے۔ اس لیے کہ شاعر کو بے وطنی کی صعوبتیں اٹھانا پڑی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جمال خان کو اس کے والد میر سلیم خان نے کسی وجہ سے جلا وطن کر دیا تھا اور وہ ان صعوبتوں کی تاب نہ لا کر دوبارہ ہنزہ میں چلا آیا تھا۔ لیکن یہاں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ ہوا اور اس کے گلے میں رسی ڈال کر اسے ہلاک کر دیا گیا۔

گشپور جمال خان کے بعد دو شعر میر ساہ غضنفر کے ملتے ہیں اور یہ دونوں شعر بھی فارسی زبان میں ہیں ؎

غضنفر سگاں سگ مرتضا است
بروز قیامت شفاعت ز اوست

☆ ☆ ☆

چو خسرو سلیم و غضنفر بفر
بالطاف شاہی شبیر و شبر

پہلے شعر میں اپنے عقیدہ کا اظہار کرتے ہوئے حضرت علیؓ کی عظمت اور اپنی نیازمندی کا بیان بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ خود اس کے نام کی وجہ سے صنعت مضاد کا جس طرح استعمال ہوا ہے اس نے ایک حسن پیدا کر دیا ہے۔ غضنفر کے معنی شیر کے ہوتے ہیں۔ شاعر کا کہنا ہے کہ وہ دنیا کے لیے تو شیر ہے لیکن حضرت علیؓ کے نزدیک اس کی حیثیت ان کے کتوں کے بھی برابر نہیں۔

دوسرا شعر اس نے اپنی انگوٹھی کے نگینے میں کندہ کروایا ہوا تھا۔ اس میں اس نے اپنی شان و شوکت کا اظہار اور خسرو کی مانند سلامتیٔ طبع کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اماہین کا اتباع کرکے وہ لطف و کرم سے کام لیتا ہے۔ اس طرح اُس نے اپنی شخصیت کی کتنی واضح تصویر پیش کر دی ہے۔ جس سے اس کے کردار کی مضبوطی اور اپنی ذات پر اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔

شاعر کے علاوہ غضنفر ایک اچھا نثر نگار بھی تھا۔ اس نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جو مسوّدوں کی صورت میں موجود ہیں۔ وہ تاریخ کا بھی ذوق رکھتا تھا اور اس نے ریاست ہنزہ کی تاریخ بھی مدّون کی۔ مگر افسوس ہے کہ تاریخ کے یہ مسودات اب ناپید ہیں۔ غضنفر نے ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔

اسی دور میں اخوند علی بھی ایک اچھا نثر نگار گزرا ہے۔ یہ شخص تاریخ ہنزہ

کی تدوین میں معاون رہا ۔

دوسرے نثر نگاروں میں اخوند تراب ، سید رسول شاہ ، سید عباس اور میر غزالخان کے نام آتے ہیں ۔ میر غزالخان کے عہد میں کریم ولد مشتاق اور شاہ سید عبدالحمید ابن شاہ یاقوت شاہ دو بڑے عالم گزرے ہیں ۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کو مذہبی تعلیم دی ۔ سید عبدالحمید تو ایک اچھا شاعر بھی تھا ۔ اس کے شاگردوں میں محمد رضا بیگ ابن وزیر اسد اللہ بیگ بھی اپنے زمانے کے عالم گزرے ہیں ۔ محمد رضا مشق سخن بھی کرتا تھا ۔ اس نے متعدد رباعیات ، مناجاتیں اور ابیات لکھیں ۔ اس کے علاوہ اس نے نئے سرے سے تاریخِ ہنزہ لکھنے کی ابتدا کی مگر مکمل نہ کر سکا ۔

موجودہ دور کے شعرا میں محمد دارا بیگ ، نصیر الدین نصیر ، غلام الدین غلام اور ایثار الدین ایثار اور عزیز اللہ نجیب تلامیذ محمد دارا مشہور ہیں اور اردو ، فارسی اور بروشسکی زبانوں میں مناقب ، مناجات ، قطعات ، لوریاں اور مرثیے کی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں ۔

کھووار ادب

چترال کا جغرافیائی پس منظر[1]

چترال پاکستان کے مغربی حصے کے شمالی سرے پر طول بلد ۷۱.۳۰ مشرق اور ۷۴ مشرق اور عرض بلد ۳۵ شمال اور ۳۷ شمال کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال اور مغرب میں افغانستان، مشرق میں آزاد کشمیر کی گلگت ایجنسی اور جنوب میں اضلاع دیر و سوات واقع ہیں۔ اس کا رقبہ ۵،۷۲۷ مربع میل ہے۔

چترال اصل میں "چھترار" ہے جو اس ضلع کے صدر مقام کا نام ہے۔ اس نام پر گذشتہ ایک صدی کے دوران میں تمام علاقہ کا نام بھی چھترار پڑ گیا ہے۔ جسے بیرونی مصنفین نے "چترال" لکھنا شروع کیا۔ لٰہذا اب کتابی معلومات رکھنے والے لوگ اس علاقہ کو چترال اور مقامی طور پر چھترار کہہ کر پکارتے ہیں۔

طبعی حالت: سابق ریاست چترال فلک بوس کوہساروں، گہری اور پیچ دار وادیوں اور تیز و تند دریاؤں کی سر زمین ہے۔ یہ تمام علاقہ ہندوکش کے سلسلہ کوہ میں آباد ہے اور اس میں چالیس سے زیادہ چوٹیاں ایسی ہیں جو سطح سمندر سے ۲۰ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں۔ ان میں ترچ میر (۲۵،۲۶۳ فٹ) سب سے بلند ہے۔ جسے مقامی طور پر پریوں کا محل کہا جاتا ہے۔

چترال کے دریا اور ندی نالے یہاں کی زندگی کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دریائے چترال جس میں یہ تمام دریا اور ندی نالے آ کر گرتے ہیں وادی یارخون کے شمالی سرے پر بروغیل میں چیانتار گلیشیر (برف کے سیّال تودے) سے نکلتا ہے اور ۲۲۰ میل کا فاصلہ طے کرکے ارندو نامی ایک گاؤں کے مقام پر افغانستان میں داخل ہو جاتا ہے۔ مختلف علاقوں میں اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ مثلاً دریائے یارخون، دریائے مستوج اور دریائے چترال۔ افغانستان کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد یہ دریائے کنہار کہلاتا ہے اور آخر میں دریائے کابل سے مل کر وہی نام اختیار کر لیتا ہے۔

چترال کے لوگوں کی آبادیاں وادیوں کے ان کھلے حصوں پر ہیں جہاں مقامی

---

(۱) Israr-ud-Din; A Sovial Geography of Chitral State; Unpublished M.Sc. Thesis, University of London, London, 1965; Chapter I, pp. 4-31.

ندی نالوں کے آبی عمل سے دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے زمین کے ٹکڑے وجود میں آئے ہیں۔ نیز بعض علاقوں (مثلاً موڑ کہو) میں جہاں پہاڑوں کا ڈھلوان زیادہ نہیں، وہاں ان ڈھلوانوں پر گاؤں بس گئے ہیں۔

وادی یارخون چونکہ چترال اور وسطی ایشیاء کے سنگھم پر واقع ہے اس لیے چترال کی تاریخ میں یہ خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔ جنگ دربند (یارخون) کے آثار اور بریپ گاؤں میں بہمن بادشاہ کے زمانے کے کھنڈرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چترال کی وادیوں میں سے بحریت کی وادی بہت مشہور ہے۔ یہ وادی کالاش وادیوں (مثلاً رمبور۔ بمبرت اور بریر) میں سے ایک ہے اور چترال خاص سے ۱۵-۲۰ میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ وادی اپنے قدرتی حسن اور قابل دید نظاروں کے علاوہ اپنے میں آباد کالاش قبیلے کی وجہ سے بے حد معروف ہے۔ کالاش لوگ اپنی پرانی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور مذہب کے لحاظ سے دنیا کے قدیم ترین باشندوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

چترال کی آب و ہوا سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں خوشگوار ہوتی ہے۔ بارشیں زیادہ تر دسمبر اور اپریل کے درمیان ہوتی ہیں اور عام طور پر برف کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں اگست اور ستمبر میں کچھ بارشیں ہوتی ہیں اور اکثر سیلاب کا باعث بنتی ہیں اور خاصی تباہی مچاتی ہیں۔ بارش کی سالانہ اوسط ۱۸ انچ ہے۔

گندم، جو، مکئی، چاول، ماش، باجرہ یہاں کی عام پیداوار ہے۔ ان کے علاوہ کئی قسم کے پھل مثلاً انار، سیب، ناشپاتی، توت (بیدانہ)، شہتوت، انجیر، خوبانی، املی، تربوز اور خربوزہ بھی بہتات میں ہوتے ہیں۔ اگر پاکستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ رسل و رسائل کا سلسلہ بہتر ہو جائے تو چترال تمام مغربی پاکستان کے لیے ان پھلوں کی ضرورت بہ آسانی پوری کر سکتا ہے۔

ملکی تقسیم: سابق ریاست چترال کو دو ضلعوں یعنی ضلع چترال اور ضلع مستوج میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ضلع تین تین تحصیلوں پر مشتمل ہے، مثلاً:

۱- ضلع چترال: تحصیل چترال۔ تحصیل لٹکوہ۔ تحصیل دروش۔

۲- ضلع مستوج: تحصیل مستوج۔ تحصیل موڑ کھو۔ تحصیل تور کھو۔

کھو قوم اور اس کی زبان

چترال کی کل آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے - جس میں ۸۰ فیصدی نفوس کھو قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں - باقی دوسرے دس چھوٹے چھوٹے قبیلوں مثلاً کالاش ، بشگالی ،گواری (یا ارندوئی) ، دامیٹری ، ڈانگرک (یا تانگیری) ، پٹھان ، بدخشی، وخک ، بخی (یا منجانی) اور گجر پر مشتمل ہیں - کالاش کے علاوہ باقی سب چھوٹے چھوٹے قبیلے بھی اگرچہ مسلمان ہیں مگر اپنی علیحدہ علیحدہ زبانیں بولتے ہیں اور اپنے اپنے رسم و رواج کی پیروی کرتے ہیں - اس طرح ایک دوسرے اور کھو قوم کے ساتھ میل جول کے باوجود انہوں نے اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھی ہے -

کھو اپنے تہذیب و تمدن اور دوسرے اُمور زندگی کے لحاظ سے اپنے جنوبی علاقوں کے پٹھانوں سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں - البتہ قدیمی تعلق ، یکساں تاریخ ، رسم و رواج اور روایات کی ہم آہنگی کی بنا پر یہ لوگ گلگت ایجنسی کی مختلف وادیوں میں بسنے والے لوگوں سے زیادہ مشابہ ہیں -

کھو قوم کی اصلیت

اپنی اصل کے لحاظ سے کھو آریہ النسل ہیں - آریوں کے ورود سے پہلے قراقرم سے لے کر ہندوکش اور ہمالیہ تک تمام علاقوں میں پساچا[۱] (Pisacha) نام کی ایک قوم آباد تھی - بعد میں جب آریہ آئے تو انہوں نے ان قدیمی باشندوں کو یا تو بھگا دیا یا اپنے میں ضم کر لیا - پرانی سنسکرت کتابوں میں ان علاقوں میں آباد شدہ آریوں کو داردا[۲] (Darda) یا درادا (Darada) نام دیا گیا ہے - رومن اور یونانی مصنفین نے ہندوکش اور ہندوستان کے درمیان تمام علاقوں کو دردستان یعنی درد لوگوں کے ملک کے نام سے منسوب کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ السنہ کی تقسیم میں آج نورستان (پرانا کافرستان) سے گلگت اور استور تک بولی جانے والی تمام زبانوں کو آریائی درد خاندان کا نام دیا گیا ہے -

خیال کیا جاتا ہے[۳] کہ چترال میں جو آریہ حملہ آور آ کر آباد ہوئے ، وہ

---

(۱) Grierson, Sir G. A.; Linguistic Survey of India, Vol. VIII, Part II; Calcutta 9119; P. 1.

(۲) *Ibid.* P. 1. and Biddulph, John; Op. Cit. P. 155.

(۳) *Ibid.* pp. 7-9.

ان آریوں سے بعد میں آئے، جنھوں نے پہلے آ کر کافرستان سے گلگت وغیرہ علاقوں تک قبضہ کیا تھا۔ اس طرح اگرچہ یہ بعد میں آئے ہوئے آریہ باشندے اپنے پیشرو آریوں کے ہم نسل تھے، مگر اپنی زبان میں مختلف عناصر اور صفات کے لحاظ سے ان سے کسی حد تک مختلف ہو گئے تھے۔ لٰہذا یہ تمام دردستان کے درمیان خلیج بن کر رہ گئے اور شین گروہ (جو گلگت ایجنسی کے علاقوں میں آباد ہیں اور جو اصلی درد ہیں) کافر گروہ سے (جو چترال کے جنوبی حصوں سے کابل تک کے علاقوں میں آباد تھا) علیحدہ ہو گیا۔

آریوں کے پھیلاؤ اور ان علاقوں میں اس طرح آباد ہونے کے بعد تاریخ میں اس قسم کے وسیع پیمانے پر انتشار کی مزید مثال ملنی مشکل ہے۔ اس لیے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چترال میں آباد شدہ قدیمی کھو آریاؤں کی نسل سے ہیں۔ موجودہ وقت میں جو کھو باشندے ہیں ان کو اصلیت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قدیمی کھو (۲) بعد میں آئے ہوئے کھو

(۱) قدیمی کھو: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے یہ وہ آریہ ہیں جو تقریباً تین ہزار سال پہلے ان وادیوں میں آباد ہوئے تھے۔ آج یہ قدیمی کھو چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر مشتمل چترال کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی آبادی میں کسی قدر اضافہ ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ کسی گاؤں میں بھی ان کا ایک ہی خاندان کے چار گھروں سے زائد کا ملنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ وہ ناسازگار حالات ہیں، جن کے یہ لوگ صدیوں سے شکار رہ چکے ہیں۔ صدہا سالوں سے جو بھی لوگ باہر سے بہ حیثیت حملہ آور، فاتح یا مہاجر چترال آئے، انہوں نے ان قدیمی کھو باشندوں کے ساتھ اپنے غلاموں جیسا سلوک کیا۔ ان کے مال و متاع پر قبضہ جمایا اور ان کے پاس صرف اس قدر رہنے دیا جس سے وہ بمشکل گزر اوقات کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جب کہ ایک خاندان کے افراد زیادہ بھی ہوتے ان کو باہر کہیں گزر اوقات کی تلاش میں گھر چھوڑنا پڑتا اور اس طرح مجبوراً ان کو اپنے حصے کی جائیداد سے خاندان کے پسماندہ افراد کے حق میں دست بردار ہونا پڑتا۔

(۲) بعد میں آئے ہوئے کھو: یہ وہ لوگ ہیں جو مختلف ادوار میں بدخشان، واخان، روس اور چینی ترکستان، گلگت ایجنسی، دیر، سوات اور افغانستان کے مختلف حصوں سے آ کر چترال میں آباد ہوتے رہے۔ یہ تقریباً دو سو خاندانوں پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر حملہ آوروں کی حیثیت سے یا حملہ آوروں کے ساتھ ان کی مدد کرتے ہوئے چترال

میں وارد ہوئے اور ان وادیوں پر قبضہ کرنے کے بعد پھر یہیں کے ہو رہے - ایسے بھی کئی ہیں جو باہر سے بھاگ کر ان علاقوں میں پناہ لینے کے لیے آئے اور جنہوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے قدیم باشندوں کو اپنے زیر نگین کرکے غلام یا رایت بنا کے رکھ دیا -

ان کا اختلاط اور ایک دوسرے پر اثر : باہر سے آنے والے یہ لوگ دور دراز کے علاقوں سے آنے کی وجہ اور مختلف پس منظروں سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہ صرف قدیمی کھو سے مختلف تھے بلکہ ایک دوسرے سے بھی بہ لحاظ زبان ، طرزِ معاشرت اور رسم و رواج اختلاف رکھتے تھے - بعد میں رہنے سہنے کے سبب اور ایک دوسرے سے شادی بیاہ کرنے کے باعث یہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور باوجودیکہ یہ لوگ قدیمی کھو کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک روا رکھتے تھے مگر پھر بھی ان سب کو بحیثیت ایک مشترکہ زبان کے کھووار کو اپنانا پڑا - قدیمی کھو کے طرزِ بود و باش کا بھی ان سب نے اثر لے لیا اور چونکہ چترال کے گرد و نواح کے علاقوں کے باشندوں سے ان لوگوں کو اکثر خطرہ لاحق رہتا تھا ، اس لیے حفظِ ما تقدم کے طور پر ان کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ متحد ہو جائیں اور اس طرح اپنی حفاظت کر سکیں - لہٰذا اس احساس نے ان کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے میں اہم کردار ادا کیا - بعد میں جب ان تمام وادیوں میں اسلام پھیل گیا تب ان میں یک جہتی اور یگانگت کو اور بھی تقویت ملی - لہٰذا آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے اور دور دراز کے علاقوں سے آنے کے باوجود یہ سینکڑوں خاندانوں پر مشتمل لوگ ایک ہو گئے ہیں اور سب اپنے آپ کو کھو سمجھتے ہیں - سب ایک زبان یعنی کھووار بولتے ہیں اور سب نے ایک ہی قسم کی طرزِ بود و باش اپنائی ہے -

کھووار : کھو قوم کی زبان کھووار ''کھو'' اور ''وار'' کے الفاظ سے مرکب ہے - ''وار'' کا لفظ مقامی طور پر زبان کے لیے استعمال ہوتا ہے - لہٰذا کھووار کے معنی کھو قوم کی زبان ہے - ڈاکٹر لائٹنر [۱] (Dr. Leitner) نے اس زبان کو آرنیہ (Arniya) کا نام بھی دیا ہے -

مشہور ماہرِ لسانیات سر جارج گریئرسن نے کھووار کو آریائی زبانوں کے درد خاندان میں شامل کر دیا ہے - اس خاندان میں ذیل کی زبانیں شامل ہیں[۲]-

(۱) Leitner, Dr. G. W.;—The Languages and Races of Dardistan, Part I, composition, grammer & vocabulary of......Arniya......, Lahore 1877.

(۲) Grierson, Sir George A; Linguistic Survey of India, Vol. VIII, Part II; Calcutta 1919; P. 2.

(الف) کافر گروپ : (۱) سگالی وار (۲) دابی الا (۳) ویرون (۴) اشکند (۵) کلاشہ اور پاسائے گروپ مثلاً کلاستوڑ، گوار بتی، پاسائے لغانی، دیغانی، دیری، بیرابی -

(ب) کھووار - چترالی یا آرنیہ -

(ج) اصل درد گروپ : (۱) سنا (۲) کشمیری اور (۳) کوہستانی

گریئرسن کی رائے کے مطابق اگرچہ کافر گروپ کے ساتھ کھووار کی کچھ قدر مشترک ہے مگر دوسری زبانوں کے معاملے میں یہ ایک آزاد مقام رکھتی ہے - البتہ "درد خاندان میں شامل دوسری تمام زبانوں کی بہ نسبت کوہ ہندوکش کے شمال میں مروجہ غالچہ زبانوں کے ساتھ اس کا گہرا رابطہ ہے[۱]" -

درد خاندان میں شامل زبانوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ درد گروپ کا کافر گروپ کی زبانوں کے ساتھ بہ نسبت کھووار زیادہ گہرا رشتہ ہے اور بڈلف کی رائے کے مطابق کسی زمانے میں اس تمام علاقے یعنی دردستان میں ایک ہی زبان بولی جاتی تھی جسے بعد میں کھووار زبان نے درمیان میں حائل ہو کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا[۲]- گریئرسن اس کا جواز یوں پیش کرتے ہیں کہ کھووار "ان درد حملہ آوروں کی زبان معلوم ہوتی ہے جو بعد میں آ گئے تھے -" اس لیے اس زبان نے ایسے میں موجود غالچہ اور ایرانی خصوصیات کی وجہ سے اصل درد گروپ اور کافر گروپ کی زبانوں کے درمیان حائل ہو کر ان کو ایک دوسرے سے جدا[۳] کر دیا - موجودہ دور کے مشہور ماہر لسانیات پروفیسر مارگنسٹائن جنہوں نے افغانستان اور مغربی پاکستان کی شمال مغربی اور مغربی زبانوں پر دقیق ریسرچ کی ہے، کھووار پر کوہ ہندوکش کے پار والی زبانوں کے اثر کے بارے میں گریئرسن کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کھووار کے "ذخیرۂ الفاظ میں زیادہ تر الفاظ ایسے ہیں جن کا ہندی آریائی خاندان میں کوئی نشان نہیں ملتا - اس میں کافی تعداد ایسے الفاظ کی ہے جو ایرانی زبانوں سے اخذ شدہ ہیں - اس کے علاوہ بروشسکی اور شنا زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں - لیکن بے شمار ایسے الفاظ بھی ہیں جن کا مآخذ معلوم نہیں[۴]" -

---

(۱) Grierson, Sir George A, Linguistic Survey of India, Vol VIII, Part II; Calcutta 1919; P. 2.

(۲) Biddulph, Major John:—Dialects of the Hindu Kush; Journal of the Royal Asiatic Society Bengal Vol. XVIII, London, 1885.

(۳) Grierson, Sir George A.—Op. at; p p. 7-9.

(۴) Morgenstierne, George:—Some Features of Khowar Morphology; Oslo 1947, p. 6.

پروفیسر موصوف ایک جگہ کھووار کی اہمیت کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں ''کھووار نے سنسکرت سے بالکل مختلف رہ کر اپنا ایک نیا تصریفی نظام (Inflectional System) بھی بنایا ہے لیکن اپنی بناوٹ کے لیے اس نے اپنے علیحدہ محل وقوع میں کسی دوسری ہندی آریائی زبان کے مقابلے میں زیادہ تر ایسے مواد کا استعمال کیا ہے جو کہ زمانۂ قدیم سے تعلق رکھتا ہے۔ لٰہذا ہندی آریائی زبان کے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے یہ زبان نہایت اہمیت کی حامل ہے[۱]''

کھووار ابجد : ''کھووار'' میں ایرانی آریائی اور ہند آریائی دونوں خاندانوں کی صفات موجود ہیں اس لیے کھووار کے ابجد میں وہ تمام حروف تہجی موجود ہیں جو کہ فارسی یا عربی اور اُردو وغیرہ میں شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ مقامی حالات کے زیر اثر (یا شاید قدیمی باشندوں بساچا کے اثر سے) کھووار میں کچھ نئے اعراب کا بھی اضافہ ہوا ہے جن کے لیے ذیل کی علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔

ځ (TJ) څ (TC) ڇ (TCH) ر (TZ) ، ݜ (TSH)۔ ان کے علاوہ کھووار میں دو زائد مرکب حروف مثلاً ڇھ (TCC) ڇھ (TCHH) اور گیارہ زائد اعراب (Vowels) ہیں۔ یاد رہے کہ اگرچہ ڑُ کا حرف کھووار حروف میں شامل ہے مگر بولنے میں یہ ڑُ سے ذرا مختلف ہے بلکہ اس کی آواز ل اور ڑ کی درمیانی آواز سے ملتی جلتی ہے۔

---

(۱) Morgenstierne, George:—Some Features of Khowar Morphology; Oslo 1947, p. 28.

سیاسی تاریخ کا پس منظر

سیاسی تاریخ : گذشتہ ڈھائی ہزار سالوں کے دوران میں سابق ریاست چترال مختلف بڑی سلطنتوں کے زیرِ اثر رہی ہے۔ جن میں سے سلطنتِ ایران[1] (ہخامنشی) کشان[2] اور چین[3] خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان وادیوں میں اسلام کا ظہور سب سے پہلے بالائی حصوں میں ہوا کیونکہ مسلمانوں نے اس طرف سے حملہ کر کے وہاں کے بادشاہ بہمن کو شکست دی، وہاں کے لوگوں کو مسلمان بنایا اور خود واپس چلے گئے[4]۔ مگر باقی حصوں کے باشندے کافی دیر تک مشرف بہ اسلام نہ ہو سکے۔ مختلف حصوں میں پتھروں اور چٹانوں پر بڑے بڑے کتبے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان علاقوں کے باشندے دسویں صدی میں بدھ مذہب کے پیرو تھے اور راجہ جے پال والئی پشاور داجاں کے ماتحت تھے[5]۔

گیارھویں صدی سے چودھویں صدی تک چترال کے جنوبی حصوں پر کالاش قابض رہے۔ جن کو بعد میں شاہ نادر رئیس نے جو کہ سلطنتِ چین کی طرف سے بالائی چترال کا گورنر مقرر ہو کر آیا تھا، شکست دے کر اپنے زیرِ نگیں کر لیا اور پھر اپنی سلطنت کو وسعت دے کر گلگت تک پہنچا دیا اور رئیسیہ خاندان کی بنیاد ڈال دی۔ اس خاندان نے سولھویں صدی کے آخر تک حکومت کی۔ اس کے بعد سانعہ خاندان نے ان سے حکومت چھین لی[6]۔

یہ خاندان کٹور کہلاتا ہے اور یہ دعویٰ رکھتا ہے کہ وہ تیمور لنگ کی نسل سے ہے۔ روایت کے مطابق بابا ایوب جو کہ تیمور کا پوتا تھا[7] ایک درویش کی حیثیت سے چترال آیا۔ اس کے پوتے سنگین علی اول نے اس زمانے کے رئیسیہ خاندان کے بادشاہ کے

---

(1) Fraser-Tyler, Sir K ; Afghanistan, London 1951, p 17

(2) Smith, V. A ; Oxford History of India, Oxford 1957, p 149.

(3) (*i*) *Ibid*, p. 192 and (*ii*) Stein, Sir Aurel, Serindia Vol I, Oxford 1921, pp 29-31.

(4) Murtaza, Mirza Ghullam, Nai Tarkh-e-Chitral (Urdu); Peshawar 1962, p 27.

(5) Biddulph, John; Tribes of the Hindu Kush; Calcutta 1880, p 149

(6) (*i*) Murtaza, M. G.; Op. Cit p p 28-43, and
(*ii*) Schomberg, R.C.F ; Kafir's Glaciers, London 1936, p 263

(7) میرزا غلام مرتضیٰ (مولف) نئی تاریخ چترال (اُردو) موجودہ خاندان کا سلسلہ نسب یوں پیش کرتے ہیں : بابا ایوب ابن شہزادہ فریدوں حسین۔ ابن سلطان حسین والئی ہرات۔ ابن غیاث الدین۔ ابن امیر زادہ بایقرا۔ ابن عمر شیخ بہادر ابن سلطان ابوسعید مرزا۔ ابن امیر تیمور صاحقران (۴۹)۔

دربار میں عزت اور شہرت پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے پوتے محترم شاہ اور خوشوقت نے ملکی انتشار اور بادشاہِ وقت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر رئیسیہ بادشاہ کو ملک بدر کر دیا اور خود حکومت پر قابض ہوگئے۔ اس وقت چترال کی سرحدیں گلگت سے چغانسرائے (افغانستان) تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس تمام سلطنت کو محترم شاہ اول اور خوشوقت نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ زیریں حصے میں موڑکھو اور تورکھو کے علاقے شامل کرکے محترم شاہ نے اپنی سلطنت قائم کی اور ''کٹور''[۱] کا لقب اختیار کرکے سابقہ خاندان کی بنیاد رکھ دی۔ ریاست چترال کا بالائی حصہ یعنی مستوج سے گلگت تک کا علاقہ خوشوقت کے حصے میں آیا، جہاں اس نے خوشوقتے خاندان کی حکومت قائم کر دی[۲]۔

اس کے بعد ۱۸۶۰ء تک چترال کی تاریخ رئیسیہ اور کٹور خاندانوں کے درمیان لڑائیوں اور جنگ و جدال کی ایک المناک داستان ہے۔ مگر رئیسیہ پر غالب آنے کے بعد کٹور اور خوشوقتے خاندانوں کی آپس میں مخالفتیں اور لڑائیاں شروع ہوگئیں اور تقریباً دو سو سال تک سابقہ ریاست مزید قتل و غارت کی آماجگاہ بنی رہی اور یہاں کے عوام ظلم و ستم اور مصائب و آلام سہتے رہے[۳]۔

۱۸۷۰ء کے بعد چترال کے حالات نے پلٹا کھانا شروع کیا اور چترال کی تاریخ میں زبردست موڑ آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یہاں مہتر امان الملک حکمران تھا۔ جس کے بارے میں لارڈ کرزن یہ رائے رکھتا تھا کہ وہ ''ایسی ریاست اور ایسے دور کے لیے نہایت ہی موزوں شخصیت تھا[۴]۔'' اس کے دور میں ریاست زیادہ تر بیرونی خطرات سے دوچار رہی۔ ایسے حالات میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح بیرونی طاقت کے ساتھ حفظِ ماتقدم کے طور پر گٹھ جوڑ کیا جائے۔ مہتر امان الملک آخر کار مہاراجہ کشمیر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔ مہاراجہ مذکور کو چونکہ ایسے زریں

---

(۱) تزک بابری۔ تاریخ بناکیتی (Binakiti) اور جمع التواریخ کے حوالے سے بڈلف رقمطراز ہے کہ کٹور نام بہت پہلے سے اس علاقے کے ساتھ وابستہ ہے اور کابل کے ترک بادشاہوں کے آخری خاندان کے بادشاہ کا نام بھی کٹاران (Kataran) یعنی ''کٹوروں کا بادشاہ'' تھا (Tribes of the Hindukush; P. 148.) موجودہ خاندان کے اس نام کو اپنانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پرانے بڑے بادشاہوں کے ساتھ منسوب ہونے کی وجہ سے اس نام میں نفسیاتی کشش اور دبدبہ تھا۔ اس لیے موجودہ خاندان نے جس نے کہ غیر معمولی حالات میں حکومت پر قبضہ کیا تھا، لوگوں کو مرعوب کرنے کی خاطر یہ نام اختیار کیا ہوگا۔

(۲) میرزا غلام مرتضیٰ: نئی تاریخ چترال۔ صفحہ ۴۹، پشاور ۱۹۶۲ء۔

(۳) ایضاً صفحہ ۴۳ - ۱۱۳ -

(۴) Curzon, Lord Kedleston; Leaves From a Viceroy's Notebook, London 1927. p. 105.

موقع کی تلاش بھی ساتھ ساتھ اس وقت برطانوی حکومت بھی شمال میں روسی خطرے کے پیش نظر یہ چاہتی تھی کہ ان شمالی علاقوں پر اگر بلاواسطہ نہیں تو کم از کم بالواسطہ اس کا تسلط رہے، لہٰذا اس نے مہاراجہ کشمیر کو اپنی مخصوص ہدایات کے مطابق شاہ چترال کے ساتھ معاہدہ کرنے کی اجازت دے دی - جس پر ۱۸۷۹ء میں دستخط ہوئے اور اس طرح سابقہ ریاست چترال ایک نئے دور میں داخل ہوئی[1] -

اب بیرونی خطرات سے ہر طرح محفوظ رہ کے مہتر امان الملک نے اندرونی طور پر اپنے تمام حریفوں کا خاتمہ کر دیا اور اپنی بادشاہت اسمار (افغانستان) سے لے کر گلگت ایجنسی میں اسماموں تک پھیلا دی[2]- ۱۸۸۵ء میں برطانیہ اور روس کے درمیان تعلقات خراب ہوگئے اور برٹش حکومت نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ان شمالی علاقوں پر اپنا تسلط اور زیادہ مضبوط کرے - لہٰذا کرنل لاکہارٹ (Col. Lockhart) ایک مشن لے کر چترال آیا اور مہتر امان الملک کے ساتھ دوستی کا مکمل معاہدہ کر لیا - اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں ڈیورنڈ کو چترال بھیج دیا گیا جس نے چترال میں ایک برٹش ایجنسی قائم کی - نتیجۃً "اب برطانوی حکومت اور سابقہ ریاست چترال کے درمیان تعلقات زیادہ واضح صورت اختیار کر گئے اور مؤخر الذکر حکومت نے کشمیر دربار کی معیت میں اس کی محدود طور کی فرمانروائیت قبول کر لی - جسے سابقہ ریاست چترال نے بخوشی مان لیا"[3]-

۱۸۹۲ء میں مہتر امان الملک کی وفات پر اس کے بیٹوں میں تخت کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی - جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۸۹۵ء میں برطانوی حکومت نے مکمل طور پر چترال پر قبضہ کر لیا اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کرکے جنوبی حصے کے لیے جس میں تورکھو، موڑکھو، چترال اور دروش کے علاقے شامل تھے، مہتر امان الملک کے چودہ سالہ لڑکے شجاع الملک کو بادشاہ تسلیم کر لیا - مستوج اور گلگت ایجنسی میں چترال کے ماتحت علاقوں پر الگ گورنر مقرر کر دیا[4]- ۱۸۹۲ء میں جب ڈیورنڈ لائن مقرر کی گئی تو چترال کے جنوبی حصے میں باشگل اور اسمار تک کے علاقے افغانستان کو دے کر ریاست

---

(۱) (*i*) Murtaza, Mirza G ,—Op. Cit pp 114-128

(*ii*) Curzon, Lord K; Op. Cit p 105 and

(*iii*) Alder, Garry,—India's Northern Frontier. London 1963, pp. 121-122.

(۲) Curzon, Lord, K.; Op. Cit; p. 108.

(۳) *Ibid*; p. 108

(۴) (*i*) Ansari, Bazmee;—The Encyclopaedia of Islam (New Edition), Vol. 2, Luzzac London 1963; p. 30.

(*ii*) Robertson, Sir G ;—Chitral, Story of a Minor Seige, London 1898, pp. 201-356.

(*iii*)Murtaza,Mirza Ghullam; op. Cit. pp. 151-179

کو ان سے محروم کر دیا گیا'۔

۱۹۱۴ء میں مستوج کا علاقہ واپس چترال کو مل گیا اور چترال کی موجودہ سرحدیں متعیّن کی گئیں۔ ۱۹۱۹ء کو مہتر شجاع الملک کو ان کی ''شاندار خدمات'' کے عوض 'مہتر' کا خطاب اور ''ہز ہائی نس'' کا لقب ملا۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی اور ان کے بعد ہزہائی‌نس محمد ناصر الملک (۱۹۳۶ء- ۱۹۴۳ء)، ہزہائی نس محمد مظفر الملک (۱۹۴۳ء- ۱۹۴۸ء) اور ہز ہائی نس سیف الرحمان (۱۹۴۸ء- ۱۹۵۴ء) یکے بعد دیگرے چترال کے مہتر بنے۔ ۱۹۵۴ء سے زمانہ حال تک سیف الملک ناصر ریاست کے والی تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو چترال نے تمام ریاستوں میں سب سے پہلے اس عظیم اسلامی مملکت میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد گذشتہ بس سالوں کے دوران میں چترال نے مختلف شعبوں میں جو نمایاں ترقی کی ہے، اس کی مثال اس کی پوری تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ پاکستان بنتے ہی لوگوں میں آزادی کا شعور جاگ اٹھا۔ ایک سال کے اندر اندر چترال مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ گیا۔ جس نے لوگوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرکے صدیوں سے ان پر توڑے جانے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۳ء میں حکومتِ پاکستان نے سابق مہتر چترال ہز ہائی نس سیف الرحمان کے ساتھ مشورہ کرکے نئے قوانین نافذ کیے جس کی رو سے والئی ریاست وہاں کے سربراہ اور اڈیشنل پولیٹیکل ایجنٹ ان کا مشیر اعلیٰ ہونا قرار پایا۔ سابقہ ریاست کے مختلف صوبوں کو نئے طور پر تشکیل دے کر گورنری نظام اور پرانے انتظامیہ کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ اس کی جگہ تمام سابقہ ریاست کو دو ضلعوں اور چھ تحصیلوں میں تقسیم کرکے دو ڈپٹی کمشنروں اور چھ تحصیل داروں کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ باڈی گارڈ کے نظام کی جگہ چترال پولیس فورس کا قیام عمل میں آیا۔ مختلف شعبوں مثلاً تعلیم، خزانہ، مالیہ، تعمیرات، تجارت اور جنگلات وغیرہ سے متعلق اُمور کے انتظام کے لیے سکرٹریٹ قائم ہوا اور تمام عہدوں اور ملازمتوں پر تقرریاں امیدواروں کی ذہنی استعداد، علمی قابلیت اور تجربے کو سامنے رکھ کر عمل میں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۹۶۶ء سے چترال کو ایک علیحدہ ایجنسی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس طرح مالاکنڈ ایجنسی کے ساتھ اس کا پچاس سالہ تعلق ختم ہو گیا، جو ۱۹۶۹ء تک براہ راست پشاور کمشنری کے ماتحت تھی۔

---

(۱) Scott, I.D.;—Notes on Chitral, Peshawar 1936. p. 2.

تاریخی اثرات : کسی ملک کے لوگوں کے طرزِ معاسرت ، ادب و ثقافت اور دیگر خصوصیات پر اس ملک کی تاریخ نہایت ہی اہم اثرات ثبت کرتی ہے ۔ چترال کی سیاسی تاریخ نے بھی کھو قوم کے ان مختلف پہلوؤں پر اہم اثرات چھوڑے ہیں ۔

معاشرے پر اثر : تاریخ کے مختلف ادوار میں چترال کا چین ، ترکستان اور بدخشاں کے ممالک کے ساتھ جو تعلق رہا ہے اور وقتاً فوقتاً اس کے گرد و نواح کے علاقوں سے جو مختلف النسل باسدے چترال میں وارد ہوتے آئے ہیں ، انہوں نے یہاں کے معاشرے کو بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۔

چترالی معاسرے کو چند سال پہلے تک تین طبقوں یعنی آدم زادہ (اعلیٰ طبقہ) ارباب زادہ یا یوفت (درمیانی طبقہ) اور فقیر مسکین (پست طبقہ) میں تقسیم کیا جاتا تھا ۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ طبقہ بندی یہاں کی تاریخ کا ورثہ تھی ۔ یہ اس لیے کہ سابقہ ریاست چترال میں اکثر جنگ و جدال کا بازار گرم رہتا تھا اور یہاں کا حکمرانِ وقت ہمیشہ اسے آپ کو خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا ۔ چنانچہ وہ اپنی حفاظت اور لوگوں کو اپنا طرفدار بنانے کے لیے مختلف با رسوخ خاندانوں کے بڑے بڑے اُمراء کو انعام و اکرام سے نوازتا اور ان کو زمینیں اور جاگیریں دے کر اپنے ساتھ ملاتا ۔ اس قسم کے خواص وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی پشتوں تک بادساہ کے خاندان کے وفادار چلے آتے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے جو حکمران طبقے کے خاندان سے ہوتے ۔ اس قسم کے تمام لوگوں کو ''آدم زادہ طبقہ'' کا نام مل گیا ۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو معمولی دہقانی کرکے یا دوسروں کے مزارع بن کر زندگی گزارتے ، وہ فقیر مسکین کہلائے جانے لگے ۔ اس طبقے میں زیادہ تر ایسے لوگ بھی شامل تھے جو چترال کے اصلی یا قدیمی باشندوں کی اولاد میں سے تھے اور جو گردشِ ایام سے مفتوح اور محکوم چلے آتے تھے ۔ ان دو طبقوں کے درمیانی طبقے کا نام ''ارباب زادہ'' یا یوفت پڑ گیا ۔ ان کی حالت درمیانی تھی ۔ نہ یہ اسے طاقتور تھے کہ اعلیٰ طبقے میں شامل ہو سکتے اور نہ ان کی حالت اتنی سقیم تھی کہ فقیر مسکین کہلاتے ۔ یہ زیادہ تر حملہ آوروں کی معیت میں آئے ہوئے یا بطور پناہ گزیں یا کسی اور صورت میں چترال میں آ کر آباد ہو گئے ۔

معاشرہ

کھو قوم کے افراد ایک ترقی یافتہ تمدن کے مالک ہیں۔ ان کے معیارِ زندگی، طور و اطوار اور کاشت کاری کے طریقے دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا[۱] اب کھو معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا مختصر سا جائزہ دیا جاتا ہے۔

بود و باش: کھو باشندے گاؤں میں رہتے ہیں - یہ گاؤں اتنے بڑے نہیں ہوتے جتنے پاکستان کے دوسرے حصوں میں ہوتے ہیں - بہت کم ایسے گاؤں ملیں گے جن کی آبادی دو تین ہزار تک ہو گی۔ ورنہ ایک گاؤں میں بمشکل ایک ہزار نفوس آباد ہوتے ہیں - گاؤں کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا دار و مدار جگہ کی موزونیت اور قدرتی حالات کی سوافقت پر ہوتا ہے۔

گاؤں کے لوگ اپنے اکثر کام امداد باہمی کے اصولوں کے تحت سر انجام دیتے ہیں اور آپس میں تعاون اور امن و آشتی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چترال میں (خاص طور پر کھو قوم میں) چوری چکاری، ڈاکہ زنی، قتل و غارت اور اس قسم کے جرائم کم پیش آتے ہیں۔

گاؤں کی زندگی میں مسجد (سنی آبادیوں کی صورت میں) یا جماعت خانہ (اسماعیلی آبادی ہونے کی شکل میں) اہم مقام ہوتے ہیں۔ یہ عمارتیں عبادت کے علاوہ دوسرے اجتماعات کے بھی کام آتی ہیں۔ جن میں لوگ مختلف ضروری اُمور پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ کھو باشندوں کے گھر اپنے طرزِ تعمیر، نفاست اور معیار کے لحاظ سے ان کی عقل و دانش کا مظہر ہیں۔ ایک گھر عام طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے[۲]۔

۱۔ ''دور'' (انسانوں کے رہنے کا حصہ)

۲۔ ''شال مودی'' (مویشی خانہ)

یہ دو حصے کہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملحق (مگر ایک دوسرے کی پشت

---

(۱) Stein, Sir A; Serindia Vol. I, Oxford 1921; p. 28

(۲) (*i*) Israr-ud-Din; A Social Geography of Chitral State; Unpublished M.Sc. Thesis, University of London 1965, pp. 112-126.

(*ii*) Idem:—Settlement Pattern and House Types in Chitral State, Pakistan Geographical Review, Vol. 21, No. 2; Lahore 1966.

پر) بنائے جاتے ہیں اور کہیں علیحدہ علیحدہ جگہوں پر - بالائی طبقہ کے اکثر خاندان اپنے تمام مال مویشیوں کے لیے گھر سے ہٹا کر اپنے کھیتوں کے کنارے جگہ بناتے ہیں - جسے ''سالدین'' کہا جاتا ہے -

دولتمند گھروں میں ''دور'' یا گھر دو حصوں یعنی ''اندرین'' (اندرونی) اور ''بیری'' (بیرونی حصہ) میں منقسم ہوتا ہے - اندرونی حصے کو گھر کے افراد خود استعمال کرتے ہیں اور بیرونی حصہ مہمانوں کے لیے وقف ہوتا ہے - یاد رہے کہ مہمان نوازی کھو کلچر کا اہم جزو ہے - ان اندرونی اور بیرونی حصوں کے گردا گرد چار دیواری ہوتی ہے - جس کے اندر دونوں حصوں کے لیے علیحدہ علیحدہ باغ بنائے جاتے ہیں - کمروں کی تعداد مالک مکان کی حیثیت اور استطاعت کے مطابق ہوتی ہے - چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ضرور ہوتا ہے - کیونکہ کھو قوم کے افراد میوہ دار اور سایہ دار درخت لگانے اور پھولوں کی کیاریاں بنانے کو بے حد اہمیت دیتے ہیں - نیز ہر ایک آدمی اپنے گھر میں صاف اور رواں پانی کی نالی گزارنے اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے آبشار بنانے کا خاص طور پر شوق رکھتا ہے -

''حتان'' یعنی کمرہ اندرونی طور پر کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے - ہر ایک حصے کا خاص مقصد ہوتا ہے - مثلاً :

۱- شوم : دروازے سے داخل ہوتے ہی پہلا حصہ ہوتا ہے جو نوکروں کے کھڑے ہونے یا ہل لکڑی وغیرہ چیزیں رکھنے کے کام آتا ہے -جوتے بھی اتار کر یہیں رکھے جاتے ہیں - اس کے ایک طرف اینٹوں سے بنا ہوا غسل خانہ بھی ہوتا ہے -

۲- بیند : اسے لکڑی کے تختوں کے ذریعے سوم سے جدا کیا جاتا ہے اور انگیٹھی کے تین طرف بنا ہوتا ہے - جسے فرش بچھا کر بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے - بیند نمبر ۱ کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے ، جہاں گھر کے مالک یا مالکہ بیٹھتے ہیں اور اگر کوئی بزرگ رشتہ دار مہمان آئے تو اسے بھی وہیں بٹھایا جاتا ہے - باقی دو بیندوں پر جوان بیٹے یا بیٹیاں یا اور رشتہ دار بیٹھتے ہیں - چھوٹے بچے عام طور پر باپ یا ماں کے ساتھ بیند نمبر ۱ پر بیٹھتے ہیں - بیند نمبر ۲ پر دسترخوان بچھا کر گھر کا مالک اپنے بیٹوں کے ساتھ کھانا بھی کھاتا ہے -

۳- ٹک : یہ ''بیند'' سے قریباً ایک فٹ اونچا ہوتا ہے اس کے کچھ حصے پر فرش بچھایا جاتا ہے - جہاں (جب مرد گھر میں ہوں) عورتیں بیٹھتی ہیں - گھر کی مالکہ یہاں بیٹھ کر کھانا تقسیم کرتی ہے - ٹک پر دیوار کی طرف برتن وغیرہ رکھنے کے لیے جگہ بناتے

ہیں۔ اس کے اوپر الماریاں یا طاق بھی بنائے جاتے ہیں۔

۴۔ نغ : 'نغ' چار ہوتے ہیں۔ نمبر ۱ اور نمبر ۲ بیند سے تختوں کے ذریعے جدا کیے جاتے ہیں اور سونے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ نغ کو اینٹوں یا پتھروں کی دیوار کے ذریعے ''شوم'' سے الگ کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی بالائی طبقوں میں ان نغوں کے سامنے پردے ڈال کر ان کو کیبن (کھوکھر) کی شکل دے دی جاتی ہے، جسے مقامی طور پر ''پنزیر'' کہا جاتا ہے۔ نغ نمبر ۳ نماز پڑھنے کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور نغ نمبر ۴ برتن رکھنے اور سٹور کو جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔[۱]

کنبہ : کھو گھر کا سر براہ باپ ہوتا ہے اور گھر کے اندرونی معاملوں کی ذمہ دار ماں ہوتی ہے۔ ایک گھر میں اوسطاً سات افراد ہوتے ہیں۔ بالائی طبقوں کے ہر کنبے میں افراد کی تعداد اوسطاً تیس تک پہنچ جاتی ہے۔ جس میں ان کے نوکر اور نوکروں کے کنبے بھی شامل ہوتے ہیں۔

ذریعہ معاش : لوگوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر کاشت کاری ہے۔ جن علاقوں میں چراگاہیں زیادہ ہیں اور جو گاؤں کے نزدیک ہیں، وہاں کے لوگ کاست کاری کے ساتھ ساتھ بھیڑ بکریاں بھی پالتے ہیں۔ جہاں بھیڑیں زیادہ ہوں، وہاں لوگ گرم کپڑے (اونی پٹی) بُن کر روزی کماتے ہیں۔

رسومات

شادی : پندرہ بیس سال قبل شادی عام طور سے بچپن میں ہی کر دی جاتی تھی مگر اب یہ رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔

خفیہ طور پر لڑکی کے والدین کی رضا مندی حاصل کرنے کے بعد کسی مقررہ دن پر لڑکے والے بارات لے کر دلہن کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کا بڑے شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد شریعت کے مطابق نکاح پڑھایا جاتا ہے۔ حق مہر وغیرہ اپنی معاشی حالت کے پیش نظر مقرر کرتے ہیں۔ پھر دولہا کو زنانہ حصے میں اپنی ساس اور دوسری رشتہ دار خواتین سے ملنے لے جایاجاتا ہے۔ اس کے بعد دولہا اور دلہن کو درمیان میں بٹھا کر ان کے سامنے ایک تھالی میں بھرا ہوا پنیر رکھتے ہیں جسے یہ دونوں

---

(۱) عام استعمال میں ''بیند'' روش کو ''تک'' اونچے حصے کو اور ''نغ'' چبوترے کو کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ عرصہ دراز سے یہ الفاظ کھوار ختان کے ان مختلف حصوں کے لیے مستعمل رہے ہیں اس لیے اب یہ ذومعنی الفاظ بن گئے ہیں۔ ہاں البتہ لفظ ''شوم'' کے کوئی دوسرے معنی نہیں۔

مل کر کھاتے ہیں۔ اسے عرف عام میں ''اسپیرو بانوں'' (یعنی سفید کھانا) کہا جاتا ہے کہ ان میں سے جو بھی پہلے لقمہ اٹھائے، وہی آگے چل کر بالا دست ہوگا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام سے پہلے دولہا اور دلہن کے اس طرح بیٹھ کے ''اسپیرو بانوں'' کھانے سے نکاح کی رسم مکمل ہوجاتی تھی۔

نکاح ہوتے ہی دلہن کو دولہا کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا ہے۔ مگر عام طور پر جب بارات دلہن کو لے کر واپس ہوتی ہے تو دولہا کے گاؤں کے لوگ ناچتے گاتے ڈھول بجاتے اور بندوقیں داغتے ہوئے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ دن اور تمام رات رقص و سرور میں گذر جاتی ہے اس دوران جو بھی مہمان دور یا نزدیک سے آتے ہیں ان سب کی خاطر خواہ تواضع کی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ دلہن کو گھر لانے کے بعد جو کوئی بھی مبارک باد دینے کے لیے آتا ہے، اس کی خدمت میں حتی الوسع ''اسپیری'' یا سیرینی پیش کی جاتی ہے۔

پیدائش: اگر کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو بندوق داغ کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تمام رشتہ دار دوست و احباب اور گاؤں والے بچے کے لیے تحفے یعنی ''وارزا لا کھالی'' لے کر مبارک باد دینے آتے ہیں۔ سب مہمانوں کی حسب توفیق تواضع کی جاتی ہے اور متواتر تین دن تک اور کبھی کبھی سات دن تک رقص و سرور کی محفلیں جمتی ہیں۔ لڑکی کی پیدائش پر اس طرح جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔

اعلیٰ طبقوں اور خاص کر حکمرانوں میں اپنے بچوں کو رضاعت کے لیے کسی دوسرے خاندان کی تحویل میں دینے کی رسم عام ہے۔ یہ رضاعی والدین چھ یا سات سالوں تک اس بچے کی مکمل پرورش کرکے اس کو واپس اصل والدین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ رضاعی والدین اپنے سلوک اور پیار و محبت کے لحاظ سے بالکل اصل والدین جیسے ہوتے ہیں۔

کھو قوم کو جو سینکڑوں مختلف نسلوں سے بنی ہے، ایک قوم بنانے میں رضاعت کی اس رسم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حکمران خاندان اور دوسرے بڑے خاندانوں میں اس کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اس کے ذریعے ملک میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون حاصل کر لیتے ہیں۔

موت: کسی کی موت اس کے خاندان کے علاوہ تمام گاؤں کے لیے ماتم کا باعث ہوتی ہے۔ تمام گاؤں والے مل کر تجہیز و تکفین میں حصہ لیتے ہیں اور ایک یا دو روز تک اس غم زدہ خاندان کے کھانے اور دوسری ضروریات کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ تجہیز و تکفین کی رسومات شریعت کے مطابق عمل میں آتی ہیں۔

تہوار: تمام اسلامی تہوار مثلاً عیدین، عید میلادالنبی، شب برات اور شب معراج مناسب طریقے سے منائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل مقامی تہوار ہیں جو کہیں

کہیں منائے جاتے ہیں:

۱- نو روز- یہ ۲۱ مارچ کو منایا جاتا ہے- خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تہوار ایرانیوں کے دور کی یادگار ہے-

۲- اونشٹوں - یہ تہوار ''کوہ'' وادی میں مئی اور جون میں فصل ربیع کی کٹائی کے موقع پر منایا جاتا ہے-

۳- پھنڈک - بالائی چترال کی بعض وادیوں مثلاً لاسپور، یارخون اور کھوت میں ماہ جولائی کے شروع میں بھیڑ بکریوں کو پہاڑوں کے اوپر چراگاہوں کو لے جاتے وقت ''پھنڈک'' مناتے ہیں-

۴- پاتھاک دک- وادی لٹکوہ اور بالائی چترال کے بعض حصوں میں ماہ دسمبر کے آخری ہفتے میں یہ تہوار منایا جاتا ہے- ظاہر ہے کہ ایسے تہوار زمانۂ ما قبل اسلام کی یادگار ہیں-

یہ تہوار پہلے تمام کھو باشندے عام طور پر منایا کرتے تھے- مگر اب آہستہ آہستہ ان کا رواج ختم ہونا جا رہا ہے اور اس وقت یہ ان چند وادیوں میں ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں-

آداب و اطوار

آداب: ہر معاشرے کی طرح کھو معاشرے میں بھی بڑے اور چھوٹے، معزز اور غیر معزز کا اپنا مخصوص مقام ہوتا ہے- ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے، کلام کرنے، طرزِ پوشاک اور کھانا کھانے کے خاص آداب ہوتے ہیں- ان کی خلاف ورزی کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے-

طرزِ گفتار: کھو قوم نہایت نرم گفتار اور شیریں کلام مشہور ہے- کھووار زبان پر فارسی کے اثر نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے- ان کا ایک دوسرے کو خطاب کرنے کا انداز بھی نہایت دلکش ہوتا ہے- مثلاً ''ماژان'' (میری جان)- ''غچھوروشتی'' (میری لذت) وغیرہ قسم کے سینکڑوں الفاظ روزمرہ گفتگو میں عام استعمال ہوتے ہیں-

معاشرتی طبقے[۱]

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے چترال کی تاریخ نے یہاں معاشرے کو تین طبقوں یعنی آدم زادہ، ارباب زادہ یا یوفت اور فقیر مسکین میں تقسیم کیا تھا- یہاں ان کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے-

ان طبقوں کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ معاشرہ نے ان کے درمیان خلیج کو اور

---

(۱) Israr-ud-Din;—A Social Geography of Chitral State; Unpublished M.Sc. Thesis, University of London 1965: pp. 46-53.

وسیع کر دیا ۔ اور ہر طبقے کے ذمے مخصوص فرائض مقرر کر دیے ۔ اس کے علاوہ بعض اور پابندیاں بھی تھیں جو اگرچہ ہندو ذات پات کی طرح بہت سخت نہیں تھیں ، لیکن اس کے لگ بھگ ضرور ہوتی تھیں ۔ مثلاً شاہی خاندان والے اپنے ہی خاندان میں شادیاں کرتے تھے ۔ البتہ وہ معزز طبقے کی کسی لڑکی سے جو اگرچہ ان کے خاندان سے نہیں لیکن آدم زادہ طبقے سے تعلق رکھتی ، شادی تو کر سکتے تھے مگر اپنی بیٹی کو (سوائے زندرے خاندان کے جو کہ کسی زمانے میں بادشاہ ہوتے تھے) نہیں دیتے تھے ۔ معزز طبقہ کے لوگ آپس میں شادی کرتے مگر ارباب زادہ یا یوفت خاندانوں میں شادی کرنے کو برا سمجھتے تھے ۔ البتہ شاہی خاندان اور معزز طبقہ کے لوگ اس درمیانی طبقے سے دامسہ ضرور رکھا کرتے تھے ۔

چترال میں عہدوں کی تقسیم بھی اس طبقہ بندی کے تحت عمل میں آتی تھی ۔ مثلاً (ما سوائے چند کے) تمام بڑے عہدے آدم زادہ افراد کو ملتے ۔ مگر خوش قسمتی سے ہندو ذات پات کے طریقے کے برخلاف اسلامی اثرات کے تحت مختلف طبقوں کے لوگوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ میل جول میں کسی قسم کی کوئی بندش نہیں تھی ۔ چنانچہ ان میں اچھے معاشرتی روابط پیدا ہوتے گئے ۔

اس طبقہ بندی نے لوگوں پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے ۔ مثلاً یہ نام نہاد آدم زادہ طبقہ کے لوگ ہمیشہ ریاست کی معیشت پر بوجھ بنے رہے ہیں ۔ وہ اپنا کام پست طبقے کے لوگوں کے ذریعے کرا کر خود بیکار اور حکمرانوں کی خوشامد میں وقت گزارتے ۔ ان کے ذہنوں میں یہ خیال پختہ صورت اختیار کر گیا تھا کہ عام لوگ ان کے زر خرید غلام ہیں ، للہذا ان کی کوشش یہی رہتی کہ ان کی حالت بد سے بد تر رہے ۔ لیکن خواص کا یہ طبقہ آپس میں کبھی متحد نہ رہ سکا ۔ ان کی اندرونی سازشیں ، بغاوتیں ، بغض و حسد ، بدلتی وفاداریاں اور خطرناک کارروائیاں تاریخ چترال پر بدنما داغ ہیں ۔ صدیوں تک چترال میں وحشیانہ کھیل کھیلے جاتے رہے ۔ حکمران قتل یا ملک بدر ہوتے رہے ۔ حکومتیں بدلتی رہیں اور غربا کی حالت روز بروز ابتر ہوتی رہی ۔ ایسے حالات میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایک عام چترالی کی حالت کیا ہو سکتی تھی ۔ ان کے لیے اپنی قسمت کو اپنے ان خود ساختہ آقاؤں کے حوالے کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا ۔ نتیجتاً وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو سبق انہوں نے سیکھا وہ یہ تھا کہ ان آقاؤں کی خوشامد کر کے ان کے ہر حکم پر لبیک کہیں اور ان کو خوش رکھ کر اپنی زندگی کے چند روز آسانی سے گزار لیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا ایک عام کھو حد درجہ منکسر المزاج ، محکوم ، احساس کمتری میں مبتلا اور بے کس و لاچار نظر آتا ہے ۔ کھووار زبان کا یہ محاورہ کہ ''جو بھی میرا ملک لے وہ میرا بادشاہ'' چترالیوں کی حالت زار کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے ۔

ثقافت

کھووار ثقافت گرد و نواح کے علاقوں کے اثرات اور مقامی رنگ کے امتزاج کی حامل ہے اور اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے الگ پہچانی جاتی ہے۔

کھووار موسیقی: دنی، سادز اور اشور جان دھنوں کے علاوہ جن کے مطابق چترال کے لوک گیت بنائے جاتے ہیں، ذیل کی دھنیں بھی مشہور ہیں، جو صرف موسیقی کے آلات پر بجائی جاتی ہیں:

(۱) نماڑوار: یہ پولو کھیل کی دھن ہے۔ جو سات مختلف دھنوں کی ملاوٹ سے بنی ہے اور کھیل کے اعلان کے طور پر بجائی جاتی ہے۔

(۲) بکار شوار: یہ دھن نہایت ولولہ انگیز ہوتی ہے اور ایسے موقعوں پر جہاں لوگوں کو جوش دلانا مقصود ہو بجائی جاتی ہے۔ مثلاً لڑائی یا کھیل کے دوران میں یا کھیل کے آغاز پر۔

(۳) پون وار: سابق ریاست کے حکمرانوں یا کسی سرکاری مہمان کی آمد یا روانگی کے وقت بجائی جاتی ہے۔

(۴) ششتووار: یہ دھن کسی خوشی کی تقریب کے آغاز میں افتتاحیہ کے طور پر بجائی جاتی ہے۔

(۵) ژانگ وار: یہ لڑائی کے موقع پر لڑنے کے لیے روانگی کے وقت کی دھن ہے۔
اس کے علاوہ نمکین خرسک، شب دراز، بار وازی، دوش نان دوشی وغیرہ دیگر دھنیں ہیں۔

لوک رقص: چترال کے لوگ رقص و سرود اور کھیل تفریح کے بے حد دلدادہ ہوتے ہیں۔ اپنے محدود وسائل اور قدرتی مشکلات کے باوجود وہ ان مشاغل کے لیے وقت نکال لیتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ چترال کے لوگ (کھو) رقص اور گانے کو پیشے کے طور پر استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے بلکہ کوئی بھی نوجوان کسی موقع پر رقص کر کے داد حاصل کر سکتا ہے اس طرح اچھی آواز والا کوئی نوجوان گانا گا کے یا اپنے احباب کے ساتھ ''بزم'' پیش کر کے آفرین و تحسین وصول کر سکتا ہے۔ یہاں کے مشہور لوک رقص یہ ہیں۔

۱۔ دنی رقص: یہ رقص کسی دنی دھن پر پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ دنی دھن میں تال کبھی تیز اور کبھی آہستہ ہوتا ہے، اس لیے رقص کرنے والا بھی اس کے مطابق قدموں کو حرکت دیتا ہے۔ یہ رقص کافی پیچیدہ قسم کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے کافی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رقص ایک ہی آدمی اکیلا کرتا ہے۔

۲۔ سادز رقص: سادز رقص بہت تیز ہوتا ہے اور عوام میں زیادہ مقبول ہے۔ اس

میں ایک وقت میں ایک سے چار رقاص تک شامل ہو سکتے ہیں -

۳- ششتووار رقص: یہ گروپ رقص ہے ، جو کسی تقریب کے آغاز پر پیش کیا جاتا ہے - اصل میں ہوتا یوں ہے کہ خوشی کے موقع پر خاص کر کسی شادی کے موقع پر تقریب کے شروع میں دولہا کے رشتہ دار ، دوست احباب اور خود دولہا ششتووار دھن بجتے ہی میدان میں نکل آتے ہیں اور گروپ میں رقص کرکے تقریب کا آغاز کرتے ہیں -

۴- سوٹپی رقص: یہ تقریب کا اختتامیہ رقص ہوتا ہے - اس میں ناچنے والوں کا گروپ کبھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور علیحدہ علیحدہ چکر لگانے لگتا ہے - جب کہ ششتووار میں ایسا نہیں ہوتا ان کے علاوہ "پسموک" اور "نوہ تک" (شادی کے موقع کے رقص) ، تتاڑھی واواڑی رقص (یعنی مرغابی رقص) ، "بزباز" رقص (چیل کا رقص) ، تلوار رقص ، گھوڑا رقص ، سارس رقص ، کھو باشندوں کے مشہور ناچ ہیں -

ناٹک: چترال کے مشہور ناٹک یہ ہیں :

(۱) باروازی (۲) اژوک ساح اور (۳) حونگ رنگنٹی

بزم: بہت سے گانے والے مل کر کسی تقریب میں گانا گاتے ہیں اور ان کے ساتھ تمام حاضرین تالیاں بجاتے ہیں ، ان کے درمیان ایک یا دو ناچنے والے ناچتے ہیں اور اس طرح محفل گرم ہو جاتی ہے - اس کو مقامی طور پر "بزم" کہا جاتا ہے -

کھیل: پولو ، نیزہ بازی ، بزکشی ، گھوڑ دوڑ ، تمبوق (دوڑتے گھوڑے کے اوپر سے بندوق سے نشانہ بازی) ، رسہ کشی ، تیراکی ، پہاڑ کی دوڑ ، کشتی وغیرہ چترالیوں کے پسندیدہ کھیل ہیں - خاص کر کھو باشندے پولو کے مانے ہوئے کھلاڑی ہوتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ پولو کا رواج چترال اور گلگت کی وادیوں سے ہو کر تمام دنیا میں پھیلا - جس جوش و خروش کا مظاہرہ ان مختلف وادیوں میں پولو کھیلتے ہوئے کیا جاتا ہے ، وہ کہیں اور نہیں ہوتا - آج کل کے لوگوں میں فٹ بال کا کھیل بھی مقبول ہو گیا ہے -

ادب و ثقافت

ادب : کھووار زبان کا ادب اگرچہ تحریری صورت میں موجود نہیں ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ زبان اپنے ادب سے تہی دامن ہے - بلکہ زبانی صورت میں اس زبان کے ادب کا بیش بہا خزانہ موجود ہے - جو کہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آیا ہے -

کھووار زبان و ادب کے تحریر میں نہ آنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عرصہ دراز سے ان علاقوں میں فارسی زبان رائج تھی - چترال کے گرد و نواح کے علاقے میں بسنے والے فارسی بولتے اور ان کے اثر سے چترال کے اکثر لوگ بھی فارسی جانتے تھے - لٰہذا فارسی کے ہوتے ہوئے کھووار میں لکھنے کی طرف توجہ نہ دی گئی - علاوہ ازیں پرانے زمانے میں جو بڑے بڑے شعراء اور نامور ادیب تھے وہ زیادہ تر بلخ و بخارا وغیرہ کے مشہور مدرسوں کے فارغ التحصیل تھے - انہوں نے جو یادگاریں ورثے میں چھوڑی ہیں وہ بھی زیادہ تر فارسی[1]

---

(۱) سر زمین چترال نے کئی فصیح و بلیغ اور باکمال فارسی گو شعراء کو جنم دیا ہے - جن میں سے مولانا محمد سیر ، اتالیق محمد شکور ، شاہزادہ تجمل شاہ محوی اور وزیر زادہ معظم خان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ "اپنی فصاحت و بلاغت اور اختراع مضامین رنگین کے اعتبار سے میرزا صائب ، میرزا بیدل ، شوکت بخاری اور ناصر علی سرہندی کے ہم سر تھے - بلکہ مولانا محمد سیر کو ان سب پر فوقیت حاصل تھی" (میرزا غلام مرتضیٰ - نئی تاریخ چترال - پشاور ۱۹۶۲ء ، صفحہ ۳۰۹) ان کے علاوہ محمد مغا بن قرل بیگ ، شاہ سنگین علی ، میرزا اطہر ، زمانی ، ملا ہیچ ، وزیر زادہ مظفر خان ، شاہزادہ کوہکن بیگ ، شاہزاد محمد افضل بیگ فاضل ، میرزا محمد غفران اور مولانا فضل کریم کشم بھی قابل ذکر ہیں - ان شعراء نے غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، مخمس ، مسدس وغیرہ اصناف میں بے شمار شہ پارے یادگار چھوڑے ہیں - اتالیق محمد شکور کا دیوان غزلیات ، مولانا محمد سیر کا دیوان اور شاہنامہ چترال ، شاہزادہ تجمل شاہ محوی کی منظوم شرح قصیدۂ امالی اور مجموعۂ غزلیات ، ملا ہیچ کا مجموعۂ اشعار ، وزیر زادہ مظفر خان کا دیوان غزلیات ، وزیر زادہ معظم خان کا دیوان ، شہزادہ محمد افضل بیگ کا دیوان اور میرزا محمد غفران کے منظوم افکار آج بھی قلمی مسودات کی شکل میں موجود ہیں - مگر ان کی نشر و اشاعت کا مناسب بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے یہ دستبرد زمانہ سے تلف ہونے کے ہمکنار ہیں اور باہر کی دنیا ان پہاڑوں کے درمیان بند جواہر پاروں سے مستفیض ہونے سے محروم ہے - فارسی نثر نگاروں میں میرزا محمد غفران کا نام پیش پیش ہے ، جنہوں نے یہ تصنیفات چھوڑی ہیں : تشریح الاقاویل - درج الالی فی شر الاسالی - توضیح مولائیہ چترال ، حواشی فقہ اکبر ، تاریخ چترال ، تاریخ خلفائے راشدین ، سفرنامۂ ہندوستان - یہ سب غیر مطبوعہ ہیں - دور جدید کے فارسی شعراء میں ہزہائی نس محمد ناصر الملک مرحوم اور مولانا حبیب اللہ کے نام قابل ذکر ہیں - اول الذکر کی تین منظوم تصانیف صحیفة التکوین ، شرق الانوار اور تحفة الابرار شائع ہوئی ہیں -

میں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی کھووار ادب بجائے خود ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس زبان کے محاورے، ضرب الامثال، لوک کہانیاں، لوک گت اور مختلف اصناف سخن اور نادر تشبیہات اس ادب کا اہم سرمایہ ہے۔ ذیل میں ان کی مختصر مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

ضرب الامثال : ۱۔ ہو روسرے اوا رویدرے۔ اسورو کا ہوں دوئے۔(تو بھی زویدرے یعنی آدم زادہ خاندان سے اورمیں بھی رویدرے۔ ہور ہمارے گھوڑے کو کون زین لگائے گا)۔

۲۔ ہوباری س رسٹوموڑنو۔ (سیلاب سے بچ کر اوالانچ یعنی برف کے سیلاب کے سچے)۔

۳۔ نوم آڑو کو ی ہو۔ سوم رویو لو ہو۔(خراب قسم کے کدو کا بیج زیادہ ہوتا ہے اور خراب آدمی کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں)

۴۔ بری یاک میں تکی(Teki) کھاڑاوے ریر (مرنے والا ''تک'' پر (کھووار کمرے کے ایک طرف کا حصہ) اسے آپ کو دفن کرانے کی وصیت کرتا ہے۔ یعنی ناممکن چیز کی خواہش کرنا ہے)

محاورے : ۱۔ بوستو موژی سونج ماستکک (بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کی تلاش۔ یعنی ناممکن کام)۔

۲۔ سلوف دریک۔ (دل میں ہتھیلی ڈبونا۔ مرے کرنا یا پانچوں گھی میں ہونا)۔

۳۔ آپا کا اوغ بیچ بونک۔(منہ میں پانی گرم نہ رکھ سکنا۔ یعنی کم ظرف ہونا) اور کوئی بات بھی چھپا نہ سکنا)۔

۴۔ ماستے اکا یوروے سک (ماسپے ایک نامی جگہ پر طلوع آفتاب کا انتظار۔ یعنی فضول توقع۔ یاد رہے کہ سردیوں کے موسم میں سورج بعض جگہوں پر جن میں سے ماستے ایک بھی ایک ہے، نظر نہیں آتا۔ کیونکہ پہاڑوں کے پیچھے سے گزر جاتا ہے۔ ایسے موسم میں ان مقامات پر طلوع آفتاب کا انتظار کرنا فضول ہے)۔

لوک کہانیاں : کھووار زبان میں بے شمار لوک کہانیاں، قصے اور داستانیں موجود ہیں۔ ان کو عام طور پر مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ سبق آموز کہانیاں : اس قسم کی کہانیوں میں زندگی کے حالات ایسے پیرائے میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے کوئی اہم سبق دینا مقصود ہو۔ مثلاً :

(الف) دو شہزادوں کی کہانی جس میں دو بھائیوں کی آپس میں محبت اور ایک دوسرے کے لیے تکلیف و مصائب برداشت کرنے کے واقعات ہیں۔

(ب) سوتیلی ماں کی کہانی جس میں سوتیلی بیٹی کے ساتھ اس کے ظالمانہ سلوک کا

بیان ہے ۔ مگر آخیر میں حالات ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ اس کی سوتیلی بیٹی ملکہ بن جاتی ہے اور وہ خود ذلیل و خوار ہو کر اس کی محتاج بن جاتی ہے ۔ لیکن سوتیلی بیٹی اس کے ساتھ اس کی برائیوں کے بدلے میں اچھا سلوک کرتی ہے ۔

(ج) شیر اور شکاری کی کہانی میں یہ بتایا جاتا ہے کہ احسان اگر شیر جیسے خونخوار جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو وہ احسان مند ہو جاتا ہے اور اسے فراموش نہیں کرتا ۔

(دوسری کہانیاں مندرجہ ذیل ہیں)

(د) سوتیلے بھائیوں کا دھوکہ اور شرمندگی

(ہ) عیار بیوی اور اس کا حشر

(و) مغرور بادشاہ اور اس انجام

۲۔ مہماتی کہانیاں : ان میں دیو پریوں اور بادشاہوں کے ایسے قصے شامل ہیں جو عام طور پر مہماتی قسم کے ہوتے ہیں ۔ ان سے یہ سبق دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان کس طرح خطرناک مہم میں بھی کامیابی حاصل کر لیتا ہے ۔ ان کہانیوں میں دیو پریوں کے ساتھ انسانوں کے تعلقات کا ذکر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کون سی مخلوق انسان کی دشمن ہے اور کون سی اس کی دوست ۔ اپنے دوستوں کی دوستی برقرار رکھنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے اس کو کون سے حربے استعمال کرنے چاہئیں ۔ مہماتی کہانیوں میں سے چند ایک یہ ہیں :

(الف) سات شہزادے اور سات شہزادیاں

(ب) طوطا اور شہزادی

(ج) اندھا دیو

(د) سات سروں والا دیو

(ہ) آسمان پری

۳۔ مزاحیہ حکائتیں : ان میں مختصر حکائتیں شامل ہیں جنہیں مزاحیہ انداز میں یہ واضح کرنے کے لیے بنایا گیا ہے کہ دیہات اور وادیوں کے بعض لوگ کتنے سادہ اور بھولے بھالے ہوتے ہیں ۔ مثلاً :

(الف) گدھی کا انڈا (گورو وغو آیو کن) ۔ یہ ایک سادہ لوح دیہاتی کا قصہ ہے ، جس نے خربوزے کو گدھی کا انڈا سمجھا تھا ۔

(ب) عقاب کی پوستین پہن کر اڑنے والے کا حشر ۔

(ج) نمک کاشت کرنے والے کا انجام ۔

(د) چترالی اور بدخشانی کا قصہ: اس میں ایک چترالی کی حاضر جوابی اور بدخشانی کی خفت اور شرمندگی کا ذکر ہے۔

رومان: کھووار زبان میں کئی رومان بھی موجود ہیں۔ ان میں محمد سیر کا رومان ، ڈوک یخدیز کا رومان، نرچھے خان کا رومان ، اکان کا رومان ، آمان کا رومان ، لالو کا زانگ کا رومان اور شیر ملک کا رومان مشہور ہیں۔ ذیل میں مختصر طور پر محمد سیر اور ڈوک یخدیز کے رومان کا ذکر کیا جاتا ہے:

محمد سیر کا رومان: محمد سیر (جو چترال کا مشہور شاعر ہے) کا رومان عوام اور خواص سب میں بے حد مقبول ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ رستین نامی گاؤں میں ایک حسینہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ حسینہ کسی اور شخص کی بیوی ہے۔ اس وجہ سے سیر کافی عرصے تک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف دل کے ہاتھوں مجبور اور دوسری طرف ضمیر کی ملامت کا شکار۔ آخرکار نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی کی راہ بدل گئی۔ اس نے اپنا فلسفہ یہ بنا لیا کہ:

ستویو صحبتو ساری دو دیریو زنہا ما بو خوش
التی پستاں بیکو سار نو آلتی ارمان ما بو خوش

یعنی محبوب کا قرب حاصل ہونے سے یہ بہتر ہے کہ دور سے اس کی تمنا رہے۔ وصال کا نتیجہ پشیمانی کے سوا کچھ نہیں اس لیے فراق کی حالت میں مدام آرزو کرتے رہنے میں مجھے زیادہ خوشی رہے گی۔

اس طرح سیر کا عشقِ مجازی حقیقی عشق میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنی محبوبہ کی یاد میں شعر کہتا، روتا اور تڑپتا۔ مگر اس کو اپنانے کے لیے اُس نے کبھی جد و جہد نہیں کی۔ اُس کی معشوقہ کے شوہر نے اُس کو طرح طرح سے آزمائش میں ڈالا۔ وہ سب پر پورا اترا۔ اس کی وفات کے بعد اس کو شہیدِ عشق کا درجہ دے دیا گیا۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں سے اب اس کا مقبرہ زیارت گاہ خاص و عام ہے اور ان کی محبت اور اس کے گیت لافانی ہو گئے ہیں۔

ڈوک یخدیز کا رومان: یہ ایک ''میاں بیوی'' کا قصہ ہے جو کئی سو سال ہوئے تور کھو کے ڈوک یخدیز (کھوت) گاؤں میں رہتے تھے۔ پرانے زمانے میں جب چترال کی سرحدیں گلگت تک پھیلی ہوئی تھیں تو اس وقت یہ دستور تھا کہ چترال کے مختلف حصوں کے لوگ سالانہ باری باری جا کر بیگار کے طور پر وہاں کے قلعوں کی رکھوالی کیا کرتے تھے اور ایک سال گذارنے کے بعد واپس آ جاتے۔ ڈوک یخدیز والا ''میاں'' بھی ایک دفعہ اس سلسلے میں درشکوم (گلگت ایجنسی) کے قلعے کی

رکھوالی کے لیے گیا - مگر کئی سال تک واپس نہ آیا - پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل اب بھی بے حد خراب ہیں مگر اس زمانے میں حالات ناگفتہ بہ تھے - اس لیے ''میاں'' کی طرف سے کوئی اطلاع گھر نہ پہنچی - جب کافی انتظار کے بعد بھی وہ نہ آیا تو اُس کے سسرال والوں نے یہ سمجھا کہ وہ مر گیا ہوگا - چنانچہ انہوں نے اپنی بیٹی کی دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا -

شوہر کی جدائی میں لڑکی کا پہلے ہی برا حال تھا اب دوسری شادی کے فیصلہ سے اسے بڑا سخت صدمہ ہوا - اُس کو یقین تھا کہ اُس کا خاوند زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور واپس آ جائے گا - چنانچہ اُس نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا - مگر اُس کی کون سنتا تھا - چنانچہ شادی کا دن مقرر کر دیا گیا ، مگر خدا کی قدرت کہ عین رسم نکاح کے وقت اُس کا شوہر واپس آ گیا اور بچھڑے ہوئے میاں بیوی دوبارہ مل گئے [1]-

لوک گیت : کھووار زبان میں گیتوں کو ''باسونو'' (Bashonu) کہتے ہیں - ان میں عشق و محبت کے علاوہ ذیل کے موضوعات کو بھی نظم کیا جاتا ہے :

(۱) لوری یا ''مہر و باسونو'' - جن میں ماؤں کی طرف سے بچوں کے لیے بنائے ہوئے گیت شامل ہیں -

(۲) بابل گیت یا ''ڈوک زور'' - یہ گیت بیٹی کی رخصتی کے وقت گائے جاتے ہیں - ان میں بیٹی کی جدائی میں ماں کے جذبات کا بیان ہوتا ہے -

(۳) نوحہ یا مرثیہ - ان میں ایسے گیت شامل ہیں جو کسی بیوی نے شوہر کی موت یا ماں نے بیٹے کے ماتم یا بہن نے بھائی کے غم میں یا کسی دوست نے دوست کی جدائی میں گائے - یہ گیت درد سے لبریز ہوتے ہیں -

(۴) جنگ یا کسی یادگار واقعہ کی یاد میں کہے ہوئے گیت - یہ اگرچہ زیادہ نہیں لیکن ایسے کچھ گیت موجود ہیں - ان میں سے ایک جو بہت مقبول ہے وہ چترال کے مشہور شاعر جیئن کا ہے جس نے ۱۸۶۸ء میں محمود شاہ والئی بدخشاں کی چترالیوں کے ہاتھوں شکست کے موقع پر لکھا تھا - (ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے دور قدیمہ) اس طرح ۱۹۱۹ء میں کسی نا معلوم شاعر نے افغانستان اور چترال کی جنگ کے خاتمے پر ایسا ہی گیت گایا تھا -

---

(۱) ڈوک یخدیز کے گیتوں کی دھن اب بھی زندہ ہے - مگر گیتوں کے بول بہت کم لوگوں کو یاد ہیں اور وہ بھی مکمل طور پر نہیں -

(ہ) بعض ایسے گیت بھی ہیں جن میں کسی جانور یا بے جان چیز کے احساسات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں مقبول ترین ''سارو باسونو'' یعنی مارخور کا گیت ہے۔ یہ گیت مادہ مارخور اور اس کے بچے کے درمیان مکالمے کی سکل میں ہے۔ بچہ سکاری کو آتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور ماں اس کو تسلی دینے کی کوشش کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

نانئے! نانئے! اف ہرا کا گویان
(ماں! اے ماں! وہاں کون آ رہا ہے؟)
(ماں کی جان! جنگل کا کوئی گڈریا ہوگا)
نانو ژاشے! آنو باز ال نودا
(ماں! اے ماں! بندوق کی چمک نظر آ رہی ہے)
نانئے! نانئے! بھوویک ژاہپئے کا پرائے
(نہیں) ماں کی جان! وہ تو سورج کی شعاعوں کی چمک ہے)
(ماں! اے ماں! میرے سینے سے خون بہہ رہا ہے)
(ماں کی جان! یہ تو گرمی کی وجہ سے پسینہ بہہ رہا ہے)
(ماں! اے ماں! یتیموں کی (اب) کون پرورش کرے گا)
(ماں کی جان تمہارا خدا تمہارا رکھوالا ہوگا)

اس گیت میں ایک ایسی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے جو انسانی ہمدردی سے بہت بلند ہے۔ یہ گیت سکاری سکار کرکے واپس گھروں کو آتے وقت گاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور گیت ''بایو باسونو'' یعنی بکری کا گیت ہے۔ جس میں ایک بکری اپنے مالک کے برے سلوک کے بارے میں ساکی نظر آتی ہے۔ ایک اور گیت ''خورو باسونو'' یعنی چکی کا گیت بھی ہے۔

لوک گیت اور موسیقی: کھووار لوک گیتوں اور موسیقی میں چولی دامن کا ساتھ ہے جس طرح اُردو یا ہندی گیتوں کی دھنیں مختلف راگوں کے مطابق ترتیب دی جاتی ہیں، اسی طرح تمام کھووار گیتوں کی دھنیں بھی مندرجہ ذیل دھنوں کے مطابق ترتیب دے کر بنائی جاتی ہیں۔ مثلاً:

(الف) دنی (ب) ساوز اور (ج) اشور جان۔

(الف) **دنی**: اس قسم کی دھن کبھی اونچی اور کبھی نیچی ہوتی ہے اور مضمون ہجر و فراق کا حامل ہوتا ہے۔ یہ گیت عام طور پر آدمی اکیلا گاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی اسے دو آدمی مل کر بھی گا لیتے ہیں۔ ذیل میں دو دنی گیت بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

مہتر محترم شاہ کا دنی گیت (سولھویں صدی عیسوی)

(۱) مہ دوست مہ گادیری اریر ۔ مدنن سار دو دیری اریر ۔ مہ گل خانو بیری اریر
(میری معشوقہ نے مجھے پاگل بنا دیا ہے ۔ مجھے اپنے سے جدا کر دیا ہے اور مجھے بے گھر بنا دیا ہے)

(۲) پست مصرع جو کہ ہر بند کے بعد آتا ہے ۔
ژانو سار خوش تو نان ۔ دوست کی مانے نو بوسان ۔ مہ کبہ جاحت یہ وطان ۔
ڈق وطا نار بے وطان مہ تیتو مانے کورے ۔ اللہ ہے نگہبان تو نان ۔
(میری جان سے تو مجھے زیادہ پیاری ہے ۔ اگر تو مری نہیں ہوتی تو مجھے اس وطن کی بھی ضرورت نہیں اور میں اس وطن سے چلے جانے کو ترجیح دوں گا ۔ میری خواہش پوری کر ۔ اے میرے اللہ تو ہی میرا نگہبان ہے ۔
میں تمام ملک میں دوا کی تلاش میں سرگرداں ہوں کیونکہ میں بیمار ہوں ۔ لیکن میری اس بیماری کے لیے جو اصل دوائی ہے وہ تمہارے میٹھے بول ہیں) ۔

۲۔ پشت مصرع ۔
(جب سے میں اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہوں ۔ تمہارے نازک بدن کا دیوانہ ہوں ۔ میری حالت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے پیاز کو ملتے ہوئے گھی پر ڈالیں پھر دیکھیں، جو اس کی حالت ہو گی وہی حالت مرے دل کی ہے ۔

(ب) **ساوز :** اس قسم کی دھنیں اگرچہ شروع میں آہستہ ہوتی ہیں لیکن بعد میں تیز ہو جاتی ہیں اور آخر میں ان کا سر کافی اونچا ہو جاتا ہے ۔ عام بزموں میں ایسے گیت گائے جاتے ہیں جن میں ایک سے زیادہ گانے والے حصہ لیتے ہیں ۔ ایسے گیتوں کے مضامین عام طور پر درد و فراق سے بھرے ہوتے ہیں ۔ مگر کبھی کبھی ایسی دھنوں میں ہلکے پھلکے موضوں پر بھی گیت بنائے جاتے ہیں ۔

ایک دھن ''کابلی ساوز'' بھی ہے جو شروع سے اخیر تک اونچی اور تیز ہوتی ہے ۔ ذیل میں ساوز دھن کے مطابق لکھے گئے ایک گیت کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

بوڈوڑ کا گیت (انیسویں صدی)

یہ گیت بوڈوڑ نامی ایک آدمی کی بیوی نے اپنے شوہر کی یاد میں جو کہ دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا گایا تھا ۔

۱۔ ترجمہ : بوڈوڑ کے پیچدار اور گنگھریالے بال اس کے سینے پر آویزاں ہوتے تھے ۔
اے بوڈوڑ ! تیرے جاننے والے تمام لوگوں کے دل تیری جدائی میں
ایسے بن گئے ہیں ،

جیسا کہ بھنا ہوا گوشت ہوتا ہے۔
ہائے افسوس ! سیر کا بچہ بوڈوڑ کہاں چلا گیا ؟
(نوٹ۔ یہ مصرع ہر سعر کے بعد دہرایا جاتا ہے)

۲۔ ترجمہ : اے بوڈوڑ ! میرا اوڑھنا بچھونا میرا سب کچھ تو تھا۔
اب (تیرے بعد) تیری اس فقیرنی کے لیے تیری قبر کے گردا گرد
(پروانے کی مانند) گھوم کر زندگی گزارنے کے بغیر اور کیا چارہ ہے۔
ہائے افسوس ! سیر کا بچہ بوڈوڑ کہاں چلا گیا ؟

(ج) **اشور جان :** یہ گیت درد و فراق سے بھرے ہوتے ہیں اور ان کی لے بھی بے حد درد انگیز ہوتی ہے۔ ان گیتوں کا نام اشور جان، جو کہ آشوب جان (یعنی دل کے آنسو) کی بگڑی سکل ہے، ان گیتوں کی اس خاص خصوصیت کی وجہ سے پڑ گیا ہے۔

اس قسم کے گیتوں کو ایک آدمی اکیلا گاتا ہے یا دو آدمی باری باری مختلف حصے گا لیتے ہیں۔ یعنی اسور جان گیتوں کے بول دو آدمیوں (مثلاً عاشق، معشوق یا دو دوست وغیرہ) کے درمیان مکالمے کی سکل میں ہوتے ہیں اور بعض میں یک طرفہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

اسور جان گیت عام طور پر رات کے آخری حصے میں گائے جاتے ہیں اور سننے والا سیے ستے نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح اسے رات کی راگنی سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ چترالی لوک گیتوں میں اشور جان کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔

اشور جان گیت (شاعر نامعلوم)

(۱) روئے مہ نانوتے دے نان سہ بہ ژار گدیری وسواسی
اے گدیری رویان نہ اوا وسواسی نہ اوا گدیری
اوا بن رفیقو بن بلبلٔ افاسی
دوست مہ حقا دریاہ ادا بیا بانو پونگا تاق ما حھی

ترجمہ : لوگ میری ماں سے کہتے ہیں کہ
تمہارا یہ بیٹا پاگل اور مخبوط الحواس ہے۔
اے دیوانے لوگو! میں نہ پاگل ہوں اور نہ ہی بد حواس ہوں۔
میں صرف اپنی محبوبہ کا مشتاق دید ہوں۔
میری معشوقہ دریا کی مانند ہے اور میں ایک بیابان پر پڑی ہوئی پیاسی

مچھلی ہوں۔

(۲) روئیے مسہ نانوتے رینیان ''تسہ یسہ ژا و گدیری

تساں یسہ گدیریو حسحھاوے تسہ تے مال نوبوئے

اے گدیری رویاں شوم بیستی حطانہ ما ژاد حال نوبوئے

کی بے ساتے نقصان بھے مرور گدیریو کیہ ہوال نوبوئے

ترجمہ : لوگ میری ماں سے کہتے ہیں۔

تمہارا یہ بیٹا دیوانہ ہے پاگل ہے۔

اس کو سمجھاؤ۔

(ورنہ) اس سے تمہیں کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔

اے دیوانے لوگو! میرا بیٹا بُرا بن کے اس وطن میں نہیں رہے گا۔

اگر اس کی وجہ سے تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہے یا کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کو مار ڈالو۔

یقین کرو کہ اس سے تمہیں کسی قسم کا گناہ نہ ہوگا۔

تشبیہات اور استعارے : کھووار گیت اپنے ماحول کی پیداوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گیتوں میں اس خطے کے قدرتی مناظر کا حسن اور سادگی ہے۔ خیالات اور جذبات میں برفانی چشموں کی بے ساختگی اور پاکیزگی اور لہلہاتے کھیتوں کی سی دلکشی اور فلک بوس کوہساروں کی وسعت ہے۔ تشبیہیں اور استعارے بھی گرد و نواح سے متاثر ہیں۔ محبوب کی خوب روئی کے لیے سرخ سیب، عناب، بنفسہ، پہاڑی چشمہ اور ہرن کی تشبیہیں دی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مینا، بلبل، باز، شہباز (''سا یورج'') وغیرہ پرندوں سے بھی مشابہت پیدا کی جاتی ہے۔ معشوق کے سر کو ''کھابنجوڑ کاپے لی'' یعنی ریشم جیسے، اس کے گلے کو ''چھیر گوڑی'' یعنی دودھ جیسا اس کے لبوں کو ''شوں لعل'' ''یعنی لعل کے ساتھ، دانتوں کو موتی یا دردانہ اور اس کے قد کو ''نخل صنوبر'' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ عشق کے میدان کو ناقابل گزر جنگل اور بیاباں، معشوقہ کو ''موجیں مارتے ہوئے سمندر''، عاشق اپنے آپ کو گردش کرتا ہوا بھنور باندھتے ہیں۔ بڑھاپے کے لیے جاڑے کی مثال اور اس قسم کے بے شمار استعارے موجود ہیں۔

کھووار شاعری میں بے شمار القابات بھی ہیں۔ مثلاً محبوب کو ''مہ ژان'' (جانم)، دوست (دوست)، رفیق، دردانہ (درد)، ''سہاردیو باہیں'' (دل کا حصہ)۔ ''میرژوری'' (یعنی پری زادی) لقب دیے جاتے ہیں۔ حریف کو جو کہ عام طور پر معشوقہ کا خاوند ہوتا ہے۔ ''دایوس'' (ناکارہ)۔ ڈستان (حریف)۔ کوڑ (کبڑا یعنی جس کی کوئی شخصیت نہ

ہو) وغیرہ اور عاسق انئے لیے ڈف (لڑکا) ، حق ڈق (چھوٹا لڑکا) ، فقیر ، ملنگ ، جوان مجنوں ، مخبوط الحواس گدیری (دیوانہ) وعیرہ نام استعمال کرتے ہیں -

کھووار شعرائے دور قدیم : کھووار ساعری زیادہ نر لوک گیتوں پر مشتمل ہے ، جن کا دکر اوپر آ چکا ہے - پرانے گیت اگرچہ سینہ بہ سینہ حلے آنے کی وجہ سے اب تک زندہ ہیں ، مکر بہت سے برانے گیت نگار شعرا کے نام جنہوں نے ان کو زندہ رکھا ، ذہنوں سے اتر گئے ہیں - جو نام معلوم بھی ہیں مثلاً گل پسر ، پھورو ژوک ، امان ، رستم وغیرہ ان کے مکمل حالات کا ہمیں علم نہیں - البتہ خوش قسمتی سے مرزا محمد غفران مرحوم[1] کی تحقیق اور کاوسوں کے نتیجے میں ہمیں چترال کے کئی ایسے فارسی گو سعراء کے حالاتِ زندگی اور طرزِ کلام کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں ، جنہوں نے کھووار زبان میں گیتوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن یعنی قصیدہ ، ہجو ، غزل ، مخمس اور نظم میں طبع آزمائی کی اور اس ادب کو ان اصناف سے روسناس کیا - ذیل میں ان کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں :

۱- اتالیق محمد شکور غریب : یہ ۱۷۰۰ء کے بعد کھووار ساعری کی طرف متوجہ ہوئے - کھووار میں ان کی غزلیں مسہور ہیں جو مختلف بحور اور اوزان میں کہی گئی ہیں - چونکہ وہ کھووار اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے اس لیے انہوں نے فارسی تراکیب و اسالیب بیان کو کھووار ادب میں استعمال کیا - ان کا رجحانِ طبع عشقیہ غزلیات کی طرف زیادہ تھا - اس لیے ان کے کلام میں حسن و عشق کی کیفیات کا اظہار پایا جاتا ہے -

نمونۂ کلام

اے دل تو یکی سیر بعالم نوکوروس کو
یک چند تماشائے دش جام نوکوروس کو

(اے دل ! تو ایک دفعہ اس دنیا کی سیر کرکے یہاں کی اچھائیوں اور برائیوں کا تماشا دیکھ کیوں نہیں لیتا) -

بیدل کہ او سویئے موس نو برير عزتہ ہرگز
عزت کہ نہ خوش بن سرد رستم نوکوروس کو

(ایک بردل آدمی کبھی بھی معزز نہیں بن سکتا - اگر تو عزت چاہتا ہے تو اپنے آپ کو رستم کیوں نہیں بناتا) -

---

(۱) میرزا غلام مرتضیٰ - نئی تاریخ چترال (اُردو) پشاور ۱۹۶۲ ع - ص ۴۱۰ تا ۴۱۴ اور صفحہ ۴۲۶ تا ۴۳۲ -

از تیر غم عشق تو پردی ہمہ لیے کھوپئے
وز لطف طبیا مہ تے مرہم نوکوروس کو

(تیرے عشق کے تیر نے میرے دل کو لہولہان کرکے رکھ دیا ۔ اے میرے طبیب! تو مجھے اپنے لطف و کرم کا مرہم کیوں نہیں لگاتا)

سمشاد تہ نوپوشی تہہ کورویئے دعوی قامت
اے نخل صنوبر نغو ملزم نوکوروس کو

(شمشاد نے تجھے نہیں دیکھا اس لیے اپنی قامت پر نازاں ہے ۔ اے نخل صنوبر! تو سامنے آکر اس کو سرمندہ کیوں نہیں کرتی) ۔

سہباز غم ہجر تو جو چوں شمع کڑیران
تن وصلہ غریبو نو بے غم نوکوروس کو

(تیری جدائی میں شہباز مثل سمع آنسو بہا رہا ہے ۔ تم اس غریب کو وصال بخش کر کیوں اس کی اسک سوئی نہیں کرتے) ۔

۲- مولانا محمد سیر سیرؔ : (۱۷۸۸ء — ۱۸۳۸ء) یہ شاہ کٹھور کے عہد کا شاعر تھا ۔ اس کی کھووار غزلیں اور گیت زبان زد خاص و عام ہیں ۔ اس کے کلام میں چترالی ماحول کی نادر تشبیہات و استعارات پائی جاتی ہیں ۔ اس نے کھووار میں اشعار کہنے کے علاوہ چترال کے وقائع کو ''شاہنامہ ٔ چترال'' کی صورت میں فارسی میں قلمبند کیا ہے اس کی فارسی غزلیات کا مجموعہ بھی موجود ہے ۔ اس کو چترال کا عظیم ترین شاعر خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کے کلام میں حسن و عشق اور مناظرِ قدرت کا بیان پایا جاتا ہے ۔ اس نے رنج و غم کی زندگی کی اپنے کلام میں جس طرح عکاسی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :

نمونہ ٔ کلام از محمد سیر

(۱) ویزے نیں غم ژیبومان چھوچیے نین دوقت ماہاسی
تو مہ قسمتو کھشتی نیزے مہ دریا ہو ناسی

ترجمہ : اے میرے محبوب! غم میرے لیے شام کے کھانے کا کام دیتا ہے
اور مصائب میری صبح کا ناشتہ ہیں ، تو ہی میری قسمت کی کشتی ہے
اور تو ہی مجھے اس رنج و الم کے سمندر کے کنارے تک پہنچا سکتا ہے ۔

(۲) شون لعل دون دردانہ مہ ژنو ہارلو نمکین
چھیتی مہ کرونگو سیارو ہاردی یوباتیں

ما روح عافانان پاسز ران کی نان ہوستین مہ مریر ۔ ارمان ہیں!

ترجمہ : (یہ ہر بند کے بعد دہرایا جاتا ہے)
تیرے لب مثل لعل اور تیرے دانت دردانہ کی مانند خوبصورت ہیں ،
اور تیری ہر بات میں نمکینی (لذت) ہے -
یہ سب کچھ دیکھ کے سیر کا دل ڈوب جاتا ہے
اور پھر ٹوٹ کے اس کے جسم کے اندر گر جاتا ہے -
کاش! ایسی حالت میں اگر تو اپنے ہاتھوں سے مجھے مار ڈالتا ،
تو میری روح کو بڑے بڑے داناؤں کا دیدار نصیب ہو جاتا -

۳- شہزادہ تجمل شاہ محوی : شاہ کٹور مہتر چترال کے فرزند تھے اور بڑے عالم شخص تھے - انہوں نے طبع رواں پائی تھی - انہوں نے فارسی اور کھووار میں عارفانہ مضامین میں اشعار کہے ہیں :

نمونۂ کلام

دنیـائی آسکـو قـرارنـکی   پھتـکن سورا اشـرو بـارنـکی
ژـندگانی یـو اعـمـارنـکی   ہر چکو عمر و سوم کیہ کارنکی
ہیچ کـلا اسناری پـائیدارنـکی

ترجمہ : اس دنیا میں رہائش ایک ناپائیدار چیز ہے -
اس کی مثال پلکوں پر آنسوؤں کے قطروں کے بوجھ کی سی ہے -
زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں -
عمر کے ساتھ (لفظ) ''دوام'' کا کوئی سروکار نہیں -
(اور) یہاں پر کوئی سے بھی پائیدار نہیں -

(۲) خلق بے ہودہ آرزو کورونی   تن مری ہت بو گمگو گورونی
ئمیریان مشکی جستجو کورونی   کمریان تن مخی پورو کورونی
لوڑیکو چھک رینی کہ یارنکی

ترجمہ : لوگ فضول آرزوئیں کرتے رہتے ہیں -
آپس میں بھی وہ جھگڑتے رہتے ہیں -
حسیناؤں کی تلاش میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں ،
اور حسینائیں (اپنی کشش بڑھانے کے لیے) سنگار کرتی ہیں -
(لیکن انجام کار) سب بے یار یعنی اکیلے رہ جاتے ہیں -

(۳) محو یانکی آخرت دو دیری   دینوسم ای ییتی آسوس گدیری

کلہ پت بہچس عاقبت ہہ دیری   شوغو ژغا کھیوتے کوس تو ژیری
تو کہ کار کوس مگر ہہ کارنکی

ترجمہ: اے محوی! آخرت اتنی دور نہیں جتنی کہ تم سمجھتے ہو،
اور دنیاوی دھندوں میں مگن پاگل بنے ہوئے ہو۔
آخر کب تک یہاں رہو گے؟
کوئی ہمیشہ تو تم نے یہاں رہنا نہیں۔
پھر بھی تم ماتم کرنے کے بجائے خوشیاں منا رہے ہو۔
کاش تم سنتے مگر تمہارے کان نہیں ہیں۔

۴۔ جین: یہ کھووار زبان میں بدیہہ گوئی کیا کرتے تھے اور مشہور ہجو گو شاعر بھی تھے۔ ۱۸۶۸ء میں محمود شاہ والئی بدخشاں کی چترالیوں کے ہاتھوں شکست کے موقع پر انھوں نے ایک مخمس کہی ہے جو خاص طور پر مقبول ہے۔ ذیل میں اس سے دو بند پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) محمود شائے تہ ارمنہ   میتار نویس تہ فرمانہ
کلہ ڈوبے ہہ در بند   ژائی روؤ سوژائی بیریہ
دوژ دیکو یو گیک بیریہ

ترجمہ: اے محمود شاہ! ہم تمہارے ''آرزو مند'' ہیں،
اور مہتر (والئی چترال) کا پونہ تمہارے ''انتظار'' میں ہے!
دربند (یارخون کا دربند جہاں یہ لڑائی لڑی گئی تھی) پر تمہاری لاشیں بھری پڑی ہیں۔
تم ان کو (مہتر کے ہوتے کو) غدار سمجھتے تھے۔
کیا ایسا ہوا؟
اور (خواہ مخواہ) تم ایسی زبردست مار کھانے کے لیے آ گئے!

(۲) پھرار کھیونن ہاد ہری   محمود شاہ برائی گدیری
کاغا نوچیے شو نتھوران ژیری   ژائی راوشوؤ ژای بیریہ
دوژ دیکو یو گیک بیریہ

ترجمہ: تم اتنی دور سے کیوں یہاں آئے؟
محمود شاہ! تم دیوانے تھے (جو تم نے یہ غلطی کی)!
(اب) کوؤں اور گدھوں کے مزے ہو گئے ہیں۔
تم ان کو غدار سمجھتے تھے۔

کیا ایسا ہوا ؟
اور تم (خوامخواہ) اسی زبردست مار کھانے کے لیے آ گئے ؟

۵- ووری : یہ قصیدہ گو شاعر تھا اور مہتر امان الملک کے عہد (۱۸۵٦ء — ۱۸۹۲ء) میں گزرا ہے ۔ یہ جس کا ہمعصر تھا ۔

٦- صوفی نظام الدین : ان کو کھووار زبان میں فی البدیہہ شعر کہنے میں یکتائی حاصل تھی ۔

موجودہ دور

دور جدید کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ریاست چترال نے ۱۸۷۹ء میں مہاراجہ کشمیر اور ۸۸-۱۸۸۷ء میں برٹش انڈیا کے ساتھ معاہدات کرکے کوہ ہندوکش کے جنوبی علاقہ جات کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے ۔ اس کے بعد اس ریاست کے باشندے آہستہ آہستہ شمالی علاقوں سے دور ہوتے گئے اور آخر کار جب ۹۳-۱۸۹۲ء میں ڈیورنڈ لائن ڈال دی گئی تو ان علاقوں سے ان کا تعلق ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا ۔ اس وقت سے اب تک ریاست میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں وہ جنوبی دروں خاص کر درۂ لواری کے اثرات کی پیداوار ہیں ۔

موجودہ معاشرہ : آج کل کا کھو معاشرہ پچاس یا سو سال پہلے کے معاشرے سے کافی مختلف ہے ۔ خاص کر گذشتہ ۲۰ ، ۲۰ سالوں کے دوران یہاں کے رسم و رواج ، عادات و اطوار ، معیشت ، اداب اور ثقافت اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں جو انقلاب آیا ہے اس کی مثال ریاست کی تمام تاریخ میں ملنی مشکل ہے ۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے انگریزوں کے دور میں چترال کے لوگ جدید تعلیم (غیر منقسم) ، برّصغیر کے لوگوں کی تہذیب و تمدن اور مغربی تہذیب کے اثرات سے روشناس ہوئے ۔ اسی دور میں ٹیلیفون ، تار ، بجلی اور موٹرکار کا مشینی دور بھی شروع ہوا ۔ علاوہ ازیں پاکستان و ہند کی تحریک آزادی کے اثر سے چترال میں بھی سیاسی بیداری کی آگ سلگنے لگی ۔

پاکستان بننے کے بعد جب چترال سے ہندو اور سکھ تاجر چلے گئے تو تجارت کا میدان خالی رہ گیا ۔ لہٰذا کھو لوگ کافی تعداد میں کاشت کاری اور بھیڑ بکریاں پالنے کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرنے لگے ۔ اس طرح نہ صرف ان کی معاشی حالت پر خوشگوار اثر پڑا بلکہ ان کے معاشرتی نکتۂ نگاہ میں بھی وسعت پیدا ہوگئی ۔

۱۹۵۳ع میں حکومت پاکستان نے چترال میں نئے قوانین نافذ کیے ۔ جس کے مطابق تمام انتظامی ڈھانچہ بدل دیا گیا ۔ اس کا ایک خاص اثر یہ ہوا کہ پرانی معاشرتی طبقہ بندی کا نظام اب اپنی موت مر رہا ہے ، کیونکہ اس نظام کے زندہ رہنے کے لیے اب کوئی جواز باقی نہیں رہا ۔ نئی اصلاحات کے مطابق طبقہ بندی پر مبنی تمام فرائض کالعدم قرار دئیے گئے ۔ اب تمام عہدوں پر عہدیدار اور دوسرے ملازمین اپنی ذاتی قابلیت اور استعداد کے مطابق مقرر کیے جاتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا ہے

کہ آج چترال میں آدم زادہ ، ارباب زادہ یا یوفت اور فقیر مسکین کا تصور فرسودہ نابیں معلوم ہوتی ہیں اور ان کی جگہ معاشی طبقے مثلاً امیر طبقہ ، درمیانی طبقہ اور نچلا طبقہ پیدا ہو رہے ہیں جن میں ہر ایک شخص محنت اور کوشش سے اپنے آپ کو کسی بھی طبقے میں شامل کر سکتا ہے ۔

معاشرتی طبقہ بندی کے خاتمے کا ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ لوگ پہلے کی طرح اب مخلف فرائض کے تابع نہیں بلکہ مکمل طور پر آزاد ہیں ۔ لہٰذا سالانہ ہزاروں لوگ پاکستان کے دوسرے حصوں میں جا کر محنت مشقت کرکے روزی کمانے کے قابل ہوئے ہیں ۔ ساتھ ساتھ پاکستان کے ان حصوں کے لوگوں سے مل کر ان کے طرزِ گفتار ، طرزِ بود و باش اور طرزِ معاشرت سے متاثر ہو رہے ہیں ۔

پاکستان بننے کے بعد چترال نے تعلیمی لحاظ سے بھی بہت ترقی کی ہے ۔ چترال میں صحیح معنوں میں تعلیمی دور کا آغاز ہز ہائی نس محمد ناصر الملک نے ۱۹۳۹ء میں چترال کے سکول کا سنگ بنیاد رکھ کے کیا تھا اور اس کے بعد مختلف علاقوں میں کئی اسکول اور مدرسے قائم کیے گئے ۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد اس میدان میں تیزی سے ترقی ہونے لگی اور آج تمام ریاست میں چار ہائی اسکول ، تیرہ مڈل اسکول ، سات لوئر مڈل اسکول اور اڑسٹھ پرائمری اسکول موجود ہیں ۔ ان کے علاوہ تین لڑکیوں کے اسکول ہیں ۔ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی لڑکوں کے لیے وظیفے مقرر کرکے آسان بنا دی گئی ہے اور ہر سال کئی طلباء اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ حکومت پاکستان مستحق طلباء کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھی بھیجتی ہے ۔ یہ طلباء اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس چترال میں آ جاتے ہیں ۔

جدید ادب و ثقافت : یہ دور کھووار ادب و ثقافت کے لیے یقیناً ترقی کا دور ہے اس لیے کہ کھووار شاعری میں روز روز نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں ۔ اصناف سخن میں حمد ، نعت ، رباعی ، ترانہ اور قطعات کے اضافے ہوئے ہیں ۔ اس طرح موضوعات میں بھی تنوع پیدا ہو رہا ہے ۔ دور جدید کے کھووار شعرا مختلف مضامین مثلاً توحید ، نعت رسولؐ ، حُبِ وطن ، جہاد ، زراعت اور ملکی ترقی کو موضوعِ شعر بنا کر کھووار ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کر رہے ہیں ۔ نئی تشبیہات اور نئے خیالات کھووار ادب میں متعارف ہو رہے ہیں ۔ ان کے علاوہ کھووار میں نثر نگاری اور ڈرامہ نگاری بھی روز بروز ترقی کر رہی ہے ۔

ریڈیو عام ہونے اور پاکستان کے دوسرے حصوں کے لوگوں کے ساتھ زیادہ روابط اور میل جول کے باعث کھووار میں اُردو پشتو کے بے شمار الفاظ داخل ہو رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ پشتو اور اُردو دھنوں کا بھی کھووار موسیقی پر خاصا اثر پڑ رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان پشاور اُردو اور پشتو آرکسٹرا پر چترالی دھنیں بنانے کا تجربہ کر رہا ہے۔ مقامی موسیقار بینڈ باجہ، بیگ پائپ (Bag Pipe) اور ہارمونیم پر کھووار دھنیں بجانے کا تجربہ کر رہے ہیں۔

چترالی رقصوں پر بھی دور جدید کا خاطر خواہ اثر ہو رہا ہے۔ گذشتہ کئی سالوں کے دوران میں پشتو دھن پر ایک نیا چترالی رقص وجود میں آیا ہے جو خاص و عام میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

ادب و ثقافت کی ترقی کے لیے انجمن چترال کا قیام عمل میں آیا ہے جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دن رات کوشاں ہے۔

زبان کی ترقی: کسی زبان کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اسے تحریری صورت میں پیش نہ کیا جا سکے۔ بد قسمتی سے کھووار زبان و ادب کو تحریر میں لانے کی طرف اس صدی کے شروع تک کسی نے سنجیدگی سے توجہ نہ دی[1]۔ یہ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے کہ شہزادہ محمد ناصر الملک (بعد میں ہز ہائی نس والئی چترال) نے میرزا محمد غفران مؤرخ چترال کی معیت میں ایک کتابچہ "کھووار قاعدہ" تیار کر کے چھاپ دیا۔ انہوں نے کھووار حروف تہجی کے زائد حروف نیز زائد حرکات کے لیے علامات بھی ایجاد کیں، مگر اس زمانے میں فارسی کی مقبولیت کی وجہ سے یہ کتابچہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا اور یہ کوشش رائیگاں گئی۔ اس کے بعد کئی سال تک کھووار کو تحریر میں لانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ ان حالات کے پیش نظر شہزادہ محمد حسام الملک اور ان کے فرزند شہزادہ محمد صمصام الملک کی کاوشیں قابل ستائش ہیں، جنہوں نے قریباً دس سال ہوئے، محمد ناصر الملک مرحوم کے ایجاد کردہ کھووار رسم الخط کے مطابق

---

(۱) یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز فوجی افسر اوبرائن (Capt. D. J. T. Obrein) نے کھووار گرامر اور الفاظ (Grammar and Vocabulary of Khowar Dialect) تصنیف کر کے شائع کی تھی۔ مگر چونکہ یہ انگریزی میں ہے اس لیے اس کا اثر افسروں اور انگریزی دان طبقے تک ہی محدود رہا ہے اور اس کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ البتہ بیرونی محققین نے اس سے خاصا استفادہ کیا ہے۔

کھووار میں کتابیں لکھنے کا آغاز کیا۔ اس طرح کھووار میں ''ینمشر'' یعنی نماز (از شہزادہ محمد حسام الملک) 'کھووار قاعدہ'، 'کھووار بول چال' اور 'کھووار گرامر' (از شہزادہ محمد صمصام الملک) لکھی گئیں۔ شہزادہ محمد حسام الملک کھووار کی سعی سے زبان و ادب کی ترقی کے لیے انجمن ترقی کھووار دروش کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس کے بعد کئی ایسے محرکات مزید پیدا ہوئے جن کو اس زبان و ادب کی ترقی میں سنگ میل کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۶۴ء میں انجمن چترال کی بنیاد رکھی گئی۔ جس میں انجمن کھووار دروش اور چترال پولو ایسوسی ایشن کو ضم کر دیا گیا۔ اس انجمن کا مقصد کھووار زبان و ادب اور ثقافت کی ترقی کے علاوہ ریاست میں مقامی دست کاری کی حوصلہ افزائی اور قدیم مسودات اور کھووار کتابوں کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام سالانہ ایک ہفت روزہ ''جشن چترال'' منایا جاتا ہے۔ جس میں پولو اور دیگر کھیلوں کے علاوہ ایک شاندار میلہ لگتا ہے، جہاں مقامی دست کاریوں کے ساتھ حکومتی ادارے بھی اسٹال قائم کرتے ہیں۔ علمی مباحثے، مشاعرے اور ثقافتی شو بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ گذشتہ چار سالوں کے دوران اس قسم کے تین جشن منائے گئے ہیں۔ ہر سال اس کی افادیت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

انجمن چترال کے قیام کے ایک سال بعد ۱۹۶۵ء میں ریڈیو پاکستان پشاور نے ہفت روزہ کھووار پروگرام نشر کرنا شروع کیا، جو اب ہفتے میں دو دفعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کھووار میں تقریریں، نظمیں، ڈرامے، فیچر اور خبریں نشر کرنے کے ساتھ ساتھ اس تمام مواد کے مسودات جو کھووار میں لکھے ہوتے ہیں محفوظ رکھنے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

۱۹۶۷ء کے آغاز میں پشاور سے ایک ہفت روزہ اخبار ''تریچ میر چترال'' بھی جاری ہوا ہے۔ اس میں ایک صفحہ کھووار زبان کے لیے وقف ہے۔ اگرچہ اس اخبار نے اب تک خاطر خواہ ترقی نہیں کی، لیکن امید ہے کہ آگے چل کر اس سے کھووار زبان کو کافی فائدہ ہوگا۔

المختصر کھووار روز بروز ایک علمی زبان بنتی جا رہی ہے اور دن بدن اس کے ادبی سرمائے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

شعرائے دور جدید

۱۔ شہزادہ محمد حسام الملک: یہ مرحوم مہتر سر شجاع الملک کے فرزند ہیں۔ موجودہ دور میں کھووار کی ترقی آپ کی ان تھک کوششوں کی رہین منت ہے۔ آپ شاعر بھی ہیں اور اسرار و رموزِ کائنات کے بارے میں آپ کے اشعار کھووار ادب میں شہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین کارنامہ قرآن مجید کا کھووار میں ترجمہ ہے۔ ان دنوں آپ تمدنِ چترال پر ایک ضخیم کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔

نمونۂ کلام

گلدبو پھران نہ دردا پور پور   مر گست تہ سوم دوئیے ہمیشہ بور بور
استاری ژاپیئے تت کونیاں غچھی   کاناں می کمبوخ تت کونیاں سومتی
تو جم کی لاڑس مت سف مزار دوبوا
خدایو ولٹار بندو ژاک دوبوا

ترجمہ: (اے انسان) گلاب کے پھول کی یہ نازک پنکھڑیاں
تیرا غم کھا کھا کے فنا ہو رہی ہیں۔
اور نرگس کا پھول ہمیشہ تیری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
(تمہیں سمجھانے کے لیے) تجھے دیکھ رہا ہے۔
ستارے ٹمٹما کر آنکھ مار رہے ہیں
(اور) درخت کی یہ ساخیں ہل کر تجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔
اگر تو غور سے دیکھے تو قدرت کی یہ تمام نشانیاں
تیرے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان پیامبر کی مانند ہیں
اور تجھے خداوند تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔

۲۔ بابا ایوب چمر گن: یہ مشرف خان سابق وزیر صنعت چترال کے فرزند ہیں۔ معیاری نظمیں لکھا کرتے ہیں، جس سے چترال کے موجودہ سیاسی اور قومی حالات کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے۔ غزلیات اور مزاحیہ اشعار بھی کہتے ہیں۔ منظر نگاری سے انہیں خاص شغف ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے ایام میں انہوں نے کئی رزمیہ نظمیں کہی تھیں جن میں سے ایک یہ ہے:

(الف) مہ سلام ہیتاں نے تن ژ نان قربان اریتی
دشمنو شکست پرانی ملکو پر امان اریتی

کلی روئیے زمینا زندہ تن نامان اریتی
اسپہ غیجھار پاچھانی جنتہ مکان اریتی

ترجمہ : ان کو میرا سلام ہو جنھوں نے اپنی جانیں قربان کیں ،
دشمن کو شکست دی
اور ہمارے ملک کو امن بخشا !
انھوں نے تمام دنیا میں اپنا نام زندہ کیا
اور ہماری نگاہوں سے ہرے جنت میں اپنے لیے جگہ بنا لی ۔

(ب) بن سفرو تاریخو ہمیشہ جراغان آریتی
اسپہ ہر دیان ٹیکہ عمرایت داغان اریتی
ہستاں ہے خوش آمدید بو فرستہ گان اریتی
ہیتاں بر دسٹوتے گبتی زندہ باد حوران اریتی

ترجمہ : انھوں نے اپنے سفر کی تاریخ ہمیشہ کے لیے روشن کر لی ۔
(اگرچہ) ہمارے دلوں کو ہمیشہ کی مفارقت کا صدمہ دے کر چلے گئے ۔
ان کو خوش آمدید کہنے والے کئی فرشتے تھے
اور حوروں نے ان کا استقبال کرتے ہوئے زندہ باد کے نعرے لگائے !

۳۔ امیر گل خان : یہ خاص چترال کے رہنے والے ہیں اور چترال کے مشہور گیت نگار ہیں ۔ اپنے مقبول گیتوں کی وجہ سے گذشتہ دس سالوں کے دوران میں چترال کی موسیقی کی محفلوں پر چھائے رہے ہیں ۔ گیتوں کے لیے دھن بھی خود بناتے ہیں اور چترال کے بہترین موسیقاروں میں سار کیے جاتے ہیں ۔ عشقیہ گانوں کے علاوہ حمد ، نعت ، قومی ترانے اور مرثیے بھی کہنے لگے ہیں ۔ ہز ہائی نس سیف الرحمان والئی چترال کی ہوائی حادثے میں اچانک موت پر امیر گل نے جو مرثیہ کہا ہے ، وہ چترال کے ہر خاص و عام میں بہت مقبول ہے ۔ ذیل میں ان کے نمونۂ کلام کے طور پر یہ مرثیہ اور ان کے دو مقبول گیتوں میں سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں :

مرثیہ :

ژان امانت اللہ و گنیتائی امانتو مگر افسوس ہمونی تہ بے مقصد مویتائے
جام خوئی نیک نیتی جام روئی اللہ تن خوش کیہ نا شکری اریتام تتاسپہ سار گنیتائے

ترجمہ : جان خداوند تعالیٰ کی امانت ہے (اگرچہ حق ادا ہوا)

پھر بھی یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے
کہ تمہیں تمہارا مقصد پورا ہونے سے پہلے ہی مار دیا۔
اے اچھی خصلت والے !
اچھے لوگ اللہ تعالیٰ کو بھی محبوب ہوتے ہیں ۔
ہم سے ناشکرا پن سرزد ہوگیا ہوگا۔
اس لیے خدا نے تمہیں ہم سے چھین لیا۔

(ب) ہزار کڑہماں کیہ سود لاکھ پلوہماں افسوس بویکرا اولوئیے باغائے وا کورا لیم
موحال ہایہ کی بیرائے مہ کیہ حاجت یہ دنیا اوا افسوسو آہن ہامو پالیم

ترجمہ : اگرچہ میں ہزار آہ و فغاں کرتا ہوں۔
یا لاکھ دفعہ (اس صدمے کے الاؤ میں) جلتا ہوں پھر بھی کیا فائدہ!
پرندہ اڑ کر چلا گیا اور اب اس کا ملنا محال ہے۔
اگر اس دنیا کی حالت یہی ہے تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔
میں اب اس کو اپنی حسرتوں سے
اور بھرپور آہوں سے جلا کر خاکستر کر دوں گا۔

صوفیانہ گیت از امیر گل :

(الف) مجنونو بھیسا بنی صحرا گردش گوری نائے
گاہی محمود و عسقا ایاز و چستی یوسوم جوست
کورا کنعانہ چیے ہو یوسفر روستی یوسوم جوست

ترجمہ : وہ کبھی مجنوں کے بھیس میں صحرانوردی کرتے ہوئے پایا جاتا ہے
اور کبھی ایاز کی خوبصورتی کے ساتھ محمود کے عشق کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔
اور کبھی چاہ کنعان میں یوسف کے جلوے میں نمایاں ہو جاتا ہے۔

(ب) خدائی ہر شکلا کوری تان جلوؤ پا سیر دنیا
کورا صلیبو پھورا منصور و مستی یوسوم جوست
اللہ لا شریک بادشاہ فقط تان ہستی یوسوم جوست

ترجمہ : خداوند تعالیٰ طرح طرح سے اپنا جلوہ ظاہر کرتا ہے
کبھی صلیب کے اوپر منصور کی مستی میں جلوہ نما ہوتا ہے
اور (اس سب کچھ کے باوجود) اللہ تعالیٰ لاشریک بادشاہ ہے!
اور اس کی ہستی واحد اور بلند ہے۔

عشقیہ گیت از امیر گل :

کابی گل گموریو سارشار گاوز — نو بھچاک حسنو سوم کو مغرور آسور
وری جو باسو سنبلی سکا پاتی — افسوس ناز کی گمبوریا نو بھچور
کوئی سور و ٹال حمں دی خرم ہوئی — بلبل نن عشقر گمبوریو نورا خسور

ترجمہ : کوئی جا کے میرے پھول سے یہ پوچھے
کہ وہ فانی حسن پر اس قدر مغرور کیوں ہے ؟
اُس کی خوشبو (بو) دو روزہ ہے جو کہ
(ایک نہ ایک دن) خوبصورتی کے ساتھ ختم ہو جائے گی
اور افسوس ! پھول کی نزاکت برقرار نہ رہ سکے گی۔
جب جاڑے کی (سد اور بے رحم) ہوا چلنے لگے گی ،
تو سارا چمن خشک اور برباد ہو جائے گا۔ (لیکن اس سب کچھ کے باوجود)
بلبل اپنے مرکزِ عشق یعنی پھول کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکے گی!

ان مشہور و معروف شعراء کے علاوہ موجودہ دور میں اور بھی بہت سے مقبول شعراء موجود ہیں۔ جن میں سے خاص طور پر میرزا فردوس فردوس ، سہزادہ عزیز الرحمٰن عزیز ، اسرار الدین اسرار ، ولی رر خان ولی ، سہزادہ فخر الملک فخر ، رحمت اکبر خان رحمت اور معراج الدین معراج کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے چند کے کلام کے نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) نمونۂ غزل (اقتباس) از میرزا فردوس فردوس

نا اہل انسان نوبوئی ، نا اہل دان اگر ، ساہ مردان کہ ہوئی
تروف میوہ سیریں نو بوی گرچہ برورش چمنا جنت عدان کہ ہوئی

ترجمہ : ایک نا اہل اور جاہل آدمی صحیح انسان نہیں بن سکتا۔ اگر وہ ساہِ مرداں بھی بن جائے ، اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔
(اس کی مثال یوں ہے کہ) تلخ میوہ اگر جنتِ عدن میں بھی پرورش پا لے ، وہ میٹھا کبھی نہیں ہو سکتا۔

(۲) رباعیات از شہزادہ عزیزالرحمٰن عزیز

(الف) عصر علم

ہنوں کہ عصر علم و چہ فرہنگ سیر — جہانو د ای خور زائیلہ آہنگ شیر

کوروسان بندگی کہ تو خوروتے ہس عیب سیر آرشر ننگ شیر

ترجمہ : آج علم و ہنر اور حکمت و ادب کو کتنی ترقی حاصل ہے!
لیکن اس دنیا کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں۔
(کیونکہ اس تمام ترقی کے باوجود اے انسان !)
تو دوسرے کی بندگی اور غلامی کے بندھن میں جکڑا ہوا ہے۔
جو کہ تیرے لیے بڑی کمی ، عار اور ننگ کا باعث ہے۔

(ب) قصہ عسق از عزیز

بلبلو نقس گمبوریو آنس گمبوریو آنس بلبلو خضس
عاسقو چہ معشوقو عشقو قصہ دنیائی ہمونی نن اوشوی بس

ترجمہ : بلبل کی خواہش پھول کی تمنا ہے
اور پھول کی تمنا بلبل کے پنجرے میں قید ہونا ہے۔
عاسق اور معشوق کے عشق کی داستان دنیا میں بس اتنی ہی ہے!

(۳) اقتباس ترانہ از اسرار الدین اسرار

اے مہ وطن جھترار بہ بچن مہ ژان نثار نسہن اوجھی شنی مورین جھیرو غور جھار
جنتو نموده تو سیلی مہ خوش تو مہ رانو سار پاک سر زمینا تہ مسال گمبوریو ای باغار

ترجمہ : اے میرے وطن چترال۔ تجھ پہ میری جان نثار ہو۔
تیرے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور تیرے درمیان دودھ کی نہریں رواں ہیں۔
تو جنت کی مانند خوبصورت ہے اور میری جنت ان سے زیادہ مجھے پیاری ہے۔
سر زمین پاک میں تیری مثال باغ میں ایک پھول کی مانند ہے۔

(۴) اقتباس پاکستان زنده باد (یوم پاکستان کے موقع پر) از ولی زر خان ولی

اے وطن گلزار گلستان زنده باد
اے گمبوریان زمین پاکستان زنده باد

کوشش مسلمنتان ہوی بنون سر انجام فرنگی حکومتو نو بوسی اسپہ غلام
پاکستانو تجویز و مپیش ارير قاید اعظام تنظیم و اتحاد و ہوئی بوشیلی انجام

اے وطن گلزار ....

ترجمہ : مسلمانوں کی کوششیں آج کے دن بار آور ہو گئیں۔
آج کے دن مسلمانوں نے وعدہ کیا
کہ آئندہ کے لیے وہ انگریزوں کی غلامی قبول نہیں کریں گے۔
قائد اعظم نے قرار داد پاکستان پیش کی
اور تنظیم و اتحاد کے اصولوں کا بول بالا ہوا۔

(۵) عشقیہ گیت از شہزادہ فخر الملک فخر

ای موش اریر مجنونو سار سوال ''لیلو جدائی یہ تہ کیہ حال
(ایک آدمی نے مجنوں سے یہ سوال کیا۔ ''لیلیٰ کی جدائی میں تمہارا کیا حال ہے''؟)
ہجر وچھے وصالو سیر کیہ خال موعار خلاص کوئے عقلہ کہ یا مال''
(ہجر اور وصل کا مزا کیسا ہوتا ہے؟ ایسی حالت سے عقل نجات دے سکتی ہے یا مال و دولت ؟)
مجنوں رسائے۔ ''خالق لا یزال''۔ (مجنوں نے کہا کہ ''خالق لا یزال'')

خاتمہ

کسی تہذیب کی بقاء اور ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھے۔ ان کو اپنے میں سمونے کی اس میں صلاحیت ہو اور ضرورت پڑنے پر اپنے بعض پہلوؤں کو ان کے مطابق ڈھالنے کی اہل ہو۔ یہ مستقبل میں ہی معلوم ہوگا کہ کھو قوم کا معاشرہ وقت کی اس آزمائش میں کہاں تک پورا اتر سکے گا۔ البتہ گذشتہ حالات اور موجودہ رجحانات کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کھو قوم اپنے پرانے طرزِ تمدن کو زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رکھ سکے گی۔

BIBLIOGRAPHY RELATING TO CHITRAL STATE AND THE KHOW PEOPLE

1. ALDCR, GARY A.—British India's Northern Frontier (1865-95); Longmans London 1963.
2. ANSARI, BAZMI—Chitral (A Brief General and Historic Description), The Encyclopaedia of Islam (New Edition), Vol. 2; Luzzac London 1963.
3. AZIZ-UD-DIN MUNSHI.—Tarikh-e-Chitral (Urdu); Agra 1897.
4. BIDDULPH, MAJOR JOHN—Tribes of the Hindu Kush; Calcutta 1880.
5. IDEM. Dialects of the Hindu Kush, Khowar...., Journal of Royal Asiatic Society (N. S.), Vol. XVII, London 1885.
6. BONAVTLIT, GABRE'—Through the Heart of Asia; London 1889.
7. CURZON, LORD KEDLESTON. Leaves from a Viceroy's Notebook; London 1927.
8. DAVIDSON, COL—Some Notes on the Language of Chitral
9. DAVID, C COLLNE—Problem of the North-Western Frontier (1908-1909): Cambridge University Press 1910.
10. DURAND, A.G—The Making of a Frontier: London 1900.
11. FRASER-TYLER, SIR—Afghanistan, London 1953.
12. FRASER-TYLER, SIR—Frontier and Overseas Expiditions From India, Vol. I, North of the Kabul River (A Government Publications): London 1907.
13. GRIERSON, SIR GELRGE—Linguistic Survey of India, Vol VIII, Part I: Calcutta 1919
14. GUHA, DR. B—Races of Northern India (All India Science Congress)· Calcutta 1936
15. IDEM—Racial Affinities of the People of India: Census of India 1931, Vol I, Part III: Simla 1935.
16 GUFFRAN MIRZA MOHAMMAD—Tarikh-e-Chitral (Forsi): Unpublished.
17. GUFFRAN MIRZA MOHAMMAD—Imperial Gaseteer of India Vol. X (pp 300-304)· Oxford 1908.
18. ISRAR-UD-DIN—A Social Geography of Chitral State: (Unpublished) M Sc Thesis Approved by the University of London in 1965
19. IDEM—Settlement Pattern and House Types in Chitral State: Pakistan Geographical Review, Vol. 21, No 2, Lahore 1966
20. IDFM.—Socio-Economic Developments in Chitral State Since Independence: P G.R.; Vol. 22, No. 1. Lahore, 1967.
21. IDEM—The Khow and the Kalash Tribes of Chitral. The Daily Bang-e-Haram, Peshawar (Chitral Edition), Vol 9, No 180: Peshawar, 20th January, 1967.
22. LEITNER, G. W.—Dardistan in 1866, 1886 & 1893 London 1895.
23. IDEM—The Languages and Races of Dardistan, Part I: Composition, Grammer and Vocabulary of . Arniya: Lahore 1877.
24. MORGENSTIERNE, GEORGF.—Report on a Linguistic Mission to North-West India: Oslo 1932.
25. IDEM.—Report of a Linguistic Mission to Afghanistan: Oslo 1926.
26. IDEM—Iranian Elements in Khowar: Bulletin of the School of Oriental and African Studies, London, Vol. VIII.
27. IDEM.—Some Features of Khowar Morphology: Oslo 1947
28. IDEM—Name, Languages and Tribes of Chitral: Encyl. of Islam (New Edition); Vol. 2:—Luzzac London 1963.
29. IDEM AND SHAH, W. A.—Some Khowar Songs: Acta Orientalia, Vol. XXIV, 1-2, Oso 1957 (?).

30. MURTAZA, MIRZA GHULAM —Nia Tarikhe Chitral (Urdu), Peshawar 1962.
31. O'BRIEN, CAPT. D. J. T.—Grammar and Vocabulary of Khowar Dialect Lahore 1895.
32. ROBERTSON, SIR GEORGAE—Chitral—The Story of a Minor Siege: London 1895.
33. SCHOMBERG, R. C. F.—Kafir's Glaciers of Travels in Chitral: London 1938.
34. SCOTT, I. D —Notes on Chitral: Peshawar 1936.
35. SHAH, WAZIR ALI AND MORGENSTIERNE, GEORGE. Some Khowar Songs: Acta Orientalia, Vol XXIV, 1-2: Oslo 1957 (?).
36. SMITH, V. A —Oxford History of India: Oxford 1921.
37. SOLV, & RICHARD BATES —Tirich Mir: London 1952.
38. STEIN, SIR AUREL —Serindia, Vol. I: Oxford 1921.
39. YOUNGHUSBAND, F. F —The Heart of Asia: London 1898.
40. IDEM AND YOUNGHUSBAND, G J —The Relief of Chitral: London 1895.

کشمیری ادب

سیاسی اور معاشرتی پس منظر- ریاست جموں وکشمیر

فی الوقت ریاست جموں و کشمیر کو جس کا رقبہ اقوام متحدہ اور سروے آف (برٹش) انڈیا کے نقشوں کے مطابق پچاس ہزار مربع میل ہے، عرفِ عام میں کشمیر کہا جاتا ہے- اسی ریاست کے وسط میں وہ وادی واقع ہے جس کو کشمیرِ جنت نظیر کہا گیا ہے- اس وادی کی لمبائی چوراسی میل اور چوڑائی بیس سے پچیس میل تک ہے- گویا اس وادی کا رقبہ جس کی وجہ سے ساری ریاست کو کشمیر کہا جاتا ہے، بمشکل دو ہزار مربع میل ہے- یعنی ریاست کے رقبہ کا اڑتالیسواں حصہ! کشمیری زبان بڑی وادی کے رہنے والوں کی مادری زبان ہے لیکن اس بات میں بھی شک نہیں کہ وادی کے علاوہ ریاست کے کئی دیگر حصوں میں بھی کشمیری زبان بولی جاتی ہے- یہ علاقے ۱۹۴۷ء کے بعد (نیا قائم شدہ) ضلع ڈوڈہ، ضلع پونچھ کی تحصیل حویلی، ضلع مظفر آباد کے شہری علاقے، اسکردو اور گلگت کے قصبے ہیں- راجوری اور دیگر اس قسم کے قصبوں میں بھی لوگ کشمیری زبان بولتے ہیں- اس طرح ضلع ہزارہ (پاکستان) قصبہ مری (پاکستان) کے بعض علاقوں میں بھی کشمیری النسل لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو کشمیری بولتے ہیں- وادی کی آبادی اس وقت کسی صورت میں بیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے- تقسیم کے بعد دو مردم شماریوں یعنی ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء میں چونکہ ریاست دو حصوں میں منقسم تھی اور ریاست کے پانچ لاکھ سے زائد انسان وطن سے باہر ہجرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکے ہیں، اس لیے ساری ریاست کی کل آبادی کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے- اس کے علاوہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے بہت سے غیر ریاستی غیر مسلموں کو بھی ریاست میں بسایا ہے- پھر بھی رياست کے دونوں حصوں اور مہاجرین جموں و کشمیر مقیم پاکستان کی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی کل آبادی ستاون لاکھ نفوس کے قریب ہے- اس ساری آبادی میں کشمیری کے علاوہ پنجابی، پہاڑی، شینا، ڈوگری بلتی، گوجری وغیرہ زبانیں بولنے والے بھی شامل ہیں-

تقسیم ہند سے قبل ریاست جموں و کشمیر کے دو ہی نہیں تین صوبے تھے- صوبہ جموں، صوبہ کشمیر اور صوبہ سرحد — تینوں صوبوں میں مسلمانوں کی غالب

اکثریت تھی۔ صوبہ جموں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ساٹھ فیصد تھا۔ جبکہ صوبہ کشمیر اور صوبہ سرحد (گلگت، بلتستان اور لداخ جن کو ریاست کی سرکاری اصطلاح میں "سرحدی اضلاع" کہا جاتا تھا) میں مسلمان پچانوے فیصد سے کم نہیں تھے۔ یہی حال وادیٔ کشمیر کا ہے۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کشمیر یا کشمیر ساری ریاست جموں و کشمیر کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور صوبۂ کشمیر کے لیے بھی، جس میں مظفر آباد کا پہاڑی ضلع بھی شامل ہے۔ صرف وادیٔ کشمیر کے لیے بھی جس میں اس وقت مقبوضہ کشمیر کے تین ضلعے اسلام آباد (سرکاری نام اننت ناگ) (اور پرانا نام مراج) بارہ مولہ (کامراج) اور ضلع سری نگر (پرانا نام یمراج) شامل ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں جو کتابیں کشمیر کے بارے میں لکھی گئی ہیں ان میں سے بعض میں صرف شہر سری نگر کو ہی کشمیر لکھا جاتا رہا ہے۔ شعرا، سیاحوں اور سیاحوں نے کشمیر کو ایرانِ صغیر، مشرق کا یونان، ایشیا کا سوئٹزر لینڈ، کشمیرِ جنت نظیر وغیرہ خطابات سے نوازا ہے۔ کشمیری زبان اور تمدن کے دائرے میں پونچھ، کشتواڑ، بشمول، ڈوڈہ، بھدرواہ علاقہ بھاگ، ضلع ریاسی اور شمالی راجوری تاریخی طور پر شامل تھے۔ گلاب سنگھ نے سیاسی اغراض کے تحت یہ علاقے صوبہ جموں میں شامل کیے، چنانچہ سکھ لاہوری نے اپنے دورِ حکومت میں پونچھ، راجوری اور ڈوڈہ کے اضلاع کو تشکیل دے کر صوبہ جموں سے علیحدہ کیا۔

ہیون سانگ مشہور چینی سیاح نے کشمیری حدود کو ٹیکسلا تک بتاتا ہے۔ سلاطینِ کشمیر کے عہد (۱۳۲۰—۱۵۵۵) میں کانگڑہ اور افغانستان تک کے علاقے بھی کشمیر کے ساتھ تھے۔ وادیٔ کشمیر سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ اونچی ہے۔ اس کا موسم گرمیوں میں معتدل اور سردیوں میں سخت سرد ہوتا ہے۔

کشمیر کی وجہ تسمیہ

لفظ کشمیر پر مستشرقین اور پاک و ہند کے محققین نے کافی تحقیق کی ہے۔ لیکن پھر بھی سب ایک نظریے پر متفق نہیں ہوسکے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ پراکرت میں 'کس' (پنجابی کسی) نالہ کو اور 'میر' پہاڑ کو کہتے ہیں۔ چونکہ کشمیر پہاڑوں اور نالوں کا علاقہ ہے، لہٰذا کشمیر کا مرکب لفظ اس کے لیے استعمال کیا گیا۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ کشمیر عبرانی زبان کا مرکب لفظ ہے۔ جب بنی اسرائیل کی گمشدہ 'بھیڑیں' یعنی بنی اسرائیل کے بعض قبائل فلسطین پر بخت نصر کے حملے کے بعد منتشر ہو کر اس علاقے میں آئے تو انہوں نے اس وادی کو اشیر (سیریا یعنی شام) کی طرح پایا۔ 'ک' عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں

مثل (Like) کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے کشمیر کے مرکب لفظ کا مطلب سیریا یا شام کی طرح کا ملک ہے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ ساری وادی پرانے زمانے میں ایک بڑی خاصی جھیل تھی اور کشمیریوں کے جنم داتا کیشپ رشی نے بارہ مولہ کے قریب بند توڑ کر پانی کے نکل جانے کا راستہ بنا دیا اور اس طرح کیشپ ریشی کے نام پر اس وادی کا نام کشپ میر یا کشمیر پڑ گیا۔ محققین کا اندازہ ہے کہ کیشپ ریشی کشمیری قوم کا کوئی محسن تھا۔ جس نے بارہ مولہ میں کسی طرح اس رکاوٹ کو تڑوا دیا جو اس پانی کے راستے میں حائل تھی۔ اس کے ہٹ جانے کے ساتھ ہی وادی کا سارا پانی نکل گیا۔ یہ روایت زیادہ مستند ہے، بہ نسبت اس کے کہ کیشمر کا مطلب ہے سیریا یعنی شام جیسا ملک جو محض قیاس آرائی ہے۔ کاش ایک تورانی قبیلہ بھی ہے۔ سنسکرت ادب میں حضرت مسیح سے پہلے بھی اس ملک کا نام کاش میر آیا ہے۔ کاشغر بھی کشمیر کے پاس ہے جس سے ظاہر ہے کہ کاش میر کاس غر کی طرح ایک مرکب لفظ ہے۔

ہند و پاکستان میں کشمیریوں کو ایک ہی نسل سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے، کیونکہ کشمیری ایک نسل نہیں ہیں۔ نسلیات کے ایک ماہر کا قول ہے کہ انسانی نسلیں مختلف بادلوں کی طرح آپس میں ملتی ہیں اور پھر الگ الگ بھی ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا ٹکڑا کون تھا کیونکہ بادل ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گیا ہوتا ہے۔ یہی حال انسانی نسلوں کا اور پھر زبانوں کا ہو جاتا ہے۔

وادیٔ کشمیر کے قدیم ترین باشندوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ناگا نسل سے ہیں۔ اس کی تائید بدھ مؤرخ تارا ناتھ اور بودھ ساستروں سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ (ہیمہ مال اور ناگیرائے) چنبیلی کا ہار اور ناگی راجہ کے نام سے کشمیری ادب میں ایک مشہور کہانی بھی موجود ہے۔ اس ناگا راجہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تلپاتال (زمین کی دوسری طرف یا دوسری حد پر) جاتا تھا۔ کوئی عجب نہیں کہ کشمیر کی مکین اس قدیم ترین قوم کا تعلق ناگا لینڈ سے رہا ہو جہاں کے لوگوں نے ان دنوں کشمیریوں کی ہی طرح بھارت سے اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے جنگ شروع کر رکھی ہے اور جس کا اصرار ہے کہ ان کا وطن کسی صورت بھارت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کشمیر اور ناگا لینڈ دونوں ہمالیائی ریاستیں ہیں۔ ایک کوہستان ہمالیہ کے مشرق میں واقع ہے اور دوسری مغرب میں۔

وادی کے باشندوں کی زبان میں ناگ سانپ کو بھی کہا جاتا ہے اور پانی کے

چشمے کو بھی - گارساں دتاسی نے ''درخت اور سانپ کی پوجا'' میں لکھا ہے کہ کشمیری لوگ نورانی نسل سے ہیں اور سانپ کی پوجا کرتے ہیں - برہمنوں کی آمد سے قبل کشمیر میں پشاچ ، یکشا ، نشر ، کھانا ، درد ، بھوٹا ، بھکشا ، ڈامر (جن کو اب ڈار کہا جاتا ہے) بانترے ، لوق وغیرہ نسلوں کے لوگ آباد تھے - تبّت کے کئی قبائل کے نام بھی بعض کشمیری قبائل یا ذاتوں سے ملتے ہیں - دلائی لامہ کے ایک وزیر کی ذات ایبو بھی جو کشمیریوں کی ایک ذات ہے - ۱۹۶۹ء میں شمالی کوریا کا ایک رہنما پاکستان آیا تھا - اس کا قبیلہ لون تھا اور لون کشمیریوں کی ایک معروف ذات ہے - کبشپ ریشی کے عمل کے بعد ساری وادی انسانی بود و باش کے قابل ہوگئی تو آس پاس کے پہاڑوں سے درد لوگ آ گئے - اور برہمن بھی آ بسے - نلمت پران کے مطابق برہمن نو آباد کار پرانے باشندوں کی خوشامد اور خاطر و مدارات کرتے تھے اور ان کو کھانے وغیرہ کھلاتے تھے تا کہ وہ ان کو ملک سے نکالنے کی کوشش نہ کریں - اچھے کھانے بنا کر رات کو باہر رکھنے کی رسم اب تک کشمیری پنڈتوں میں ہے - مثل مشہور ہے کہ پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے تو بیٹھنے کی خود بنا لی جائے گی - یہی کام برہمنوں نے کیا - انھوں نے وادی میں آہستہ آہستہ اس طرح قدم جما لیے کہ وہ بھی وادی کے اصل باشندے بن گئے -

اورینٹل جاگرافی کے مصنف کی روایت کے مطابق میر سید علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدانی نے کشمیر کا نام باغِ سلیمان رکھا - یہ بھی روایت ہے کہ باغِ سلیمان کشمیر کا نام حضرت سلیمان کے نام پر نہیں بلکہ سیخ سلیمان کے نام پر رکھا گیا ہے ، جو حضرت شاہ ہمدانی کے زمانے کا ایک تاجر تھا - اس نے جب کہ وہ غیر مسلم تھا ، حضرت شاہ ہمدانی کو کشمیر آنے کی دعوت دی - یہ حضرت کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور اس کا نام سلیمان رکھا گیا - سکر اچاریہ والا ٹیلا اس کا مسکن تھا اور اسی وجہ سے اس ٹیلے کو تکیہ سلیمان یا تختِ سلیمان وغیرہ کہا گیا - اس اعتبار سے کشمیر میں اسرائیلی نفوذ کی روایت سیاح برنیئر کی قیاس آرائی ہے -

ناگ مت کے بعد کشمیر میں برہمن مت کا دور دورہ رہا - شمالی ہند میں آریاؤں کی آمد سے لے کر ۲۷۲ قبل مسیح تک یہاں برہمن راجاؤں نے حکومت کی - اس کے بعد بدھ مت کو عروج حاصل ہوا - ویسے بدھ مت کی ترویج کے وقت کشمیر کا حکمران اراولی تھا جو برہمن نہیں بلکہ ناگ نسل سے تھا - اشوک اور کنشک کا دورِ حکومت قابل ذکر ہے - اس زمانے میں شاردا کے مقام پر ایک تعلیم گاہ بھی بنائی گئی تھی جس کے آثار اب تک وادی کے شمال مغرب میں ، شاردا ضلع مظفر آباد کے مقام پر

پائے جاتے ہیں۔

چونکہ وادیٔ کشمیر پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے اس لیے بہت دیر تک یہ خارجی اثرات سے محفوظ رہی اور اسلام کو برّصغیر میں آئے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں، جب مسلمانوں کی کوئی منظم مہم اس طرف متوجہ ہوئی۔ سلطان محمود غزنوی نے دو دفعہ ۱۰۱۵ء اور ۱۰۲۱ء میں حملہ کرنے کی کوشش کی مگر دونوں دفعہ لوہ کوٹ کے قلعہ کو سر نہ کر سکا۔ البتہ ترک کشمیر آنے جانے لگے اور ترک عسکریوں کو کشمیر کے راجاؤں نے ملازمت دینی شروع کر دی۔ انہیں ''ترشکا'' کہتے تھے۔ اس طرح یہاں کے معاشرے میں اسلامی شعار کا دخل ہونے لگا۔

۱۳۳۵ء میں سوات کا ایک باشندہ جس کا نام شاہ مرزا تھا اور جو قوم کا غالباً ''پٹھان'' تھا کشمیر میں آیا اور اس وقت کے راجہ جس کا نام سینھا دیوا تھا، کا ملازم ہوا۔ رفتہ رفتہ اسے مناصب اعلیٰ ملنے لگے اور وہ راجہ کا وزیر بن گیا۔ راجہ کی وفات پر اس نے رانی سے شادی کر لی اور سلطنت سنبھال کر سلطان شمس الدین لقب اختیار کیا۔ یہ ۱۳۴۶ء کا واقعہ ہے۔ شمسؔ الدین ۱۳۴۹ء میں فوت ہوا اور اس کے بعد یہ خاندان ۱۵۶۱ء تک یعنی کوئی دو سو پندرہ سال کشمیر میں حکومت کرتا رہا۔ ۱۵۶۱ء میں اس خاندان کے آخری نا اہل سلطان حبیب نامی کو غازی خان چک نے معزول کر دیا اور خود سریر آرائے سلطنت ہوگیا۔ چک خاندان نے ۲۷ سال حکومت کی اور پھر ۱۵۸۹ء میں شہنشاہ اکبر کے ہاتھوں کشمیر مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔

شاہ مرزا کے خاندان میں دو سلاطین بہت مشہور ہوئے۔ ایک سلطان سکندر بت شکن (۱۳۹۴ء — ۱۴۱۶ء) اور دوسرا اس کا بیٹا سلطان زین العابدین شاہی خان (۱۴۲۰ء — ۱۴۷۰ء)۔ سلطان سکندر ایک متقی شخص تھا اور اسلامی شعائر کا سختی سے پابند بھی تھا۔ وہ اپنے ملک میں نئے مندر تعمیر نہیں ہونے دیتا تھا۔ بلکہ شکستہ اور ریختہ مندروں کو مسمار بھی کر دیتا تھا۔ اس لیے اس کا نام سکندر بت شکن مشہور ہوگیا۔ اس کے زمانے میں بہت سے کشمیری برہمن ملک چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ سلطان سکندر علماء کی بہت قدر کرتا تھا اور ان کی سرپرستی سے بالکل دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے ان ہندوؤں پر جو فوجی ملازمت کے قابل نہ تھے جزیہ لگا دیا، مگر عدل و انصاف میں کوئی کمی نہ کی۔ اس کا بیٹا سلطان زین العابدین مقابلتہً آزاد خیال اور وسیع النظر تھا اور رواداری کا قائل تھا۔ اس نے ہندوؤں پر سے سختیاں ختم کر دیں اور جو لوگ ترک وطن کر چکے تھے انہیں واپس بلانے کی کوشش کی۔ وہ علوم و فنون کا مربّی تھا اور اس کی حمایت اور سرپرستی کی وجہ سے

مہابھارت اور پنڈت کلہن کی منظوم تاریخ 'راج ترنگنی' کا فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کا عہد کشمیر کی تاریخ میں ایک زرّیں دور شمار کیا جاتا ہے۔

کشمیر کی بدقسمتی سے سلطان زین العابدین (بڈ شاہ) کے بعد نا اہل ورثہ نے اس خاندان کی ساکھ مٹا ڈالی اور مسلسل خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک میں بد امنی اور بے اطمینانی، کساد بازاری اور معاشی بد حالی کے آثار پیدا ہوگئے۔ ایک سو سال کے بعد چک خاندان کے سرداروں نے اس خاندان کے آخری فرمانروا کو تخت سے اتار دیا مگر ۱۵۴۰ء میں مغل شہزادہ حیدر دوغلت نے کشمیر پر حملہ کیا اور اپنے عزیز ہمایوں بادشاہ کے نام پر دس سال تک یہاں حکومت کی۔ مگر ۱۵۵۰ء میں ایک بغاوت میں مارا گیا اور چک خاندان پھر برسراقتدار آ گیا۔ ۱۵۶۱ء کے بعد اس خاندان نے شاہی مراتب اختیار کر لیے اور اس کے افراد اپنے نام کے ساتھ بادشاہ کا لقب استعمال کرنے لگے۔ اس خاندان کے پانچ افراد یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے مگر ۱۵۸۹ء میں اکبر اعظم نے کشمیر کو فتح کر کے اسے مغل سلطنت کا حصہ بنا لیا۔

کشمیر میں اشاعت اسلام

مسلمان ۱۳۲۴ء سے ۱۸۱۹ء تک یعنی چار سو چورانوے سال تک کشمیر پر حکمرانی کرتے رہے اور اس زمانے میں کشمیر نے ہر طرح سے ترقی کی۔ اس کے ربع صدی بعد برعظیم میں مسلمانوں پر زوال آنے لگا۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس علاقے پر قبضہ کر کے اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ سکھا شاہی میں کشمیر کو آفات ارضی و سماوی نے آ لیا۔ سیلاب، وبا اور قحط نے ملک کو تباہ کر دیا۔ یعنی انگریزی ضرب المثل کے مصداق مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی ہے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ کشمیر سے نقل مکانی کر کے ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے اور وہ اب تک کشمیری کہلاتے ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور ۹ مارچ کو اسی سال انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس کے مطابق کشمیر پر انگریزوں کی بالا دستی مانی گئی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو جموں کے راجہ گلاب سنگھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین ایک اور معاہدہ ہوا جس کے مطابق وادی کشمیر اور ملحقہ کچھ علاقے انگریزوں نے گلاب سنگھ کو فروخت کر دیے۔ ڈوگروں کا ریاست جموں و کشمیر پر تسلط ایک سو ایک سال رہا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان اور پاکستان آزاد مملکتوں کی صورت میں وجود میں آئے تو ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ تعویق میں ڈالا گیا۔ ریاستی مسلمانوں کی

غالب اکثریت کے علاوہ کشمیر میں ایسے روشن خیال غیر مسلم بھی تھے جو پاکستان کے ساتھ الحاق کے خواہشمند تھے ۔ لیکن ڈوگرہ حکمران نے بھارتی حکومت کے ساتھ سازش کر کے ریاست کا الحاق جبراً بھارت کے ساتھ کر دیا ۔ حالانکہ اس موقع پر آزاد کشمیر حکومت بھی قائم ہو چکی تھی ۔ اور ریاست کے ⅓ سے زائد علاقہ پر آزاد مجاہدین قابض ہو گئے تھے اور جنگ آزادی بھی جاری تھی ۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے مداخلت کی اور پورے پندرہ ماہ کے بعد جنگ بند ہوئی ۔ اس شرط پر کہ باہر کی فوجوں کے اخراج پر ساری ریاست میں الحاق کے سوال پر رائے شماری کرائی جائے گی ۔ لیکن بیس سال سے رائے شماری نہیں ہو سکی ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بھارت کشمیریوں کے متوقع فیصلہ سے خائف ہے ۔ اسے معلوم ہے کہ کشمیریوں کے ووٹ بہر صورت بھارت کے خلاف پڑیں گے ۔ عملی طور پر اس وقت ریاست جموں و کشمیر دو حصوں میں منقسم ہے ۔ یعنی آزاد کشمیر جہاں آزاد کشمیر حکومت کی حکمرانی ہے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر ۔

۹ اگست ۱۹۶۵ء کو مجاہدین کشمیر نے پھر جنگ آزادی کا آغاز کیا ۔ پاکستان نے بھی ان کی مدد کی اور ہر قدم پر بھارتی فوجوں کو شکست دے کر بہت سے حصہ پر قبضہ کر لیا ۔ بھارت نے اپنی شکست کا بدلہ لینے اور خفّت مٹانے کے لیے پاکستان پر حملہ کر دیا ۔ سترہ دن مزید دونوں ملکوں میں بڑے پیمانے پر جنگ جاری رہی ۔ اس جنگ میں پاکستان نے نہ صرف ہندوستان کے حملہ کو ناکام بنا دیا بلکہ اس کا بہت سا علاقہ بھی چھین لیا ۔ بھارت کو قدم قدم پر شکست کا سامنا کرنا پڑا ۔ اقوام متحدہ کی مداخلت پر ایک بار پھر جنگ بند کر دی گئی اور اقوام متحدہ اور روس کی کوشش سے دونوں ملکوں کی فوجیں کشمیر میں اپنی سابقہ حالت اور دوسرے مقامات پر اپنی بین الاقوامی سرحدوں پر واپس آ گئیں ۔ لیکن پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی کشیدگی میں اضافے کے باوجود ، بھارت کی ہٹ دھرمی کے باعث ، اقوام متحدہ کا تنازعۂ کشمیر پُر امن طور پر حل کرنے کا وعدہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ۔

اس وقت صورت حالات یہ ہے کہ کشمیری بولنے والوں کا بیشتر علاقہ بھارت کے قبضہ میں ہے ۔ جس علاقہ کو وادیٔ کشمیر کہتے ہیں اس کا کوئی حصہ آزاد حکومت کے قبضے میں یا ہندوستان کی جابرانہ دسترس سے باہر نہیں ہے ۔ لیکن کشمیری بولنے والوں کی ایک خاصی جمعیّت پاکستان اور آزاد کشمیر میں مہاجروں کی حیثیت میں رہ رہی ہے ۔ ان مہاجرین میں سیاسی کارکن بھی شامل ہیں اور اخبار نویس ، تاجر اور عام مہاجرین بھی ۔ آزاد کشمیر نامی علاقہ میں کشمیری زبان آزاد علاقہ میں ضلع پونچھ کی تحصیل حویلی ، ضلع مظفر آباد کے علاقوں کرناہ ، گزیر و راوا ، مظفر آباد ، چکار ،

گڑھی ہٹیاں ، چناری وغیرہ قصبات میں بولی جاتی ہے -

معاشرتی اور تہذیبی پس منظر

اس نظریہ کے کافی سواہد میسّر ہیں کہ وادیٔ کشمیر پہلے بڑی سی جھیل تھی - جب 'کیشپ ریسی' کی کرامات جس کو ہم انجینئرنگ کے کارنامہ سے تعبیر کرسکتے ہیں ، ظہور پذیر ہوئیں تو آس پاس کے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے - ابتدا دردستان والوں نے کی جو خود بھی آریہ قوم کی ہی شاخ تھے - کشیپ ریسی غالباً برہمن تھا کیونکہ برہمن اس کے اقدام کے بعد ہی کشمیر میں آکر آباد ہوئے - آہستہ آہستہ کشمیر شیو دھرم کی آماجگاہ بن گیا - کیونکہ سارے بر عظیم سے رشی اور منی یہاں بسنا کے لیے آنے لگے - اس دور میں سنسکرت زبان خوب بولی پھولی - برہمنوں کے آنے سے یہاں بھی لوگ چار بڑی ذاتوں یعنی برہمن ، کھشتری ، ویش اور سودر اور چھوٹی چھوٹی گوتوں میں منقسم ہوگئے - بت پرستی کا عام رواج ہوگیا - اس زمانے کے ادب پر بھی یہی رنگ غالب ہے -

مسلمانوں کے آنے سے قبل معاشرہ ذاتوں اور گوتوں میں بٹ چکا تھا - معاشرتی اونچ نیچ اور تفریق نے نوع انسانی کو ایک دوسرے کا دشمن اور حاسد بنا رکھا تھا - مذہب یا دھرم پر صرف پنڈتوں اور پروہتوں کی اجارہ داری تھی - یہی وجہ تھی کہ جب اس وادی میں مذہبِ اسلام کی اشاعت ہوئی ، تو تھوڑے ہی عرصہ میں آبادی کی غالب اکثریت نے اسے بخوشی اختیار کر لیا - بودھ تصوف اور شیو دھرم کی توحید پرستی کسی حد تک اس مسئلہ میں اسلام کی ممّد ثابت ہوئی -

سلطان صدر الدین شاہ (۱۳۲۰ء -- ۱۳۳۰ء) جس کا سابق نام رینچن تھا ، انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ سوم کا ہم عصر تھا - اصل میں وہ لداخ یا مغربی تبّت کا رہنے والا تھا - ایک بزرگ حضرت شریف الدین سید عبدالرحمن ترکستانی شاہ بلال جن کو عرف عام میں کشمیری بلبل شاہ کہتے ہیں ، راجہ سمدیو (۱۳۰۱ء-۱۳۱۹ء) کے زمانہ میں کشمیر آئے - آپ شاہ نعمت اللہ ولی فارسی الکشمیری کے مرید تھے - ریچن شاہ کا اسلام قبول کرنے کا واقعہ بھی بہت دلچسپ اور روائتی انداز کا ہے - وہ جب حکمران ہوا تو وہ کشمیر کے مروجہ مذاہب سے اُکتا چکا تھا اور روح کے سکون کی تلاش میں تھا - ایک بار اس نے اور اس کے اُمراء اور وزراء نے فیصلہ کر لیا کہ راجہ دوسرے دن صبح سویرے جس مذہب کے آدمی کو سب سے پہلے دیکھے گا اس کا مذہب اختیار کیا جائے گا - دوسرے دن بادشاہ کی نظر ایک درویش پر پڑی جو وضو کر رہا تھا - وضو کرنے والا تھوڑی دیر بعد خالقِ دوجہاں کے آگے

سر بسجود ہو گیا۔ یہ بلبل شاہ تھا۔ ربِّ دو جہاں کی عبادت کا یہ طریقہ بادشاہ کے دل کو متاثر کر گیا۔ اس نے شاہ صاحب کو بلوایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اس کے وزراء اور سپہ سالار نے بھی محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اختیار کر لیا۔ بادشاہ کا اسلامی نام سلطان صدر الدین رکھا گیا۔ مگر اس واقعہ کے بعد الناس علیٰ دین ملوکھم کے مصداق لوگ جوق در جوق اسلام اختیار کرنے لگے۔

اسلامی اثرات

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح کشمیر میں ہندوؤں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا تو ان کی قبل ذاتوں کا سلسلہ بھی بطور ورثہ اس میں چلا آیا۔ لیکن ایک ذات یا طبقے کا دوسری ذات یا طبقے میں منتقل ہونا ناممکن نہ رہا۔ بلکہ مذہبی آزادی کی وجہ سے ایک نیم متحدہ معاشرہ وجود میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ معاشرت اور تہذیب و تمدن میں کشمیری مسلمانوں کے ساتھ ان کا میل جول ایسا ہوا کہ اب ان کے غیر کشمیری ہونے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ لوگوں میں تارک الدنیا بننے کی بجائے محنتی اور جفاکش اور خود کفیل ہونے کا رجحان پیدا ہوا۔ چنانچہ کشمیر میں زراعت کے بعد صنعت و حرفت معیشت کا دوسرا بڑا ذریعہ بنی اور تجارت کو بھی فروغ ہوا۔ حصولِ تعلیم پر پابندیاں ختم ہونے کی وجہ سے سنسکرت کا زور کم ہو کر ختم ہوگیا۔ اس کی جگہ فارسی اور عربی نے لے لی۔ ہندو، مسلمان اور بعد میں سکھ یکساں طور پر فارسی پڑھنے لگے۔ اس کی وجہ سے معاشرے اور ادب میں وحدت اور یگانگت پیدا ہو گئی۔

برعظیم کے دوسرے حصوں کی طرح وادی میں بھی اسلام اکثر و بیشتر وسط ایشیا اور افغانستان کے راستے آیا، جہاں کی زبان فارسی تھی۔ حضرت شاہ ہمدانی (میر سید علی ہمدانی) نے اپنے سات سو ساتھیوں کو لا کر کشمیر میں تبلیغ اسلام شروع کی۔ ان سب کی مساعی کی بدولت آفتاب اسلام کی کرنیں کشمیر کے کونے کونے میں پہنچ گئیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے انہی کی شان میں کہا ہے:

سیـــد السّادات سالارِ عجم　　دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم
خطہ را آن شاہِ دریا آستین　　داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آن مردِ ایرانِ صغیر　　بـا ہُنر ہـائے غریب و دلپذیـر

منشی محمد دین فوق 'شباب کشمیر' میں لکھتے ہیں کہ سلطان زین العابدین (بڈ شاہ) جو اوائل عمر میں امیر تیمور کے ساتھ سمرقند گئے تھے اپنے ساتھ مزدوروں کی ایک

اچھی خاصی جماعت لے کر آئے۔ انہوں نے کشمیریوں کو مزدوری اور صنعت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ کشمیر کی معاشرت میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ لباس، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بود و باش اور سماجی ماحول سبھی کچھ متاثر ہوا۔ مکانات کی زیب و زینت پر بھی ایرانی رنگ غالب آیا۔ اب یہ حال ہے کہ شادی بیاہ پر مسلمانانِ کشمیر جو متعدد سالن پکاتے ہیں، ان کے نام بھی فارسی میں ہیں۔ کشمیر آن کی آن میں اسلام کا ایک گہوارہ بن گیا اور پاکستان و ہند کے علاوہ ایران اور توران سے بھی لوگ آ کر یہاں حصول علم میں مصروف ہوگئے۔ کشمیر کو ایرانِ صغیر کہا جانے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک بھی کشمیر لایا گیا اور اسے حضرت بل کی درگاہ میں عام زیارت کے لیے رکھا گیا اس وقت سے کشمیر کو مدینۂ ثانی بھی کہا جانے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے کشمیر کو قبۂ اسلام بھی کہا ہے۔

کشمیری آرٹ، فنِ تعمیر اور موسیقی پر بھی وسط ایشیائی اثر ظہور پذیر ہوا جو اب تک موجود ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں صنعت و حرفت یعنی پتھر پر پالش کرنا پتھر کاٹنا، بوتلیں بنانا، لکڑی پر نقش و نگار اور سونے چاندی کے ورق بنانے میں بڑی مہارت حاصل کی۔

مصوری میں کشمیری قلم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری مصور بُرش کو سادے پانی میں بھگو کر نقش ابھارتے تھے۔ براؤن 'ہندوستانی مصوّری'[۱] کے صفحہ ۱۰۵ پر لکھتا ہے کہ اس طرح کشمیری مصوّروں نے بڑے ہی نازک اور لطف رنگ پیدا کر لیے اور آئندہ کی تصویر کاری کے لیے رہنمائی کا کام کیا۔ وہ کاغذ پر پانی ڈال کر رکھ دیتے اور جب تک سوکھ نہ جاتا نہ ہلاتے۔ یہ نمونی چہروں اور دوسرے خد و خال کے لیے پس منظر کا کام دیتے۔ پانی کشمیری تصویر کاری میں بنیادی رنگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے رنگ جمانے والے مسالے یعنی گوند، گڑ اور السّی کا تیل وغیرہ بناتے۔

---

(۱) کتاب انگریزی میں ہے اس کا نام Indian Painting ہے۔

کشمیری زبان

انسانی نسلوں اور قبائل کی طرح زبانیں بھی بادلوں کی طرح ایک دوسرے میں ایسے گھل مل جاتی ہیں کہ ان کے عناصر ترکیبی کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تاہم کشمیری زبان کے متعلق ماہرینِ لسانیات کے نظریات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کی ابتداء اور ارتقاء کے مختلف مراحل کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ آئیے ان نظریات کا جائزہ لیں۔ کشمیری زبان اس وقت ریاست جموں و کشمیر اور برِعظیم پاک و ہند میں چالیس لاکھ کے قریب انسانوں کی زبان ہے۔ یہ ایک محتاط اندازہ ہے ورنہ عبدالاحد آزاد نے کشمیری بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ بتائی ہے۔

کشمیری زبان کو کبھی سرکاری اور درباری زبان بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ غیر مسلم دور میں سنسکرت کا زور شور تھا تو اسلامی دور میں عربی اور فارسی کا۔ اس کے بعد سکھوں کا دور آیا۔ اس وقت بھی فارسی زبان دفتری رہی۔ ابتدائی ڈوگرہ دور میں فارسی کا ہی پرچم بلند رہا اور پھر اس کی جگہ انگریزی اور اُردو نے لی کشمیری زبان کا تو بقول اقبال یہ حال رہا کہ ——

در دیار خود غریب افتادہ است

لیکن یہ سچ ہے کہ اسلامی دور میں ہی اس بات کو پھلنے پھولنے کا پہلی بار موقع ملا۔

کشمیری زبان درد زبان کی ایک شاخ ہے کیونکہ جب کشمیر کی عظیم جھیل سے پانی نکل گیا تو سب سے پہلے دردستان کے ہی لوگ یہاں آ کر آباد ہوگئے۔ اس وقت بھی دردستان کی شینا زبان سے کشمیری زبان کو خاص مناسبت ہے۔

مسٹر بہلر کا اندازہ ہے کہ کشمیری زبان سنسکرت کی ہی شاخ ہے، لیکن یہ ہندوستان کی ان زبانوں سے خاصی مختلف ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے ۱۸۷۳ء میں لاہور کے عجائب گھر میں کشمیری زبان کا ایک کتبہ دیکھا تھا جو دیدہ رانی کے عہد (۹۸۰ء — ۱۰۰۳ء) کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کے قریباً دو سو سال بعد پنڈت کلہن نے کشمیری مشہور تاریخ 'راج ترنگنی' تصنیف کی، جس میں کشمیری زبان کے صرف تین محاورے ملتے ہیں، جو یہ ہیں: سرانہ پٹ تہ چھوتی نا (تیرے پاس لنگوٹا بھی نہیں ہے کیا ؟) رنگس ہیون دنو ملا۔ ہوش دیو ہیو — لیکن اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس سے البتہ اس نظریہ

کو تقویت ملتی ہے کہ کشمیری کو کبھی درباری اور دفتری زبان ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا۔

سر جارج گریئرسن کی رائے کے مطابق کشمیری زبان دردستان زبان کی ہی شاخ ہے۔ اگرچہ برہمنوں کی کشمیر میں آمد پر اس پر سنسکرت کے اثرات بھی ہوئے، جس کی وجہ سے اس کو سنسکرت کی بیٹی سمجھا جانے لگا۔ اس کے بعد مسلمان آئے اور اس زبان کو عربی اور فارسی نے بہت متاثر کیا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مصنف 'کسیر' کے الفاظ میں کشمیری زبان کو ہڈیوں کا ڈھانچہ درد زبان نے مہیا کیا۔ سنسکرت نے اسے گوشت اور پوست عطا کیا اور اسلام نے اسے روح بخشی۔ مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے نہ صرف معاشرے کو متاثر کیا بلکہ زبان پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ برعظیم پاک و ہند میں اُردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما مسلمانوں کی آمد اور استقامت سے وابستہ ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں عربی زبان ملکی زبانوں پر اثر انداز ہوئی اور عربی رسم الخط کو اپنایا گیا (صرف ترکی میں اتاترک کے اقتدار کے بعد یہ رسم الخط ترک کیا گیا) کشمیری زبان کا بھی اب یہی رسم الخط ہے۔

کشمیری زبان کی اصل کیفیت

گریئرسن کی یہ رائے کہ کشمیری دردستانی زبان ہے۔ تاریخی پس منظر کے اعتبار سے زیادہ حقیقت کے قریب ہے۔ اس لیے کہ اولاً وادی میں شمالی علاقوں یعنی گوریز، اسنور، بلتستان، لداخ، گلگت، داریل، چلاس اور چترال جن کو دردستان کہتے ہیں، کے لوگ وارد ہوئے اور ان کی زبانیں ہند آریائی اور تورانی زبانوں کی مختلف ساخیں ہیں۔ اس کے بعد جنوبی علاقوں یعنی پنجاب اور سندھ جہاں ہند آریائی زبانوں (جن میں سنسکرت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی) کے تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ آ بسے۔ یہ سب قبائل مختلف بولیاں بولتے تھے جن کے اختلاط اور میل جول سے ایک نئی بولی کی ابتدا ہوئی اور اس کی بنیاد دردی خاندانوں کی زبانوں پر رکھی گئی۔ یہ بولی محض ضروریات زندگی فراہم کرنے اور ایک دوسرے کے ما فی الضمیر کو سمجھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ مذہبی اور علمی حلقوں میں سنسکرت کو اوّلیت کا درجہ حاصل تھا۔ اس لیے کہ برہمنوں کی آمد سے یہ خطّہ ہندو مت کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ جس کی وجہ سے کشمیری زبان میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے داخل ہوگئے۔ مگر اس زبان کی اساس دردی زبان پر قائم رہی۔ اس لیے کہ کشمیری زبان میں بعض ایسی آوازیں موجود ہیں جن کا صحیح تلفظ

صرف شینا ، تبتی ، چینی اور پشتو زبانوں ہی میں پایا جاتا ہے۔

مسلمان مبلّغین کی آمد اور مسلمانوں کے اقتدار حاصل کر لینے کی وجہ سے کشمیری زبان میں عربی ، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش ہوگئی۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس زبان کو حقیر بلکہ اس کے استعمال کو گناہ سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود اس زبان کو بڑی وسعت ملی اور یہ زبان گوریز ، استور اور بلتستان سے گزر کر گلگت اور چترال تک کے علاقوں ، وادی کشن گنگا (اب وادیٔ دریائے نیلم) سے مظفر آباد اور ہزارہ تک ، دوسری طرف کوہالہ ، گلمرگ اور پونچھ ، پھر ریاسی ، راجوری اور بھمبر تک ، جنوب کی طرف پیر پنچال سے بانہال ، کستوار اور بھدرواہ اور رام بن سے جموں تک پھیل گئی۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ کشمیری زبان عبرانی اور سریانی سے نکلی ہے۔کشمیری ایک دوسرے کو احتراماً جُو کہتے ہیں۔ جس سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ جُو کا استعمال یہودی طرزِ تحریر کے اثر کا نتیجہ ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں سکندر کے حملہ کے بعد کشمیر میں یونانی آباد ہو گئے تھے اور ان کی زبان عبرانی تھی جو بعد کو بگڑ کر کشمیری زبان کی شکل اختیار کر گئی۔ کشمیری قوم میں بنی اسرائیل بھی ہیں۔ لہذا ان کی زبان بھی عبرانی زبان کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بعض مورّخین اور محقّقین اور ماہرین لسانیات و نسلیات کے مشاہدات اور ریسرچ کے پیش نظر اس بات کی قطعی تردید بھی نہیں کی جا سکتی کہ بعض اسرائیلی کشمیر آئے ہوں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان سے پہلے کشمیر خالی پڑا تھا ، مبالغہ ہے۔ ڈاکٹر ناموس کی کتاب ' گلگت اور شینا زبان' میں لکھا ہے کہ شینا میں جُو لفظ کا مطلب وہی ہے جو سارے ہند و پاکستان میں جی (انگریزی Sir) کا ہے۔ اب جب کہ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ کشمیری درد زبان ہونے کی وجہ سے شینا کی بہن ہے تو یہ بات تعجب خیز نہیں کہ اس زبان میں بھی جُو احتراماً بولا جاتا ہوگا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسرائیل کبھی اپنے نام کے ساتھ جُو (Jew) کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔

یورپین محقق جی ٹی وِن[1] نے جو انیسویں صدی میں سکھا شاہی کے دوران کشمیر آ بسا تھا ، کشمیری زبان کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ۵۰ فیصد عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں۔ یہ اندازہ کوئی ڈیڑھ سو سال قبل کا ہے اور اس میں اعتراض کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک زبان میں جو بنیادی طور پر درد زبان ہے ، سنسکرت کے الفاظ پچاس فیصد کیونکر گھس آئے ؟ کشمیر میں برہمنوں کا راج صدیوں تک رہا اور وہ اب تک وہاں آباد ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ درد زبان کی وہی صورت رہتی جو پہلے تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد

۱- G. T. Vigne.

بھارت میں اُردو کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ ظاہر ہے کہ اب وہاں کی اُردو میں عربی فارسی کی بجائے ہندی کے الفاظ بڑی تعداد میں شامل ہونے لگے ہیں۔

وین نے کشمیری زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا جو تناسب قائم کیا تھا وہ وقت کے ساتھ بدلتا بھی جا رہا ہے۔ زمان و مکان کے تفاوت کے ساتھ ساتھ اس تناسب میں بھی فرق آتا رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جو علاقے زیادہ آباد ہوں، جہاں بیرونی علاقوں کے لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہو، وہ بیرونی اثرات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ دیہات اور دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں باہر والوں کے اثرات بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہاڑی علاقوں کی کشمیری، دیہاتی کشمیری اور کشتواڑی کشمیری میں وہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کو سن کر شہر والے مسکرا دیتے ہیں یا ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اہلِ شہر کو کیا معلوم کہ ابتدا میں ان کے آبا و اجداد بھی یہی الفاظ استعمال کرتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر دس میل کے فاصلہ کے بعد کی کشمیری زبان مختلف ہے۔ یہ حال صرف کشمیری زبان کا ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کا بھی ہے۔ پنجابی کو ہی لیجیے، پونچھ کی بولی مظفر آباد سے مختلف ہے۔ ہزارہ کی پوٹھوہار سے مختلف اور پوٹھوہار کی گجرات سے مختلف، اسی طرح پنڈتوں اور مسلمانوں کی کشمیری زبان میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً مسلمان پانی کو آب، اور پنڈت پون، کہتے ہیں۔ یعنی پنڈتوں کی زبان میں سنسکرت کا اثر زیادہ ہے۔

کشمیری زبان کی خصوصیت

جی ٹی وین رقمطراز ہیں: ”کشمیری زبان انگریزی اور عربی کی طرح نہایت وسیع زبان ہے اور اس کے الفاظ کے تلفظ میں ایسی ایسی عجیب آوازیں نکلتی ہیں جو کہ کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک حرف کو کئی کئی آوازوں سے ادا کیا جاتا ہے اور ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکلتے ہیں۔ اس زبان کے حروف ہجی کی تعداد پینسٹھ کے قریب ہے۔“

پروفیسر سدھیشور ورما لکھتے ہیں: ”کشمیری زبان کی خصوصیت اس کا نہایت ہی پیچیدہ اور لطیف نظام حروف علّت ہے، اس میں ایسے باریک حروف علّت موجود ہیں جن کے وجود کو صرف بولنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ سننے والے کو بہت کوشش اور توجہ کے بعد ہی ان کا پتہ چلتا ہے۔“

”کشمیری زبان کا رسم الخط“ کے عنوان سے اسلام آباد یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحبزادہ سید حسن شاہ (سابق پرنسپل ایس۔ پی کالج سری نگر) کا نوٹ دلچسپی سے

پڑھا جائے گا:

"کشمیری کا قدیم رسم الخط شاردا تھا ۔ جو شاردائی یونیورسٹی سے منسوب ہو تو کچھ عجب نہیں ۔ عہد مغلیہ کے شروع تک مسلمان بھی کشمیری کے لیے شاردا استعمال کرتے تھے ۔ چنانچہ مزار کلاں حضرت بہاءالدین گنج بخش اور قبرستانِ مرکزی متصّل درگاہ حضرت بابا نصیب الدین غازی میں کشمیری زبان میں جو تاریخیں اور عبارتیں درج ہیں وہ شاردا رسم الخط میں ہیں ۔ حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیری جو کشمیری قومیت اور حُبّ الوطنی کے عظیم داعی اور ہم سب کے روحانی پیشوا ہیں ، شاردا رسم الخط میں ہی دستاویزات پر دستخط فرماتے تھے ، جو اب بھی موجود ہیں ۔ دیوناگری میں ہندی رسم الخط کا استعمال سکھ ڈوگرہ دور سے پہلے کشمیر میں ثابت ہے ۔ کشمیری کے لیے فارسی رسم الخط کا استعمال سولھویں صدی سے شروع ہوا ۔ یہ رسم الخط نسخ تھا اور بابا نصیب نے اسے 'کشور نامہ' میں استعمال کیا ۔ اس کے قدیم نمونے حضرت بل کے کتب خانہ میں موجود ہیں ۔

فارسی رسم الخط میں حروفِ علت کی ایزادی کی ضرورت اور اس پر غور و فکر کا سہرا سیف الدین لدھیانوی (اتالیق شہزادہ سجاع الملک) کے سر ہے ۔ ان کا رسالہ 'اصواتِ کشمیری' راقم نے دریافت کیا اور اس کی تدوین و اشاعت کی طرف سرینگر میں اربابِ اقتدار کی توجہ دلائی ۔ کشمیر میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس رسم الخط میں کتابیں چھپتی رہیں ۔ پروفیسر سرس کینٹھ خوشحال نے کشمیری کے لیے بین الاقوامی رسم الخط کی تحریک شروع کی ۔ لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی ۔ ۱۹۴۸ء میں خواجہ غلام احمد کشائی مرحوم کے زیر صدارت ایک کمیٹی نے نئے اعراب کے ساتھ خط نسخ کشمیری ایجاد کیا اور ۱۹۵۴ء تک درسی کتب اسی میں شائع ہوتی رہیں ۔ پنڈت لوگ نسخ کو قرآنی رسم الخط قرار دے کر اس کی مخالفت کرتے رہے ۔ بالآخر پروفیسر جیالال کول کی کوشش سے خط نستعلیق بحال ہوا مگر اعراب قائم رہے ۔ اس کمیٹی کے اراکین میں راقم اور مولوی عبداللطیف نے دیگر اراکین سے اختلاف کر کے الگ نوٹ دیا اور خط نسخ کو بحال رکھنے پر زور دیا ۔ بہر کیف بخشی غلام محمد نے پنڈتوں کو خوش کرنے کے لیے پروفیسر کول کی تجویز قبول کر لی ۔"

کشمیری زبان کا رسم الخط

درد زبانوں میں سے کسی ایک کا اپنا رسم الخط نہیں تھا اور نہ اب تک ہے ۔ ان سب زبانوں میں سے کشمیری کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے پاس اپنا کافی ادب موجود

ہے۔ برہمنوں کے دور سے قبل تو کتابوں کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس دور میں کشمیری ایک عوامی بولی تھی۔ برہمنوں نے سنسکرت کو فروغ دیا اور وہی سرکاری اور مذہبی زبان بن گئی۔ مگر سنسکرت زبان لسانی تعصب اور مذہبی تقدس کی وجہ سے کشمیری زبان کے ہم آہنگ نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہو سکی۔ کشمیری زبان کا پرانا ادب بے شک ان لوک گیتوں، چھکریوں، روہ اور ونہ ون پر مشتمل ہوا ہوگا جو شاعروں کے ناموں کے بغیر ہی لوگوں کے سینہ بسینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ 'لول' کشمیری میں عشقیہ نظم کو کہا جاتا ہے۔ 'روہ' کا گانا عورتیں گاتی ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ دیہات میں کشمیری مرد بھی روہ میں شامل ہو جائیں۔

جب کشمیر میں اسلام پھیلا تو درس و تدریس کا سلسلہ عام ہوگیا۔ مقامی لوگوں کو مذہب اور دوسرے علوم کے رموز ان کی اپنی ہی زبان میں سمجھانا ضروری تھا، اس لیے ان کی مقامی بولی کو امدادی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا اور اسے بھی اس طرح سے پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ زین العابدین بڈ شاہ کے دور کے بعض مصنفین نے کشمیری زبان کو شاردا، دیوناگری اور ہندی رسم الخط میں ڈھالنے کی کوششیں کیں، لیکن یہ کوششیں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ البتہ اس زمانے میں کشمیری علم و ادب کی تدریس شروع ہوئی۔ 'سورو دیا' میں موسیقی کے متعلق، 'مہابیا پرکاس' میں سنو دھرم کے فلسفہ کے بارے میں، 'ست سر' میں ادب اور نجوم کے متعلق اور 'رام اوتار چرت' میں راجہ رام چندر جی کے حالات لکھے گئے ہیں۔ یہ کتابیں شاردا، ناگری رسم الخط میں لکھی گئی تھیں۔ مؤخرالذکر کتاب البتہ فارسی رسم الخط میں بھی ملتی ہے۔ غیر مسلم اس زمانے میں کشمیری زبان کے لیے شاردا رسم الخط کو اور مسلمان فارسی رسم الخط کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ لیکن فارسی عربی اور اُردو رسوم الخط کشمیری حروف علت کو کماحقہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے اب کشمیری مصنفین نے بسیم کشمیر کے بعد نستعلیق رسم الخط میں مزید ترمیمیں کی ہیں اور وہ ایک ایسے رسم الخط کو وجود میں لا کر استعمال کر رہے ہیں، جو کشمیری واویل آوازوں کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ اب موجودہ دور کے کشمیری غیر مسلم مصنفین نے بھی اپنی نظم و نثر کی تصانیف کے لیے یہی رسم الخط استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

کشمیری زبان پر فارسی اور عربی کا اثر

کشمیر میں فارسی زبان کو عروج شاہ میری خاندان کے حکمران سلطان شہاب الدین غازی کشمیری (م — ۱۳۸۹ء) کے دور میں ہوا۔ عربی تو اب مذہبی زبان تھی ہی۔ فارسی کو

بھی لوگوں نے بہت اونچا درجہ دیا ۔ سب سے زیادہ ترقی فارسی کو سلطان زین العابدین بڈ شاہ کے زمانہ میں ہوئی ۔ جنھوں نے اس کو سرکاری زبان قرار دیا ۔ آپ نے ایک دارالترجمہ قائم کیا جس کو سنسکرت اور دوسری دیسی زبانوں سے کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے کی سہولتیں دی گئیں ۔ مسلمان تو مسلمان ، کشمیری پنڈتوں نے بھی فارسی سیکھی اور اس میں اتنی دسترس پیدا کی کہ ایرانی اہلِ زبان بھی ان کی قدر کرنے لگے ۔ پنڈتوں نے بھی فارسی میں کتابیں تصنیف کیں ۔ فارسی زبان اور ایرانی تہذیب و تمدن کشمیر میں اس طرح عام ہوا کہ کشمیر کا نام ایرانِ صغیر پڑ گیا ۔ مرزا صائب اصفہانی اور ابوطالب کلیم جیسے اساتذہ ملا محمد طاہر غنی کشمیری سے شرف ملاقات اور اس کے کلام کا مفہوم سمجھنے کے لیے کشمیر آتے رہے ۔

حضرت شاہ ہمدانی قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ جو سات سو سادات آئے تھے ، ان کی زبان فارسی تھی ۔ انھوں نے کشمیر میں اشاعتِ اسلام کا کام سر انجام دیا ۔ مساجد میں عربی نماز پڑھنے کے بعد اور مسنون دعاؤں کے بعد فارسی میں طویل و عریض دعائیں پڑھی جانے لگیں اور ان کے پڑھنے کا کشمیر میں آج تک رواج ہے ۔

فارسی زبان میں جتنی بھی اہم کتابیں تھیں ان کا ترجمہ کشمیری فارسی دانوں نے کشمیری زبان میں کیا ۔ چونکہ اس وقت کشمیری کا کوئی اپنا رسم الخط نہیں تھا ، اس لیے فارسی کے نستعلیق رسم الخط کو ہی کشمیری کے لیے اپنایا گیا ۔ معروف کشمیری ساعر محمود گامی (م — ۱۸۵۵ء) نے 'زلیخا یوسف' 'شیریں خسرو' 'لیلیٰ مجنوں' اور ہارون الرسید ، عزیز اللہ حقانی نے 'ہارون الرشید' 'محمود غزنوی' اور 'شیخ صفار' کے واقعات کو نظم کیا ۔ عبدالوہاب (م — ۱۹۰۴ء) نے 'شاہنامہ فردوسی' کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا ۔ اس لیے ایک تو فارسی زبان کے اثرات کی وجہ سے فارسی رسم الخط رائج ہو گیا ۔ دوسرے فارسی کے منظوم قصوں کے تراجم کے باعث کشمیری ساعری میں لگ بھگ وہی عروض استعمال ہونے لگے ، جو فارسی میں رائج تھے ۔ کشمیری میں فارسی کے اوزان اور بحور عام ہو گئے ۔ عام کشمیری زبان بھی متاثر ہوئی اور اس کی لغت میں بھی خاصی وسعت پیدا ہو گئی ۔ کشمیری زبان کو علمی ادبی اور مذہبی اصطلاحات کا ایک ایسا ذخیرہ مل گیا جو اب اس زبان کا ہی حصہ بن چکا ہے ۔ فارسی اشعار اور ضرب الامثال کشمیری لوگ روزمرّہ کی بات چیت میں اس طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح خود ایرانی کرتے ہیں ۔ استعمال کرنے والوں میں پڑھے لکھوں کے علاوہ ان پڑھ بھی شامل ہیں ۔

کشمیری ادب کی ابتداء اور ارتقاء ۔ شاعری کی اصناف

دوسری زبانوں کی طرح کشمیری زبان کا ابتدائی ادب بھی لوک گیتوں پر ہی مشتمل

ہے۔ یہ لوک گیت عرصہ سے لوگوں میں سینہ بسینہ محفوظ چلے آتے ہیں۔ اور نئے لوگ ان میں حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ بھی کرتے رہے ہیں۔ لوک گیتوں اور شعر کی یہ قسمیں ہیں :

۱۔ روف : ہلکے پھلکے گیت جو عورتیں کھڑی ہو کر گاتی ہیں۔ اس کو رقص آمیز گیت کا نام دینا سراسر زیادتی ہے۔ کشمیری عورتیں یہ گیت کھڑی ہو کر ضرور گاتی ہیں۔ لیکن رقص نہیں کرتیں ، کیونکہ وہاں کے مسلمانوں میں عورتوں کا رقص کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ان گیتوں میں مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ ان کی بحر طویل نہیں بلکہ مختصر ہوتی ہے۔ عورتوں کے دو گروہ بنے ہیں جو آمنے سامنے کھڑے ہو کر باری باری ایک ایک بند یا ایک ایک شعر مل جل کر گاتی ہیں۔ عموماً روہ یہ ہے :

عید آیہ رسہ رسہ۔ عید گاہ دیھوے۔ عید گاہ رسہ وے

(عید رفتہ رفتہ آتی ہے۔ آؤ عید گاہ چلیں ، آؤ عید گاہ چلیں ، سکھیو)

روہ کی ابتداء اس شعر سے کی جاتی ہے :

سمبوی و کنیو روہ ہے کرہ دے۔ روہ ہے کرہ وے

(و گنو۔ اے اسیراؤ۔ آؤنا روہ کا گانا گائیں۔ گانا گائیں)۔

جب یہ الفاظ چند لڑکیاں یا عورتیں ادا کرتی ہیں تو یہ دوسروں کے لیے جمع ہونے کا اشارہ ہوتا ہے۔ تاکہ وہ ان کے ساتھ مل کر گانا گائیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ گانے والیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خاموش دیہات میں جب ایک گاؤں سے یہ روحانی نغمے دوسرے گاؤں میں پہنچتے ہیں تو فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں اور عید کے دن یہ نغمے خاص طور پر گائے جاتے ہیں۔

ونہ ون : اس کی ایک ہی مقررہ بحر ہے اور یہ شادی بیاہ کے ہی موقع پر گایا جاتا ہے۔ ابتداء اس مصرعہ سے ہوتی ہے :

بسم اللہ کیرتھ ہمے ون وونوئی صاحب انجام او نوے

(بسم اللہ الرحمٰن کہہ کر ہم گانا شروع کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شادی بیاہ کا کام انجام تک پہنچایا)۔ اس کے بعد سرورِ کونین صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی شان میں شعر کہے جاتے ہیں۔ پھر دلہن اور دولہے کی شان میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ دولہا میاں کو منظوم نصیحتیں کی جاتی ہیں۔

دولہا کو کشمیری میں ''مرازہ'' کہتے ہیں جو لفظ مہاراجہ کی کشمیری صورت ہے۔ دلہن کو مہارن کہتے ہیں جو مہارانی کی کشمیری صورت ہے۔ گویا یہ دولہا اور دلہن ایک دن کے لیے مہاراجہ اور مہارانی ہوتے ہیں۔ کشمیر میں ۱۹۳۱ء کی تحریکِ حریت کے بعد

ونہ ون میں بے دھڑک سیاسی مضامین بھی باندھے جاتے ہیں ۔

چھکری : یہ کورس گیت ہے جو عام طور پر مزدور ، کسان اور ہنرور (پیشہ ور) گاتے ہیں ۔ یہ قوالی سے ملتا جلتا ہے ۔

بچہ نغمہ : کشمیر میں فی الوقت عورتوں کے رقص کا رواج نہیں ۔ البتہ کشمیریوں میں پٹھانوں کی طرح لڑکے کو لڑکی کے کپڑے پہنا کر نچوانے کی علت موجود ہے ۔ جسے کشمیری میں بچہ نغمہ کہتے ہیں اور پشتو میں لختئے ۔ اس میں گانے والوں کا سرغنہ یہی نوجوان ہوتا ہے اور باقی اس کے چند سازندے اور ساتھی ہوتے ہیں ۔ یہ رقص اور گیت دیہات اور شہر دونوں میں عام ہیں ۔

لڑی شاہ : آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں کہ یکایک ایک یا دو تین آدمی ہاتھ میں ایک لمبی سیخ لیے آتے ہیں ۔ لوہے کی اس سیخ کو لوہے کے ہی دائرے پہناتے ہیں جو سیخ سے کہیں زیادہ کھلے ہوتے ہیں ۔ آدمی اس سیخ پر ہاتھ مارتے ہیں اور ان کی آواز سے موسیقی کا سماں پیدا ہو جاتا ہے ۔ ان حضرات کو لڑی شاہ کہا جاتا ہے ۔ لڑی دھن ہندی لفظ ہے ۔ جس کا مطلب ہار ہوتا ہے ۔ لیکن یہاں لڑی موتیوں کی یا پھولوں کی نہیں آہنی دائروں کی ہوتی ہے جس کے اندر دھاگا نہیں لوہے کی سیخ پروئی ہوتی ہے ۔ لڑی شاہ ہاتھ بھی مارتا جاتا ہے اور گانا بھی گاتا جاتا ہے اس گانے کی ایک ہی بحر ہے جو ازمنۂ قدیم سے نہیں بدلی ۔ موجودہ عروض کے حساب سے اس کا وزن یہ کچھ ہے :

فاعلن فاعلن فاعلاتن

لڑی شاہ دیہاتی اور شہری لوگوں کے لیے تفریح کا سستا ذریعہ ہے ۔ لڑی شاہ پرانے دیومالائی یا تاریخی قصے ، موجودہ جنگ و جدل کی کہانیاں ، قحط یا سیلاب کی تباہ کاریاں یا سیاسی ایجی ٹیشن کی روئداد اپنی نظم میں سناتے ہیں ۔ اس میں مزاح کا عنصر بھی ہوتا ہے ۔ یہ لوگ ہر نئے واقعہ کو بڑی تیزی سے نظم کی صورت دیتے ہیں اور سننے والوں کو اپنے زورِ بیان سے مسحور کر لیتے ہیں ۔ لڑی کی موسیقی کے ساتھ ساتھ ان کا زورِ بیان انسان کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتا ۔ جب ہوائی جہاز پہلی بار کشمیر آیا تو لڑی شاہ بولے :

ہوائی جہازہ آو ملک کشمیر   یحووچھ تمو پڑ توبہ تقصیر

(جب ہوائی جہاز کشمیر آیا تو لوگوں نے ڈر کے مارے توبہ استغفار کیا) ۔ سیلاب کا نقشہ ان الفاظ میں دیکھئے :

مٹی پو روتہ کھوت آب سیلاب   نٹی پورو اتی جندہ بیت ژراہ

(جب نٹی پور گاؤں میں پانی کا سیلاب آیا تو نٹی پورہ کے لوگ اپنے ساز و سامان کو لے کر چرار شریف سے پندرہ میل دور بھاگ گئے) ۔

زنانہ دپ مردس یہ کہو گوم ؔکسابہ ہے اوسم سہ کتو گوہ
سہ ہے ننوئی گرابن گھر یکر ناوان آب سیلابک وُچھ طوفان

ترجمہ : عورت نے خاوند سے کہا ،
ہائے یہ کیا ہوگیا !
میرے سر کا کسابہ کہاں گیا ؟
وہ بولا ۔ اری اسے تو سیلاب اپنے ساتھ بہا کر لے گیا ۔
دیکھو سیلاب کی تباہ کاریاں !

آزاد کشمیر ریڈیو سے شاعری کی اس صنف کے ذریعے بھارتی ڈوگرہ استبداد کے خلاف اچھا خاصا دلچسپ اور موثر پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے ۔

ویداکھ : المیہ نظم یا مرثیہ ہوتا ہے جو کسی شخص کی موت ملک یا قوم کی تباہی پر لکھا جائے ۔

صوفیانہ کلام : وہ غزل ، نظم ، رباعی یا کلام ، جس میں تصوف یا روحانی عشق و محبت کا مضمون باندھا گیا ہو ۔ جس طرح قوال لوگ ایک ہی شعر یا مصرعہ کو کافی دیر کھینچ تان کر بیان کرتے رہتے ہیں اسی طرح صوفیانہ کلام میں بھی ہوتا ہے ۔ جامی کی رباعی ہے :

خطِ سبز و لبِ لعل و رخِ زیبا داری حُسنِ یوسف[۳] دمِ عیسیٰ[۴] یدِ بیضا داری
سوئے شکل و شمائل حرکات و سکنات آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

صوفیانہ طرز میں اس کے گانے پر بھی پانچ منٹ لگائے جائیں گے ۔

چند کہاوتیں : کشمیر کہاوتوں کا ملک ہے ۔ اس زبان میں بے شمار کہاوتیں پائی جاتی ہیں ۔ ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی بھی اپنی روزمرہ کی بات چیت میں کہاوت ضرور استعمال کرے گا اور وہ بھی برمحل ۔ فارسی زبان کی کہاوتیں اور شعر نما کہاوتیں بھی اکثر استعمال ہوتی رہتی ہیں ۔ چند ایک ملاحظہ ہوں :

(الف) ان سنتر کوہے خدا لسن حوالہ (اندھے کی بیوی کا خدا رکھوالا)
(ب) ریہ کو وسمنی طوفان (غریب آدمی کے لیے تھوڑا سا نقصان ہی بڑا ہے) ۔
یہ محاورہ فارسی میں یوں ہے : شبنم در خانۂ ما طوفان است
(ج) بے رچھم تمن کنُں رچھتم خدایو (ہمیں دوستوں سے دوستی کی امید تھی ۔ ہمارا خیال کس قدر غلط تھا !)

فارسی میں یہ محاورہ یوں ہے :   ماز یاران چشم یاری داشتیم
خود غلط بود آنچہ ما پندا شتیم

(د) بیکار ہر دربار (بے کار آدمی ہر دربار میں موجود ہوتا ہے اور دخل در معقولات دیتا رہتا ہے) ۔

(و) احمقس دائے دین گہہ وڑھ ککر کس نون دیون (بے وقوف آدمی کو نیک مشورہ دینا ایسا ہے جیسے گلہری کو نمک کھلانا ۔ یعنی بے سود کام کرنا) ۔

(ر) آیے یہ داند رس تہ گلا گاندرس (کنجڑے کی بلا نانبائی کے سر۔ یعنی بندر کی بلا طویلے کے سر) ۔

(ز) اینم سوئے دوم سوئے سجم سوئے پانسی (میں نے کاٹنے والا پودا [پہاڑی میں "کنجی"] لا کر بویا ۔ اس نے مجھے ہی کاٹ لیا ۔ خود کردہ را علاجے نیست)

(ح) انس مشو باوین نہ گناہ نہ ثواب (اندھے کو مکہ دکھانا نہ گناہ ہے نہ ثواب ۔ یعنی بھینس کے آگے بین بجانا) ۔

کشمیری لوک کہانیاں

کسی علاقے کے معاسرتی حالات اور تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں وہاں کی لوک کہانیاں جتنی مددگار ہو سکتی ہیں ، شاید کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ لوک ادب میں یہاں کے رہنے والوں کے رسم و رواج ، جذبات و احساسات ، طرزِ زندگی اور اندازِ فکر کا کھلا ، واضح اور براہ راست اظہار پایا جاتا ہے ۔ لہٰذا لوک ادب میں معاشرے کی جو تصویریں بنتی ہیں وہ واضح اور حقیقی ہوتی ہیں ۔ فنی لوازم اور زیب داستان کے شوق کے تلے دب کر بگڑ نہیں جاتیں ۔

کشمیری لوک کہانیوں میں بھی وہاں کے لوگوں کی زندگی کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں ۔ البتہ بعض کہانیاں مختلف اقوام کے ساتھ سفر کرتی ہوئی دوسرے علاقوں میں پہنچ جاتی ہیں ۔ لیکن یہ کہانیاں واقعات اور مذکورہ مقامات کی وجہ سے الگ پہنچانی جاتی ہیں ۔ چنانچہ 'تین شہزادے' ایک ایسی ہی کہانی ہے جو کشمیر میں رائج ہے ۔ اس میں سمندر کا ذکر ملتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ کشمیر سمندر سے بہت دور پہاڑی علاقہ ہے ۔ لہٰذا یہ کہانی یہاں کے لوگوں کی نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ کسی ساحلی علاقے سے یہاں پہنچی ہوگی ۔ کشمیری لوک کہانیوں کو موضوع کے اعتبار سے مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کر سکتے ہیں :

۱ ۔ مہم جوئی کی کہانیاں   مثلاً تین شہزادے

۲۔ جانوروں کی کہانیاں
۳۔ مزاحیہ کہانیاں
۴۔ روایات پر مبنی کہانیاں
۵۔ رومانوی کہانیاں

ان کہانیوں میں بہت سی کہانیاں کرداروں کے ناموں کے اختلاف اور واقعات کے معمولی تصرف کے ساتھ پاکستان و ہند کے دوسرے علاقوں میں بھی رائج ہیں۔ یہاں ہم چند ایک اُن کہانیوں کا ذکر کرتے ہیں، جو اس خطہ سے مخصوص ہیں:

۱۔ گیشیراری اور ویسٹروان

یہ دو پہاڑیوں کے نام ہیں۔ روایت ہے کہ ویسٹروان کی چوٹی کشمیر کی دوسری چوٹیوں سے بلند تھی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب دنیا نئی نئی آباد ہوئی تھی اور پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔ نانگا پربت کی چوٹی بھی ویسٹروان کے کندھوں تک مشکل سے پہنچتی تھی۔ اگرچہ ویسٹروان سب سے بلند پہاڑ تھا مگر گیشیراری اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے سب سے ممتاز تھی۔ چنانچہ ویسٹروان نے جب گیشیراری کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا، حتیٰ کہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ گیشیراری ویسٹروان کی بلندی پر رشک کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے غرور سے بلند سر کو جھکا دے۔ لٰہذا جب ویسٹروان نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر گیشیراری سے کہا ”اے حسین پہاڑی! مجھے پیار سے چوم لو، ورنہ میں مر جاؤں گا۔“ تو اس نے عیاری سے جواب دیا کہ ”او مغرور پہاڑ! میں تمہیں کیسے چوم سکتی ہوں جبکہ ہمارے درمیان میلوں کا فاصلہ ہے۔ میرے لب تو اس وقت بھی تمہارے لبوں تک نہ پہنچ پاتے جب میں تمہارے برابر کھڑی ہوتی۔“ اس کے باوجود ویسٹروان اصرار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ گیشیراری نے مسکرا کر کہا ”تم اگر بوسہ لینا چاہتے ہو تو اپنے غرور کو چھوڑو اور اپنی تمام تر لمبائی کے ساتھ میری طرف جھکو۔ تب میں بڑھ کر تمہارا بوسہ لوں گی، اس پر ویسٹروان نے اپنا بڑا حصہ کشمیر کی وادی پر پھیلا دیا اور پہاڑوں اور وادیوں پر سے ہوتا ہوا گیشیراری کے دامن تک پہنچ گیا۔ مگر گلشن جیسا سرد دل رکھنے والی ملکہ نے اپنا چمکتا ہوا سر اور بھی بلند کر لیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگی ”جتنے عاجز اور مسکین ہیں سب سے پیار کرو۔“

کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ ویسٹروان کا پہاڑ وادی اور پہاڑوں کے اُوپر سے پھیلتا ہوا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا سرا گیشیراری کی پہاڑی کے قدموں تک پہنچ جاتا ہے

۲- ہیہ مال (چنبیلی کا ہار)

یہ ایک عشقیہ داستان ہے اور اس لحاظ سے کہ جہاں 'لیلیٰ مجنوں' اور 'وامق عذرا' کے قصے عرب سے اور 'شیریں فرہاد' کا قصہ ایران سے کشمیر آیا وہاں 'ہیہ مال' (چنبیلی کا ہار) خود اسی سر زمین کی پیداوار ہے - یہ قصہ کرداروں کے اعتبار سے اسلام سے بہت پہلے کا ہے - قصہ یوں ہے :

کہتے ہیں کشمیر کے پانڈو حکمران خاندان کے ۳۳ ویں راجے کی لڑکی کا نام ہیہ مال تھا - یہ لڑکی بہت حسین تھی - چنانچہ اس کے حسن کا چرچا سارے برِ صغیر میں ہو گیا - حتیٰ کہ ناگ قوم کے سہزادہ ارجن نے اس کا نام سنا اور نادیدہ اس شہزادی پر عاشق ہوگیا اور جب عشق کی تاب نہ لا سکا تو فقیرانہ لباس پہن کر کشمیر جا پہنچا - کسی طرح شہزادی تک رسائی حاصل کی - وہ بھی ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی اور سوئمبر رچا کر اس فقیر کو خاوند منتخب کر لیا - دوسروں کے طعنوں اور باپ کے منع کرنے کے باوجود اس سے شادی کر لی - ناگ شہزادہ نے اپنی اصلیت ابھی تک شہزادی سے پوشیدہ رکھی تھی - جب سہیلیوں نے طعنے دیے کہ فقیر کی ذات کا پتہ نہ گوت کا ، نہ جانے تو نے کس اجنبی سے شادی رچا لی ، تو سہزادی نے ناگ سہزادے سے اس کی اصلیت کے متعلق سوال کرنے شروع کر دیے - جب اصرار بڑھا تو ارجن ناگی نے سانپ کا روپ دھارا ، دودھ کے کڑاہے میں ڈبکی لگائی اور پاتال کی راہ لی - اب شہزادی اس کے فراق میں تڑپنے لگی - اسے افسوس تھا کہ اس نے سہیلیوں کے کہنے پر اپنے خاوند کو بھاگنے پر مجبور کیا - آخر اس نے راج پاٹ کو لات ماری ، بھیس بدلا اور اپنے پتی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی - بڑی مصیبتوں اور دوڑ دھوپ کے بعد ناگاؤں کے دیس میں پہنچی جہاں اس کی اپنے عاشق خاوند سے پھر ملاقات ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے -

اب ایک اور کہانی ملاحظہ فرمائیے :

ا کہ نندن

اسے پرکاش بٹ ، احد زرگر ، رمضان بٹ وغیرہ نے نظم کیا ہے - یہ کہانی یوں ہے کہ سلطان نگر میں ایک نیک بادشاہ چکنہ ویگ اور اس کی رانی رتن مالا رہتے تھے - ان کے ہاں گیارہ لڑکیاں تھیں اور لڑکا کوئی بھی نہیں تھا - دونوں نے خدائے قدیر کے ہاں دعائیں کیں کہ ہمیں اولادِ نرینہ عطا فرما - دعا منظور ہوئی ، وہ اس طرح کہ ایک جوگی آیا - اس نے دونوں کو کہا کہ لڑکا تمھارے ہاں ضرور ہوگا - لیکن اس کی یہ شرط

ہے جب وہ بارہ سال کا ہوگا تو اس کو میں جو چاہوں کر دوں گا ۔ والدین نے شرط کے ساتھ اتفاق کیا ۔ یہ سوچا کہ جوگی نے آخر لڑکے کو کرنا کیا ہے ۔ وہ لے بھی جائے تو لڑکا ہمارا ہی ہوگا ۔ لڑکا جب پیدا ہوا ۔ اس کا نام چکمہ ویگ اور رتن مالا نے اکہ نندن رکھا ۔ یہ بڑا ہونہار اور پیارا لڑکا ثابت ہوا ۔ اس نے پڑھائی لکھائی اور شرافت و ذہانت میں نام پیدا کر لیا ۔ جب بارہ سال ہوئے تو ایک دن یک لخت وہی جوگی نمودار ہوا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اکہ نندن کو میرے حوالے کر دیا جائے ۔ جوگی نے ایسی کرخت آواز میں جس سے سننے والوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی حکم دیا کہ اکہ نندن کو میرے کھانے کے لیے ذبح کیا جائے ۔ کیونکہ مجھے بھوک لگی ہے ۔ احد زرگر لکھتا ہے :

آو جو گیاہ ژاو سہ نوئے کتہ بھوون اکہ نند نوئے

(ایک ننگ دھڑنگ جوگی آیا اور اس نے پوچھا کہ کہاں رکھا ہے تم نے اکہ نندن کو ؟)
راجہ نے اسے بیٹے کو ذبح کیا ۔ رانی اس کا گوشت پکاتی رہی ۔ بقول احد زرگر :

باللہ اکہ نندنس چھ دیگر پاکوان دلا سوز ماتم کران گژھ بیان

(قسم ہے اللہ کی کہ اکہ نندن کو دیگ میں پکایا جاتا رہا ۔ اے دل ماتم کا سوز بیان کرتا جا) اس کی ماں اور گیارہ بہنوں کی چیخ پکار سے پتھر بھی پگھل رہے تھے سوائے جوگی کے جو کہ خوش تھا) ۔

پکوان تیار ہو گیا تو جوگی نے حکم دیا کہ باپ ، ماں اور گیارہ بہنیں میرے ساتھ دسترخوان پر اکہ نندن کا گوشت کھانے کے لیے بیٹھ جائیں ۔ سب لوگ دسترخوان پر بیٹھے تو جوگی نے پوچھا کہ اکہ نندن بھی اس گھر کا فرد ہے اس کے کھانے کی تھالی کہاں ہے ؟ راجہ رانی اور راجکماریاں حیران ہوئیں کہ جوگی کیا کہہ رہا ہے ۔ جوگی نے کہا کہ اکہ نندن کو بھی بلاؤ جوگی کے سحر انگیز حکم کے تحت ماں نے پکارا اکہ نند نو! تو جواب آیا ہوا! چشم زدن میں ایک طرف سے اکہ نندن ہنستا ہوا آیا اور دوسری طرف جوگی مع خوان کے غائب ہو گیا ۔ اکہ نندن نے کہا کہ ماں مجھے تو بھوک لگی ہے کھانا دو ۔ اس طرح سے یہ ماتم عید میں تبدیل ہو گیا ۔

ظاہر ہے کہ اکہ نندن کے ذبح ہونے کا واقعہ ایک کشفی واقعہ تھا ۔ ڈاکٹر صوفی کے بیان کے مطابق اس واقعہ کو حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے واقعہ کے ساتھ خاصی مناسبت ہے (یہودیوں اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابراہیم کو حضرت اسحٰق کے ذبح کرنے کا حکم ملا تھا نہ کہ اسماعیل کو) جوگی کی دوبارہ آمد کا قصہ محض راجہ اور رانی کی آزمائش تھی ۔ کشمیری ادب میں اس قصہ کی عرصہ دراز سے موجودگی اس بات کی

گواہی دیتی ہے کہ کشمیری میں سامی روایات بہت پہلے کسی نہ کسی طرح آ چکی تھیں۔ اکہ نندن ساری رات اس طرح پڑھا جاتا ہے جس طرح پنجاب میں 'ہیر رانجھا یا 'سوہنی مہینوال' کا قصہ۔ جب اکہ نندن کے ذبح کرنے کا واقعہ شعر میں بیان کیا جاتا ہے تو آہ و بکا کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ سنانے اور سننے والے دونوں آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔ سردی کی طویل راتیں اس قسم کی قصہ خوانی کے لیے مخصوص ہیں، جب کھیتوں میں اور گھروں کے باہر برف پڑی ہوتی ہے، باہر کا کام نہیں کیا جا سکتا اور کھانے کے لیے دانے گھروں میں جمع ہوتے ہیں۔

کشمیری ادب (شاعری) پر ایک اجمالی نظر

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کشمیری علم و ادب کا ذخیرہ بیشتر نظم میں ہے۔ نثر کی کتابوں کی تعداد انگلیوں پر گننے کے قابل ہے۔ لہٰذا کشمیری زبان کی تاریخ اس کے شعر کی ہی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے عبدالاحد آزاد مرحوم نے اپنی کتاب کا نام 'کشمیری زبان اور شاعری' ہی رکھا ہے، جو شبلی کے 'سعر العجم' کی طرح لکھی گئی ہے۔ اس میں کشمیری کو چار دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کشمیری ادب اور شاعری کا دورِ اول۔ ۱۴۲۲ء تک

یہ وہ دور ہے جب مذہب اسلام کشمیر کے بلند و بست پر چھا رہا تھا۔ اس زمانے سے قبل بھی لا تعداد شاعر گزرے ہوں گے لیکن ان کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں۔ قابل قدر تین ہیں۔ شتی کینٹھ، للہ عارفہ اور شیخ نورالدین صری۔ شتی کنیٹھ پہلا کشمیری شاعر ہے جس کا کلام دستیاب ہے۔ یہ تیرھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس کے کلام کا مجموعہ 'مہانیہ پرکاش' ہے۔ اس کے کلام میں سنسکرت کے الفاظ کی بھتات ہے اور ہندو دھرم کے خیالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب سری نگر سے چھپ چکی ہے۔ لیکن عام لوگ اس سے متعارف نہیں۔

للہ عارفہ

جن کو لل ماج، لل دیدی، للی ایشوری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کشمیر کی ایک

غیر معمولی بیٹی تھی - غیر مسلم اِن کو دیوی اور مسلمان ولی اللہ سمجھتے ہیں - آپ کا نام پدماوتی تھا - آپ ۱۳۳۰ء میں پاندریٹھن (سری نگر سے چھ میل) میں پیدا ہوئیں، جب کہ ہندوستان میں محمد تغلق حکمران تھا - آپ کی شادی قریب کے گاؤں پدمان پور (حال پانپور) میں ہوئی - یہ علاقہ زعفران کی پیداوار کے لیے سارے برعظیم میں مشہور ہے - لل کی ساس بڑی ظالم تھی - اس کے برتن میں چاولوں کے نیچے ایک بڑا سا گول پتھر صبح و شام ڈال کر رکھ دیتی تھی اور اوپر تھوڑے سے چاول بکھیر دیتی تھی تاکہ سب سمجھیں کہ اس کا برتن کھانے سے بھرا ہوا ہے - یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا - للّی سب کچھ برداشت کرتی رہی اور اُس نے اُف تک نہ کی - آخر ایک دن اس کے خاوند کو اس بات کا پتہ چل ہی گیا - اس پر گھر میں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا - للّی نے ترکِ دنیا کیا اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اِدھر اُدھر گھومنا شروع کیا - جب حضرت شاہ ہمدانی کشمیر آئے، للّہ نے ان سے بھی رابطہ پیدا کیا اور ان سے دین حق کے اسرار و رموز سیکھ لیے - للّہ بیجباڑہ نامی گاؤں میں کافی لمبی عمر پا کر وفات پا گئی - آپ کو اسلامی طریقہ پر دفن کیا گیا، جس سے ظاہر ہے کہ آپ نے حضرت شاہ ہمدان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی - (حضرت حسین سمنانی کو بھی للّہ عارفہ کا مرشد کہا جاتا ہے) -

آپ کے اسلوک (جن کو لل دیدہ ہندو واٹھ بھی کہا جاتا ہے) کا ترجمہ سرجارج گریرئسن نے انگریزی میں کیا ہے اور ان کو شیو دھرم کا پرستار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سرجارج گریرئسن نے کشمیری زبان کی لغت تیار کی ہے - اس میں اسے ایک کشمیری پنڈت نے خاص مدد کی - ورنہ قیاس غالب یہی ہے کہ حضرت شاہ ہمدان، شیخ نور الدین ولی اور دوسرے مسلمان بزرگوں کے فیض سے للّہ عارفہ بھی خدائے واحد کی پرستار اور مذہب اسلام کی دلدادہ بن چکی تھیں -

للّہ نے جب ترک دنیا کیا تو گھر والوں نے اسے واپس لانے کی بڑی کوشش کی - شری کینٹھ نامی گورو بھی آیا - للّہ، اس کے خاوند اور گورو کے درمیان مباحثہ ہوا - جس میں چار سوال پوچھے گئے :

۱- سب سے اچھی روشنی کون سی ہے ؟
۲- سب سے اچھا تیرتھ کون سا ہے ؟
۳- سب سے اچھا رفیق کون ہے ؟
۴- سب سے زیادہ تسکینِ قلب کس چیز میں ہے ؟

للّہ کے شوہر نے کہا کہ :

اچھ ہیو نہ پرکاش کنے   کو ٹھیس ہیو نہ تیرتھ کانہ

چندس ہیو نہ باندو کنیے   کھنہ ہوبوو نہ سوکھ کانھ

ترجمہ : اپنی آنکھوں جیسی کوئی روشنی نہیں ،
اپنے گھر (کے کمروں) کے برابر کوئی اور جگہ نہیں۔
اپنی جیب سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں ،
اور تندرستی کے برابر کوئی چیز آرام دہ نہیں۔

گورو جی بولے :

یمریس ہیو نہ پرکاش کنیے   گنگا نہ ہیو نہ تیرتھ کانھ
بالیس ہیو نہ باندھو کنیے   رنہ ہیو نہ سوکھ کانھ

ترجمہ : سورج کے برابر کوئی روشنی نہیں ،
گنگا کے برابر کوئی تیرتھ نہیں ،
سگے بھائی جیسا کوئی دوست نہیں ، اور
بیوی کے برابر کوئی سکھ والی شے نہیں !

للہ عارفہ نے جو سلوک کی منزلیں طے کرچکی تھی، دونوں کو اس بات سے لاجواب کردیا :

معیس ہیو نہ پرکاس کنیے   ہیس ہیو نہ تیرتھ کانھ
دیس ہیو نہ باندھو کنیے   بھیس ہیو نہ رونہ کانھ

ترجمہ : عرفان الٰہی کے برابر کوئی روشنی نہیں ہے ،
عین الیقین کے برابر کوئی تیرتھ نہیں ہے ،
اللہ تعالیٰ جیسا کوئی دوست نہیں ہے ، اور
خوف خدا (تقویٰ) کے برابر کوئی ذریعہ سکون نہیں ہے !

قرآن پاک میں بھی آیا ہے :
الا بذکر اللہ تطمئن القلوب! اللہ کے ذکر سے ہی قلب مطمئن ہوتا ہے۔ للہ کے شلوک ذکرِ الٰہی سے بھرپور ہیں۔ بایں ہمہ آپ کا فلسفہ ہمہ اوست کا فلسفہ ہے۔ پھول ہو یا گھاس، بھیڑ ہو یا اس کو ذبح کرنیوالا ، للہ کو ان سب میں ذات باری کا ہی جلوہ نظر آ رہا ہے۔ للہ اللہ تعالی سے ایک بندۂ گستاخ کی طرح سوال پوچھنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ کہتی ہے :

پانے پانس چھک اتمو داران   زئی ہے ناران تہ یم کم وہ
پانے دانس کھستر کرہ ناوان   زئی ہے ناران تہ یم کم وہ

ترجمہ : تو بھکاری بن کر خود ہی اپنے سے بھیک وصول کرتا ہے ،
تو ہی مالک ہے۔ تو یہ کیا چکر ہے!

تو خود بھیڑ بنتا ہے ، اور قصائی بن کر
اپنے آپ کو ذبح کرتا ہے !
تو خود نرائن (مالک) ہے تو یہ کیا تماشا ہے ؟
بقول کسے ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ !''

للہ نیک بیک وقت صوفیانہ اور ماورائی (کانٹ کے) فلسفہ پر یقین رکھتی تھی - وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہی آخر اسے روحانی تسکین پانے میں کامیابی ہوئی - اس کی اپنی ذات ہی اس کے لیے روحانی معلم کی حیثیت اختیار کر گئی اور اس نے یہ حقیقت جان لی کہ اس کی یہ روح اور خدا ایک ہی ہیں - اس کی زبان سنسکرت آمیز ہے -

للہ ، منصور حلاج کی طرح انا الحق کا نعرہ بلند کرنے سے بھی نہیں چوکتی :

اسی دس تے اسی آسو اسی رو رو تہ وبہ !
سوس سورہ نہ ربوں نہ مرں روس سورہ نہ انہ گژھ

ترجمہ : ہم ہی تھے اور ہم ہوں گے ،
ہم ہی ہمیشہ دورہ کرتے رہیں گے !
محبوب کے لیے جینا اور مرنا کبھی ختم نہ ہوگا ،
اور سورج کا طلوع اور غروب کبھی ختم نہ ہوگا -

اورہ نہ پانے تو رہ نہ پانے تو وائے دزہ نہ راتھ
پانے گودت نہ پانے کیا نے پانے دانس سود نہ راتھ

ترجمہ : ادھر بھی وہی ہے اور ادھر بھی وہی ،
وہ کبھی سمجھنے نہ رہا -
خود ہی وہ باطن ہے ، خود ہی ظاہر -
وہ کبھی فنا نہیں ہوگا !

بے ثباتی عالم کے بارے میں :

دمی ڈیو ہم دہ نسہ بار دمئی زُمہثم گجع وزہ وفی
دمی دُبھم کراجی ماس دمی دبھم پانڈو ماجی

ترجمہ : ابھی میں نے بھٹی کو بھڑکتے دیکھا اور پھر
ابھی نہ دھواں نظر آیا اور نہ آگ تھی !
ابھی میں نے ایک عورت کو پانڈوں کی ماں کی طرح (رانی بنے ہوئے) دیکھا
اور ابھی ایک کمہارن کی صورت میں دیکھا !

حضرت شیخ نور دین نورانی

حضرت سیخ العالم نور الدین نورانی ساعر سے زیادہ ولی الله ہیں ۔ لیکن انپے پاکیزہ خیالات کا اظہار کرنے کے لیے چونکہ انہوں نے ساعری کو ہی اختیار کیا اس لیے ان کو ساعروں کی صف میں بھی رکھا گیا ہے ۔ آپ موضع کیموہ میں ۱۳۷۷ء میں عید الاضحیٰ کے دن سیخ سالار دین کے ہاں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد سبز خاندان سے تعلق رکھتے تھے ، جو کشتواڑ کے راجوں کے خاندان سے تھے ۔ سیخ سالار دین نے یاسمن ریسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ یاسمن رسی جنگلوں میں رہا کرتے تھے اور بسا اوقات سیر کی سواری بھی کرتے تھے ۔ سدرہ ماجی جو سیخ نور دین کی والدہ تھیں ، انہی سیخ سالار کی دوسری بیوی تھیں ۔ یہ بیوہ ہو گئیں ، تو انھوں نے بھی سیخ سالار دین کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ انہی کے مشورہ سے سیخ صاحب سے نکاح کیا ۔ روایت ہے کہ جب سیخ نور دین پیدا ہوئے تو سدرہ ماجی کا دودھ نہیں پیا ۔ ادھر سے للّہ عارفہ کا گزر ہوا ۔ اس نے بچے کو ڈانٹ کر کہا کہ پہاتسہ سند چھوک نہ وون چھک حد مند حھان (تو اس دنیا میں آنے سے نہیں سرمایا ، اب دودھ پینے سے سرماتا ہے کیا؟) اس پر سیخ صاحب نے دودھ پینا سروع کیا ۔

حضرت سیخ اولیائے کشمیر میں سب سے افضل ہیں ۔ آپ نے ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی ۔ سلطان زین العابدین بڈ شاہ نہ صرف ان کے جنازہ میں خود شریک ہوئے بلکہ جنازہ کو کندھا بھی دیا اور پھر ان کے اعزاز میں ایک سکہ بھی جاری کیا ۔ اتنا بڑا اعزاز سایہ ہی کسی بزرگ کو ملا ہو کہ شاہ وقت جنازہ کو کندھا دے اور اس کے اعزاز میں سکہ جاری کیا جائے ۔ سیخ صاحب کو چرار سریف میں دفن کیا گیا ۔

حضرت شیخ صاحب کی بے شمار کرامات ہیں ۔ شیخ نور الدین کا انداز للّہ عارفہ کی نسبت زیادہ مبلّغانہ ہے ۔ مگر یہاں ہم صرف ان کی ساعری پر بحث کریں گے ۔

سعر میں سیخ صاحب اور للّہ عارفہ کا اسلوب ایک ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی کشمیری زبان فارسی ، عربی سے متاثر ہوئی تو ضرور تھی لیکن عربی فارسی عروض کو کشمیری شاعری نے ابھی اپنایا نہیں تھا ۔ حضرت شیخ اور للّہ عارفہ شاعر نہیں بلکہ ”دوست خدا“ تھے ، اور یہ اپنے خیالات منظوم صورت میں لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے ۔ شاعری ان کا مقصد نہیں تھا ۔ بقول مولانا روم :

من ندانم فاعلاتن فاعلات شعر می گویم بہ از قند و نبات

حضرت شیخ اور للّہ عارفہ کی ساعری چار چار مصرعوں کے شلوکوں پر مشتمل ہے ۔ قطعہ کو کشمیری میں سلوک کہا جاتا ہے ۔

حضرت شیخ کے اشعار، دنیا کی بے ثباتی، حسد و بغض اور لالچ کی مخالفت اور توحید الٰہی کے جذبات سے مملو ہیں۔ اگرچہ اسلام میں کہا گیا ہے کہ "لا رہبانیت فی الاسلام" اور قرآن مجید میں عیسائی راہبوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے ترک دنیا کو خود بخود اپنا لیا لیکن وہ اس سلسلہ کو نبھا نہیں سکے۔ مگر حضرت شیخ نورالدین اپنے آپ کو اسی سلسلہ (حضرت اویس قرنی سے منسوب) کی مناسبت کی وجہ سے ساتواں ریشی سمجھتے تھے۔ آپ نے فقر کو اس طرح نبھایا کہ شاید ہی کوئی نبھا سکے۔ آپ کی والدہ ماجدہ، اہلیہ محترمہ اور بچوں نے آپ کو ترک دنیا سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آپ اپنے اختیار کردہ راستے سے نہیں ہٹے۔ آپ کے اپنی والدہ، حضرت زی دیدی اور والد سے مکالمات کشمیری منظومانہ شاعری کے عمدہ نمونے ہیں۔ فرماتے ہیں:

سنطان لس لا حم نره بارس	نه راو نارس رو رس ونه
ختمه درم درم نمو نمارس	ریته سمسارس گیم لبه

ترجمہ: ابلیس نے میرے حس و حواس کے ذہن کو آگ لگا دی! اور
میں اپنا راستہ بھول گیا،
جس طرح جوردی کو پار کرنے والا گھاٹ بھول جاتے ہیں!
اس بازار میں ناحق کے دھوکے اور فریب ہیں!
اس دنیا میں آ کر میں ذلیل اور خوار ہو گیا!

آداس وتے گداس وتے	نه منز سونهے لجم رانه
وجھِم حندس بار در ایے	ناوه نارس وس کیاسه

ترجمہ: میں راستے پر چلتا رہا۔
آخر دریا کے کنارے پر پہنچا تو رات سر پر آ گئی۔
اب دریا کو پار کرنے کے لیے کشتی بان کو پیسے دیتے ہیں۔
میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر وہ خالی تھی!
اب میں کشتی والے کو کیا دوں کہ وہ مجھ کو پار اتار دے!

موت اٹل ہے اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

دس اوره نمی یورو سے	دس عالم و ده نه لسه مو
دس داس کرن ل وتے	بنی آسه تے کھسے مو!

ترجمہ: جس کے لیے موت کا پیغام آیا،
ساری دنیا بھی اس کے لیے آنسو بہائے تو کیا وہ زندہ رہ سکتا ہے؟
جو اڑھائی گز زمین کے نیچے (قبر میں) اترا،

اگر وہ نبی بھی ہو، تو اس کو اس دنیا میں واپس نہیں لایا جا سکتا۔

حضرت محمد حق سُند پیارو دمہ دمہ جبریل بارس
تمی بلہ سکہ نتی پارو دپھتہ بایہ دنیا یار کس

یہ شلوک آیہ کریمہ و ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل کی تفسیر ہے۔ حضرت شیخ کا کلام کشمیر اکیڈیمی سری نگر نے ۱۹۶۶ء میں 'نورنامہ' کے نام سے شائع کیا ہے۔ جسے محمد امین کامل نے ترتیب دیا ہے۔

ان کے کلام اور للّی ماجی کے کلام میں جو کشمیری لفظ استعمال ہوتے رہے ہیں وہ اب بستر متروک ہو چکے ہیں اور کاتب حضرات نے بھی بعض الفاظ کو نہ معلوم کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔ بعض اسلوکوں کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لل دیدی کے ہیں یا شیخ صاحب کے۔

شیخ صاحب کے کلام میں ملاؤں اور لل دیدی کے کلام میں برہمن گوروؤں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ حضرت شیخ کا مشہور دوہا ہے:

ہیرے سوبلی اندر سوہی ممبران لھست یہ کر کرکار
ملے دہروہ یہ مولوی رومس نہ ملہ ڈیشمہ اسغفار

ترجمہ: باہر سے یہ خوبصورت دکھائی دیتے ہیں اور اندر سے منحوس ہیں!
یہ لوگ منبروں پر چڑھتے ہیں اور 'کارِ دیگر' بھی کرتے ہیں!
اگر مُلاؔ کہا جا سکتا ہے تو مولانا جلال الدین رومی کو کہا جا سکتا ہے۔
ورنہ مُلاؔ کو دیکھ کر تو استغفار کہا کر!

شیخ نورالدین کے زمانے میں ہی سوم پنڈت نے 'زین چرتر' اور دودھ بٹ نے 'زینہ ولاس' لکھی۔ چونکہ اس وقت کشمیر اپنے شباب پر تھا اور سرکاری زبان کا درجہ فارسی کو ملا تھا۔ اس لیے زیادہ پڑھے لکھے لوگ فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن وہ لوگ ہمارے موضوع سے باہر ہیں حق تو یہ ہے کہ کسی اور زبان میں لکھنے والے کو عوام میں وہ ہردلعزیزی حاصل نہیں ہو سکی جو کشمیری شعر کہنے والوں کو ہوئی۔

اس دور کی شاعری میں یاس و ناامیدی کے مضامین زیادہ ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہاں کی شخصی آزادی کا فقدان اور معاشرتی بد حالی ہے۔ یہ دور زمیندارانہ نظام کے عروج کا دور تھا۔ شیخ نور الدین نے دنیا کو دکھوں کا گھر سمجھ کر اس سے فراریت کا درس دیا، اور یہ شاعری نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والوں، بے سرو سامان مزدوروں اور کسانوں کی پر الم زندگی کی داستان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سوز و گداز اور درد کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

اس زمانے کی شاعری کی دوسری خصوصیت سنسکرت کے اثر سے نکل کر فارسی کے زیر اثر آنا ہے۔ اب فارسی تراکیب اور فارسی آمیز تراکیب کا استعمال عام ہونے لگا۔

کشمیری ادب کا دور ثانی

سوم پنڈت (مصنف رتنہ حریر۔ کشمیری زبان میں زین العابدین بڈ شاہ کے سوانح حیات) اور بودھ بٹ (مصنف زینہ ولاس جس میں کشمیری زبان میں عہد بڈ شاہ کے ایک واقعہ کو ڈرامائی صورت میں لکھا گیا ہے) دراصل اس دور کے شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ اس دور کے باقی شاعر حبہ خاتون، حبیب اللہ نوشہری، روپا بھوانی، صاحب کول، ارنی مال، ملا فقیر اور میر عبداللہ بیہقی ہیں۔ ہاتھوں لکھنے والے غیر مسلموں کا طرزِ نگارش ٹھیٹھ کشمیری ہے۔ باقی شعرا جو مسلمان تھے ان کا کلام فارسی عروض سے متاثر ہے۔

حبہ خاتون

جو موجودہ کشمیری غزل کی بانی ہے، کا اصل نام زونی تھا۔ اس کی پیدائش ۱۵۴۱ء سے ۱۵۵۲ء تک لکھی گئی ہے۔ یہ ایک غیر معروف گاؤں چندن ہار میں پیدا ہوئی۔ اس کی شادی ایک سیدھے سادے لڑکے عزیز لون سے ہوئی۔ سسرال والے زونی سے کام زیادہ کراتے تھے اور بد سلوکی بھی کرتے تھے۔ ادھر زونی کو قدرت کی طرف سے طبع موزوں ملی ہوئی تھی۔ اس کو اٹھتے بیٹھے، چلتے پھرتے شعر سوجھتے تھے۔ اس پر گھر والے اور بھی بیزار ہو جاتے تھے۔ ایک دن وہ کھیت میں اکیلی کام کر رہی تھی اور عالم غربت میں سسرال والوں کی زیادتیوں کے خلاف ایسا بنایا ہوا ایک دردناک گیت بھی گا رہی تھی۔ زونی پھاوڑے کی ضربوں سے ساز کا کام لے رہی تھی اور گاتی بھی جاتی تھی۔ وہاں اتفاقاً یوسف شاہ چک بادشاہ وقت سیر کرتا ہوا جا نکلا۔ اس نے جب اس حسن مجسم کو دیکھا اور پھر گیت بھی سنا تو:

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر جاتا رہا اک آہ کے ساتھ

کچھ عرصہ بعد یوسف شاہ نے زونی سے نکاح کر لیا۔ اس نے اب دل کھول کر شاعری شروع کی اور اپنا قلمی نام حبہ خاتون رکھ لیا۔

حبہ کی اپنی شاعری کے تین دور ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب وہ اپنے سسرال میں ایک مظلوم نوجوان بہو تھی۔ اس زمانے کی مشہور غزل ہے:

وارہ ویں سیت وارہ چھس نہ چارہ کر میون ما پینوہو

(سسرال والوں کا میرے ساتھ سلوک ٹھیک نہیں ہے۔ میرا چارہ کرو اے میرے نہال والو)

یہ غزل ہر کشمیری بہو جو سسرال والوں سے تنگ ہو دردناک آواز میں گاتی ہے۔

حبہ کی شاعری کا دوسرا دور وہ تھا جب نہ ملکہؑ وقت تھی ۔ اس دور کا کلام عشق و محبت کا مرقع ہے ۔

تیسرا دور وہ ہے جب ۹۹۳/۱۰۸۵ء ھ میں اکبر بادشاہ نے کشمیر پر حملہ کیا اور یوسف شاہ چک کو گرفتار کرکے بنگال میں نظر بند کر دیا گیا ۔ حبہ یوسف شاہ کے بیٹے یعقوب شاہ کی سوتیلی ماں تھی ۔ وہ زیادہ دیر شاہی محل میں نہ رہ سکی ۔ ادھر سے یوسف شاہ بھی کبھی واپس نہ آیا ۔ اس موقع پر حبہ نے ترک دنیا کیا اور کشمیر کے آخری آزاد تاجدار کی یہ ملکہ ساری وادی میں دیوانہ وار پھرتی رہی ۔ عشقِ مجازی نے عشقِ حقیقی کی صورت اختیار کر لی ۔ ترک دنیا کے بعد سترہ سال زندہ رہی ۔ پانتہ چھوک ، سری نگر سے چار میل دور اس کے نام پر ایک مسجد بھی ہے ۔ قریب ہی اس کی قبر بھی ہے ۔ اشعار میں ہجر و فراق کے مضامین زیادہ ملتے ہیں جن میں چاہت اور وصال کی تڑپ نمایاں ہے :

گوش سزھا و بھرادے ووله ساند سیو سنے لاہ سو
ووله متیہ گرہ ووہسہ ے بس مرہ سئہ کتو سہ ے
سرادان چھسہ یوزے دولہ میانہ پوسے مدہ نو
وولہ سہ گرہسو و پوسن سارہ لٹ سارجھم روشن
روشنہ رودم گوسن وولہ سانہ پوسے مدہ نو
وولہ سہ گرہسو و ہندے لکسہ مت کرس رندے
لانوں نائے کسہ ادرے وولہ سانہ نوسے مدہ نو
وولہ سہ گرہسو و آدس دنیاہ جھ ندرہ نہ خوابس
تیرا ران جھہ توجو اسی وولہ سانہ نوسے مدہ نو

ترجمہ : میں کونے کونے میں تیرے لیے پھولوں کی سیجیں بچھا دوں گی ۔
اے میرے پھولوں کے رسیا آجا !
اے میرے محبوب آ! ہم یاسمین کے پھول چن لیں ۔
جو مرے گا وہ دوبارہ دنیا میں کس طرح آئے گا؟
میں تو تیرے ہی انتظار میں جی رہی ہوں ۔
آجا ! اے میرے دیوانے آجا ،
آ میدانوں میں پھول چن لیں ۔
میرے محبوب تو کیوں پیچھے رہتا ہے ؟
تو دور دراز کے علاقوں (بنگال) میں کیوں رہ گیا؟

میرے پھولوں کے رسیا آ جا !
آ میرے سارے ! سلے پھول چن لیں -
لوگ تو مجھے اب طعنے دیتے ہیں اور مذاق کر رہے ہیں -
قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے !
اے میرے پھولوں کے رسیا آ جا !
میرے محبوب ! آ جا ہم ندی کنارے جائیں -
اس وقت ساری دنیا گہری نیند سو رہی ہے -
میں تیرے جواب کی منتظر ہوں -
میرے پھولوں کے رسیا آ جا !

بہت سے معمر مصنفین نے مندرجہ بالا غزل کو حبہ خاتون کی ہی غزل قرار دیا ہے - مثلاً آزاد اور ڈاکٹر صوفی نے - لیکن یہ ساری غزل میری نظر سے 'اصلی موسیقی کشمیری' نامی کتاب کی جلد دوم میں (جو حافظ احمد اللہ سحابی صراف کدل سری نگر کی تصنیف ہے) گزری - یہ کتابیں غلام محمد ، نور محمد تاجران کتب نے شائع کی ہیں - اس میں یہ غزل پوری دی گئی ہے - شاعر کا نام نہیں دیا گیا - ایک بند اس میں یوں ہے :

وولہ یارہ دنہ وو نارا — حضرت بل دیدارا
سنبس کرو زارہ سارا — وولہ مانہ نوسے مدہ نو

اے محبوب ! آ ہم کشتی میں جہلم کو پار کریں اور درگاہ حضرت بل میں دیدار (نبی ص کے موئے پاک کا) کرتے جائیں - نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے حضور آہ و زاری کریں) -

حضرت بل کی زیارت اورنگ زیب کے زمانے میں ہی - جب موئے مبارک کشمیر آیا - حبہ خاتون کے زمانے میں یہ زیارت بالکل نہیں تھی لہذا وہ اس کے بارے میں کس طرح شعر کہہ سکتی تھی[1] - ظاہر ہے کہ یہ غزل کسی اور شاعر یا شاعرہ کی ہے یا اس میں کسی نے اپنی طرف سے چند شعر ملا دیے ہیں -

حبہ خاتون کا کلام سادہ اور سحرل ہے - جذبات اور زبان میں فارسی شاعری کا رنگ غالب ہے - غزل میں ایک بحر نہیں ، بلکہ مختلف بحروں کے ذحاف ملتے ہیں - انہوں نے کشمیری زبان میں فارسی انداز کو رواج دیا -

---

۱- عین ممکن ہے یہ شعر بعد میں کسی نے بڑھا دیا ہو - غزل میں ننگال کا ذکر بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حبہ خاتون نے یوسف شاہ کے فراق میں یہ غزل کہی - خود فاضل مقالہ نگار کے دل میں شک ہے - (ادارہ)

خواجہ حبیب اللہ نوشہری (پ - ۱۵۵۴ء — ۱٦۱۷ء/۹٦۲ھ — ۱۰۲۷ھ)

والد کا نام شمس الدین گنائی تھا - پیشہ دکانداری - بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کیا اور پھر دوکان پر بیٹھے - تلاوت کلام اللہ یا شعر کہنے میں اس قدر محو رہتے کہ اکثر لوگ خود ہی سودا تول کر لے جاتے تھے - فارسی اور کشمیری دونوں میں لکھتے تھے - انہوں نے غزل میں تصوف کے مضامین کو رواج دیا -

کشمیری کا زیادہ تر کلام نایاب ہے - غزل کا نمونہ یہ ہے :

تارہ گژہوو دیوہ ے   وہ لوگ ژہوو دیوہ ے
آسکارا در اوہ ے   صورتن خز ژاوے
چھس محمد ناده ے   وولہ گرہوو دیوہ ے
کنت کنزاً آوہ ے   جلوہ ساران در اوہ ے
نحن اقرب آوہ ے   وولہ گرہوو دیوہ ے

ترجمہ : محبوب حقیقی نے خود ہی اپنے آپ کو آسکارا کیا
وہ خود ہی مختلف صورتوں میں داخل ہوا
اس کا نام محمدؐ ہے
آؤ میلے کو چلیں -
کنت کنزاً (میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا) کی حدیث ،
تو نے سنی ہوگی -
یہی ذات جلوہ دکھانے کے لیے نکلی !
اللہ تعالیٰ خود بھی فرماتا ہے کہ
میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہوں.
(نحن اقرب الیہ من حبل الورید) -
آؤ میلے کو چلیں -

صاحب کول (م - ۱٦۴۲ء)

شہنشاہ جہانگیر کے دور میں گزرے ہیں - سری نگر کے محلہ جوکول کے رہنے والے تھے - ۱۸۷۵ء میں ایک یورپین محقق مسٹر بہلر کشمیر آئے وہ ان کی ایک کتاب 'کرشن اوتار' کا قلمی نسخہ اپنے ساتھ لے گیے - کلام نایاب ہے -

مرزا اکمل الدین بدخشی (۱۶۴۴ء—۱۷۱۸ء/۱۰۵۴ھ — ۱۱۳۱ھ)

قادر الکلام ادیب اور شاعر تھے ۔ 'بحر الفرقان' کے نام سے اسی ہزار اشعار کی مثنوی فارسی زبان میں لکھی ۔ مرزا صاحب کے مزار پر ان کے عقیدت مند بے مقطع کشمیری غزلیں پڑھتے رہتے ہیں ۔ جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ ان کی تصنیف ہیں ۔ دیکھیے محبوب کے لیے اپنی محبت کے والہانہ پن کو کس طرح ظاہر کیا ہے :

بالبہ ہے رُمہ رُمے   چھم بارہ سمد تمنا
کانہ ستھ ڈیوٹھمے   دون لاگ آنگس رام
رائی رائی د چھمے   چھم بارہ سمد تمنّا
دوسہ ستھ ڈیوٹھمے   بوسہ ما سپر عماحس
عصہ کرتھ رلوسے   چھم بارہ چون تمنا

ترجمہ : اے دوست مجھ الھڑ کے انگ انگ میں تیری محبت بھری ہوئی ہے!
میں نے اسے بارہ دری سے دیکھا ۔
وہ بہروپیے کی صورت میں میرے صحن میں آیا ۔
اس نے میرے ذرہ ذرہ کو نکھلا دیا ہے ،
پھر بھی مجھے اس کی تمنا ہے !
میں نے اُسے صحن کی دیوار کی اوٹ میں سے دیکھا ،
اور پھر اس کی شمسے کی چادر کو کھینچا ۔
مگر وہ اپنی سی بات پر ناراض ہو گیا ۔
پھر بھی میرے دل میں اس کی تمنا ہے !

روپہ بھوانی (پ - ۱۶۲۵ء)

روپہ بھوانی نام اور الک تخلص ۔ آپ ۱۶۲۵ء میں پنڈت مادھو رام کے گھر میں پیدا ہوئیں ۔ ایک مسلمان بزرگ ولد محمد صادق سے ملاقات ہوئی ۔ آپ کے کلام میں للی ایشوری کا رنگ ہے اور سنسکرت کے الفاظ کی بہتات ۔ آپ کے نام پر سری نگر میں ایک ٹرسٹ قائم ہے ۔ مندر رام جو (سری نگر کے پاس) ان کے نام کا ایک مندر بنا ہوا ہے جس پر سرد یوں میں میلہ لگتا ہے ۔

جم (اہلیہ رشید)

مرزا اکمل الدین بدخشی کے مریدوں میں سے ایک نانبائی رشید نامی بھی تھا ۔ جم

اس کی زوجہ تھی ۔ اس کا مرزا صاحب کی وفات پر لکھا ہوا مرثیہ اب تک لوگوں کی زبان پر ہے :

سانہ ہسو ہیو — ہی بولدہ یوناونی
بنی صاحبہ جھوؤ — نتوی گزھم وا سوئی
سہ دیدار دسو — ہی بولدہ یوناونی

ترجمہ : اے میرے یاسمین کے پھول !
میں یاسمین کے پھول کشتوں میں بھر کر تیرے پاس بھیجدوں گی ۔
او رسول اکرم کے سوالی !
ان کے پاس بھیج جانا ۔
آنحضور وہاں اپنا دیدار دکھائیں گے ۔
میں یاسمین کے پھول بھیج دوں گی !۔

اس مرثیہ میں اس عقیدہ کا اظہار ملتا ہے کہ نیک انسانوں کو مرنے کے بعد رسول کریمؐ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے ۔

سید غلام شاہ آزاد (۱۷۳۳ء — ۱۷۷۵ء / ۱۱۴۶ھ — ۱۱۸۹ھ)

مدفن محلہ خانیار سری نگر میں ہے ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں ان کی منقبت مشہور ہے :

شیخ عبدالقادرس کو زارہ بار (شیخ عبدالقادر کے سامنے آہ و زاری کر) انہی کی تصنیف ہے ۔

پرکاش بٹ

محمود گامی سے پہلے گزرے ہیں ۔ علاقہ دیوہ سر تحصیل گورگام کے موضع کری گام میں پیدا ہوئے ۔ پرانے پنڈت شعرا میں سے صرف انہی کے کلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اسے عام کشمیری بآسانی سمجھ سکتا ہے ۔ ان کی کتابیں 'رام اوتار چرت'، 'شیولگن' اور 'اکہ نندن' ہیں ۔ پہلی کتاب 'رامائن' کا کشمیری ترجمہ ہے ۔ 'اکہ نندن' مشہور کہانی ہے ، جس کی تفصیل پہلے دی گئی ہے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

رام چندر جی کی ماں رانی کوسلیا بن باس اختیار کرنے والے رام سے کہتی ہے :

کوسلایہ ہندہ گوبرو — کرہ یوگورہ گورہ
کو نو گوہم زہ تراونہ — کہسو ہیکہ حال باونہ
انی کس منہ ناونہ — کرہ یو گورہ گورہ
لگہ یوپوت ژہایے — ہی کرہس بوہایے

نــارس ووٹــھ لاےٗ کرہ یوگــورہ گــورہ

ترجمہ : اے کوسلیا کے بیٹے !
میں تجھے جھولاؤں ۔
تو مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے ،
میں اپنا حالِ دل کس کو سناؤں ؟
تمہیں منا کر کون لائے گا ؟
میں تجھے بلارے دیتی ۔
میں تیرے ساتھ پر بھی واری جاؤں ،
تو نے مجھے جنگل کے پھول کی طرح راکھ بنا ڈالا ۔
میں تیرے ساتھ ہی آگ میں کود پڑوں گی ۔
آ تجھے بلارے دوں !

اس دور میں ایک اور شاعر ملا فاخر کا نام بھی آتا ہے جس کا کلام ناپید ہے ۔

ارنی مال

کشمیری پنڈت خاتون موضع پلہ ہالن میں جو سری نگر شہر کے ۱۹ میل دور شمال کی طرف واقع ہے ، پیدا ہوئی ۔ ان کی شادی مشہور ادیب پنڈت بھوانی داس کاچرو سے ہوئی ۔ جن کا تخلص نیکو تھا ۔ ان کے کلام میں بھی حبّہ خاتون کے کلام کی طرح درد و سوز کی افراط ہے ۔ انھوں نے گیت اور غزلیں بھی لکھی ہیں ۔ خیالات و جذبات میں لطافت ، زبان میں صفائی ہے اور محاورات کی بندش چست ہے ۔ مضامین میں متانت پائی جاتی ہے ۔ حبّہ خاتون کی فارسی روایت کو انھوں نے آگے بڑھایا ۔ موسیقی کی ماہر تھی ، انھوں نے اپنے کلام کو موسیقی کے راگوں میں ڈھالا ۔

میر عبداللہ بیہقی

میر عبدالرشید بیہقی کے صاحبزادے تھے ۔ صاحبِ علم و فضل اور اہلِ قلم صوفی تھے ۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے ۔ کشمیری میں آپ کی منظوم تصانیف 'عقائد منظوم' ، 'مختصر وقایہ' ، وغیرہ ہیں ۔ ۹ مارچ ۱۸۰۷ء بمطابق ۹ محرم الحرام ۱۲۲۲ھ میں وفات پائی ۔

ملا عبیداللہ

ملا عبیداللہ محلہ ترپرستان سرینگر کے رہنے والے تھے۔ ملاابوالخیر کے شاگرد تھے اور درس تدریس پر گذر اوقات ہوتی تھی۔ ۱۲۶۸/۱۸۵۱ء ھ میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے :

بالیے نیری یارہ بل ته لولو | کالی ما فیری میرہ تل ته لولو
گوندہ کس بندہ بندہ ویسراونس | خندہ جھس نارہ وزہ مل ته لولو
میلہ موت یار میون سیلس دراو | اتھ ہیتھ عسقہ کرتل ته لولو

ترجمہ : آؤ ری سکھی پن گھٹ پر جائیں۔
یہی موقعہ ہے ، ورنہ کل جب تو ،
مٹی کے نیچے دفن ہوگی ،
اس وقت پچھتائے گی ،
کہ پن گھٹ پر کیوں نہ گئی۔
اس کا سہرا کیا خوب ہے !
اس نے میرے بدن کے جوڑ جوڑ کو پگھلا دیا ہے۔
اس کی ہنسی کیا ہے ، بجلی کا ایک کوندا ہے !
میرا میلے کا رسا دوست سیر کو چلا ہے !
اس کے ہاتھ میں عشق کی تلوار ہے۔

کشمیری ادب کا تیسرا دور

اس دور میں کشمیری باقاعدہ علمی اور ادبی زبان بن گئی۔ اس دور کے شعراء نے روزمرہ کی زبان کو اسے کلام میں استعمال کیا۔ ثقیل اور متروک الفاظ استعمال کرنے کا رواج ختم ہوگیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان کشمیر پر اپنی حکومت کے تقریباً پانچ سو سال پورے کر چکے تھے۔ پانچ صدیوں کی حکمرانی کے بعد اب کشمیر پر فارسی زبان کا گہرا رنگ چڑھ چکا تھا اور کشمیری زبان میں سلاست، نکھار، روانی اور گھلاوٹ پیدا ہو چکی تھی۔ اس دور میں ادب کا خاصا ذخیرہ پیدا ہوا۔

محمود گامی

محمود گامی تحصیل اسلام آباد یا اسلام آباد کے گاؤں آڑ دیدرمیں پیدا ہوا۔ بنگالی کی طرح کشمیری میں بھی گاؤں کو گام کہتے ہیں۔ محمود پڑھا لکھا نہ تھا مگر اس کی زبان بالکل سری نگر کی ٹکسالی زبان ہے۔ محمود پٹھانوں کے دورِ حکومت میں پیدا ہوا۔ سکھوں کی حکومت دیکھی اور ڈوگرہ راج میں اس وقت جب کہ کشمیر کی خرید و فروخت کو ۹ سال ہو چکے تھے، یعنی ۱۸۵۵ء میں فوت ہوا۔

محمود کا ہم عصر شاعر ولی اللہ متو جو مشہور کہانی 'ہیمہ مال' کا مصنف ہے، وہ محمود کی شان میں رطب اللسان ہے:

خصوصاً کا شرین منز مرا نامی چھ گیاہ گژھ اس زبان محمود گامی
میہ کورنم تم شتھاہ شہر آبادہ دل شاد سہ اوسوئی کا شرین منز مرد استاد
دہن شرنم سہ شہتا انگینہ کنوتی زدنم جُھہ سُس ثانی لمبی نہ!

ترجمہ: کشمیریوں میں ایک مرد محمود گامی نامی گزرا ہے،
اس نے شاہ آباد میں میرا دل خوش کیا۔
وہ کشمیری زبان کا استاد تھا،
اس نے میرے منہ کو شہد سے بھردیا!
وہ ایک لاثانی شاعر تھا۔

اسے فارسی اور عربی پر بھی عُبور حاصل تھا۔ اس کی فارسی غزلیں بھی موجود ہیں۔ ان میں حافظ شیرازی کی شاعری کی جھلک ہے۔ اس نے 'لیلیٰ مجنوں'، 'یوسف زلیخا' 'قصہ سلطان محمود غزنوی' 'قصہ ہارون الرشید' اور ایک حکایت فارسی کتابوں کو

سامنے رکھ کر لکھی - وہ روایتی شاعری کا بانی ہے - خیالات میں انسانوں کے لیے حسن پسندی اور عشق شعاری لازم ٹھہرایا ہے - اس کے کلام پر فارسی کا اثر غالب ہے - تشبیہیں اور استعارے تمام تر فارسی یا فارسی آمیز ہوتی ہیں - وہ فقیر دوست تھا - ارادت کیشوں کو رسد و ہدایات کی راہ بھی دکھایا تھا - شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی - اُس کے کلام میں فقر کی چاشنی بھی موجود ہے -

اہلِ کشمیر اس کو کشمیری زبان کا نظامی گنجوی بھی کہتے ہیں - ارنی مال اور حبّہ خاتون عورتیں تھیں - انہوں نے اپنی شاعری میں نسوانی جذبات کی ترجمانی کی ہے ، تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے ، لیکن محمود کو دیکھیے ، کس کامیابی کے ساتھ عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے :

کـرہ یومنز جگرس جـائے — میہ نـومـائے مشان جـانی
بدن میون عشقن کـرائے — تتھ منز وونـدہ تلتھ مـے
دو دُم سینہ کُر منہ والیے — مہ نو مائے مشان جـانی
یہ کم بـارہ دی رائے — رٹُھ میـون مـلا لـے
فقیرس پہ فقیر بـائے — مـہ نومائے مشان جـانی
لگنـے رمـہ ریـسن آئے — مـہ چھم جـون تمنـا
ارمـان جـانی کـس درائے — مہ نومـائے مشان جـانی

ترجمہ : تیرے لیے اپنے جگر میں جگہ بنا دوں گی !
تیری محبت کو میں بھول نہیں سکتی -
میرا بدن عشق کی جلتی ہوئی کڑاہی ہے ،
اسی میں تم نے میرا دل تل دیا ہے -
میرا سینہ جل گیا ہے ،
پھر بھی میں نے اُف نہ کی !
تیری محبت کو میں بھول نہیں سکتی -
تو جُگ جُگ جیتا رہ !
میرے دوست ! یہ کس نے تم کو مجھ سے بدظن کر دیا ،
کہ تو بالکل روٹھ گیا !
میں اسی طرح تیرے پیچھے چلوں گی ،
جس طرح کہ جوگی کے پیچھے جوگن !

میں تیری محبت کو فراموش نہیں کر سکتی،
میرے ارمان ابھی تک میرے دل میں ہیں،
میں تیری محبت کبھی بھول نہیں سکتی!

یہ کتاب دراصل روہ ہے۔ محمود نے تقریباً شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور وہ بھی کامیابی کے ساتھ۔

سری نگر میں خواجہ غلام نبی خیال نے ان پر ایک سو ستر صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے۔

پنڈت پرمانند

نام پنڈت نند رام عرف پرمانند۔ آپ ۱۷۹۱ء میں موضع سیر میں پیدا ہوئے جو کشمیر کے مشہور تیرتھ کے پاس ہی ہے۔ آپ کا تخلص عرف تھا۔ پیشہ سے پٹواری تھے لیکن اس کام سے نفرت تھی۔ آپ نے فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں میں شعر لکھے۔ حال ہی میں پرمانند جی کی شاعری کے متعلق سری نگر سے پروفیسر توشخانی نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں موصوف کے حالات اور کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ ان کے شاگرد لکشمن اور کرشن داس تھے۔ انہوں نے بھی اپنے استاد کی طرح شعر و شاعری میں نام پیدا کیا ہے۔ پرمانند کے مشہور گیت میں برہمن رادہاں کورس میں گاتی ہیں:

راسہ منڈلس حمھ سرینک رس
سانسہ دزہ سرہ گمرہ سرہ نس
اکھ اکس اتھ واسہ لایان آسہ ناراہ
رادھا کرشنا رادھا کرشنا رادھا کرشنا جی!

ترجمہ: ہزاروں گوپیاں محبت کی شراب پی کر،
راس منڈل کے گرد ناچنے میں مست تھیں۔
ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر
وہ پکار رہی تھیں،
رادھا کرشن! رادھا کرشن! رادھا کرشن جی!

ان کے فلسفے کے پیش نظر پرمانند جی کو کشمیر کا حکیم سنائی کہا جاتا ہے۔

قطب الدین واعظ

چرار سریف کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ میں وفات پائی ۔ آپ کی ساعری وعظ و نصیحت پر مشتمل ہے۔ ان کی زبان سنسکرت آمیز کشمیری ہے ۔ انہوں نے اپنے کلام میں حقیقت نگاری اور فطرت کی ترجمانی کی ہے ۔

شاہ غفور

ساہ عفور موضع جھونی تحصیل بڈگام کا رہنے والا تھا اور محمود گامی کا ہم عصر ۔ اس نے اپنی غزلوں میں تصوف کے راز بیان کیے ہیں ۔ بعض غزلوں میں ، جن میں وہ گبان دھیان کی باتیں لکھا کرتا تھا ، سنسکرت اور پنڈتوں کی کشمیری زبان کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں اور بعض میں قرآنی محاورے بھی استعمال کر لیے گئے ہیں ۔

مقبول شاہ کرالہ واری

مقبول ساہ نام اور مقبول تخلص تھا ۔ موضع کرالہ واری تحصیل بڈگام میں ایک سید گھرانے میں ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے ۔ صحت سروع سے خراب رہی ۔ آخر عین شباب میں ان کی جان سپ دق کے مہلک مرض نے لی ۔

آپ نے ’گل ریز‘ نامی کہانی کو نظم میں بیان کیا ہے جس کو کشمیری شوق سے پڑھتے ہیں ۔ یہ سہزادہ عجب ملک اور نوس لب سہزادی کی کہانی ہے جس کا پلاٹ فارسی کی ایک کتاب سے لیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ مقبول ساہ نے ’گریس نامہ‘ ، ’پیر نامہ‘ ، ’بہار نامہ‘ ، ’منصور نامہ‘ کے نام سے بھی کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں ۔ ان میں سے کئی ایک میں ہجو اور طنز و مزاح کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں ۔ ’گریس نامہ‘ میں کسانوں کی ہجو ہے :

ییک یلہ پیر منگنے پسوب ،سانگے !!
ستہ رستہ چھک ووبھان اوہ ہوں بانگے

ترجمہ : جب ان کا پیر ان سے ایک چوزہ مانگنے آتا ہے ،
تو اس کو دیکھ کر ،
یہ سور مچانا شروع کرتے ہیں ۔
جیسا اس وقت مچایا جاتا ہے ،
جب چیل چوزوں پر جھپٹی ہے !

'گل ریز' میں مشہور غزل ہے :

وسے گلن آوئے بہار | از سالہ انین بالہ یار
بیہ براہ والے گوئے ریہ کاہ | مرار بهس کماہ جھم راہ
اسنش سوحانی عمگسار | ار سالہ ابین دار دار

سری نگر کی کلچرل اکادمی نے پروفیسر حامدی کاشمیری کی تصنیف 'مقبول شاہ کرالہ واری' شائع کی ہے ، جس میں ان کے کلام اور سوانح حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے -

رسول میر شاہ آبادی

عبدالواحد آزاد لکھتے ہیں "رسول میر شاہ آبادی غزل کے لیے بہترین دل و دماغ لے کر دنیا میں آئے تھے - انہوں نے محمود گامی کے بعد کشمیری غزل کو غیر معمولی ترقی دی اور سحر کاری سے اس میں ایسا سماں باندھا کہ دورِ حاضر کے بلند پایہ غزل گو حضرت مہجور بھی ان کی ساعت پر فخر کرتے ہیں :

اس دردہ صور پردہ بلبہ گوشہ رسل میر
مہجور لاگت آؤ پسنہ دوبارہ ای روز

ترجمہ : عشق و محبت کے پیکر کو ،
رسل میر نے بے نقاب کر دیا -
اب وہی مہجور کی صورت میں
دوبارہ جنم لے کر آیا ہے !

ایک اور جگہ مہجور لکھتے ہیں :

میرہ سید برون میں لا بوس باس | تی کنن برو سخانن منز
مہجور دا گراو بھرہ ہانن

ترجمہ : ہم نے میر کی ہرائی سہد
نئے برتنوں میں بھر دی ہے ،
اور اس کو شراب خانوں میں
فروخت کرنے کے لیے لے گئے -
اے مہجور ! اب تو یہ شراب تقسیم کر
اور پیالوں میں بھرتا جا !

میر صاحب شاہ آباد کے میر خاندان سے ہیں ۔ آپ کشمیری زبان میں اسی طرح غزل کہنے کی قدرت رکھتے تھے جس طرح اُردو میں داغ دہلوی ۔ کشمیری زبان میں عشقیہ شاعری دو طرح کی ہے ۔ ایک میں مرد کی طرف سے اظہارِ عشق ہوتا ہے ، دوسری میں عورت کی طرف سے ۔ میر صاحب کا کمال ہے کہ انہوں نے مرد عورت دونوں کے جذبات کے اظہار کے لیے غزلیں لکھی ہیں ۔ مرد کی طرف سے اظہارِ محبت ملاحظہ ہو :

شوبہ شاباش جانہ ست ز با نہ لولو رندہ پوسہ مال گندنے درایہ لولو
راہ ہنزدانہ ناز کیا حھمہ ابر نہ گراں دیا الٰہی چشم بدہ نِس رچھتن
گرہ کیاہ کم چانہ دربارگاہ لولو رندہ پوسہ مال گندنے درایہ لولو
کالہ مولیس طاوس حھس برسر ہیلہ ناوہ علمت بیہ ازفر
ہنزہ ہبران رونزہ کھو دایہ لولو رندہ پوسہ مال گندنے درایہ لولو
رونہ گوذہ کوئی یامت بوزم ساز بوری دوزی نابہ آوساہ نیہ راز
پوسہ مال چھم پوسہ نِل ڈھابہ لولو رند پوسہ مال گندنے درایہ لولو

ترجمہ : میری پرچھائیں بھی شاباش کہے جانے کے قابل ہے ،
وہ شوخ گل اندام ،
پھولوں کی مالا پہننے کو چلی ہے !
اس ہندو راجکماری کی گردن ہنس کی طرح ہے ۔
چشم بد دور !
اے اللہ اس کو چشم بد سے بچائیو !
اس سے میری بارگاہ میں کیا کمی ہوگی !
اس کے کالے بالوں کے اوپر سنہری طاؤس ہے
اس نے اپنی زلفوں میں ،
پھلیل ، مشک نافہ اور مشک ازفر ملا ہے !
اس ہندو دیوی کو باندیاں اور داسیاں سنوار رہی ہیں ۔
جب اس نے میری محبوبہ کے پائل کی آواز سنی تو ،
پریوں کا راجہ اندر بھی اس محفل میں آیا ۔
میری محبوبہ کا وزن اڑھائی پھولوں کے وزن سے زیادہ نہیں ۔
میری چنچل پھولوں کی مالا پہننے چلی ہے !

اب عبودیت کا اظہار محبت ملاحظہ ہو:

مے یمہ رہ و یمہ زونہ دزی جانہ لولرے
سرس دار سور مرہ نکرہ نری جانہ لولرے
بوحال وندے ور شیے تارہ سنہ روس
مے اچھ بوس مال دزم جانہ لولرے
داس ... و ہم زار دوہس خارنہ لی تا
راس ... ۳ ... سپارہ پری جانہ لولرے

ترجمہ: میرے دیوانے ذرا ٹھہر!
میں نے تو تیری محبت کے صدقے روزے رکھے۔
اور دیئے ہی ہیں میں نے جھومنے والی سنہری جوڑیاں سوالی۔
اے میرے محبوب میں تجھے اپنا حال سناتی ہوں۔
مجھ سے نہ روٹھ جا، دل لیول کرتی ہوں،
میں نے تیری محبت میں اچھ بوس (ددری کا پھول) کے ہار بنائے۔
میں دن بھر اللہ کے حضور،
آہ و زاری کرتی رہی تا کہ تو مجھ پر مہربان ہو جائے!
اور تیری محبت کے لیے ہی میں نے
رات تو بس ارے (قرآن مجید) پڑھے!

میر صاحب تو سراپا نذری میں بھی دل حاصل تھا۔ یہی غزل جس کے شعر نقل کیے گئے ہیں دراصل ایک سراپا نعت ہی ہے۔ وہ نعت میں بلندی اور اظہار میں عمل کا درس دیتے تھے۔ اسلوب کے اعتبار سے میر صاحب، محمود گامی اور مقبول شاہ سے بڑے شاعر ہیں۔ وہ کشمیری شاعری کے اہم ستون ہیں اور کشمیری شاعری کی روایت کے برخلاف محبوب کے لیے نسوانی اوصاف اور صیغۂ مونث استعمال کرتے ہیں۔

ولی اللہ متو

موضع ڈہس کام متصل قصبہ بیروہ تحصیل بڈگام کے رہنے والے تھے۔ کشمیری میں ان کی تصانیف، 'ہشت مال' (مثنوی) ترجمہ 'حصول اسرار' 'ترجمہ ضروریات دین' وغیرہ ہیں۔ اول الذکر تصنیف میں عبدل ... اور طریف خان نے بھی آپ کی مدد کی ہے۔ ولی اللہ متو صوفی منش، مذہب کے دلدادہ اور رسول پاک کے عاشق تھے۔ جب حج کرنے گئے تو مکہ

سے مدینہ جاتے ہوئے جگہ جگہ خاکِ بطحا سے دیوانہ وار لپٹ جاتے تھے۔ 'ہیمہ مال' کی کہانی پہلے ہی دے دی گئی ہے۔

عبدالاحد ناظم

عبدالاحد نام اور ناظم تخلص۔ رسول میر ساہ آبادی کے ہم عصر ہیں۔ سال پیدائش اور سالِ وفات کا علم نہیں۔ ان کے کلام میں غزلیں، نعتیں اور ایک مثنوی 'زین العرب' اور ہجویہ نظمیں تھیں۔ 'زین العرب' ایک داستانِ عشق ہے۔ ناظم صاحب کا پیشہ پیری مریدی تھا۔

ثناء اللہ کریری

کریری تحصیل بارہ مولہ کے ایک گاؤں کا نام ہے ثناءاللہ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور اسی نسبت سے کریری کہلائے۔ ثناء اللہ کے خاندان کا علم و فضل کے ساتھ پرانا تعلق ہے۔ آپ ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ میں راہئی ملک عدم ہوگئے۔ آپ نے مناجاتیں اور نعتیں لکھی ہیں جو اب تک کشمیر کی بیشتر مساجد میں درد و سوز کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب 'احوال الآخرت' ہے جس میں امام مہدی کے ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے موقع نزول، یاجوج ماجوج اور حشر وغیرہ کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ ان کی مشہور نعت ہے:

با واوہ و انکنا تو توی یس ڈاف براوبھ مصطفیٰ
احوال میونوی سں ونک سوئی ہو کریم دادس دوا

ترجمہ: اے صبح کی ہوا تو ادھر تو جانا،
جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم استراحت فرما رہے ہیں۔
میرے احوال ان کو بتانا،
وہی میرے دکھوں کا علاج فرمائیں گے!

امیر الدین کریری

آپ بھی موضع کریری میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ میں سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف 'خاور نامہ'، 'سام نامہ'، 'معراج احمدی'، 'اعجاز سرمدی' 'انوار محمدی'، 'عارف قادری'، 'جنگ محمد حنیف در انتقامِ یزید' وغیرہ ہیں۔

خواجہ اکرام بقال

قصبہ حرار سریف کے رہنے والے تھے۔ اپنے قصبہ کی ایک حسینہ کے دام محبت میں گرفتار ہو گئے اور خاصے بدنام ہوئے۔ آپ کی ایک مثنوی 'مہر و ماہ' بہت مشہور ہے جس کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا جواب آج تک نہیں لکھا جا سکا۔ یہ 'شاہنامہ' فردوسی' کی بحر میں ہے۔ اندازہ ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے ہی عشق کا حال بیان کیا ہے۔ بقول شاعر :

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

سیف الدین تارہ بلی

سیف الدین نام اور سیف تخلص تھا۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں۔ ۱۸۷۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سیف کشمیر کے مشہور مرصع نگار شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں 'ہشت حال' اور 'وامق عذرا' ہیں۔ 'ہشت حال' میں دو ہزار ایک سو گیارہ شعر ہیں اور سارے کے سارے مرصع۔ اس قسم کی صنائع کو عام لوگ سمجھتے نہیں۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

دلبرس قسمہ گرس شعر برس خوش الحان　　　　کرتم گوش دتم ہوش نم چھمہ توان

یارنس رہبرن دس پردہ تکیں جان جرس　　　　تجکہ آفت رہ سور سمہ حور جہان

یعنی فارسی زیادہ اور کشمیری کم آپ رسالہ 'اصوات کشمیری' کے بھی مصنف ہیں جو کشمیری رسم الخط کے مسئلہ پر پہلی کتاب ہے۔

عبدالوهاب پرے

موضع حاجن کے باشندے تھے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء کو وفات پا گئے۔ سری نگر کی کلچرل اکیڈمی کے زیر اہتمام پروفیسر غلام محی الدین حاجنی نے ان کی سوانح عمری اور تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں :

۱۔ ہفت قصہ مکرزن (اس میں حیلہ گر عورتوں کی ۷ داستانیں ہیں)
۲۔ اکبر نامہ (اس میں انگریزوں اور افغانستان کے مابین جنگ کو نظم میں لکھا ہے)
۳۔ بہرام گور۔ مشہور قصہ
۴۔ شاہ نامہ (فردوسی کے شاہنامہ کا چار جلدوں میں منظوم ترجمہ ہے)
۵۔ سلطانی

۶- بے بُوج نامہ (یعنی اندھیر نگری چوپٹ راج)
۷- دیوانِ وہاب (یہ فارسی اور اردو نویس شعراء کی طرح ردیف کے مطابق تالیف کیا ہوا پہلا کشمیری دیوان ہے)۔
۸- ہفت قصہٴ اعمیٰ
۹- قصہ چہار درویش
۱۰- نونہال گلبدن
۱۱- خلافت نامہ
۱۲- درویسی -
۱۳- سکل و سائل آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نمونہ کلام :

اکی ضربہ ستین سوگوونیم جان ۔۔۔ سپن ریزہ ریزہ نمس استخوان

(اس کی ہڈیاں چور چور ہوگئیں۔ اس کی ایک ہی ضرب سے وہ نیم جان ہوگیا)

اسد پرے

اسد پرے بھی موضع حاجن کا ہی ایک اور قابل ذکر شاعر تھا۔

لکشمن کول بلبل

۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۳۱ء سمت ۱۹۸۸ بکرمی میں وفات پا گئے۔ اپنا قطعہٴ تاریخ وفات خود ہی لکھا اور جان دے دی۔ فارسی کے عالم تھے اور کشمیری میں بھی شعر کہتے۔ تھے وھوہ اور چرس کے رسیا تھے۔

آپ نے کشمیری زبان میں 'سام نامہ'، 'قصہ نل و دمن'، 'چائے نامہ'، 'سیو لگن' کے علاوہ غزلیں اور بھجن وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

پیر عزیز اللہ اسد حقّانی

عزیز اللہ نام تھا اور حقّانی تخلص اور خاندانی عرف۔ سلسلہٴ نسب شاہ قاسم حقّانی سے ملتا ہے۔ اوائل عمر میں محلہ نر برستان سری نگر میں رہے، ۲۵ سال کی عمر میں موضع بٹہ وارہ چلے آئے۔ یہاں بھی ان کا قیام صرف دو سال ہی رہا۔ اس کے بعد لداخ، یارقند اور ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیاحت کی۔ لاہور میں داتا گنج بخشؒ کے مزار پر ساڑھے چار

برس رہے۔ حقانی نادرالکلام اور نطق العنان سخنور تھے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

'قصہ' بے نظیر بدر منیر'، 'گلشنِ عشق'، 'ماہروی گل اندام'، 'جوہرِ عشق'، 'چراغِ محفل'، 'روضۃ الشہداء' 'سر الشہادہ'، 'مثنوی شمار بے نظیر'، 'قصہ دستان'، 'قصص نامہ'، 'عجائب ابداع'، 'دیوان حقانی' (فارسی)، 'لطائف الحقانی' (فارسی) 'ردِ وہابی فارسی'، 'تاریخِ عالم' (فارسی)، 'موجِ سام'۔ ان کے علاوہ مختلف موضوع کی چھوٹی بڑی نظمیں، نعت و مناقب اور قطعات و رباعیات وغیرہ ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے:

ہم در فراق دلبر دل بے قرار ہے ملنے و جان سمو تر تا گلعذار لیے
کس بادہ نے ترا نہ اختیار کی روانہ بے درد کی دوا نہ زخم نگار لیے
گناہ کرہ لوانہ فارس و سوم الہ دارس عاشق چھ انتظرس نے اختیار لیے

مولوی صدیق اللہ

مولوی صدیق اللہ کے حالات زندگی کے تو بہت کم علم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ آپ نے ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔ آپ نے نظامی گنجوی کے 'سکندر نامہ' کا کشمیری ترجمہ کیا۔

ماسٹر زندہ کول

ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ لوگ ان کو احتراماً 'ہمارے ماسٹر جی' کہا کرتے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں وفات پائی۔ آپ نے پرمانند کی بعض تصانیف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ فارسی اُردو اور کشمیری میں شعر کہتے تھے۔ کشمیری کلام ایک کتاب 'سمران' کی صورت میں شائع کیا ہے۔

پنڈت دیار رام گنجو

آپ فارسی اور کشمیری زبان میں لکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں نصیحتیں اور اخلاق پائی ہوتی ہیں۔

رمضان بٹ

جس نے 'اکہ نندن' کو تصنیف کیا اور یہی اس کا شاہکار ہے۔ موضع درسنہ تحصیل بڈگام کا رہنے والا تھا۔

شمس فقیر

نام محمد صدیق بٹ ۱۹۰۶ء میں وفات پائی۔ آپ کا کلام غزلوں پر مشتمل ہے۔ آپ کی سوانح حیات پروفیسر شمس احمد نے سری نگر میں تصنیف کی ہے جو کلچرل اکیڈیمی نے شائع کی ہے۔ آپ کی مشہور غزل ہے:

کس ونہ میدچود عشمن سراب مسساہ مس گوس در خواب
اسے صوفیانہ کلام گانے والے بڑے مزے لے لے کر گاتے ہیں

کشمیری زبان کے تیسرے دور کے شعراء میں مندرجہ ذیل شاعر بھی شامل ہیں

بیب صاحبہ

آپ موضع حضرت بل میں پیدا ہوئیں۔ اس سے زیادہ آپ کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ آپ عشقِ حقیقی میں محو ہو کر تارک الدنیا ہو گئیں۔

واعظ حیدر بابا

حیدر بابا قصبہ چرار شریف کے رہنے والے تھے۔ مرقد زیارت نورالدین ریشی کے صحن میں ہے۔ آپ نے کشمیری زبان میں نعت و مناقب 'سہال نبوی' اور 'مشک نامہ نبوی' لکھے ہیں۔ صوفی منش تھے۔ تقریباً ۱۸۵۸ء تک زندہ تھے۔

ریشی اسمال

آپ موضع لسہ پورہ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے صرف غزل اور گیت کہے، چونکہ خوش آواز تھے اس لیے دوستوں کی صحبتوں میں اپنی غزلیں گایا کرتے تھے۔ ۳۶ برس کی عمر میں ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔

مہدہ شاہ ویکہ

عظیم شاہ کے بیٹے تھے۔ شوریدہ سر اور سودائی تھے۔ مگر فارسی کے زبردست عالم اور صاحبِ کمال شاعر تھے۔ بذلہ سنجی اور فی البدیہہ شعر کہنے میں کوئی ثانی نہ تھا۔ عموماً دیوانہ وار پھرتے رہتے تھے۔ ایک دن ڈاکوؤں نے ان کو دریا میں پھینک دیا جس سے موت واقع ہوئی۔

مہدی ترالی

محی الدین نام اور مہدی تخلص تھا۔ عاشق ترالی کے بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۹۸ء/۱۳۱۶ھ میں وفات پائی۔ مہدی نے کشمیری زبان میں پانچ مثنویاں لکھیں جو یہ ہیں:
'اصحابِ کہف'، 'احوال القیامت'، 'داستانِ زیبا'، 'جنگِ خیبر' اور 'چندر بدن'۔

رحمان ڈار

محمود گامی کے ہم عصر اور سری نگر کے رہنے والے تھے۔ 'ماچھ تلر' (شہد کی مکھی) اور 'شش رنگ' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

خواجہ حبیب اللہ زرگر

فارسی زبان کے ماہر تھے۔ (۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ) ۳۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ فارسی اور کشمیری غزلوں کی ایک بیاض غیر مطبوعہ ہے۔

امد بٹ

قصبہ ترال کے رہنے والے تھے (۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ) میں انتقال ہوا۔ کشمیری زبان میں غزلیں، نعت رسول اور اولیاء اللہ کے مناقب لکھتے رہے۔

حسن گنگالی

چرار شریف کے رہنے والے تھے۔ آپ نے اپنے ملکی حالات اور علاقہ کی فرسودہ حالی کے بارے میں نظمیں لکھیں اور اپنی حرأت کا مظاہرہ کیا۔

سیف الدین عارض

سیف الدین نام اور عارض تخلص تھا۔ آبائی پیشہ پیری مریدی تھا۔ موضع نوجھل متصل پلوامہ میں پیدا ہوئے۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ ایک مثنوی 'نوبہار' بھی لکھی۔ ان کے کلام میں مقبول شاہ کرالہ واری کا رنگ نمایاں ہے۔ مثنوی 'نوبہار' کے چند ابتدائی ابیات ملاحظہ ہوں:

الٰہی زعشق خود مدہوش کرتم   شراب عشق چشہ لب نوش کرتم
زسور خود کورم پروانۂ عشق   بہ چاوم جام از مے خانۂ عشق

ترجمہ: الٰہی! مجھے اپنے عشق سے مدہوش کر۔
شراب عشق پلا کر مجھے سیراب کر دے!

اپنے سوز سے مجھے پروانۂ عشق کر دے !
مجھے میخانۂ عشق سے جام پلا دے !

حفیظ اللہ

حفیظ اللہ موضع رامو، تحصیل پلوامہ کے رہنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حفیظ مکتب میں 'شیریں خسرو' پڑھا کرتے تھے، مگر جب غسلِ شیریں والے باب پر پہنچے تو شیریں پر عاشق ہو گئے اور آخر کار نوبت جنون تک پہنچ گئی۔

کافی شاہ

کافی شاہ نام تھا اور اشعار میں تخلص کے طور پر بھی نام کو ہی استعمال کرتے تھے۔ موضع ربرہ نورہ علاقہ کوٹہ ہار کے رہنے والے تھے۔ سالِ وفات کا صحیح علم نہیں۔ قرائن سے پتہ چلا ہے کہ ۱۹۰۸ء - ۱۹۲۱ء/۱۳۲۶ھ - ۱۳۴۰ھ کے درمیان انتقال ہوا، کشمیری زبان میں غزل اور عشقیہ مثنوی 'قصہ بہرام' کا اردو منظوم ترجمہ لکھا۔

وہاب کھار

وہاب نام تھا اور تخلص کی جگہ نام ہی لاتے تھے۔ موضع کھریونار تحصیل پلوامہ کے رہنے والے تھے۔ آبائی پیشہ آہن گری تھا۔ قصہ 'سیخ سما' اور 'مانجھ یولر' گیتوں کے طرز میں نظم کیا ہے۔ وہاب چونکہ ان پڑھ تھے اور لوازمات شاعری سے ناواقف، اس لیے کلام میں جا بجا ادبی خامیاں نظر آتی ہیں۔

اکبر بٹ

اکبر، سبحان بٹ کے بیٹے تھے۔ موضع بڈی گام تحصیل اسلام آباد کے رہنے والے تھے۔ آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ ناظم کے شاگرد تھے۔ صوفیانہ غزلیں اور ہجویہ نظمیں کہی ہیں 'مکرزن'، 'پسل گاہ' اور 'پتہ ہاریں' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

وازہ محمود

وازہ محمود سری نگر کے محلہ نواب بازار کے رہنے والے تھے۔ طبیعت کو شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی۔ متعدد غزلیں اور گیت کہے ہیں۔ عمر اور سال وفات کے متعلق صحیح علم نہیں، البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان فوت ہوئے۔

ویشنہ کول

وشمبر ناتھ نام عادل تخلص تھا۔ وشنہ کول کے نام سے مشہور ہوئے۔ کشمیری برہمنوں کے سارسوت خاندان سے تھے۔ سنسکرت، اردو اور فارسی میں مہارت حاصل تھی، ذریعۂ معاش مدرسی کا پیشہ تھا۔ فارسی اور کشمیری زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی غزلیات کا دیوان 'دیوانِ عادل' کے نام سے لکھا۔ کشمیری میں 'مخمس لیلائیں' اور کتاب 'وشنو پربات رامائن' نظم کی ہیں۔ 'وشنو پربات رامائن' تین ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی ہے۔

خوجہ سبحان

موضع اونتی پورہ میں خواجہ محمد امین بلی کے گھر پیدا ہوئے۔ ۲۳ برس کی عمر میں ہیضہ سے وفات پائی۔ 'بدر مال' اور 'اکبر الف' کی تہائی کشمیری غزل کی طرز پر سات ابواب میں منظوم کی۔

عبدالغفار فارغ

عبدالغفار نام اور فارغ تخلص تھا۔ سری نگر کے محلہ نہ مالہ میں سکونت کرتے تھے۔ تجارت پیشہ تھے۔ تصانیف میں 'قصہ یوسف و زلیخا'، 'ترجمہ مسدس حالی منظوم' شرح کلام حضرت نورالدین ریشی اور 'ملہ نامہ' وغیرہ مشہور ہیں۔

کرشن رازدان

موضع ونی پوہ متصل اننت ناگ میں پیدا ہوئے۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ شیو فلسفہ ان کا مسلک تھا۔ موسیقی کے بھی بڑے شوقین تھے۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا ان کی تصانیف میں 'شوپرہ نے' اور 'شو لگن' مشہور ہیں۔ ان کی نظمیں ہلکی پھلکی اور مترنم ہیں۔

آنند رام

والد کا نام مکند رام تھا۔ قصبہ ترال کے رہنے والے تھے۔ کشمیری زبان میں صوفیانہ غزلیں کہی ہیں۔ سنہ رام دت کی طرح حضورؐ کی نعت بھی لکھی:

از سہ دادن کردوا یا محمد مصطفیٰ
چھس نو آس تا امید مے کرم یا احمد
بوز تم لولک صدا یا محمد مصطفیٰ

ترجمہ : میرے دکھوں کی دوا کر یا محمد مصطفیٰ !
میں امید لیکر آیا ہوں ،
مجھے نا امید مت کر ،
میری محبت بھری آواز سن لے ،
یا محمد مصطفیٰ !

تیسرے دور کی شاعری

اس دور کی شاعری میں سماجی اور سیاسی حالات کی ترجمانی بالواسطہ ہوئی ہے ۔ کشمیر اس دور میں سکھوں کا اور پھر ڈوگروں کا غلام رہا ۔ اس زمانے میں شاعری میں قنوطیت ترک دنیا اور بے ثباتیِ عالم کے پیغامات ہیں ۔ اس دور کی کشمیری شاعری ، کشمیری قوم کی بے کسی اور بے بسی کی ایک واضح تصویر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کی ساری قوم راضی بہ رضا ہو گئی ہے ۔ اسی دور میں لاکھوں کی تعداد میں کشمیری مسلمان وطن چھوڑ کر چلے گئے ۔ اس وقت حال یہ تھا کہ :

جان گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

اس دور میں جب کشمیر کو ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کرکے صرف ۸۰ لاکھ روپوں کے عوض کشمیریوں پر غلامی کی مہر ثبت کر دی ، اس وقت اہل قلم اور شاعر حضرات اہلِ خطہ کے حالات سے بے نیاز گل و بلبل اور خیالی عشق کے قصے نظم کرنے میں مصروف تھے ۔ یہ دور کشمیریوں کے انحطاط کا زمانہ ہے ، اسی لیے کلام سے بے عملی اور بے بسی ٹپکتی ہے ۔ قوموں کی زندگی میں اتار چڑھاؤ لا محالہ آتا رہتا ہے ۔ اس زمانے کے کشمیری ادب سے ظاہر ہے کہ یہ ادب برائے زندگی نہیں تھا بلکہ ادب برائے تفریح تھا ۔ اقبال نے اسی دور کے اخیر پر کشمیریوں کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ :

ترے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبح گاہ من
کہ برد آن شور و مستی از سیہ چشمان کشمیری

(الف) کشمیری ادب اور شاعری کا
چوتھا دور (یعنی) عصرِ جدید

اس دور میں کشمیریوں نے ڈوگرہ مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور یہیں سے جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا۔ کشمیریوں نے سالہائے دراز کی غلامی کے بعد بیداری کی کروٹ لی اور پہلی بار جلوس نکال کر مہنگائی کے خلاف احتجاج کیا۔ اس جلوس کی رہبری ایک کشمیری شاعر غلام حسن شاہ زیرک نے کی۔ اس کی پاداش میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ ڈوگرہ حکومت بھی غلہ کی قیمت گھٹانے پر مجبور ہو گئی۔ زیرک نے جیل خانے میں یہ شعر لکھا:

زیرک از زیرکی چو جهل رسید   رنج مالی بجان حسن رسید

یہ واقعہ ۱۹۲۴ء کا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء آیا۔ اس وقت تک کشمیریوں نے اپنی سیاسی اقتصادی اور تعلیمی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ڈوگرہ استبداد کشمیریوں کو ابتدائی سیاسی حقوق دینے پر مجبور ہوا۔ اس کے بعد کشمیری زبان میں جو شعر و شاعری کی بیداری ہوئی اس میں قومی آزادی، مجلسی انصاف، حریت پرستی اور بغاوت کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ اگرچہ بعض شعراء اب بھی ادب برائے ادب کے نظریہ کے تحت گل و بلبل کے نغمے الاپ رہے تھے لیکن کشمیر اہلِ قلم جوانوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کو اپنانے لگے تھے، اور اس دور کو بجا طور پر رزمیہ شاعری کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں کشمیری رزمیہ ادب کی روایت کا آغاز ہوا۔ اسلامی درس گاہوں میں فارسی رزمیہ قصے 'شاہنامہ' فردوسی' اور 'سکندر نامہ' نظامی' بطور نصابی کتب پڑھائے جانے لگے۔ اس کے علاوہ فارسی رزمیہ قصوں کے تراجم بھی ہوئے۔ یہ درست ہے کہ اس دور سے پہلے بھی کشمیری شاعری میں فارسیت کے غلبے کے باوجود رزمیہ نظمیں لکھی گئیں۔ مثلاً 'شمس فاریغ' (م ۔ ۱۸۳۰ء) کی رزمیہ نظم اور رسول میر کی شاعری میں بھی عمل کا پیغام ملتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کشمیری زبان میں رزمیہ شاعری کا باقاعدہ آغاز مہجور کی شاعری سے ہوتا ہے۔

مہجور کاشمیری

آپ ۱۸۸۸ء میں مترگام تحصیل بڈگام میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک مقامی سکول میں پڑھنے کے بعد آپ کشمیری مزدوروں کے ساتھ برطانوی ہند آئے۔

وہاں علامہ سبلی نعمانی مرحوم سے رابطہ پیدا کیا ۔ اُردو اور فارسی ساعری کی طرف توجہ کی ، لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ آخر مہجور تخلص رکھ کر اپنی مادری زبان میں ہی شاعری سروع کی ۔ محکمہ مال میں پٹواری تھے اور حلقہ دار کی حیثیت بھی حاصل تھی ۔ ابتدا میں عام شاعروں کی طرح عسق و محبت کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے ۔ آخر تحریکِ آزادی سے متاثر ہو کر حُبِ وطن کے موضوع پر نظمیں لکھنے لگے :

بلبل و نان جھ بوشن گلشن وطن جھ سونوں!!

سونسوں وطن جھ گلشن گلسن وطن جھ سونوی

تقسیم سے قبل ایک آل انڈیا مشاعرہ سری نگر میں منعقد ہوا ۔ اس میں آپ نے اپنی نظم ''باغ نشاط کے گلو ۔ ناز کران کران وولو'' پڑھی اور سب سے داد حاصل کی ۔ ''وموہا باغوانو نو بہاران شان پیدا کر ۔ کرن گل گسرد بلبل ہمے سامان پیدا کر''۔ اس نظم میں آپ نے کسمیریوں کو ان کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہوئے ان کی غیرت کو جھجھوڑ کر رکھ دیا ہے ۔ آپ نے پیش گوئی کی کہ ایک دن کشمیری شہباز سامراجی اُلّووں کو اسے وطن سے نکال باہر کر دیں گے ۔

قومی نظموں کے علاوہ مہجور نے غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں محبت کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ مہجور کو مناظر قدرت اور حسنِ سادہ مثلاً دیہاتی حسن کی تصویر کسی میں بھی کمال حاصل ہے ۔ جب آپ نے اپنی مشہور نظم 'گرس کور' (دیہاتی دوسیزہ) لکھی تو مشہور ہندوستانی ساعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کو کسمیر کے ورڈز ورتھ کا خطاب دیا ۔ ایک اور مشہور نظم نان رادر (آبشار) ہے ۔ اس میں بھی مناظر قدرت کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ آپ کی مشہور غزل ہے :

ونیے ٹوجی کور گرپک زیر کنی زننئے

رنبی آرس بارہ بران جھک زہ کنی زنئے

(بول اے لڑکی تو کہاں جائے گی اتنی دیر سے اکیلی؟

تو اکیلی رنبی آرہ کے خطرناک نالہ کو کیوں پار کر رہی ہے؟)

مہجور نے ۱۹۵۲ء میں وفات پائی ۔ آپ نے کشمیری زبان میں پہلا ہفت روزہ اخبار نکالا جس کا نام 'کاش' تھا ۔ لیکن اُردو اخبارات کی موجودگی میں یہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا ۔

عبدالاحد آزاد

ان کو پنڈت[۱] پریم ناتھ بزاز نے کسمیر کا شاعرِ انقلاب اور شاعرِ انسانیت قرار

۱۔ پنڈت صاحب نے آزادی کشمیر کی جد و جہد کے متعلق مندرجہ ذیل کتاب تصنیف کی ہے
The History of struggle for Freedom in Kashmir.

دیا ہے۔ نثار صاحب نے ایک کتاب 'شاعر انسانیت' آزاد کے بارے میں بھی لکھی ہے۔

آزاد نے 'کشمیری زبان اور شاعری' کے نام سے ایک ضخیم کتاب تین جلدوں میں لکھی۔ جو ان کی وفات کے بعد کشمیر اکیڈمی نے سری نگر سے شائع کی ہے۔ آپ ۱۹۰۲ء میں بڈگام تحصیل کے ڈوئن رانگر میں پیدا ہوئے اور ۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو سری نگر کے ہری سنگھ ہسپتال میں ایک مفلس کی طرح وفات پا گئے۔ آپ کے سیاسی اور ادبی دوست اس وقت یا تو جیلوں میں نظر بند تھے یا جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔

آزاد ایک سرکاری سکول میں مدرس تھے۔ فارسی، اردو اور کشمیری کے عالم تھے۔ بعد نثار نے جب ایک ہفت روزہ اخبار 'وتستا' کے نام سے جاری کیا تو آپ نے ایک نظم 'دریاؤ' کے عنوان سے لکھی جس میں آپ نے دریا کو زندگی سے تشبیہہ دی۔ (وتستا بھی دریائے جہلم کا پرانا اور تاریخی نام ہے) یہ نظم جس میں انسانی زندگی کے ارتقاء اور جہد للبقا کی داستان بیان کی گئی ہے کشمیری زبان کا لازوال ادب پارہ ہے۔

آپ کا کلام آپ کی زندگی میں 'سنگرمالا' (پہاڑوں کی چوٹیاں) کے نام سے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اب ان کا تمام کلام 'دیوان آزاد' کے نام سے کشمیر اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں معاشی، اخلاق اور مجلسی انقلاب اور ان کے ساتھ انسان دوستی کے بلند اصولوں کا پیغام دیا ہے۔ خدائے قدوس اور عرشِ الٰہی وغیرہ کے بارے میں بعض جرأت مندانہ سوالات کی بنا پر بعض ناقدین نے آزاد کو دہریہ قرار دیا ہے۔ آزاد مرحوم سے ۱۹۴۲ء تک میرا خاصا رابطہ تھا۔ آپ صادق مسلمان تھے۔ البتہ ملائیت اور مذہبی استحصال سے ضرور بیزار تھے۔ ذات باری پر ان کو پختہ ایمان تھا۔ آپ تعصب، مذہبی قوم پرستی، فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف تھے۔ سیاسی غلامی اور مجلسی اونچ نیچ کے دشمن تھے۔ آپ کے شعر اندھی تقلید اور شخصیت پرستی کے لیے زہر میں بجھے ہوئے تیر ہوا کرتے تھے جن سے شاید ہی کوئی بچ سکا ہو۔ اظہارِ حق کے لیے وہ کسی بھی خطرے کو مول لینے کے لیے تیار رہتے۔ آپ کے لہجہ میں جوش پایا جاتا ہے۔ آپ حقیقی معنوں میں شاعرِ انقلاب تھے۔ خیالات کی گہرائی اور فلسفیانہ فکر کی وجہ سے آپ مہجور اور دوسرے ہم عصروں سے بہت بلند ہیں۔ یہ بند ملاحظہ فرمایئے :

ژھین راد ظلم تن دراد انقلاب آہستہ آہستہ
پھرن ہر بلبلو سو سچ کتاب آہستہ آہستہ
گلہ زرح سنگرو نت گاس آؤ باران نورن پھوت
پھولان چھم ول رزان جگرک حباب آہستہ آہستہ

ترجمہ : ظلم روپوش ہو گیا اور،

انقلاب رفتہ رفتہ نمودار ہوگیا !
بلبلوں (اہل کشمیر) نے محبت کی کتاب پڑھنی شروع کی ۔
اندھیرا پہاڑوں کے پرے بھاگ گیا ، اور
سورج روشنی کے ٹوکرے بکھیرتا چلا آیا ۔
یہ دیکھ کر میرے دل کی کلی کھلتی جاتی ہے
اور جگر کی جلن جاتی رہتی ہے !

ستار گوجری عاصی

دودھ بیچنے والے تھے ۔ بوجھ اٹھانے کا کام بھی کرتے تھے ۔ آپ کو مزدور شاعر بھی کہا جاتا تھا ۔ آپ نے استخلاصِ وطن کے لیے جیل بھی کاٹی ۔ آپ اپنی نظموں کے ذریعے مزدوروں کے حقوق اور آزادیٔ وطن کا نعرہ بلند کرتے رہے ۔ آپ نے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی ۔

پنڈت پتیا میر ناتھ درفانی

ایک ترقی پسند اور انسانیت دوست شاعر ہیں ۔ آپ کا مجموعہ کلام 'پوسہ ڈالباہ' (پھولوں کا تحفہ) 'حباب اور ترانہ زندگی' کی صورت میں شائع ہوا ہے ۔ عبدالاحد آزاد بر ان کا مرثیہ خوب ہے ۔

غلام حسن بیگ عارف

غلام حسن عارف کے کلام میں تصوف اورجدیدیت کا امتزاج پایا جاتا ہے ۔ آپ مزاحیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں ۔ ان کے کلام میں آورد زیادہ ہے اور زور کم ۔ آپ کی بعض نظمیں حُبِ وطن اور قومی آزادی کے جذبہ سے معمور ہیں ۔

* * *

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے وقت کشمیر میں جنگ آزادی چھڑ گئی ۔ ۱۹۴۹ء کی پہلی صبح کو جنگ بند تو ہوئی ، لیکن ساتھ ہی ریاست جموں و کشمیر کے سینے پر ایک سرخ لکیر ، حد متارکۂ جنگ ، کھینچ دی گئی ۔ جس کے نتیجہ کے طور پر کشمیر کے علم و ادب کے بھی دو ٹکڑے ہوگئے ۔ چونکہ دونوں علاقوں میں آمدورفت کی اجازت نہیں ، اس وجہ سے ان کا آپس میں رابطہ بھی قائم نہ رہ سکا ۔ اس لیے تقسیم کے بعد ابھرنے والے شعراء اور ادیبوں کا تذکرہ الگ الگ ہی کرنا پڑے گا ۔ مقبوضہ کشمیر میں ادیبوں نے سیاسی نظریات سے قطع نظر اپنی زبان کے دامنِ ادب کو مالا مال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے ۔

کشمیر اکیڈمی نے آزاد کی 'کشمیری زبان اور شاعری' کی تین جلدوں کے علاوہ لکشمن نول کی 'شاہ نامہ' اور صوفی شاعر کے عنوان سے کشمیری صوفیانہ کلام کی دو جلدیں شائع کی ہیں، جن میں سوچھ کرال، نعمہ صاحب، احمد بٹہ واری، رحمان ڈار، شاہ غفور، شاہ قلندر رحیم صاحب، وہاب کھار اور اسد پرے کا کلام شامل ہے۔ کشمیری موسیقی پر ایک کتاب 'کاشر سرلم' دو جلدوں میں شائع کی گئی جس کی تالیف شیخ عبدالعزیز نے کی۔ کافی عرصہ پہلے حافظ احمد اللہ سجابی نے بھی کشمیری موسیقی پر ایک کتاب شائع کی تھی۔

دینا ناتھ نادم

موجودہ دور کے ایک ذہین شاعر ہیں۔ انہوں نے بھی مشہور کہانی 'بمبہ مال' کو نظم دیا ہے۔ آپ نے کشمیری زبان کا پہلا ماہوار رسالہ 'کونگہ پوس' (زعفران کا پھول) شائع کیا جو جلد ہی بند ہو گیا۔

عبدالرحمٰن راہی

ایک اور شاعر ہیں۔ یہ 'نو روز وصبا'، 'سنہ ون ساز' اور 'صحک سودا' کے مصنف ہیں۔

غلام نبی خیال

سری نگر کے ایک نوجوان ادیب ہیں۔ آپ کشمیر محاذ رائے شماری کے اخبار 'اُردو محاذ' کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اس سے علیحدگی کے بعد آپ نے کشمیری زبان کا پہلا روزنامہ اخبار 'وطن' جاری کیا، جو چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے خیال صاحب کو 'وطن' کی بندش پر لکھا کہ "میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ (اُردو کے اخبارات کی موجودگی میں) کشمیری اخبار کو کوئی نہیں پڑھے گا"۔ اب خیال صاحب نے اُردو ہفتہ وار اخبار 'اقبال' جاری کیا ہے۔ آپ نے عمر خیام کی فارسی رباعیات کا ترجمہ کشمیری میں کیا ہے۔ جو 'رباعیاتِ عمر خیام' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ فارسی رباعی دیکھیے، پھر اس کا کشمیری ترجمہ ملاحظہ فرمائیے، جس میں خیال نے کس خوبی سے فارسی مفہوم کو کشمیری کا جامہ پہنایا ہے:

ابریقِ مے مرا شکستی ربی؎ برمن درِ عیش را بہ بستی ربی؎!
بر خاک ریختی مے لعل مرا خاکم بدہن سخت مستی ربی؎!

اب اس کا کشمیری ترجمہ ملاحظہ ہو:

مس ملرژ ہنھتم پتھر آغومیہ کیا اوسوئی کھیومُت
دام کثر نام ایس اتھ منز قطـرہ کھنڈ او سم چمت
کیا زہ دیتھم ٹھوس پیانن تہ دل ہند رو ونھم
کماہ ونے ما فی د زیم جھک پانہ نمایدِ مس گمت

خیال ترجمے میں رباعی کی مخصوص بحر کو قائم نہیں رکھ سکے۔ خیال صاحب نے ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' کا ترجمہ بھی کیا ہے اور گامی پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

امین کامل

جن کے کتابچہ 'اچھرہ زان' کے حوالے پہلے دیے گئے ہیں، ایک پڑھے لکھے شاعر ہیں۔ پہلے غربی تخلص کرتے تھے، پھر کامل ہو گئے۔ آپ کا اپنا کلام 'مس معر' (شراب کا مٹکا) کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ آپ 'نورنامہ'، 'لوہ تہ پریوہ' اور 'گٹومنز کاش' نامی کتابوں کے مصنف ہیں۔

عبدالستار رنجور کشمیری

یہ کیگام پلوامہ کے ایک شاعر ہیں جو کمیونسٹ پارٹی آف کشمیر (روس نواز) کے لیڈر بھی ہیں۔ ان کا کلام 'بانگِ انقلاب' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسی نام سے رنجور کا اُردو کلام بھی شائع ہوا، جو فنی اعتبار سے اتنا قابل قدر نہیں۔ کشمیری نظمیں خوب ہیں۔

غلام رسول نازکی

یہ بھی کشمیری زبان کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ کی کتاب 'نمرود نامہ' ہے۔

اوتار کشن رہبر

انہوں نے کشمیری زبان پر خاصی ریسرچ کر کے کشمیری زبان میں 'کاشرہ ادبچ تاریخ' شائع کی ہے۔ بچوں کے لیے آپ نے کشمیری زبان میں کشمیری کہانیوں کے مجموعے نثر میں 'لختہ لر' (موتیوں کی مالا) اور تبروک (تبرک) کے نام سے شائع کی ہیں۔

پروفیسر غلام محی الدین حاجنی

'کاشرہ شاعری' اور 'کاشر سترّچ' کتاب کے مصنف ہیں۔ آپ کو تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں جیل بھی کاٹنی پڑی۔ آپ نے 'مسدس حالی' کا کشمیری نظم میں ترجمہ شائع کیا ہے اور کشمیری ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

اختر محی الدین

نثر کی کتابوں میں 'ستِ سنگر' (سات پہاڑ) 'سونہ لّد' (قوس قزح) اور 'دود داغ' (درد و داغ) کے مصنف ہیں۔ یہ افسانوں کے مجموعے ہیں۔

علی محمد لون

کشمیر اکیڈیمی کے سیکرٹری ہیں۔ آپ نے 'کاشرِ نک نابہ' (کشمیری شاعری کے نمونے) شائع کی ہے اور ناجی منور اور موتی لال ساقی کی مدد سے ایک کشمیری ناول 'اس تہٕ چھہ انسان' (ہم بھی انسان ہیں) شائع کیا ہے۔

بنسی نردوش

انہوں نے 'بالٕ مرٕہ سو' (میں جوان مرگ ہو جاؤں گی) اور 'آدم چھ سپدے بدنام' (انسان ہوتی بدنام ہے) شائع کی ہیں۔ یہ نثر میں ہیں۔

چمن لال چمن

نظموں کی کتاب 'سبزی سار' کے مصنف ہیں جس کے لیے اکیڈیمی نے مدد دی ہے۔

(ب) حد متارکہ سے اس طرف یعنی آزاد کشمیر میں ادب کی کیفیت

حدِ متارکۂ جنگ سے اس طرف جو کشمیری شاعر مہاجر ہو کر آئے یا اس طرف کے رہنے والے ہیں ان کا اجمالی ذکر درجِ ذیل ہے:

فتح محمد خان آذر عسکری

۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ زیادہ تر اُردو میں لکھتے ہیں۔ چونکہ کشمیری مادری زبان ہے، اس لیے اس میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔ طبیعت کا میلان طنز و مزاح کی طرف ہے۔

خواجہ غلام احمد ناز کاشمیری

تحصیل کولگام کے رہنے والے آزادی پسند شاعر ہیں۔ مگر کم نویس۔ ان دنوں آپ اقبال کی مثنوی 'اسرارِ خودی' کے کشمیری ترجمہ کے کام میں مصروف ہیں۔ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور سیاسی و قومی نظمیں بھی۔

احمد شمیم

آزاد کشمیر کے محکمۂ اطلاعات میں افسر ہیں ۔ اُردو اور کشمیری دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں ۔ نظموں میں کشمیر کی آزادی کے لیے تڑپ پائی جاتی ہے ۔ انہوں نے کئی ترانے لکھے ہیں ، جو آزاد کشمیر ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں ۔

علی محمد کنول

مظفر آباد میں رہتے ہیں ۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے لیے سیاسی نظمیں اور فیچر وغیرہ لکھتے ہیں ۔

عبدالخالق عندلیب

شاعر اور فیچر نگار ہیں ۔ آزاد کشمیر ریڈیو سے وابستہ ہیں ۔

طاؤس بانہال

نام غلام رسول ۔ کشمیری شاعر اور نثر نگار ریڈیو کے محکمہ سے وابستہ ہیں ۔

حب سلمانی

مظفر آباد میں ہیر ڈریسر کا کام کرتے ہیں ۔ جب غمِ روزگار سے فرصت ملتی ہے تو اعلیٰ پائے کے شعر کہتے ہیں ۔

سید شمس الدین بخاری

میر پور میں تحصیل مفتی کے عہدہ پر فائز ہیں ۔ نعتیں اور سیاسی نظمیں لکھتے ہیں ۔

غلام محمد مورُوجی

وادیٔ کشمیر کے مہاجر شاعر ، مظفر آباد میں رہتے ہیں ۔ کشمیری میں قومی نظمیں لکھتے رہتے ہیں ۔

غلام محمد مسرور

وادی کے مہاجر ہیں اور قومی و ملّی موضوع پر نظمیں لکھتے ہیں ۔

خواجہ احمد اللہ دلنواز

کشمیر میں ان کا کلام 'رسالۂ دل' ، 'عشقہ باغ' ، 'کلام الفت' ، 'کلام عمہ خوجہ' ،

"اطہور کلیں"، "سرور عشق" کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جنگ ہوئی تو آپ پاکستان چلے آئے۔ یہاں ریڈیو آزاد کشمیر کے لیے قومی نظمیں لکھیں۔

تحسین جعفری

آپ پاکستان کے محکمۂ اطلاعات کے ہفت روزہ 'کشمیر' کے مدیر رہ چکے ہیں۔ اُردو اور کشمیری میں خوب لکھتے ہیں۔ شہر پونچھ کے رہنے والے ہیں۔ آپ کا کلام پاکیزہ، مذہبی جذبات سے پُر اور حریت آموز ہے۔

خواجہ عبدالاحد دلاور دانی

کشمیری شاعر ہیں۔ ریڈیو سے متعلق رہے ہیں۔

میر عبدالعزیز

وادیٔ کشمیر کے مہاجر ہیں۔ آپ نے اپنی مادری زبان میں نظمیں لکھیں، جو اخبارات میں شائع اور ریڈیو سے نشر ہوتی رہیں۔ اُردو اور کشمیری میں ریڈیائی فیچر بھی لکھے ہیں۔

سید مبارک علی شاہ شاہین وغیرہم

ایڈیٹر 'مظلوم کشمیر' لاہور۔ اُردو اور کشمیری میں شعر لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ میر غلام احمد کشفی، خواجہ نورالدین دار، محمد مظفر فاضلی، قاضی نورالدین اختر، قاضی حفیظ اللہ سالک، مسٹر مسعود احمد تبسّم، سوز کاشمیری، میر نور محمد، محمد عالم سرنا وغیرہ کشمیری زبان کے نثر نگار ہیں۔ کشفی صاحب نے 'کاشر زبان' کے نام سے ایک کتاب بھی کشمیری زبان پر لکھی ہے۔ اسی طرح محمد اسداللہ قریشی اور خواجہ غلام نبی گلکار نے کشمیری بول چال پر ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ خدا مبارک کرے اس طرف اور بھی شاعر اور نثر لکھنے والے ہیں۔ جو کشمیری زبان کے علم و ادب کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ اب یہ چراغ روشن ہی رہے گا اس لیے کہ

(۱) دورِ جدید میں ایسا اب موقع آیا ہے کہ کشمیری زبان پڑھائی جانے لگی۔

(۲) اب اس کا ایک ایسا رسم الخط بنایا گیا ہے جس کی مدد سے اس کی تمام واوِیل اور دیگر آوازیں قلمبند کی جا سکتی ہیں۔

(۳) ریاست کے دونوں حصوں میں کشمیری کے ادباء اور شعراء کی تسلی بخش تعداد پائی جاتی ہے جو اس زبان کے ادبی اور علمی ذخیرے میں اضافہ میں کوشاں ہے۔

(۴) کئی ایک ادبی انجمنیں اور ادارے کشمیری زبان و ادب اور ثقافت کو فروغ

دینے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

اسی طرح کا ایک ادارہ صاحبزادہ حسن شاہ صاحب (رجسٹرار اسلام آباد یونیورسٹی) کی مساعی کی بدولت کشمیر کلچرل سنٹر کے نام سے حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب کشمیریوں کے ادب سے بوئے رہبائی نہیں آتی۔ بلکہ وہ عملِ مسلسل اور جہدِ پیہم کا پیغام بر ہے۔ اس دور میں کئی رزمیہ اور حریت پسندانہ نظمیں لکھی گئی ہیں۔

کشمیری صحافت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اُردو زبان کے عام رواج کے باعث کشمیری زبان میں اخبارات شائع کرنا بے کار کوشش ثابت ہوئی ہے۔ اُردو اب کشمیر کی بھی اسی طرح زبان بن چکی ہے، جس طرح پنجاب اور سرحد کی۔ لاہور میں کوئی شخص اگر اُردو اخبارات کے ہوتے ہوئے پنجابی زبان میں روزنامہ یا ہفت روزہ جاری کرے تو اسے بھی شاید ناکامی ہی ہو۔ سری نگر میں سب سے قبل مہجور نے 'گاش' (روشن) کے نام سے کشمیری ہفت روزہ نکالا، جو جلد ہی بند ہو گیا۔ چند سال قبل سری دینا ناتھ نادم نے 'گونگہ پوش' کے نام سے ایک ماہنامہ کشمیری میں جاری کیا لیکن وہ بھی بند ہو گیا۔ مسٹر غلام نبی خیال نے 'وطن' جاری کیا مگر خیال صاحب کا خیال خام ثابت ہوا۔ سری نگر میں کشمیر اکیڈیمی کی طرف سے ایک دو ماہی رسالہ سیراز نکلتا ہے جو سرکاری مدد پر زندہ ہے۔

حدِ متارکہ سے اس طرف یعنی آزاد کشمیر میں کوئی کشمیری زبان کا جریدہ شائع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ غالباً اس سلسلے میں سب سے بڑی دقّت یہ ہے کہ حدِ متارکہ سے اس طرف کشمیری زبان میں کتابیں وغیرہ شائع کریں تو اس زبان کے لکھنے والے کاتب نہیں ملتے۔

بایں ہمہ اہل وادی کے اُردو جرائد میں خواہ وہ وادی کے اندر شائع ہوتے رہے ہوں یا پاکستان میں یا آزاد کشمیر میں، کشمیری میں نظمیں اور مقالات شائع ہوتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے کشمیر میں صحافت کی ابتدا ہوئی۔

۱۔ ذیل میں ان ہفت روزوں اور روزناموں کے نام درج کیے جاتے ہیں جن میں کشمیری میں نظمیں وغیرہ شائع ہوتی رہی ہیں۔

ہفت روزہ 'وتستا' سری نگر۔ ایڈیٹر پریم ناتھ بزاز۔ وادی کا پہلا ہفت روزہ 'صداقت' سری نگر، اسے شیخ محمد عبداللہ نے جاری کیا۔ اس کے مدیر مولوی عبدالرحیم تھے۔ روزنامہ 'حقیقت' سری نگر، یہ صداقت کی بندش کے بعد شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر صوفی کی تحقیقات کے

مطابق اس اخبار کے ایڈیٹر بھی درپردہ پریم ناتھ بزاز تھے۔ یہ اخبار شیرِ کشمیر محمد عبداللہ کی مسلم کانفرنس کا ترجمان تھا۔

روزنامہ 'مارتنڈ' سری نگر۔ اُردو روزنامہ۔ کشمیری پنڈت فرقے کا ترجمان۔

'سہ روزہ اسلام' سری نگر۔ مولوی محمد امین کی ادارت میں ۱۹۳۳ء میں واعظ پارٹی نے جاری کیا۔ لیکن چل نہ سکا۔ کچھ دیر علامہ حسین میر کاسمیری نے بھی اس کی ادارت کی۔

ہفت روزہ 'کشمیر جدید' سری نگر۔ منشی محمد دین فوق ۳۳ - ۱۹۳۴ء میں شائع کرتے رہے۔

ہفت روزہ 'ابری' سری نگر۔ مالک و مدیر محمد ایوب صابر۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک جاری رہا۔

ہفت روزہ 'بیکار' سری نگر۔ صدر الدین مجاہد ۱۹۳۲ء میں چلاتے رہے۔

ہفت روزہ 'خالد' سری نگر۔ صدر الدین مجاہد نکالتے رہے۔

روزنامہ 'ہدایت' سری نگر۔ میر واعظ ہمدانی کی نگرانی میں کچھ دیر چلتا رہا۔ مفتی ضیاء الدین جیسا ادارت سے وابستہ تھے۔

'ونکای دیس' سری نگر۔ پنڈت کسب بندھو کا اخبار تھا۔

ہفت روزہ 'رہبر' سری نگر۔ مالک و مدیر خواجہ غلام محی الدین رہبر۔ اب تک جاری ہے۔

روزنامہ 'ہمدرد' سری نگر۔ پہلے شیخ محمد عبداللہ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے مشترکہ طور پر جاری کیا۔ پھر شیخ صاحب نے ۱۹۴۰ء میں اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مسٹر بزاز نے اسے ایک اعلیٰ درجے کا روزنامہ بنا لیا۔ 'ہمدرد' نے کشمیری زبان کی بڑی خدمت کی۔ آزاد کی کتاب قسط وار اس اخبار میں شائع ہوتی رہی۔ مہجور، آزاد اور دوسرے شعراء کا کلام بھی اس میں بھی شائع ہوتا رہا۔

روزنامہ 'خدمت' سری نگر۔ نیشنل کانفرس کا ترجمان۔ اب کشمیر کی نام نہاد کانگریس کا ترجمان ہے۔ اس اخبار میں بہت سے کشمیری شعراء کا کلام شائع ہوتا ہے۔

ہفت روزہ 'ملت' سری نگر۔ مالک مولوی غلام رسول، ایڈیٹر میر عبدالعزیز۔ یہ دونوں جرائد ۱۹۴۷ء میں بند ہوئے۔

ہفت روزہ 'اصلاح' سری نگر۔ جماعت احمدیہ کشمیر کا اخبار تھا۔ ۱۹۴۷ء سے بند ہے۔ ایڈیٹر چوہدری عبدالواحد اور آخر میں خواجہ عبدالغفار ڈار تھے۔

۲۔ ان کے علاوہ اس وقت سری نگر میں حسب ذیل کشمیری زبان اور علم و ادب کے بارے میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہتا ہے۔

روزنامہ 'چنسار' سری نگر۔ ایڈیٹر اسرار احمد آزاد۔
روزنامہ 'خدمت' ایڈیٹر نند لال واتل۔
ہفت روزہ 'زینہ' ایڈیٹر شمیم احمد شمیم، ہفت روزہ 'محافظ' ایڈیٹر رشید تاثیر۔
ہفت روزہ 'اقبال' ایڈیٹر غلام نبی خیال۔ ہفت روزہ 'رہبر' ایڈیٹر غلام محی الدین رہبر۔
ہفت روزہ 'پیام انقلاب' ایڈیٹر خواجہ غلام محمد بٹ، خواجہ عمر بٹ بی۔ اے۔ ویکلی 'روشنی' ایڈیٹر خواجہ عبدالعزیز شورہ۔ روز نامہ 'آفتاب' ایڈیٹر خواجہ ثنا اللہ بٹ روزنامہ 'مارتنڈ'۔

۳۔ راولپنڈی سے اس وقت مندرجہ ذیل چار ہفت روزے شائع ہوتے ہیں۔ جن میں کشمیری زبان کا ادب شائع ہوتا رہتا ہے۔

(الف) ہفت روزہ 'کشمیر' راولپنڈی۔ ایڈیٹر خواجہ عبدالصمد وانی۔

(ب) شیخ فقیر حسین کا ہفت روزہ 'ریاست' راولپنڈی۔

(ج) ہفت روزہ 'مظلوم کشمیر' ایڈیٹر سید مبارک شاہین (تمغہ پاکستان)

(د) ہفت روزہ 'انصاف' راولپنڈی، ایڈیٹر میر عبدالعزیز۔

۴۔ کشمیر سے باہر کشمیری معاسرے اور زبان و ادب پر لکھنے والے رسائل:

کشمیر میں پریس کی آزادی باقاعدہ طور پر ۱۹۳۱ء سے حاصل ہوئی۔ اس سے قبل لاہور اور برطانوی ہند کے دوسرے علاقوں کے بہت سے جرائد کشمیریوں اور کشمیری علم و ادب کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

<u>ہفت روزہ 'خیر خواہ کشمیر' لاہور۔</u> ایڈیٹر پنڈت ہرگوپال خستہ۔ یہ رسالہ ۸۳-۱۸۸۲ء میں شائع ہوتا رہا۔ خستہ صاحب کو رنبیر سنگھ ڈوگرہ نے جلا وطن کر دیا تھا اور آپ اس اخبار میں دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ اس لحاظ سے پنڈت جی پہلے کشمیری اخبار نویس ہیں۔

<u>ہفت روزہ 'اخبار عام' لاہور۔</u> ۱۸۸۱ء میں شروع ہوا۔ ایڈیٹر پنڈت کند رام گرٹو اور پھر ان کا بیٹا پنڈت گوپی ناتھ۔ اس کے بعد یہ روزنامہ نیا دور تقسیم ہند سے کئی سال قبل بند ہو گیا۔

<u>ہفت روزہ 'راوی' لاہور۔</u> ہفت روزہ ''پبلک نیوز'' لاہور

<u>ہفت روزہ 'مراسلہ کشمیر' لاہور۔</u> ۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۰ء۔ پنڈتوں کا اخبار تھا۔

<u>ماہنامہ 'کشمیر پرکاش' اردو۔ لاہور۔</u> ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک جاری رہا۔ پنڈتوں کا اخبار تھا۔

دوماہی 'کشمیر درپن' الہ آباد۔ اُردو اور ہندی دونوں میں سر تیج بہادر سپرو کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے۔

رسالہ 'شہالی' راولپنڈی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں نکلتا رہا۔

ہفت روزہ 'گلشن کشمیر' لاہور۔ (۱۹۰۱ء) ایڈیٹر مولانا تاج الدین احمد تاج۔

ہفت روزہ ''پنجہء فولاد'' لاہور (۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک)۔ ایڈیٹر محمد دین فوق مرحوم

ماہنامہ 'کشمیر گزٹ' لاہور: مالک چوہدری خان محمد گنائی۔ ایڈیٹر منشی محمد دین فوق مرحوم۔

ماہنامہ کشمیر مخزن، لاہور: ایڈیٹر خواجہ کمال الدین احمد بی اے، ایل ایل۔ بی، بانی مسلم ورکنگ مشن انگلنڈ۔

ماہنامہ کشمیری میگزین، لاہور: ۱۹۱۲ء میں فوق صاحب نے جاری کیا۔

ماہنامہ سفید، لاہور: کشمیری پنڈت صاحبان نے ۱۹۱۴ - ۱۹۱۶ء میں جاری رکھا۔

ماہنامہ صبح کشمیر، لاہور: پنڈت لچھمن رائنہ کول اور پنڈت دینا ناتھ مست نے ۱۹۱۶ء میں جاری کیا۔ اس میں کشمیر کے سیاسی معاملات پر بحث ہوتی تھی۔

ماہنامہ بہار کشمیر، لاہور: پنڈت فرقہ کا اخبار۔ اُردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوتا تھا۔

ہفت روزہ ''رفیق ہندوستان'' لاہور

ہفت روزہ 'آئینہ ہند' لاہور: ایڈیٹر بابو غلام محمد۔ اس میں کشمیر میں مقرر کردہ کونسل آف ایجنسی کی مخالفت ہوتی تھی اور پرتاب سنگھ کی حمایت۔

ہفت روزہ 'ہمدرد ہند' لاہور: اس میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کی مخالفت اور کونسل کی حمایت ہوتی تھی۔ یہ پہلا ہندوستانی پرچہ ہے جس کا داخلہ ریاست کشمیر میں حکماً بند کر دیا گیا۔

ہفت روزہ 'کشمیر' امرتسر - مظلوم کشمیر، لاہور: یہ جرائد روزنامہ انقلاب لاہور والوں نے ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر کے دنوں میں شائع کیا۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس مقالہ میں کشمیریوں کے جس علم و ادب کا ذکر کیا گیا ہے، وہ صرف کشمیری علم و ادب ہے۔ اہلِ خطہ نے فارسی اور اردو کلام اور فلسفہ میں بھی بہت نام پیدا کیا۔ مثال کے طور پر غنی کشمیری جن کا سارا کلام فارسی میں ہے۔ ان کا اس میں ذکر بے جا ہوگا۔ غنی کشمیری کے پورے دیوان میں صرف ایک ہی کشمیری لفظ کرانہ ہن (کمہار کا دھاگا) استعمال ہوا ہے جس کو کمہار لوگ برتن کاٹنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جس شعر میں غنی نے یہ مرکب لفظ استعمال کیا اس کے معانی سمجھنے کے لیے مرزا صائب اصفہان سے کشمیر آئے۔ شعر یوں ہے:

موئے میانِ تو شرہ کرالہ پن　　کردہ جدا کاسۂ سرہا ز تن

اسی طرح ملا محمد محسن فانی فلسفی مصنف 'دبستان مذاہب'، یا پھر برج نرائن چکبست اور سر محمد اقبال مرحوم بھی کشمیری تھے، لیکن ان کا کلام اُردو اور فارسی میں ہے، اس لیے ان کا اس مقالہ میں تفصیلی ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ جذبۂ حرّیت بیدار کرنے میں اقبال، منشی محمد دین فوق اور دوسرے اہل علم حضرات کی تحریروں کا بڑا حصہ ہے جو انہوں نے اہلِ کشمیر کو مخاطب کرکے لکھیں۔

(ج) کشمیر کی تاریخ پر ریاستی مؤرخین کی کتابیں

کشمیر کی تاریخ پر سنسکرت فارسی، اُردو اور انگریزی میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلی تاریخ کلہن پنڈت کی 'راج ترنگنی' (بادشاہوں کا دریا) ہے۔ اس میں صرف راجوں مہاراجوں کی نہیں بلکہ کشمیری قوم کی اس وقت تک کی ساری تاریخ درج ہے۔ اس میں ابتدا سے ۱۱۵۰ء تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کے دور سے تاریخ نویسی کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ جدید دور میں اُردو اور انگریزی میں کشمیر کی تاریخیں لکھی گئیں۔ منشی محمد دین فوق نے 'تاریخ اقوام کشمیر'، مکمل 'تاریخ کشمیر'، 'تاریخ بڈشاہی'، 'شباب کشمیر'، 'خواتین کشمیر' لکھ کر کشمیری قوم کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کی کتاب 'کشیر' جو کہ پنجاب یونیورسٹی نے دو جلدوں میں چھپوائی ہے کشمیر کی سب سے مبسوط تاریخ ہے، جس کی تیاری میں فاضل مصنف نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ پنڈت بزاز کی کتابیں 'ہسٹری آف سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر'، 'انسائڈ کشمیر' اور 'کشمیر ان کروسیبل' میں تحریک آزادی کے متعلق اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں لالہ رخ پبلی کیشنز نے ایک کتاب 'کیز ٹو کسمیر' شائع کی ہے، جو مختصر مگر خاصی دلچسپ اور معلومات سے پر ہے۔ مفتی محمد شاہ سعادت کی کتابیں بھی محققانہ ہیں۔ میر غلام احمد کشفی کی کتاب 'تحریک آزادی کشمیر'، کلیم اختر کی 'شیر شیخ محمد عبداللہ'، سردار ابراہیم کی 'کشمیر ساگا'، چودھری غلام عباس کی 'کشمکش'، خواجہ عبد الصمد وانی کی 'کے۔ ایل۔ ایم' قابل ذکر کتابیں ہیں۔ کشمیر پبلی کیشنز مظفر آباد، آزاد کشمیر کے محکمہ اطلاعات اور پاک پریس انفرمیشن کی طرف سے بھی کثیر مقدار میں پمفلٹ جاری ہوتے رہے ہیں۔ جن سے کشمیر کی تاریخ خاص کر تحریکِ آزادی پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد اسد اللہ قریشی نے بھی کشمیری

زبان اور اس قوم کی نسلی تاریخ کے بارے میں مقالات سائع کیے ہیں - سری نگر میں حال ہی میں رشید تاثیر نے "کشمیر کی تاریخ" پر ایک کتاب سائع کی ہے - جی - ایم صادق حال نام نہاد وزیر اعلیٰ کشمیر نے بھی ۱۹۴٦ء میں لاہور سے ایک کتاب انگریزی میں بعنوان 'کشمیر ان ٹرائل' (کشمیر کی آزمائش) سائع کی تھی - ان کے علاوہ کشمیری مؤرخین اور مصنفین کی مندرجہ کتب ملتی ہیں :

جون راج کی راجاوی حوڑہن کی ترنگنی کا تسلسل ہے -

شری وار کی جین راج ترنگنی ۱۴۵۹ء سے ۱۴۸٦ء کے واقعات کا مرقع

تاریخ نادری از ملا نادری

تاریخ وقایع کشمیر از ملا احمد کشمیری (نایاب)

کشمیری زبان اور غیر ملکی مصنفین

ان کے علاوہ انگریز پادریوں نے بھی کشمیری زبان کی ترویج اور اشاعت کا کام (اپنے تبلیغی مقاصد کے لیے) کیا - کشمیر میں مشن ہسپتال اور مشن سکول قائم کیے گئے - بائبل کے دونوں حصوں (پرانا اور نیا میثاق) کے ترجمے کشمیری میں سائع کیے گئے - ڈاکٹر ایلس ملی نے کشمیری انگلش ڈکشنری ۱۸۷٦ء میں سائع کی - ٹی آرڈیڈ نے کشمیری زبان کی گرامر سائع کی - سر جارج گریئرسن نے ایک کشمیری پنڈت کے تعاون سے کشمیری زبان کی مبسوط ڈکشنری سائع کی، جس کی ایک سو بیس روپے قیمت ہے اور جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی سے ملتی ہے - یہ ڈکشنری رایل ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کی ہے - گریئرسن نے ایک اور کتاب 'کشمیری مینویل' کے نام سے لکھی ہے - ایک اور کتاب آپ نے حاتم کی کہانیاں مرتب کی - اس کے علاوہ 'فوک ٹیلز ان کشمیر' بھی ان کی تالیف ہے - رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے ایک مفید کتاب ''دی پرونن سیشن آف کشمیری'' شائع کی ہے - اس کے مصنف ٹی گراہم بیلی ایم - اے، بی ڈی - ڈی لٹ ہیں - اس میں کشمیری تلفظ کو انگریزی حروف علت کی مدد سے لکھا گیا ہے - کتاب میں کشمیری لوک کہانیاں بھی دی گئی ہیں اور آخر میں بہت سے کشمیری لفظوں کا انگریزی حروف ہجا میں تلفظ بھی بتایا گیا ہے - امر سنگھ ڈوگری کالج سری نگر اور ایس - پی کالج سری نگر کے میگزینوں میں فارسی

اور شاردا رسم الخط میں کشمیری مضامین ، افسانے اور نظمیں شائع کی ہیں ۔ غلام محمد پشاوری نے بھی کشمیری زبان کی گرامر لکھی ہے ۔

اس وقت ریاست کے دونوں حصوں کے چار میں سے تین ریڈیو سٹیشن (۱) آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد ۔ (۲) آزاد کشمیر ریڈیو نراڑ کھل ۔ (۳) ریڈیو کشمیر سری نگر ، کشمیری زبان میں پروگرام نشر کرتے ہیں ۔ ان کے علاوہ ریڈیو پاکستان اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی کشمیری پروگرام نشر ہوتے ہیں ۔ (ریڈیو جموں سے کوئی کشمیری پروگرام نشر نہیں ہوتا) ۔ ان پروگراموں میں خبروں کے علاوہ فیچر ، گیت اور ڈرامے وغیرہ نشر ہوتے ہیں ۔

کشمیری شاعری کا بنیادی خیال

کشمیری شاعری کا ابتدائی دور سے لے کر آج تک مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک بنیادی نقطۂ نظر اور ایک ایسا رخِ حیات کار فرما نظر آتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ہر بڑے اور چھوٹے شاعر کے کلام سے مترشح ہوتا ہے ۔ اسے آپ کشمیری شاعری کی روح کہہ لیں یا کشمیری معاشرے کی پکار ۔ بہر حال اس سے ایک پوری قوم کے احساسات کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ اس میں جہاں شکایتِ زمانہ ہے اور محرومی کا احساس ہے وہاں احتجاج کا پہلو بھی موجود ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری شعراء اپنے معاشرے کے زیر و بم سے پوری طرح متاثر ہوتے تھے اور وہی بات قلمبند کرتے تھے جو ان کے سارے معاشرے پر صادق آتی تھی ۔ خود اختیاری کی یہ کوشش آخر کار بے ثمر ثابت نہ ہوئی اور کشمیری لوگوں میں جو ولولۂ حیات رونما ہوا وہ اسی احتجاج کا نتیجہ تھا ۔

للّہ عارفہ ابتدائی دور کی ممتاز شاعرہ ہیں ۔ ۱۳۵۱ء میں ان کی ولادت ہوئی اور بتایا جاتا ہے کہ ۱۳۷۷ء میں زندہ تھیں ۔ ان کے کلام میں بھی اس روح کی نشاندہی ہو جاتی ہے جس سے ہم متعارف ہونا چاہتے ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسی روح کے جانکاہ احساس نے للّہ عارفہ کی شخصیت میں ہیجان پیدا کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے بیزار ہو گئیں اور امروز و فردا کی کشمکش سے دامن چھڑانا ، گویا ان کے لیے ضروری ہو گیا ۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو :

جو کچھ بھی اس کا نام ہو
وہ مجھ غریب عورت کو اس سنسار کے پھندوں سے چھڑائے

'غریب عورت' کے الفاظ ایک مجبور اور بیکس عورت کی تصویر پیش کرتے ہیں اور یہ ایک

مجروح اور درماندہ روح کی علامت بھی تصور کیے جا سکتے ہیں ۔ اس غریب عورت سے آپ کشمیر بھی مراد لے سکتے ہیں جس کے حسن اور ثروت نے اسے ہمیشہ سے استحصال کا مرکز بنائے رکھا ۔ للہ عارفہ نے اس مجازی دنیا سے نظر اٹھا کر حقیقت کی تلاش میں عمر صرف کر دی مگر اس کے کلام میں بھی کشمیر کے غربا اور عوام کی محرومی کا درد اٹھتا رہتا ہے ۔ شاید اسی لیے اس نے سنسار سے گریز اختیار کیا اور بڑے دردِ دل کے ساتھ اس غیبی ہاتھ کو مدد کے لیے پکارا جو اسے ان پھندوں سے نجات دلا سکتا تھا ۔

للہ عارفہ کے بعد شیخ نور الدین ریشی، کا ذکر مناسب ہوگا جن کا سال وفات ۱۴۳۸ء ہے ۔ شیخ صاحب نے والدہ اور بیٹے کے درمیان ایک مکالمہ نظم کیا ہے ۔ بیٹا اہلِ عالم کی برائیوں اور جفاؤں سے بچنے کے لیے ایک گپھا میں پناہ لیتا ہے ۔ والدہ کہتی ہے :

اے پیارے گپھا میں جو بیٹھے ہو
تیری گودڑی سیلی ہوچکی ہے
تو زمین پر کیسے سوئے گا

بیٹا جواب دیتا ہے :

ماں گپھا میں مجھے بڑا آرام آیا
میری جان ایک مسافر ہے

اس کی پناہ گاہ تمام سہولتوں سے خالی تھی ۔ الٹا اس میں مزید تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ لیکن ایک بات تھی جس کی وجہ سے اسے وہاں بڑا آرام آیا ۔ گپھا دنیا کے جاں گسل واقعات سے محفوظ تھی جن سے کشمیر کو واسطہ پڑتا رہا ہے ۔

چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کو چھوڑ کر جس میں کشمیر سکندر بت سکن اور زین العابدین بڈ شاہ جیسے جلیل القدر بادشاہوں کے آسودہ دور سے گزرا، ہم سترھویں صدی کے شعراء میں بھی یہی احساسِ محرومی اور بیکسی کی جھلکیاں دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ مغلیہ عہد کا زمانہ ہے اور ان دنوں کشمیر پر کوئی ظلم یا جبر نہیں ہوتا تھا ۔ حبّہ خاتون کا سال وفات ۱۶۰۱ء ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولھویں صدی عیسوی کی نمائندگی کرتی ہے ۔ یہ جلال الدین اکبر کا زمانہ تھا ۔ حبّہ خاتون سارے کشمیر کی ترجمان بن کر کہتی ہے :

میں نعمت ہوں
میرے مہمان تو نوش کر

محسوس ہوتا ہے کہ حبّہ خاتون کے الفاظ یہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ گویا مغل بھی کشمیر کو خوان نعمت کے طور پر استعمال کرتے تھے ۔ شک ہوتا ہے کہ انفعالیت کسی نہ کسی طرح کشمیریوں کے ذہن میں جم گئی تھی ۔ مگر چونکہ کشمیری بے زبان نہیں تھے ، اس لیے صدائے احتجاج بلند کرنے سے نہیں رکتے ۔ حبّہ خاتون یہی بات بڑی صراحت سے بیان کرتی ہیں :

جب میں برقع زیب تن کرکے نکل آئی
تو ساری دنیا فریفتہ ہو گئی
بنوں میں تپسیا کرنے والے رشی تک تپسیا بھول بیٹھے
اور جب ہی میرے نصیبوں کا آفتاب غروب ہو گیا

یوں یہ بات ناقابل تسلیم نہیں کیونکہ جو لوگ بظاہر نیک نہاد اور نیک اندیش تھے وہ بھی 'مال غنیمت' کو اڑا لے جانے سے باز نہ آتے تھے ۔ کشمیر کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے والے بھی اکثر لٹیرے نکلے ۔ حبّہ خاتون کو تمام استحصال کرنے والے سسرال والوں کی صورت میں نظر آتے ہیں ۔ سسرال بھی ذیل میں علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے ۔ مراد اس سے وہ بے درد لوگ ہیں جو کشمیر سے متمتع ہونے کے باوجود کشمیری معاشرے سے کوئی گہری دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور وہ اس طرح پکار اٹھتی ہے :

میری سسرال والوں سے نہیں بن پاتی
میکے والو! مجھے بچانے کی کوئی تدبیر کرو

یہ کشمیری عورت اور وادیٔ کشمیر دونوں کا احتجاج ہے ، بلکہ ایک صاحبِ دل عورت کی سوسائٹی کو للکار ہے ۔

حبیب اللہ نوشہری (م - ۱۶۱۷ء) کے دل میں ظاہر اور باطن دونوں کے غارت ہو جانے کا شدید احساس ہے ۔ حسنِ ظاہر اگر پامال ہوا تو عادات و اخلاق بگڑے ۔ گل و گلزار ، کشمیر کے لیے ایک نعمت تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے عذاب بن گئے ۔ ظاہری حسن کے غارت ہو جانے کے متعلق وہ کہتے ہیں :

میں پر بہار ٹہنی کی مانند گل بدوش تھی
مگر یہ بہار مرجھا گئی اور میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی

اور چنگیزیت اختیار کرکے اغیار نے اہلِ کشمیر کی روح کو جس طرح پامال کیا اس کا ذکر حبیب اللہ نوشہری اپنے اشعار میں پر درد طریقے پر کرتے ہیں اگرچہ انھوں نے علامتوں سے کام لیا ہے ، مگر ان کے ہاں بھی احتجاج کا جذبہ موجود ہے :

کوسوں دور سے وہ تیرِ مژگان سے مجھ پر حملہ آور ہوا ، اور
میری روح کو ضائع کرکے چلا گیا

مگر اہلِ کشمیر شاید اس پکار کو صبر و شکر کے جذبہ میں چھپانے کے عادی ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے شعراء نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ کشمیر تو دل و جان سے ہر ایک کے ساتھ اظہار وفاداری کرتا ہے مگر اس کا کوئی وفادار نہیں۔ ہر کوئی خود غرضی اور لذت کوشی کا قائل نظر آتا ہے۔

الغرض محرومی ، نامرادی اور پامالی کے احساسات ایک رو کی طرح ساری کشمیری شاعری میں بہتے نظر آتے ہیں اور شاید یہ بالکل قدرتی امر تھا۔ شاہوں اور غیر ملکی حکمرانوں نے کشمیر کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی وجہ سے بیچارگی اور کس مپرسی کا جذبہ ان کے ذہن پر مرتسم ہوگیا۔ ان سے جو برتاؤ ہوا اس میں تاراجی اور تفرقے کے عناصر زیادہ تھے اور ہمدردی اور تعمیر کے عناصر کم۔ شاید اسی وجہ سے شعراء اپنی محرومی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ڈوگرہ راج میں جو کچھ ہوا ، وہ ہر ایک پر ظاہر ہے۔ حسن شاہ بیدل اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ نعتِ رسولِ مقبول لکھتے ہوئے اپنے آپ کو 'بھیڑ' کہتے ہیں۔ بیچارگی کی اس سے زیادہ موثر تصویر اور کونسی ہوگی :

اے بھیڑ !
گڈریے کے پیچھے چل ،
جب ہی تو نستاں کا لطف اٹھائے گی ،
نہیں تو کہیں کھائی میں گر جائے گی!

دیکھئے تباہی اور بربادی کا احساس اہلِ کشمیر کے دل میں ہر وقت موجود ہے!

اب ذرا بیسویں صدی عیسوی کے ایک شاعر مقبول شاہ کرالہ واری کا کلام دیکھئے ان کا سال وفات ۱۹۳۶ء بمطابق ۱۹۹۲ بکرمی ہے ، یعنی آج سے صرف پنتیس سال ادھر۔ ان کے کلام میں احتجاج کی ایک اور صورت نظر آتی ہے۔ مقبول شاہ کہتے ہیں ، اغیار کیوں کشمیر کی دولت کو لوٹیں۔ اہلِ کشمیر خود کیوں نہ اس سے مستفیض ہوں ، چنانچہ کہا ہے :

میں چاہتا تھا کہ شگوفے کا لطف اٹھاؤں ،
اور بلبل کی طرح آہ و فغاں کروں ،
آہ پھولوں کی جگہ کانٹے ہاتھ لگے !

ان کی مثنوی 'گلریز' میں بھی یہی خیال کار فرما ہے ۔ یہاں وہ بالواسطہ طور پر اپنے وطن کی نعمتوں سے اپنی محرومی کا اظہار کرتے ہیں ۔ اس لیے ان کی مثنوی 'گریس نامہ' بڑی تلخ ہے ۔ لیکن گہرائیوں میں جا کر دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بیمار معاشرے سے نالاں ہیں جو غلامی کی پیداوار ہے اور ان کے دل میں خود اختیاری اور آزادی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں ۔

مقبول شاہ تک ہم پہنچتے ہیں تو کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع ہو جاتی ہے اور پوری قوم فعّالیت کے جوش میں ایک نیا روپ دھار لیتی ہے ۔ اب کشمیری بے چارہ نہیں ، اعتماد سے سرشار نظر آنے لگتا ہے ، اور اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے ۔ یہی جذبہ موجودہ دور کے ادب کی نمایاں خصوصیت معلوم ہوتی ہے ۔

مدیر عمومی

ہندکو ادب
(فصل اول)

جغرافیائی حالات

مغربی پاکستان کے ان علاقوں میں جو شمال میں ضلع ہزارہ اور جنوب مغرب میں ڈیرہ اسماعیل خان تک پھیلے ہوئے ہیں ہندکو بولی جاتی ہے ۔ یہ لہندا یا لہندی زبان کی ایک بولی ہے ۔ لہندا کے معنی مغرب کے ہیں ۔ یعنی اس پانچ دریاؤں کی سر زمین میں سے جو دریائے سندھ کا طاس کہلاتی ہے مغربی اضلاع میں استعمال ہونے والی زبان ہندکو کہلاتی ہے ۔

علاقائی تاریخ

اس علاقہ کی تاریخ کو باقی برصغیر بالخصوص مغربی پاکستان کی تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اب سے تین لاکھ سال سے بھی قبل راولپنڈی کے قریب دریائے سواں کے کنارے جو باشندے رہتے تھے وہ پرانے پتھر کے زمانے سے متعلق تھے اور پتھر کے بھدے سے اوزار استعمال کرتے تھے ۔ ہمیں ان لوگوں کی معاشرت اور ان کی بولی کا کوئی علم نہیں ۔ البتہ مغربی پاکستان میں ایک پرانی ، منظم اور متمدّن قوم کے بہت سے آثار برآمد ہوئے ہیں ۔ اس تہذیب کو وادئی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے ۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں یہ قوم اپنے عروج پر تھی اور اغلباً فرات اور دجلہ کی وادی کے تمدّن سے اس کے روابط قائم ہو چکے تھے ۔ کیونکہ دونو جگہ کئی ایک ایسی مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو ایک دوسرے سے کامل مشابہت رکھتی ہیں ۔

یہ تہذیب دریائے سندھ کے پورے طاس میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے آثار مشرق میں ضلع انبالہ اور مغرب میں بلوچستان ، شمال میں صوبہ سرحد اور جنوب میں گجرات کاٹھیاوار تک پائے گئے ہیں ۔ اس تمدّن کے دو دارالسلطنت بھی دستیاب ہوئے ہیں ۔ ایک ہڑپہ ضلع ساہیوال میں اور دوسرا موہن جو دارو صوبہ سندھ کے وسط میں ۔ دونو شہروں کے کھنڈرات اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اعلیٰ قسم کی شہری زندگی بسر کرتے تھے ۔ ان کے شہر معقول اور مفید اصولوں پر وضع کیے گئے تھے ۔ شہروں میں قلعوں اور محلات کے علاوہ تالاب اور مطبخ اور دیگر سہولتیں بہم پہنچانے کا سامان تھا ۔ نالیاں زمین دوز تھیں ۔ سڑکیں سیدھی اور باقاعدہ پلان کے مطابق بنی ہوئی تھیں ۔ ان کی زبان جو تختیوں پر کندہ

ہے ابھی تک پڑھی نہیں گئی۔ مگر ظاہر ہے ایک ایسا تمدّن جو برِّصغیر کے تمام شمال مغربی علاقوں میں پھیلا ہوا ہو اور جو غالباً بیرونی ممالک سے تجارتی یا سیاسی روابط رکھتا ہو زبان و ادب، مذہب، ارکان و رسوم مذہب اور عبادت کے طریقے سبھی باتوں کا حامل ہوگا۔ چنانچہ ماہرین کی رائے ہے کہ ہندو مت میں شو دیوتا کی پرستش وادیٔ سندھ کے باسیوں کے مذہب سے لی گئی ہے۔ یہ تمدّن کوئی دو ہزار سال قائم رہا۔ یہ لوگ کانسی کے ہتھیار استعمال کرتے تھے اور غالباً امن پسند تھے۔ چنانچہ جب ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں جنگ جو آریا قوم موجودہ افغانستان سے اس برِّصغیر میں داخل ہوئی تو یہ لوگ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور یہ تہذیب تقریباً تقریباً معدوم ہو گئی۔

آریاؤں کی مذہبی کتب میں وادیٔ سندھ کی پرانی تہذیب کے اشارے ملتے ہیں۔ 'رگ وید' کی تصنیف کا زمانہ یہاں آریوں کے دور سے بعد کا ہے۔ اس میں پنجاب کے دریاؤں کے علاوہ کوبھا (کابل)، کرومو (کُرّم)، گومتی (گومل) اور سندھو (سندھ) یعنی ان چار دریاؤں کے نام بھی موجود ہیں جو اس علاقے میں بہتے ہیں، جہاں آج کل ہندکو بولی جاتی ہے۔ 'رگ وید' میں وادیٔ سندھ کے شہروں اور قلعوں کی تسخیر کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ آریاؤں کے خیال کے مطابق اندر دیوتا ان کے دشمنوں کے مضبوط شہروں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔

آریاؤں کی آمد کے بعد اس علاقہ میں تاریخ نے ایک اور کروٹ لی۔ ۵۱۶ ق-م کے بعد ایران کے ہخامنشی حکمران داریوس کبیر نے امیر البحر سکائی لاکس کے زیرِ کمان ایک مہم روانہ کی، جس نے قندھار اور ٹیکسلا کے علاقوں کو بھی ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مغربی پاکستان کا جنوبی حصہ اس خاندان کے بانی سائرس نے فتح کر لیا تھا۔ اب تقریباً سارا مغربی پاکستان ایرانیوں کے تسلّط میں چلا گیا۔ ایرانی اثرات پھیلنے لگ گئے اور خروشتی رسم الخط جو آرمائی طرزِ تحریر سے ماخوذ تھا اور عربی رسم الخط کی طرح دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا یہاں آیا۔ یہ رسم الخط چوتھی صدی عیسوی تک یہاں باقاعدہ رائج رہا۔

اگرچہ ان ایام میں ادھر مشرق میں بہار کی طرف جین مت اور بدھ مت کی تبلیغ شروع ہو چکی تھی مگر شمال مغرب کی طرف ہندو مت کا دور دورہ تھا اور ٹیکسلا بدستور ہندوؤں کی ایک عظیم درسگاہ شمار ہوتا تھا۔ جہاں چاروں ویدوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے اثرات لازماً سارے مغربی پاکستان میں پھیل گئے ہوں گے۔ البتہ یہ درست ہے کہ ٹیکسلا میں جین اور بدھ لوگ بھی پہنچ رہے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہخامنشی شہنشاہوں کی وجہ سے زرتشت کی تعلیمات کا بھی دخل ہو چکا تھا۔

یہ حالات تھے جب یونانی فاتح سکندرِاعظم آخری ہخامنشی شہنشاہ دارائے سوّم کو شکست

دیتا ہوا ۳۲۶ ق-م کے آغاز میں یہاں آیا ۔ ٹیکسلا کا ہندو راجا امبھی اس کا مطیع ہو گیا ۔ البتہ رچنا دوآب کے راجہ پورس نے پوری ہمت کے ساتھ سکندر اعظم کا مقابلہ کیا ، مگر شکست کھائی ۔ سکندر اعظم باری دو آب میں بسنے والی ملّی قوم کو فتح کرتا ہوا ملتان یا یہیں کے کسی اور بڑے شہر کے قلعہ کو مسخر کر کے سندھ کے راستے واپس چلا گیا ۔ مگر اس کے جانشینوں یعنی باختری حکمرانوں کی بدولت بعد میں یہاں یونانی اثرات پھیلنے کی صورت پیدا ہو گئی ۔ اس سے پہلے اس طرف مہاراجہ اشوک (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق - م) کی وجہ سے بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا ۔ مہاراجہ اشوک نے ٹیکسلا میں بدھ یونیورسٹی کا اجرا کر کے اس شہر کو بدھوں کا بہت بڑا مرکزی مقام بنا ڈالا ۔ ضمناً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پشاور کے قریب شہباز گڑھی میں مہاراجہ اشوک نے جو کتبہ کندہ کرایا تھا وہ خروشتی رسم الخط میں ہے ۔ جیسا کہ ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے اس علاقہ میں اہم تبدیلی پھر باختر کے یونانی بادشاہوں کی وجہ سے عمل میں آئی ۔ ان کے سب سے بڑے بادشاہ می نانڈر (۱۸۰ تا ۱۶۰ ق - م) نے ساکلا (سیالکوٹ) میں اپنا دارالسلطنت بنایا ۔ اس طرح ایک طرف گندھارا اور ٹیکسلا میں یونانیوں کا فنِ سنگتراشی رواج پذیر ہوا اور بہت جلد بدھ کے مجسّمے بننے لگ گئے اور دوسری طرف لوگوں کی زبان پر یونانیوں کی در آمد کی ہوئی علمِ نجوم کی بہت سی اصطلاحات جاری ہو گئیں ۔ لازماً یہاں کی زبان پہلے ویدک سنسکرت ، پھر ژند اور پہلوی ، بعد میں یونانی زبان سے متاثر ہوئی ۔

ولادتِ مسیح کے قریب ایک اور قوم یہاں وارد ہوئی ۔ اسے ساکا کہتے تھے ۔ یہ ایک بہت بڑی قوم تھی اور اس کی ایک شاخ کا نام کسان تھا ۔ کشان خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ کنشک (۱۲۰ء تا ۱۶۲ء) تھا جو بدھ مت کا پیرو تھا ۔ اس نے پشاور کو اپنا دارالسلطنت بنایا ۔ اسے شاہِ گندھارا کہا جاتا ہے ۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے اس کی عمارت کے آثار پشاور میں دریافت کیے ہیں ۔ گندھارا آرٹ کو جس پر یونانی سنگ تراشی کا گہرا اثر تھا اس کے عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ کشانوں کی سلطنت کا نچلا حصہ یعنی سندھ کا علاقہ ایران کے ساسانی بادشاہوں نے ۲۲۶ء کے بعد فتح کر لیا لیکن کابل میں ان کی سلطنت پانچویں صدی عیسوی تک موجود رہی جس کا خاتمہ سفید ہنوں نے کیا جو بلائے بے درماں بن کر کابل ، گندھارا اور پنجاب پر نازل ہوئے اور ہندوؤں کی گپتا سلطنت کو تاراج کرتے ہوئے شمالی اور وسطی ہندوستان پر چھا گئے ۔ یونانی مؤرخ انہیں افتھال کہتے ہیں ۔ ان کے ساتھ گرجارا آئے جو گوجر کے نام سے آج تک موسوم ہیں اور شمال مغربی سرحد پر اب بھی دور تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ یوسف زئی میں ایک گاؤں کا نام انہی کی وجہ سے گوجر گڑھی ہے ۔ پشاور کے قریب بھی اسی نام کا ایک گاؤں موجود ہے ۔ بنیر کے آس پاس

اور ضلع ہزارہ میں گوجروں کے کئی دیہات ہیں ۔ اسی طرح گوجر خان (راولپنڈی) اور گوجرانوالہ سے لے کر گجرات کاٹھیاوار تک متعدد شہر اور علاقے ان کی تعداد اور جوع الارض کی شہادت دیتے ہیں ۔

شمال مغربی سرحد پر مسلمانوں کی آمد تک مغربی پاکستان کی زبان اور معاشرہ کئی اور اثرات قبول کر چکے تھے، یعنی کشانی ، گوجری ، ہنّی وغیرہ ۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد تک یہ معاشرہ غالباً اپنی اصلی ہئیت بہت کچھ بدل چکا تھا ۔ ساتویں صدی عیسوی میں چین کا مشہور سیاح ہیون سانگ یہاں سے گذرا ۔ یہ راجہ ہرش کا عہد تھا ۔ ہیون سانگ اس علاقے کی شادابی اور خوشحالی کا ذکر کرتا ہے ۔ ہرش اگرچہ شمالی ہند میں ایک وسیع سلطنت کا مالک تھا مگر مغربی پاکستان اس کے زیر نگیں نہ تھا۔ اس کی زندگی ہی میں برہمنی ردّ عمل شروع ہو گیا تھا اور ہندوؤں اور بدھوں کے مناقشات بڑھ گئے تھے ۔ اب بدھ مت کو زوال ہونا شروع ہوا اور ہندو مت کو پھر فروغ حاصل ہو گیا ۔ مسلمانوں نے بلوچستان کو جسے اس زمانے میں دو تین ناموں سے پکارا جاتا تھا اور جس کا نصف جنوبی حصہ مکران کہلاتا تھا ۴۴ء تک فتح کر لیا تھا ۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا اورسندھ اور ملتان خلافت بنی امیّہ کا حصہ بن گئے ۔ عربوں کی حکومت یہاں تین سو سال تک رہی ۔ انہوں نے نئے شہر آباد کیے ۔ عربی زبان کو رواج دیا اور ہندوؤں کے علوم بھی سیکھے ۔ مقامی زبان میں عربی کے الفاظ شامل ہونے سے سندھی زبان وجود میں آئی ۔ محمود غزنوی (۹۹۹ء تا ۱۰۳۰ء) نے گیارھویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں سندھ کو فتح کر لیا ۔ پشاور اور لاہور کی طرف اسلام اسی عظیم فاتح کے زمانے میں پھیلا اور پھر قطب الدین ایبک (م - ۱۲۱۰ء) کے زمانے تک کاروانِ اسلام برِصغیر کے اطراف و اکناف تک پھیل گیا اور اسلامی تہذیب و تمدّن کے اثرات مغربی پاکستان میں پھیلتے رہے ۔ سلاطینِ دہلی نے اپنا دارالخلافہ دہلی کو قرار دیا لیکن مغربی پاکستان کے علاقوں میں ورودِ اسلام کی وجہ سے جو مذہبی ، معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیاں شروع ہوئی تھیں بدستور جاری رہیں ۔ ان ایام میں فتنۂ چنگیزی مسلمانوں کے لیے فتنۂ محشر بن کر نمودار ہوا اور اس طرف بھی ایک صدی سے زیادہ عرصے تک منگول حملہ آور ہوتے رہے ۔ قدرتی طور پر وہ بھی اپنے کچھ اثرات چھوڑ گئے ۔ کہا جاتا ہے کہ مغلپورہ (لاہور) انہی منگولوں کی یادگار ہے ۔ ان کی وجہ سے ترکی کے کچھ الفاظ بھی مغربی پاکستان کی زبانوں میں شامل ہو گئے ۔ علاوہ بریں خونخوار منگولوں سے خوفزدہ ہو کر ہزاروں مسلمان اہلِ علم وسط ایشیا سے بھاگ کر ادھر آگئے ۔ ہمارے معاشرے کی تہذیب و ثقافت پر ان کی آمد کا بھی اثر پڑا ۔

برِصغیر میں عظیم مغلوں کا عہد امن اور خوشحالی کا عہد تھا ۔ اس لیے اسلامی اثرات کو یہاں تقویت پانے کا اور بھی زیادہ موقع ملا ۔ اور مسلمانوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنی ذہانت و فطانت کا اس عمدگی سے اظہار کیا کہ ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ مغل شہنشاہ پنجاب کو خاص اہمیت دیتے تھے ۔ اکبر اور جہانگیر کافی عرصہ تک لاہور رہے ۔ تقریباً تمام شہنشاہوں کی آمد و رفت حسن ابدال اور کشمیر کی طرف ہوتی تھی اور درباری اثرات ان اطراف میں بھی کار فرما رہتے تھے ۔ مغل حکمران علم و فن کے مربّی تھے اور شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے ۔ ہمایوں کے وقت سے اہلِ ایران کی توجہ برِصغیر کی طرف بڑھ گئی تھی اور یہ بھی تھا کہ ایران کے صفوی حکمران شعراء کی سرپرستی نہیں کرتے تھے ۔ اس وجہ سے بھی شعراء مغلیہ دربار کا رخ کر لیتے تھے ۔ جہاں شہنشاہوں کے علاوہ اُمرائے دربار بھی انہیں انعام و اکرام سے مالا مال کر دیتے تھے ۔ ان حالات کے باعث اصفہان، شیراز، سمرقند، بخارا، نیشاپور وغیرہ کے علمی اور ثقافتی مراکز سے شعراء اور دیگر اہلِ علم ادھر چلے آتے تھے اور معاشرہ کو ثروتِ فکری کے ساتھ ثروتِ الفاظ بھی عطا کرتے تھے ۔ اسی لیے مغربی پاکستان کی زبانوں میں ہمیں وہ خیال اور احساسات ملتے ہیں جو عربی اور فارسی علم و ادب کی وساطت سے یہاں آئے ۔

بنگال اور مدراس کی طرف انگریزوں کا اثر و نفوذ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف اول کے بعد بڑھ گیا تھا اور وہ برِصغیر میں ایک نئی طاقت بن کر ظاہر ہوئے ۔ مغلوں کی کی سلطنت ۱۸۵۷ء میں ختم ہوئی لیکن انگریز مارچ ۱۸۴۹ء سے پنجاب اور سرحد اپنی عملداری میں شامل کر چکے تھے ۔ اب یہاں علوم مغرب کی تعلیم شروع ہوئی ۔ جدید ایجادات پہنچنے لگ گئیں اور ریل جاری ہوئی ۔ تخلیقِ پاکستان تک کوئی ایک صدی کے عرصے میں مغربی پاکستان کے زبان و ادب اور تمدّن و معاشرت میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ لیکن چونکہ ہندو اور مسلمان دونو قومیں اپنے اپنے مخصوص نظریوں سے وابستہ رہیں اور بنیادی طور پر معاشرہ جوں کا توں رہا اس لیے مغربی پاکستان کی زبانوں پر انگریزوں کے اثرات صرف سطحی قسم کے ہیں ۔ تمام مقامی زبانیں اپنے ذخیرۂ الفاظ میں انگریزوں کے کئی الفاظ کا اضافہ کر پائی ہیں مگر ان کا ادب بنیادی لحاظ سے وہی کچھ ہے جو پہلے تھا ۔ البتہ تخلیقِ پاکستان کے بعد ان کے نثری ادب میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی ہے لیکن وہ بھی زیادہ نمایاں نہیں ۔ البتہ میکانکی اصطلاحات و الفاظ بڑی تعداد میں مغربی پاکستان کی سب زبانوں میں داخل ہو گئے ہیں ۔

معاشرتی اور ثقافتی پس منظر

چونکہ ہمارا مقصد ہر کو زبان سے قارئین کو متعارف کرانا ہے اس لیے ہم گذشتہ

صفحات میں بیان کردہ علاقائی تاریخ کو زیر نظر رکھ کر صرف اس خطّہ کے معاشرتی و ثقافتی پس منظر کو بیان کریں گے ، جہاں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ اس خطے کے مختلف حصوں سے جو پرانے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں وہ ہندو تہذیب اور کلچر کے آئینہ دار ہیں۔ ہزاروں سکے بھی ملے ہیں جن پر سنسکرت کے الفاظ مرقوم ہیں۔ ان آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں گندھارا کا علاقہ ہندوؤں کی تہذیب کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ یہاں سے بدھ کے مجسّمے بھی دستیاب ہوئے ہیں جو بدھوں کے عروج کی داستان سناتے ہیں۔ مجسّمے کشان حکمران کنشک کے زمانہ اور بعد کے ہیں۔ کیونکہ اسی کے عہد میں مہایانہ یعنی بدھ کو خدا کا اوتار ماننے کا عقیدہ شروع ہوا اور گندھارا آرٹ وجود میں آیا۔ ہندوؤں اور بدھوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ ایرانی تہذیب کے اثر و نفوذ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ داریوس کبیر کے زمانہ میں خروشتی رسم الخط وادیٔ پشاور میں شروع ہوا تھا اور پھر کئی سو سالوں تک یہاں رائج رہا۔ اس لیے اس علاقہ کے ثقافتی اور معاشرتی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے ہندوؤں ، قدیم ایرانیوں اور بدھوں کے مختلف تہذیبی اثرات کو زیر نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آثار کے علاوہ پشاور کے گرد و نواح میں ایرانی ماحول کا عکس بھی موجود ہے ۔ گندھارا آرٹ جس فنِ سنگتراشی کی وجہ سے وجود میں آیا ، وہ باختر کے یونانی بادشاہوں کے ذریعے یہاں وارد ہوا تھا۔ چنانچہ جہاں تک بیرونی تہذیبوں کا تعلق ہے ہم ایرانی کے علاوہ یونانی اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس خطّے میں جتنی اقوام وارد ہوئیں۔ انجام کار ہندو مذہب اختیار کر گئیں اور جو معاسرہ پیدا ہوا اگرچہ مختلف تہذیبوں کے عناصر اپنے اندر رکھتا تھا ، مگر بنیادی طور پر ہندو معاشرہ تھا۔

جب اس خطّے میں اسلام پھیلا تو معاشرتی اور ثقافتی پس منظر میں دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بت پرستی اور اس سے متعلق فنون متروک ہو گئے۔ مندروں اور پاٹ شالوں کے ساتھ مسجدوں اور مکتبوں کی عمارات بھی نظر آنے لگیں۔ شادی بیاہ کے طریقوں کھانے پینے کی اشیاء ، عبادات و معاملات ، زبان اور لکھنے پڑھنے ، ظاہری ہیئت ، الغرض ہر چیز میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور توحید و رسالت کی بنیاد پر ایک نیا معاشرہ ابھرا۔ پٹھان قوم نے کھلے دل سے اسلام قبول کیا تھا۔ گوجر اور گکھڑ بھی اس سلسلے میں پیچھے نہ رہے اور اس طرح اس خطّے میں ایک وسیع اسلامی معاشرہ اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ ظاہر ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ یکسر تبدیل ہو گئے۔ بلکہ معاشرے میں پرانی رسوم کے نشانات

دیر تک موجود رہے۔ توحید و رسالت کی اساس پر وحدتِ فکر پیدا کرنے کے بعد اسلام مقامی حالات سے متعلق فروعی اختلافات سے چنداں متعرض نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ رقص جس کی اصل ہندو معاشرہ میں مذہبی تھی اب محض ثقافتی اور بزمی تفریح کی حیثیت سے باقی رہ گیا۔ علاوہ بریں جنگ کے دوران فتح کی صورت میں اظہارِ مسرت کے طور پر بھی ناچنا جاری رہا۔ ناچ کے ساتھ گانا لازماً ہوتا ہے اور وہ بھی آج تک اس خطّے کا خاصا بنا ہوا ہے۔ اس علاقہ میں سادگی جو بعض دفعہ درشتی کی حد تک پہنچ جاتی تھی، جنگجوئی، مروت، حمیّت اور مہمان نوازی کے اوصاف پہلے سے موجود تھے۔ اسلام نے انہیں اور نکھارا۔

زمانۂ قدیم سے اس خطّہ کے لوگ زراعت پیشہ تھے اور پہاڑوں پر ریوڑ بھی پالتے تھے۔ اس لیے ان کی رہائش زیادہ تر دیہات میں تھی، مگر رسماً اور شغلاً یہ جنگ بازی میں بھی مصروف رہتے تھے۔ بیرون جات سے آنے والے لوگ عام طور پر کسی نئی تہذیب کے علمبردار بن کر آتے تھے اور شہری زندگی کو پسند کرتے تھے۔ اس طرح شہروں کی بنیاد پڑگئی۔ تجارت کے ساتھ بھی اسی قسم کے لوگوں کو شغف ہوتا تھا۔ وسط ایشیا اور پنجاب و ہند کے علاقوں سے ان کی تجارت کے سلسلے قائم تھے۔ اس لیے ان کے تمدّن و معاشرت میں اختلاف کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ان کی زبان بھی مختلف ہو جاتی تھی۔ شہر کے لوگ نسبتاً آرام پسند ہوتے تھے، اس لیے دیہات کے جنگ آزما لوگ ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے اور موقع ملتا تھا تو حملہ آور ہو کر انہیں لوٹ بھی لیا کرتے تھے۔ اسلام سے پہلے اور بعد بھی ہندو تاجر شہروں میں رہائش کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ شہر ان کے لیے محفوظ تھے۔ اس طرح اس خطّے میں آہستہ آہستہ پشاور، نوشہرہ، مانسہرہ، ہری پور، مردان، کوہاٹ بنوں اور ڈیرہ اسمعیل خان کے شہر آباد ہو گئے۔ ہخامنشی بادشاہوں نے دریائے سندھ کے قریب کے علاقہ کا نام 'ہندوکا'[1] رکھا تھا، اس لیے کہ حرف سین زند اور پہلوی میں 'ہ' سے بدل جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے جو زبان یہ لوگ بولتے تھے، وہ 'ہندکو' یا ہندکی' کہلائی اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔ پٹھانوں کی قومی زبان پشتو ہے۔ وہ اسی کو استعمال کرتے رہے۔ مگر ہندکو بولنے والوں سے وہ ہندکو میں بھی بات چیت کر لیتے تھے۔ البتہ گوجر اور دیگر غیر پٹھان قوموں کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ گھروں میں بھی ہندکو میں بات چیت کرتے تھے اور جب اپنے ریوڑوں کی اونی کھالیں وغیرہ شہروں میں آ کر بیچتے تھے تو اسی زبان کو استعمال میں لاتے تھے۔ آج تک

1. Jack Finegan, The Archaeology of World Religions, Princeton, 1962, P. 121.

ان کی حالت یہی ہے۔ پشتو ان کے لیے محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

مذہبی اقدار اور روایات کا اثر

مندکرہ بالا تاریخی واقعات و حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ اس خطّے میں صدیوں تک ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا تسلط رہا۔ ان کے مذہبی علوم کی بڑی بڑی درسگاہیں یہیں تھیں جہاں برِّصغیر کے علاوہ وسط ایشیا سے طلباء حصولِ علم کے لیے آتے تھے۔ اس علاقے کے ایک قصبے لہور (تحصیل صوابی) میں سنسکرت کے مشہور عالم پانینی نے سنسکرت زبان کی صرف و نحو مرتب کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عظیم رزمیہ 'مہا بھارت' پہلے پہل ٹیکسلا میں پڑھی گئی، جو گندھارا اور ہزارہ کے قریب ہے۔ یہ علاقہ بدھ مت کی تبلیغ کا بھی بڑا مرکز بنا۔ پالی بدھوں کی مقدس زبان تھی اور بھکشو اپنا مذہبی ادب اسی زبان میں محفوظ رکھتے تھے۔ اور ماہرینِ لسانیات کی رائے ہے کہ پالی غالباً ٹیکسلا ہی میں فروغ پائی۔ بدھوں کے آثار اس دھرتی کے چپے چپے پر ملتے ہیں۔ چین، برما، بھارت اور لنکا سے تشنگانِ علم کے علاوہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں متبرّک مقامات کی یاترا کے لیے بھی یہاں آتے تھے۔

ورود اسلام کے بعد قرآن و حدیث کی تعلیم کا یہاں رواج ہوا۔ عربی زبان و ادب کے ساتھ فارسی زبان و ادب سے بھی رابطہ قائم ہوا۔ آیات و احادیث کے علاوہ عربی، فارسی کے اشعار زبانوں پر آنے لگ گئے۔ قریبی اسلامی ممالک میں آہستہ آہستہ فارسی زبان کی وہ کتابیں تصنیف ہو رہی تھیں، جنھیں بعد میں کلاسیکی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اسلامی دنیا میں لوگ بڑے ذوق و شوق سے انھی سے استفادہ کرتے تھے۔ اس طرح بے شمار اسلامی اصطلاحات اور تلمیحات مقامی زبان و ادب میں غیر محسوس طور پر منتقل ہونے لگ گئیں۔ اور اسلامی کتب، فارسی ادب، مبلّغینِ اسلام اور بھاری تعداد میں آنے والے دیگر مسلمانوں کی وجہ سے ایک ایسا معاشرہ پیدا ہوگیا، جس کے ذخیرۂ الفاظ میں عربی، فارسی کے علاوہ پشتو، سنسکرت، ہندی اور قدیمی دراوڑی زبان کے الفاظ کم و بیش نسبت کے ساتھ شامل تھے۔ دردستان قریب تھا دردی زبان کے الفاظ بھی آنے جانے والوں کی وجہ سے داخل ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً اچھنا، گچھنا (آنا، جانا) کے الفاظ جو ہزارہ کی ہندکو میں ملتے ہیں، دردی زبان سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ہندکو نے آہستہ آہستہ اسلامی رنگ اختیار کر لیا۔ لیکن یہ رنگ قدیم اور جدید تمام مذہبی اقدار و روایات کا نتیجہ تھا اور اس کی تشکیل میں

قرونِ وسطیٰ سے لے کر آج تک اس خطّہ کی تمام تاریخ نے حصہ لیا تھا ۔

مذہبی اقدار و روایات کا ایک اثر بڑا تعجّب خیز ہے ۔ چونکہ مقامی باشندوں کے اسلام قبول کرنے سے اس خطّے کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی ، اس لیے باقی ماندہ ہندو اقلیّت قدرتی طور پر اکثریت کی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہوئی ۔ اس اقلیّت کے افراد ہندو ہوتے ہوئے بھی اسلامی کلچر کے رنگ میں رنگے گئے ۔ یہاں تک کہ ان کے نام بھی عمر لال ، غفور چند ، جمعہ ناتھ ، کرم سنگھ ، خان چند ، وزیر سنگھ قسم کے رکھے جانے لگے اور ہندوستان کے ہندو تو انہیں مسلمان ہندو کہتے تھے ۔

لباس سب کا ایک ہی قسم کا تھا ۔ اکثر لوگ پگڑی کا استعمال کرتے تھے ۔ عورتیں بھاری شلوار اور لمبا کرتا پہنتی تھیں اور صدری کا رواج عام تھا ۔ کھانا پینا بھی مختلف نہ تھا ۔ ادھر کے ہندو گوشت خور تھے ۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ گائے کا گوشت ان کے لیے ممنوع تھا ۔ عید یا شبرات کے مواقع یا معراج اور مولود جیسی مذہبی روایات تو مختلف تھیں ، مگر مسلمان ہندوؤں کے تہواروں میں حصہ لے لیتے تھے ۔ اس لیے معاشرہ میں ایک قسم کی یکانگت تھی ۔

ہندکو زبان و ادب کی تاریخ ، اس کے ماخذ اور لسانی مطالعہ

(فصل دوم)

جس طرح دریائے سندھ سے پار کے علاقہ کی تاریخ کو برّصغیر کے شمال مغربی خطّے کی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح 'ہندکو' زبان و ادب کی تاریخ کو بھی ملحقہ قریبی علاقوں کی زبان کی تاریخ سے جدا کرنا درست نہیں ۔ زبان باہمی میل جول سے بنتی اور بدلتی ہے اور دریائے سندھ کے مشرق اور مغربی علاقوں میں راہ و رسم زمانۂ قدیم سے چلی آئی ہے اور ان تمام علاقوں کے تاریخی حالات بھی یکساں ہیں ۔ چنانچہ زبان میں یکسانیت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا ۔ بنا بریں ہندکو زبان کو اگر لہندا کی دوسری شاخوں اور خاص طور پر پنجابی زبان سے مماثلت حاصل ہے تو تعجّب کا مقام نہیں ۔

ہندکو زبان کی وجہِ تسمیہ صحیح طور پر معلوم نہیں ۔ ایک روایت یہ ہے کہ کوہ ہندوکش کے قریب جو لوگ شہروں میں آباد تھے انہیں دیہات میں رہنے والے آزاد اور جنگجو قبائل ''ہندکو'' کہتے تھے ۔ اس نام میں شہری آبادی کی تن آسانی کے باعث نفرت اور حقارت کا پہلو موجود ہے ۔ یہ نام شہر میں رہنے والے لوگوں کی زبان کا بھی پڑ گیا ۔ وہاں سے یہ نام ہولے ہولے ادھر بھی پہنچ گیا ۔ تاریخی شواہد ایک اور وجہ بتاتے ہیں جو زیادہ

قرین قیاس ہے۔ پیشتر ازیں بتایا جا چکا ہے کہ ہخامنشی شہنشاہوں نے دریائے سندھ کے قریب کے علاقہ کا نام ہندکو رکھا تھا جو دراصل سنسکرت کے لفظ 'سندھو' سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی دریا ہے۔ اسی لیے 'سندھو' دریائے سندھ کے نام کے طور پر مستعمل تھا۔ 'انڈیا' اور 'ہندو' کے الفاظ بھی 'ہندوکا' سے ماخوذ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہخامنشیوں نے علاقہ کے 'ہندوکا' نام کی مناسبت سے اس کی زبان کا نام بھی ہندکو یا ہندکی رکھ دیا ہوگا یا خود یہاں کے لوگوں نے اپنی زبان کو اس نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ اہلِ یونان بھی ہخامنشیوں کے رکھے ہوئے اسی نام کی بنا پر تمام ہندوستان کو 'انڈیکا' یا 'ہندیکا' کہتے تھے۔ چنانچہ یونانی مؤرخ اور فلسفی آرین نے برِصغیر کے حالات پر مشتمل جو کتاب لکھی ہے اس کا نام 'انڈیکا' یا 'ہندیکا' ہے۔ یہ تاریخی حقائق ہندکو زبان کی وجہ تسمیہ سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ یعنی محض دریائے سندھ (انڈس) کے کنارے کے ساتھ ساتھ بولے جانے کی وجہ سے اس زبان کو ہندکو کہا گیا ہے۔

ہندکو زبان کے مراحلِ ارتقا کا تاریخ اور علم اللسان کی رو سے متعیّن کرنا بھی بہت مشکل نہیں۔ آریا لوگ جب اپنے ریوڑ لے کر شمال مغربی سرحدی دروّں سے اس خطّے میں داخل ہوئے ہیں تو یہ ویران نہیں تھا۔ یہاں ایک قوم آباد تھی جو بڑی مہذب اور متمدّن تھی۔ اس کے شاندار تمدن کے آثار ہڑپہ اور موہن جو داڑو میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ خود 'رگ وید' میں سندھو (دریائے سندھ) کی سدا بہار، زرخیز و شاداب اور حسین وادیوں کا ذکر ہے جن کے باشندوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ خوش پوش ہیں اور سونے سے آراستہ و پیراستہ۔ ان کی زبان کو 'رگ وید' ''اجنبی'' کہتا ہے۔ یہ دراوڑ لوگ تھے اور ان کا براہوئی قبیلہ آج بھی بلوچستان میں آباد ہے اور کسی نہ کسی حد تک اس ''اجنبی'' زبان کو آج بھی استعمال کر رہا ہے۔ اس زبان کو لکھنے کے لیے ان لوگوں نے ایک رسم الخط ایجاد کیا تھا جو خط میخی سے ملتا جلتا ہے۔

آریا لوگ یک لخت آگے نہ بڑھے بلکہ اس متمدن قوم اور دیگر قبائل کی طرف سے انہیں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے ساتھ ایک زبان لائے تھے۔ یہاں کی سابقہ زبان اور اس نئی زبان کا بھی آپس میں تصادم ہوا۔ قدرتی طور پر دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔ خود ویدوں کی زبان اسی طرح وسعت پذیر ہوتی رہی اور جب پانچویں صدی قبل مسیح میں پانینی نے سنسکرت کی گرامر کو معیاری درجہ پر پہنچایا تو یہ علماء اور فضلا کی زبان بن چکی تھی۔ مگر عوام کی زبان مختلف تھی۔ ٹیکسلا اور گندھارا میں اہلِ علم درس و تدریس کے لیے سنسکرت استعمال کرتے تھے۔ مگر کوچہ و بازار میں عوام وہ زبان استعمال کرتے تھے جس کی اساس تو یہاں کی قدیمی زبان (دراوڑی، منڈا وغیرہ) تھی مگر اس میں نو وارد

کی زبان کے الفاظ بھی شامل ہو چکے تھے -

سنسکرت اور عوامی زبان کے درمیان یہی بُعد تھا جو مہاتما بدھ (۵۶۳ تا ۴۸۳ ق - م) نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا - انہوں نے دیکھا کہ ہندو مت عملی زندگی میں اس لیے کسی قسم کی اصلاح کرنے سے عاجز آ گیا ہے کہ سنسکرت جیسی عالمانہ زبان کے ذریعے عوام تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی - صاف ظاہر ہے اس وقت سنسکرت لوگوں کی مادری زبان نہیں تھی - اس لیے مہاتما بدھ نے ویدوں کی زبان کی بڑی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی اور کہا کہ ان کے خیالات کی اشاعت عوام کی اپنی زبان میں کی جائے - اس لیے بدھ مت کے مبلّغین نے ہر جگہ دیسی زبان کو ذریعہ تبلیغ بنایا - آج لنکا وغیرہ ممالک میں بدھ کی تعلیمات پالی زبان میں ملتی ہیں - لیکن پالی کوئی ایسی زبان نہیں تھی جسے مہاتما بدھ مگدھ سے لے کر نکلے تھے، بلکہ ہر جگہ دیسی زبانوں میں تبلیغ کرتے کرتے یہ زبان پیدا ہو گئی - چنانچہ اہلِ تحقیق اس کی ولادت گاہ کے متعلق بحث کرتے ہوئے ٹیکسلا اور اجین دو مقامات کا نام لیتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ پالی زبان کی تخلیق میں اس زبان کا بھی دخل ہے جو ٹیکسلا اور گندھارا کے عوام استعمال کیا کرتے تھے - ذیل میں پالی، سنسکرت اور اُردو کے چند مترادفات دیے جاتے ہیں - ان کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ پالی کے الفاظ ہند کو، ملتانی یا پنجابی کے انہی معنوں والے الفاظ کے کس قدر قریب ہیں :

پالی	سنسکرت	اُردو
اوٹھا	اوسٹھا	ہونٹ
ستا	سپتا	سات
اگی	اگنی	آگ
نکھا	نکسنا	نىز
پیوتی	پیوا	وہ پیتا ہے

علاوہ بریں پالی زبان میں 'ادھا' 'یہاں' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - اب ہند کو سمیت لہندا زبان کی مختلف بولیوں میں ''یہاں'' کے جتنے مترادف الفاظ ہیں - وہ 'ادھا' کے بڑے قریب ہیں - پالی کے ان سب الفاظ کو زیر نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہند کو کے مترادف الفاظ کو ان سے بڑی مماثلت حاصل ہے - یہ سب کچھ بدھ مبلّغین کے اس اہتمام کا نتیجہ ہے کہ تبلیغ عوام کی اپنی زبان میں ہونی چاہیے - ظاہر ہے بدھ مت کے فروغ کی وجہ سے اس خطّہ میں مقامی اور عوامی زبان کو اور بھی زیادہ قوت حاصل ہو گئی -

مہاراجہ اشوک نے اس خطّے میں جو کتبے چھوڑے ہیں وہ بھی مقامی بولی میں ہیں - اس ضمن میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے - شہباز گڑھی میں مہاراجہ اشوک کے

جو چودہ کتبے ہیں وہ خروشتی رسم الخط میں ہیں لیکن ٹیکسلا کے شہر سرکپ میں ایک کتبہ ملا ہے جو آرمائی رسم الخط میں ہے۔ اس کو دیکھ کر دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ہخامنشی شہنشاہوں کی بدولت یہاں آرمائی رسم الخط پہنچا تھا، لیکن یہاں کے لوگوں نے ترمیم کر کے اسے اپنی ضروریات کے مطابق ایک اور صورت میں ڈھال لیا اور اس کا نام ٹیکسلا کے ضلع خروشتی کے نام کے مطابق رکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہاراجہ اشوک کے کتبے، زبان اور رسم الخط کے اعتبار سے کلیتہً مقامی حالات کی متابعت میں کندہ ہوئے ہیں۔ یہ عوامی زبان کی زبردست فتح تھی۔ مہاراجہ اشوک کی موت سے بتیس سال بعد باختر کے یونانیوں کی جب حکومت قائم ہوئی تو ان کے سکوں کا رسم الخط جہاں خروشتی تھا وہاں ان کی زبان بھی عوامی تھی۔ گپتا عہد میں ہندو مت کا احیاء ہوا اور سنسکرت کو پھر وہی سابقہ اقتدار حاصل ہوگیا، لیکن عوامی زبانوں یعنی پراکرتوں کی جڑیں اب اس قدر مضبوط ہو چکی تھیں کہ سنسکرت عوام کی زبان نہ بن سکی۔

بنا بریں یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں تک پراکرتوں کا تعلق ہے گپتا حکمرانوں کا اقتدار ایک ریلا تھا جو اوپر سے گزرتا ہوا ختم ہوگیا۔ عوامی زبانوں میں اختلاف بھی تاریخی عوامل اور جغرافیائی حالات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سکندر اعظم کے ورودِ ہند کے زمانہ کو لے لیجیے۔ سوات اور کنار کی طرف اساسینی اور اسپاسی قبائل آباد تھے۔ یہ دریائے سندھ سے پار کا علاقہ تھا اور بلند پہاڑوں کی وجہ سے دشوار گذار تھا۔ سکندر نے وہاں کئی مہینے گذارے تھے۔ ادھر دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیان یعنی دوآبہ سندھ ساگر کے شمالی حصے میں راجہ امبھی کی حکومت تھی اور دوآبہ رچنا میں راجہ پورس حکمران تھا۔ باری دوآب میں سبّی اور ملّی قبائل آباد تھے۔ پہاڑ اور دریا ان علاقوں کی اس طرح حد بندی کر رہے تھے کہ بالخصوص اس زمانے میں قبائل کا ایک دوسرے سے اختلاط آسان نہیں تھا۔ اس طرح ہر قبیلے کی زبان ایک جگہ محدود رہنے کی بنا پر یا ہر جگہ تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج موجود ہونے کی وجہ سے مختلف صورت اختیار کر رہی تھی۔ ٹیکسلا اگر ہندو تہذیب کا عظیم مرکز تھا تو ملّی قبیلہ مادی ترقی اور فوجی طاقت کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ اسی طرح سوات میں دشوار گذار پہاڑوں میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اساسینی اور اسپاسی قبائل باقی تمام علاقوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر ہر جگہ مقامی زبانوں کو فروغ پانے کا موقع ملا۔

سبکتگین (م — ۹۹۷ء) اور محمود غزنوی (م — ۱۰۳۰ء) کے اس طرف حملہ آور ہونے

کے موقع پر پشاور اور اس کے قرب و جوار میں بولی جانے والی زبان یا بولیوں کے متعلق کچھ کہنا مشکل نہیں۔ آلِ غزنہ نے لاہور کو اپنا دوسرا مستقرِ دولت بنایا ہے تو مثال کے طور پر ہمیں شیخ اسماعیل لاہوری (م — ۱۰۵۶ء) جو غزنی کی طرف سے آئے تھے، مقامی آبادی کو اس کی اپنی زبان میں تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ زبان پشتو یا فارسی نہیں تھی - یہ اس زمانے کی پنجابی زبان تھی جس میں مسعود سعد سلمان (م — ۱۱۲۱ء) نے ایک دیوان اشعار بھی چھوڑا جو اب نایاب ہے۔ کوہ سلیمان سے اس طرف کے آنے والے یہ زبان اس لیے جانتے تھے کہ قدیم الایام سے ادھر کے لوگ موسم سرما گذارنے کے لیے بڑی تعداد میں اس طرف آتے رہے ہیں۔ لاہور میں مسلمان علماء و فضلا، اُمراء اور اہلِ حرفہ، عمّال حکومت اور عساکر کا ہجوم ہو رہا تھا۔ اس لیے یہاں کی پنجابی زبان میں سری سے عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہونے لگ گئے۔ لاہور اور ملتان میں فرق یہ تھا کہ لاہور وسطِ ہند کے زیادہ قریب تھا اور ملتان سندھ کے نزدیک تھا۔ اہلِ تحقیق بتاتے ہیں کہ سندھ میں شروع ہی سے دردستان کی زبانوں کا اثر رہا ہے، اس لیے لاہور اور ملتان کی زبان میں کچھ فرق پیدا ہوگیا۔ لہندا کی اساس میں بھی دردی زبانوں کا زیادہ دخل ہے۔ گریئرسن ہندکو بولی کو بھی لہندا کی ایک شاخ قرار دیتا ہے۔ ایک تو تمام آنے والے مسلمان پشتو بولنے والے قبائل میں سے گزر کر آتے تھے۔ دوسرے خود پختون قبائل کے افراد بھی کافی تعداد میں ادھر آنے لگ گئے۔ لہٰذا پشتو کے الفاظ بھی تمام مقامی بولیوں میں شامل ہوگئے اور جس علاقہ میں ہندکو بولی جاتی ہے وہاں ساتھ ساتھ پختون قبائل بھی تھے اس لیے پشتو کا اثر خاصہ تھا۔ اسی طرح ہندکو کے علاوہ لہندا زبان کی باقی شاخوں نے بھی عربی، فارسی اور پشتو کے اثرات کم و بیش قبول کیے۔ پالی، سنسکرت اور یونانی زبانوں کے اثرات پہلے سے موجود تھے اور دراوڑی زبانیں یہاں کی تمام بولیوں کی اساس تھیں۔ سندھ اور پنجاب میں مسلمانوں کی آمد کے باعث پانچ سو سال تک مقامی بولیاں عربی اور فارسی کے جدید ذخیرۂ الفاظ کی وجہ سے تغیر پذیر ہوتی رہیں اور جب یہ متعیّن صورت اختیار کر چکی تھیں تو سلطان قطب الدین (م — ۱۲۱۰ء) کے عہد میں مسلمان آگے بڑھے ہیں۔ آگے بڑھتے ہوئے پہلے اُن سے ہریانوی زبان اثر پذیر ہوئی اور بعد میں کھڑی بولی۔

برِ صغیر کے شمال مغربی حصّے میں بولی جانے والی زبان پساچی کا بھی گریئرسن ذکر کرتا ہے۔ اسے پالی زبان کی شاخ کہا جاتا ہے۔ اس میں دردستان کی زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ زیادہ تر اس طرف کے گوجر لوگ اس کو استعمال میں لاتے ہیں۔

پساچی اور ہندکو میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہے:

پساچی: ای دو تریہ چار پانچھ شے سانہ آشت ناوہ دایہ

ہندکو: اک دو ترے چار پنج چھے ست اٹھ نو دس

بلکہ کوہاٹ اور بنّوں کے ہندکو لہجے میں بھی تین کو تریہ، پانچ کو پانچھ، سات کو ساتہ، نو کو ناوہ اور دس کو دایہ اب تک بولتے ہیں۔ اس مماثلت سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندکو اور پساچی کی اصل ایک ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ گندھارا، ٹیکسلا اور دریائے سندھ سے پار کوہاٹ، بنّوں وغیرہ کی تاریخ ایک ہی رہی ہے اور ایک ہی قسم کی اقوام یہاں آتی رہی ہیں اور آ کر آباد ہوئی ہیں۔ اُن کا مذہب اور تمدن بھی ایک ہی رہا ہے۔ اگر ایک جگہ کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ باقی مقامات کی طرف بھی سرایت کر گئی ہے۔

بعض اختلافات کے باوجود ہندکو اور پنجابی میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے اور یہ مماثلت آگے بڑھ کر بھارتی پنجاب کی زبان میں بھی موجود ہے۔ ہم پہلے آج کل کی ہندکو شاعری کا نمونہ پیش کرتے ہیں:

دل دی گلاّں دلچ پا کے چپ چیپتی رہیاں
میں گنگی کج بول نہ سکی وس برائے پئیاں
شرم حیا دی نانڑ کے چادر جپ چپ دلچ رووان
جاگاں نال خیالاں تیرے یاد دہری نال سواں
آ دونو رل مل کے کج ناں سوچ لئیے ندبیراں
ظلم دی اکھچ اکھیاں پا کے توڑ دئیے زنجیراں

(سیّد فارغ بخاری، فروری ۱۹۶۵ء)

اب پنجابی شاعری کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

کلیاں دا دل چیر کے نکلی کلیاں دی خوشبو
سورج دے وچ دھپ نہ رہندی چن دے اندر لو
کبتے تے کی پچھوتا ناں کیتے تے نہ رو

* * * *

میں پاپی آں میری جھولی ہن کسے دا پا
پیار دی راہ وچ پتھر ہویا کاہنوں اکھاں لا
نمّی وا دیئے جاندیئے لہرے میرے ول وی آ

(احمد ظفر ۱۹۶۴ء)

مندرجۂ ذیل اقتباس آج کل کی بھارتی پنجاب کی ایک مشہور شاعرہ امرتا پریتم کی پنجابی نظم ''اقراراں والی رات'' سے لیا گیا ہے :

ایہہ دھرتی میں آپے گوڈی
ایہہ کنکاں میں آپے چھنڈیا
ایہہ ''روٹی'' اج میری ہوئی
میرا ہو گیا ''پہات''
میری اقراراں والی رات

۱۹۴۷ء تک برِصغیر کی تقسیم نہیں ہوئی تھی اور پشاور سے لے کر جالندھر اور انبالہ تک عوام جو زبان بولتے تھے وہ مقامی اختلافات کے باوجود ایک تھی۔ زبان کی یہ وحدت اور یکسانیت مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہے۔ مقامی ادب میں ان تینوں شعراء (فارغ بخاری، احمد ظفر، امرتا پریتم) کی حیثیت مسلّمہ ہے۔ اس لیے ان کا کلام اپنے اپنے علاقوں کی زبان کی ہر طرح نمائندگی کر رہا ہے۔ تینوں اقتباسات میں عربی، فارسی اور برِصغیر کی اپنی زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ فقروں کی بناوٹ ایک جیسی ہے۔ افعال میں یکسانیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں قدیم الایام سے لسانی، مذہبی، تمدنی اور معاشرتی اثرات ایک جیسے رہے ہیں۔ علاوہ بریں تینوں اقتباسات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اُردو زبان کے بھی بہت سے الفاظ موجود ہیں۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مغربی پاکستان نے اُردو زبان کے نشو و ارتقاء میں اہم کردار انجام دیا ہے اور یہ کہ اُردو پنجاب اور مغربی پاکستان کے دیگر علاقوں کی اپنی زبان ہے۔

ہم اس لسانی مطالعہ کو اس بات پر ختم کرتے ہیں کہ ہندکو بولی لہندا کی دیگر شاخوں مثلاً ہندکی (ضلع ہزارہ کی زبان) اوان کاری (ڈیرہ اسمعیل خان کی زبان) ملتانی وغیرہ سے بڑی ملتی جلتی ہے۔ گریئرسن نے اس مماثلت کے متعلق بڑی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ صرف مقامی لب و لہجہ کی وجہ سے زیادہ تر اصوات میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ مثلاً معیاری شاہ پوری لہندا میں الفاظ کے اختتام پر 'ہ' کی آواز ہوتی ہے جو ہندکو میں بکثرت نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ شاہ پوری، ڈھڈھ، ڈھڈ (پیٹ) بن جاتا ہے اور 'کجھ' کج۔ اسی طرح 'د' کی آواز ڈیرہ اسمعیل خان میں 'ڈ' کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور سدن (بلانا) کی بجائے سڈن کہا جاتا ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کا تلفظ بھی بگڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اہل پشاور

لائق کو، لیکھہ، کہہ کر پکاریں گے۔ اعداد اور افعال بھی مقامی لب و لہجہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر لہندا کی شاخوں اور ہندکو میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے علاوہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہی زبان ہے جو پشاور، ہزارہ، کوہاٹ، بنّوں کے زیادہ تر شہری لوگ استعمال کرتے ہیں اور اس کے اثرات ڈیرہ اسمعیل خان تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ یہ برابر نشو و نما پا رہی ہے، کیونکہ یہ عوامی زبان ہے اور زندگی میں ہر طرح اور ہر وقت عوام کا ساتھ دیتی ہے۔

ہندکو ادب

(فصل سوم)

ہندکو ادب بہت قدیم ہے اس کے مقابلہ میں اس کے ادب کی تاریخ اتنی قدیم نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجیے کہ ہندکو کے قدیم ادب کا ابھی تک پوری طرح سراغ نہیں مل سکا۔ بہت سی مقامی بولیوں کی طرح ہندکو کا المیہ بھی یہی ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اس کا ادبی سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ ہندکو شہری آبادی کی زبان ہے اور شہری آبادی انقلابات و حوادثات سے زیادہ متاثر ہوتی رہی۔ پھر انگریزی سامراج کے خلاف برِّصغیر میں پورے ڈیڑھ سو برس تک جو جنگِ آزادی لڑی گئی، اس کے لیے پشاور اور یہاں کے دوسرے شہر اس تحریک کے بہت بڑے مراکز تھے۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد کا آغاز یہیں سے کیا۔ خلافت تحریک، سرخ پوش تحریک، خاکسار تحریک، احرار، کانگرس، مسلم لیگ اور بھارت سبھا کی سرگرمیوں کا پشاور سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہاں آئے دن گرفتاریاں، خانہ تلاشیاں اور پکڑ دھکڑ نے ہر گھر کا نظام درہم برہم کر رکھا تھا۔ غالباً ان وجوہات سے قیمتی مسودات اور دستاویزات یا تو لوگوں نے خود ہی ضائع کر دیے یا ایسے اندھے کنوؤں میں ڈال دیے جہاں وہ گل سڑ کر ختم ہو گئے۔

اُردو شاعری کی نشاندہی یہاں سترھویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہوتی ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ہندکو اُردو کی ابتدائی شکل ہے اور اُردو سے بہت پہلے یہ زبان یہاں رائج تھی۔ اس لیے اس کا ادب بھی بہت قدیم ہونا چاہیے اور ہے، لیکن اس قدیم ادب کے نمونے جو اب تک دستیاب ہو سکے ہیں، وہ لوک گیتوں، لوک کہانیوں، کھیلوں کے منظوم بولوں اور ضرب الامثال و محاورات کی صورت میں ہیں، جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں۔ ہندکو کی قدیم دریافت شدہ نظم کا مصنف غلام محمد مائیو ہے۔ یہ نظم میرزا عبدالغنی

کی بیاض 'گلستہ' سے دستیاب ہوئی ہے۔ میرزا کی روایت کے مطابق محمد دین مائیو ۱۷۰۰/۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ ہوا ہے ۔ اس طرح ہندکو کی دریافت شدہ شاعری کی عمر تقریباً دوسو سال بنتی ہے۔ اس بیاض کے باقی شعراء میں سے دو تین شاعر بارھویں صدی ہجری یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے ربع آخر کے ہیں اور دوسرے تیرھویں صدی ہجری یعنی انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں گزرے ہیں۔ یہ کل سترہ شعراء کا تذکرہ ہے، جس میں خود میرزا بھی شامل ہے۔ دو دو تین تین سطروں میں ان کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام بھی دیا گیا ہے۔ مائیو کو میرزا نے نہیں دیکھا۔ اس کے بیٹے سے اس کی ملاقات ایک ہنگامی تقریب میں ہوئی، جس نے اسے بتایا کہ اس کا باپ اس کے بچپن ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ وہ ہندکو اور فارسی کا بہت بڑا شاعر تھا اور صاحبِ دیوان تھا۔ اس نے اپنے والد کا کچھ ہندکو کلام سنایا جو میرزا کے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ اس نے میرزا کو یہ بھی بتایا کہ اس کا دیوان موجود ہے جس میں ہندکو کلام زیادہ ہے اور یہ کہ اس نے ہندکو شعراء کا ایک تذکرہ بھی لکھا جس کا نام 'چن تارے' ہے۔ یہ تذکرہ بھی اس کے بیٹے کے پاس محفوظ تھا اور اس نے میرزا کو دکھانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس تذکرے میں پرانے ہندکو شعراء کا بلند پایہ کلام درج تھا۔ مائیو کا بیٹا بڑا افسر تھا جو ان دنوں نوشہرہ میں متعین تھا۔ میرزا نے یہ مسودے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کا پتہ بھی نوٹ کر لیا۔ لیکن وہ اچانک بیمار ہوگیا اور چھ سات ماہ بعد جب نوشہرہ گیا تو مائیو کے بیٹا کی تبدیلی دہلی ہو گئی تھی۔ اس لیے پھر ملاقات نہ ہو سکی اور میرزا ان نوادرات کے دیکھنے سے محروم رہا۔

میرزا نے اپنے دادا سکندر خان کے حوالے سے دو قدیم ہندکو کی منظوم کتابوں 'دین دے چراغ' اور 'کالی کملی والا سائیں' کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے یہ کتابیں 'چن تارے' سے زیادہ پرانی ہیں، لیکن ان کے مصنفین کے نام نہیں بتائے اور نہ ہی سنِ تصنیف کا تعیّن کیا ہے، صرف اتنا لکھا ہے کہ 'دین دے چراغ' اولیائے کرام کا تذکرہ ہے اور 'کالی کملی والا سائیں' نبی کریمؐ کی سیرتِ مطہرہ پر مشتمل ہے۔ ہندکو ادب کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ کتابیں بڑی کارآمد تھیں، لیکن افسوس کہ اب یہ عنقا ہیں اور کسی دوسرے ذریعہ سے بھی ان کی نشاندہی نہیں ہوتی۔

ہندکو نثر کا سب سے پہلا نمونہ میرزا عبدالغنی کی بیاض 'گلستہ' میں ملتا ہے۔ یہ وہی میرزا ہے جس کی نظم و نثر کے نمونے گریئرسن نے لینگوسٹک سروے آف انڈیا میں دیے ہیں۔ وہ نہ صرف ہندکو نثر کا بانی مبانی ہے بلکہ ہندکو افسانے کا خالق

بھی ہے۔ لیکن میرزا کے بعد دورِ جدید تک ہندکو نثر کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ البتّہ منظوم کھیلوں اور منظوم لوک کہانیوں میں بین السطور نثر کے کچھ ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ جن کے مصنفین اور سنِ تخلیق کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خاصی پرانی چیزیں ہیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی ہیں۔ کیونکہ تحقیق کرنے پر تین چار نسلوں تک ان کی نشاندہی ہوتی ہے، جو کم از کم ڈیڑھ سو سال کا عرصہ احاطہ کیے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درمیانی عرصہ نثر کے اعتبار سے بھی رائیگاں نہیں گزرا اور اس میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ اس طرح ہندکو نثر کی عمر بھی اس کی نظم کے لگ بھگ جا پہنچتی ہے، بلکہ ان کھیلوں اور لوک کہانیوں کا اگر تجزیہ کیا جائے اور لوک گیتوں کا بھی خاطر خواہ جائزہ لیا جائے تو ہندکو نظم و نثر کی تاریخ کی قدامت مسلّم نظر آتی ہے۔ بلاشبہ یہی اس کا قدیم ادب ہے۔ جس پر صدیوں پہلے کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور اگرچہ ان کے مصنفین کا پتہ نہیں چلتا لیکن ان کی قدامت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ادب کے جملہ اجزاء و عناصر ملتے ہیں اور اپنے قدیم معاشرے کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں اور بعض تاریخی حقائق بھی اس کی قدامت کی گواہی دیتے ہیں۔

ضرب الامثال، محاورے، لوک گیت، لوک کہانیاں اور کھیل،

ضرب الامثال اور محاورے

اس روشن دور میں تاریخ کا علم سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ انسانی تہذیبیں بنتی بگڑتی رہی ہیں۔ اگر دستاویزی ثبوت پر ہی انحصار رہتا تو شاید زیادہ دور رس نتائج سامنے نہ ہوتے۔ اس دھرتی پر انسان کا وجود لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے۔ لیکن لکھنے پڑھنے کا شعور بہت بعد میں پیدا ہوا۔ اس سے پہلے کا طویل زمانہ ایک ایسی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، لیکن اس صورتِ حال سے ماہرین و محققین مایوس نہیں ہوئے بلکہ گمشدہ انسانی تاریخ کے تاریک راستوں کو منوّر کرنے کے لیے کوششیں جاری رکھیں اور آثار قدیمہ، صنادید اور قیاسات و قرائن کی مشعلیں جلا کر ہزارہا سال کی انسانی تاریخ کا سراغ لگایا اور ایک ایسا شعور پیدا کیا، جس کی بدولت آج ہم زبان و ادب کی تاریخ کے ظلمات کو بھی سر کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ زبان و ادب کی تاریخ کا کھوج لگانے کے لیے تحریری دستاویزات سے آگے صرف عوامی ادب کا صحرا رہ جاتا ہے، جہاں تجسّس و تفکّر سے شواہد و حقائق کے ایسے آبدار موتی دستیاب ہو سکتے ہیں جن کی

روشنی میں تاریخ کی گہری اور تاریک کھائیوں کو عبور کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

عوامی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو کسی فردِ واحد کی کاوش اور محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ عوام الناس کے سالہا سال کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے اور جس کے پیچھے حقائق و عوامل کی پوری تاریخ ہوتی ہے، بلکہ پورا معاشرہ اور پوری تہذیب ہوتی ہے اور یہ بات عوامی ادب میں اشاروں یا کنایوں کی صورت میں کچھ ایسی رچی بسی ہوتی ہے کہ فکر و نظر کی معجزانہ صلاحیتوں کے بغیر اس کا ابلاغ ممکن نہیں۔

ضرب الامثال اور محاورات بھی عوامی ادب کا ایک ایسا سرمایہ ہے جو ذہین فطین عوام کے فکری اعجاز سے تخلیق پذیر ہوتے ہیں۔ ہندکو ضرب الامثال اور محاورات میں نہ صرف اس خطے کے باشندوں کا کردار جھلکتا ہے، بلکہ ان میں قدیم ہندکیوں کی طرزِ زندگی اور ان کی ثقافت پر بھی روشنی پڑتی ہے، مثلاً:

دلچ ہووی سچ تا ننگا ہو کے نچ

یہ ضرب المثل ایک صاف گو اور بیباک قوم کے کردار کو واضح کرتی ہے۔

ظلم دی گڈی سدا نئی اُڈی

اس میں ظلم و استبداد کی فضا میں مایوس ہونے کے بجائے خود اعتادی اور رجائیت کا اظہار ہے۔

نفس ہووے سہان تے پپل تلے گیان

رنگ رنگ دی بولی تے گلی گلی ہولی

نہ ہنگ تے نہ شنگ تے گئو ماتا دا سنگ

یہ ضرب الامثال اسلام سے پہلے بدھ اور ہندو عہد کی یاد دلاتی ہیں، جبکہ مندرجہ ذیل اسلامی معاشرے کی عکاس ہیں:

جیڑا نبی دا محتاج ادا جنت وچ راج

اللہ اللہ تے خیر صلیٰ

چھوڑا کفر دا گراں تے ہنٹر کے لینڑاں ناں

اس طرح ''کلمہ گو کافر'' ـــــ ''کلمے دی مار'' اور ہک گل مکے تے ہک مدینے'' وغیرہ محاروں سے بھی اسلامی کلچر کی نشاندہی ہوتی ہے اور ہندکو زبان کی قدامت کا بھی کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لوک گیت

لوک گیت ایک خود رو فصل ہے جو عوام کی جذباتی زندگی سے وجود میں آتی ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں لوک گیتوں کا وافر ذخیرہ ملتا ہے۔ یہ گیت صدیوں سے دلوں کے صحراؤں میں خود بخود پھوٹتے اور نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ یہ عوامی خزینہ ہے اور عوام ہی اس کے خالق ہیں، اس لیے ان میں عشق و محبت اور شادی و غمی کے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول اور گرد و پیش کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔

ہندکو میں لوک گیتوں کا گراں بہا سرمایہ محفوظ ہے، جن کی مشہور قسمیں یہ ہیں:

۱- سٹھنی: شادی بیاہ کے موقع پر دولہا کے ساتھ چھلیں کرنے کو سٹھنی کہتے ہیں۔ یہ گیت اس وقت گائے جاتے ہیں جب برات دلہن کے گھر آتی ہے۔ ایک بند ملاحظہ کریں:

ککڑ نہ کھاندوں چوھا کھاندوں — جمع کر کے شادی رچاندوں
اجلا ہو کے شان وکھاندوں — صورت اے تیری فقیراں جئی
بھیڑے تنو اے مناسب نئی

بعض اوقات یہ چھلیں فحش اور عریاں بھی ہوتی ہیں۔

۲- ترنگی: یہ بھی شادی کا گیت ہے۔ اس میں عجیب سی ترنگ محسوس ہوتی ہے:

الا اللہ ہو ——— یارو الا اللہ — ککڑ ہلے، پکھا چھلے، یارو الا اللہ
او گھوڑے ویچ کے ستا — اسدی جتی لے گیا کتا
کج بھی ریا نہ پلے، یارو الا اللہ

۳- مستا: یہ بھی نوجوان لڑکیاں شادی کے موقع پر مستانہ لے میں گاتی ہیں:

ڈیوہ پیا بلے، برسات تلے — سر پیا ہلے، برسات تلے
آؤ سہیلیو تماشا دیکھو — منجے تے جیندا لاشہ دیکھو
مردہ پیا چلے، برسات تلے — ڈیوہ پیا بلے، برسات تلے

۴- ابیتی: آپ بیتی کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔ دوشیزائیں تنہائی میں گنگناتی ہیں:

تارے چھپ چھپ کے سانو اکھیاں پئے مارن
کرناں جھوم جھوم کے ساڈے حسن اتے وارن
یار بول دا نئی — گرہ کھول دا نئی

رانــاں جــاگ کے گــذاراں
آجا ویکھدا جا ـــــ ساڈیاں جاندیاں بہاراں

۵- ٹپہ: گانے کے بول کو ٹپہ کہتے ہیں۔ بڑی مقبول اور محبوب صنف ہے:

چھــٹی دا دن ماہیا
تیرے بنا نہ لا سکدا ، ہور کوئی میرے جن ماہیا

چن چڑھ کے لے گئے نی
نکی جئی جندڑی نوں وڈے ویدے پے گئے نی

۶- لوری: مائیں بچوں کو سلاتے وقت ماسا کی لے میں گاتی ہیں اور بہادری اور جرأت کا درس دیتی ہیں:

آ للو، آ للو، آ للی للی للو، آ للو
میرے بچڑے دے سر تے پاک نبی دا سایہ ـــ آ للو
اے وڈا ہو کے غزا تے جاسی
اسلام دے اتوں جان لٹاسی
دشمنڑ نل لڑ کے شہادت پاسی ـــ آ للو
آ للو ـــ للو للو

یہ ہندکو کے مخصوص لوک گیت ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی انہیں ہمہ گیری حاصل ہے۔ کوئی ایسا مضمون نہیں جو ان کی عملداری سے باہر ہو۔ زبان و بیان سے بھی ان کی قدامت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور بعض تاریخی اور ارتقائی اشاروں سے بھی کسی حد تک ان کے عہد کا تعیّن کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان لوک گیتوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لکھے گئے اور کس نے لکھے، تاہم ان کی قدامت مسلّم ہے۔

لوک ناچ

قدیم مقامی لوک ناچوں میں پرکو، نرنگی اور منگڑی اب تک رائج ہیں۔ یہ شادی بیاہ اور موسمی تہواروں سے متعلق ہیں۔ ان میں ہندو دیو مالائی اثرات بھی ملتے ہیں اور پشتو کے مخصوص لوک ناچوں کی چھاپ بھی ہے۔ یہ ناچ ڈھول یا طبلے کی تھاپ پر اور اکثر و بیشتر گھڑے کی تھاپ پر گھریلو ماحول میں بعض گیتوں کے مخصوص بولوں پر کیف و مستی کے عالم میں پیش کیے جاتے ہیں۔

پرکو میں رزمیہ رنگ ملتے ہیں اور وجد آور کیفیت پائی جاتی ہے ۔
ترنگی بڑا گرم ناچ ہے اور ترنگ سے بھر پور ہے ۔
منگڑی اس کے بر عکس ایک نہایت سبک اور خنک قسم کا رقص ہے جس میں عشق و محبت کی خوشبو رچی بسی محسوس ہوتی ہے اور ایک قسم کے تقدس کا احساس ہوتا ہے ۔

ان کے علاوہ دو ناچ **شنی** اور **شاہ ڈولہ** بھی ہیں ۔ شنی خوشی کی تقریبوں میں ناچا جاتا ہے اور اس میں صرف عورتیں حصہ لیتی ہیں ۔ شاہ ڈولہ مردوں کے لیے مخصوص ہے ۔ یہ ایک مقبول دھن ہے جو ڈھول یا نقارے پر بجتی ہے ۔

لوک کہانیاں

ہر زبان کی لوک کہانیاں عموماً رومانوی ہوتی ہیں ، لیکن ہندکو کی لوک کہانیاں زیادہ تر منظوم ہیں اور ایک آدھ نثر میں بھی ہے ۔ ان میں اصلاحی رنگ غالب ہے اور رومانوی رجحان نسبتاً کم ہے ۔ جہاں رومان آیا ہے وہاں بھی محض حقیقت کو شیریں بنانے کے لیے ہے ، لیکن کہیں ابتذال کا شائبہ تک نہیں ۔ عموماً ان کہانیوں میں غیرت و حمیت اور جرأت و ہمت کا بیان ہے یا پھر ظلم و استبداد کے خلاف جد و جہد کا درس ہے ۔ ہم ایک منظوم کہانی نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں :

پپل تے فقیر

جیٹھ ہاڑ دی تھپ جیویں دوزخ دی اگ وسے
چڑیاں کاں اڈنا بھل گئے سڑ بھج کے نسے
ہک فقیر جنگل اچ جاندا ، تا کھا کے ٹھٹا
پپل نے باواں پھیلا کے اس تے سایا سٹا
پپل نوں وال اپڑا دتا فقیر نے ہو کے شاد
اوکھے وخت وال مروڑ کے منو کریں یاد
مولا نوں منظور ہویا تا تیرا روگ مٹاساں
جان بھی آپڑی دے کے اے احسان میں تیرا لاساں
اللہ دے کم کج مدے نوں قحط کج ایسا پیا
اس جنگل دی راہ وچ کوئی پھل بوٹا نہ رہیا

طوفان نے آ کے اتھے پیڑ پیڑ نوں چھانٹا
قحط دے ہتھوں او پپل بھی سک کے ہویا کانٹا
پپل نو اس دکھ دے ویلے یاد آیا فقیر
وال مڑور کے آس لگائے سوچاں وچ دلگیر
اتنے وچ کے ویکھدا وے حاضر ہویا او بابا
پپل ویکھ کے شور مچایا کر کہہ شابا شابا
بابا اسے پپل تلے سر بسجدہ ہویا
اللہ دی جناب دے وچ بلک بلک کے رویا
مولا تنو شرم اے میری پردا رکھیں میرا
اے پپل اے محسن میرا انو کر دے ہرا
ہک دم ایسا معجزہ ہویا اتھو چشمہ پھٹا
چشمے دا او سارا پانڑی ادیاں جڑانج جھٹا
رب پیارے نے لاج فقیر بابا دی رکھ لئی گویا
ویکھدیاں ویکھدیاں سارا پپل پھر او ہرا ہویا

کھیل

ہندکو زبان میں بچوں کے کھیلوں کا خاصا سرمایہ موجود ہے جو تمام و کمال منظوم ہے۔ ان میں بھی ایک خاص بات یہ ہے کہ اکثر کھیل سبق آموز اور تدریسی صورت میں ہیں۔ یہ کھیل فارسی اوزان کے بجائے خالص ملی اوزان میں ہیں۔ بعض میں آزاد شاعری کے نمونے بھی ملتے ہیں اور خصوصی طور پر صوتی اثرات اور غنائیت پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے جو ایسے رواں دواں اور مترنم ہیں کہ بچوں کو فوراً ازبر ہو جاتے ہیں۔ یہ کھیل بے شمار ہیں اور ان میں نئے نئے ہیئتی تجربے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

مثلاً ایک کھیل بچے یوں کھیلتے ہیں کہ دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اور انگوٹھے پھیلا کر مندرجۂ ذیل بول پڑھتے جاتے ہیں اور منہ، رخساروں، ٹھوڑی اور پھر گھٹنوں پر یہ پھیلی ہوئی انگلیاں مارتے جاتے ہیں۔ اس میں ہار جیت نہیں۔ بچوں کا مرغوب کھیل ہے۔ اس میں زیادہ تر صوتی اثرات ملتے ہیں:

بلم بم بکا   بلم بم بکا
چڑی اے ممولا اے   کس نے بوا کھولا اے

گڈی گڈے دا ڈولا اے — گل کرتا نہ چولا اے
کم کم ککا — بلم بم بکا
بیوی دے گھر وسنی آں — روئی آں آئی ہسی آں
منی آں آئی رسی آں — او تتر تے میں مسی آں
چلم چم چکا — بلم بم بکا
میں نہدی کاندی کڑی آں — کڑی سونے دی پڑی آں
میں کھیڈدی کھیڈدی مڑی آں — میں مڑدے مڑدے ٹری آں
ملم مم مکا — بلم بم بکا

بلم بم بکا

ان منظوم لوک کہانیوں ، لوک گیتوں ، لوک ناچوں اور کھیلوں کو ہندکو شاعری کی اساس قرار دیا جائے تو ہندکو ادب کی تاریخ کی وسعت اور قدامت کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو جاتا ہے ، کیونکہ ان میں ہندکو شاعری کے بعض ایسے نادر نمونے ہیں جو ہندی اور پشتو کی قدیم شاعری کی یاد دلاتے ہیں اور فنی اعتبار سے بھی یہ تخلیقات کسی طرح کم پایہ نہیں ہیں -

ہندکو نظم کا ارتقاء

دنیا کی ہر زبان کی ابتدا نظم سے ہوئی ہے - ہندکو لوک گیتوں کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ہندکو زبان کی تاریخ - پھر ہندکو کی منظوم کہانیاں اور منظوم کھیل بھی ہندکو نظم کی تاریخی قدامت کے لیے سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں - اگرچہ حتمی طور پر ان کے لیے کسی عہد کا تعیّن کرنا ممکن نہیں ، تاہم انہیں یکسر نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے - اگر اُردو کے متعلق امیر خسرو کی پہیلیوں اور انمیل بے جوڑ قسم کی ُتک بندیوں کو کوئی مقام حاصل ہوسکتا ہے تو ہندکو لوک گیتوں اور منظوم کھیلوں کو ، جو ان کہانیوں اور پہیلیوں سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہم تک پہنچے ہیں یقیناً خاصی اہمیت حاصل ہونی چاہیے اور انہیں ہندکو نظم کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے - یہ صدیوں پرانی عوامی تخلیقات ہیں اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ان کی قدامت زبان و بیان اور بعض دوسرے شواہد و قیاسات سے ثابت ہوتی ہے -

جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے ہندکو کی باقاعدہ قدیم شاعری کا سراغ ہمیں میرزا عبدالغنی کی دریافت شدہ بیاض 'گلدستہ' سے ہی ملتا ہے ۔ اس بیاض میں کل سترہ شعراء کا تذکرہ درج ہے ، جن میں میرزا کے اپنے حالات اور کلام بھی شامل ہے ۔ باقی شعراء کا ذکر نہایت مختصر ہے ۔ میرزا خود بھی اچھا شاعر تھا اور بقول اس کے ہندکو کے علاوہ اُردو و فارسی میں بھی ٹوٹے پھوٹے شعر کہہ لیتا تھا ۔ یہ وہی میرزا عبدالغنی ہے جس کے کلام کا نمونہ گریئرسن نے اپنی مشہور کتاب لینگوسٹک سروے آف انڈیا میں بھی دیا ہے ۔ یہ ایک چار بیتہ نما نظم پر مشتمل ہے ۔

اس بیاض کے صفحات میں جن شعراء کا ذکر شامل ہے ان میں سے غلام محمد مائیو کی نظم سب سے زیادہ پرانی ہے ، جو میرزا کی روایت کے مطابق ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ ہوا ہے ۔ اس طرح ہندکو کی دریافت شدہ شاعری کی عمر تقریباً دو سو سال تک پہنچتی ہے لیکن اس کے بعد تسلسل قائم رہتا ہے اور آخر تک کسی قسم کا خلا نہیں آتا ۔ مائیو کے حالات میں 'گلدستہ' کے مؤلف نے بتایا ہے کہ اس کے بیٹے کے پاس مائیو کی لکھی ہوئی ایک بیاض 'چن تارے' موجود تھی جس میں بہت سے بڑے بڑے ہندکو شعراء کا ذکر شامل تھا لیکن بدقسمتی سے میرزا وہ بیاض دیکھ نہیں سکا ۔ مائیو کی ایک حرفی اور ایک نظم جو 'گلدستہ' میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھا اور میرزا کے مطابق ہندکو ، فارسی اور اُردو میں اس کا دیوان موجود تھا ، لیکن اس کی بیاض 'چن تارے' نایاب ہے ۔ اگر یہ دستیاب ہو جاتی تو شاید بہت سی گم گشتہ کڑیوں کا سراغ مل جاتا ۔

مذہبی و اخلاقی شاعری

ادب کسی زبان کا بھی ہو اپنے سماجی ، معاشرتی ، ثقافتی اور سیاسی حالات کے اثرات ضرور قبول کرتا ہے ۔ ہندکو کے اس اوّلین دور کی شاعری تمام تر نعت و منقبت اور حمد پر مشتمل ہے ۔ جس سے اس عہد کے شعراء کے اسلامی جذبات اور مذہبی شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ زبان سادہ اور سلیس ہے لیکن کہیں کہیں پشتو ، ہندی اور فارسی کے الفاظ کی آمیزش نظر آتی ہے ۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس ابتدائی دور کی ہندکو شاعری کی بنیاد فارسی بحور اور اوزان کے بجائے پشتو اور ہندی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ، پشتو اور ہندی کے مِثلی اوزان[1] پر رکھی گئی ہے اور نظموں کی تکنیک بھی قدیم پشتو شاعری

۱- ان کی بنیاد سیلابلوں (Syllables) پر ہے - یہ لفظ کے رکن ہوتے ہیں ۔

سے ملتی جلتی ہے، بلکہ پشتو کی قدیم مُلی صنف چار بیتہ کے انداز پر اکثر نظمیں ملتی ہیں۔ البتہ حرفی ہندکو کی اپنی مخصوص صنف ہے جس کا پہلا نمونہ حاتم کے ہاں ملتا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہی اس صنفِ سخن کا خالق تھا۔ دوسرا یہ کہ پشتو کی طرح ہندکو شاعری کے اس اولین دور میں اسلامی اور رزمیہ شاعری کے نادر نقوش موجود ہیں اور ان میں اپنے معاشرے کی عکاسی بھی ملتی ہے جس میں غریبوں اور خوانین کی طبقاتی کشمکش بھی ہے۔ ظلم و استبداد کے خلاف ردِّ عمل بھی ہے اور پیاسے کھیتیوں کے لیے بارانِ رحمت کے نزول کی دعائیں بھی ہیں۔

ہندکو شاعری کا تیسرا دور نسبتاً زیادہ جاندار ہے۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہندکو کے تقریباً تمام شعراء، فارسی کے بھی نامور شعراء گذرے ہیں۔ بلکہ بعض تو پشتو میں بھی لکھتے رہے۔ یہ روایت یہاں شروع سے اب تک موجود ہے۔ آج بھی اُردو کے بیشتر مشہور و معروف شاعر اور ادیب ہندکو، فارسی اور پشتو کے بھی بلند پایہ فنکار ہیں۔ حیدر پشاوری، قدیر، قیس، سائیں احمد علی، عبداللہ سیفی شاہ اور جگر کاظمی وغیرہ دوسرے دور کے شعراء میں ممتاز مقام کے مالک ہیں اور ان شعراء کو اُردو اور فارسی شاعری میں بھی اساتذہ کا درجہ حاصل ہے۔ اس دور کے شعراء چار بیتہ اور حرفی سے آگے نہیں بڑھے، لیکن ان اصناف ہی میں انہوں نے مضمون آفرینی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ طباعت و اشاعت کے ذرائع نہ ہونے کے باوجود اُنہوں نے بیرونِ سرحد کے ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اس دور میں خاص طور پر صوفیانہ اور عاشقانہ شاعری نے فروغ پایا۔ عوامی سطح کے عظیم الشان ہندکو مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا جن سے ہندکو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں خاصی مدد ملی۔ عوام میں ہندکو شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور نئے نئے لکھنے والے سامنے آئے، جنہوں نے آگے چل کر ہندکو شعر و ادب کو ترقی اور رفعت سے ہمکنار کیا۔

تیسرے دور یعنی دورِ جدید میں اُردو کی تمام اصناف غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام وغیرہ کو نوجوان شعراء نے اپنا کر ہندکو شاعری کو اور وسعت دے دی ہے۔ ان نئی اصناف کے ساتھ ساتھ نئے نئے موضوعات بھی پیدا ہوئے۔ ترقی پسند شعراء نے ہندکو شاعری کو پہلی دفعہ انقلابی رجحانات سے آشنا کرایا اور ہندکو سے نئے شاعروں نے اپنے مسائل کے علاوہ قومی، ملکی اور عالمی مسائل کو بھی اپنے فن کا موضوع بنایا۔ شاعری میں تفکر، تجسس، بلند پروازی اور نازک خیالی نے راہ پائی اور ہندکو شاعری پٹی ہوئی ڈگر سے ہٹ کر کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو گئی۔ اس نے فرسودہ روایات کی دلدل سے

نکل کر ایک ہی جست میں تمام حدود پھاند لیے اور وہ دوسری ترقی یافتہ ملکی زبانوں کی صف میں نظر آنے لگی۔ اب ہم ہر دور کے شعراء کا مختصراً علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں۔

پہلا دور

۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ – ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ

محمد دین مائیو (م۔ ۱۷۵۶ء)

ان کا ذکر میرزا عبد الغنی کی مذکورہ بالا بیاض میں ملتا ہے۔ مائیو نے تقریباً سو سال عمر پائی۔ آپ اُردو، فارسی اور ہندکو کے شاعر تھے۔ انہوں نے اردو، فارسی اور ہندکو کے شعراء کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ ان کا دیوان اور تذکرہ دونو نابید ہیں۔ پشاور کے رہنے والے تھے۔ میرزا کی بیاض سے ان کی ایک حمد نقل کی جاتی ہے:

تیرے بنای اتھے رب کج — توئی سب کج توئی سب کج
رب جی تیرا ای سارا ظہور اے — ہر اک شئے وچ تیرا ای نور اے
دل تے دل دا جانی آپ ایں — آدم تے در خانی آپ ایں
آپی اگ تے آپی پانڑی — آپی پیٹا آپی تانڑی

سائیں غلام دین ہزاروی (م۔ ۱۷۷۸ء)

آپ صوفی شاعر تھے۔ مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ ایک عرصہ تک ''رش'' کے میدان میں تبلیغِ اسلام کرتے رہے۔ کشمیر، ہزارہ اور پشاور میں ان کے عقیدت مند پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کے چند اوراق محفوظ ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے ڈیڑھ سو سال کے قریب عمر پائی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

سوداگر اس بازار دا — ویکھ واکھ کے بازی ہارادا
کیوں غفلت نال گزاردا — دنیا ہیوے فانی
تو سنڑ لے مرے دل جانی

میں امت نبی سردار دا — خاص اللہ دے یار دا
کیا پھل سچے گلزار دا — شعلہ اے نورانی
تو سنڑ لے مرے دل جانی

استاد نامور (م - ۱۷۵٦ء)

پشاور میں پیدا ہوئے۔ ہندکو، پشتو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کی ایک حرفی ہم تک پہنچی ہے:

جوڑ جوڑ کے سندر خیال آ پڑے — موتی پیغلہ جوانی دی راہ کڈ دے
کوئی لدی نہ جد مثال انسان — بے مثال دلوں ٹھنڈی آہ کڈ دے
نیناں نیر اندر بھریا او جادو — نظر کرو تا جیکر او ساہ کڈ دے
نامور عشق سوں او کم کیتا — جیوں چیرا دے کے روگ جراح کڈ دے

صاحب حق (م - ۱۷۵٦ء)

پشاور کے باشندے تھے۔ استاد نامور ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ طویل عمر پائی۔ ہندکو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کی مندرجہ ذیل حرفی دستیاب ہوئی ہے:

رتاں جاگ جاگ من بھور ہویا — بے نشان را نہ کوئی نشان لبھیا
جان گال دتی موں اس سوچ اندر — پر اس توں نہ کدی داں لبھیا
کے لبھیا اگر اس جگ دے وچ — چن تارے لبھے آسان لبھیا
صاحب حق اس حق نوں لبھدا اے — جدے لبھیا دین ایمان لبھیا

سائیں شادا (م - ۱۷۵٦ء)

چار بیتہ باز گزرے ہیں۔ مردان کے رہنے والے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید کے ساتھ سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالا کوٹ میں شہید ہوئے۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ ان کے ایک مقبول چار بیتہ کا ایک بند ملاحظہ ہو:

خون شد دل من ، خون شد دل من
نیناں تیرے مار مکایا ، پردے اندر تیر لگایا
کے کراں کتھے جاواں، بیٹھے ستیاں اپنو سولی چڑھایا
سخت حیرانم ، خون شد دل من
سچے رہا تیرا ای آسرا اے ، تو ای دکھیا دا مددگار اے
تو ای مددگار ایں دکھیاراں دا، نگہ تیری ہووے تاں بیڑا پار اے
مجنوں شد دل من ، خون شد دل من

سخی نمانڑا (م - ۱۷۵۶ء)

نوسہرہ کلاں کے مشہور چار بیتہ باز تھے - ان کے چار بیتے کا صرف ایک بند ملا ہے :

نـالاشـم تـالا فضل کـر مـولا

فـضـل کـر مـولا سک گئے رحمت دے دریا

سک گئے رحمت دے دریا نیتاں ہو گئیاں خـراب

نیتاں ہو گئیاں خـراب غلـط ہـو گئے حساب

غلـط ہـو گئے حساب کوئی خان کوئی نواب

اللہ دا بندہ کـوئی بھی نینـگا

نظیر احمد روا (م - ۱۸۰۰ء)

استاد صاحب حق کے شاگرد اور مرید تھے - ان کے آباو اجداد ایران سے آ کر پشاور میں آباد ہوئے - بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے ، لیکن بیعت کے بعد درویشی اختیار کر لی - ہندکو کے نرگو اور بدیہہ گو شاعر تھے - اب ان کی صرف چند حرفیاں ملتی ہیں - نمونہ دیکھیے :

لامکاں دی دکان دا جوہری ہـو نبڑ مہماں آ کے رگ جـان بیٹھا

سنگ ہیرے دی اصلی پرکھ کرنے سنگ بیٹھیاں دے کدرے آن بیٹھا

ہر مورکـھ دی کان نشان بیٹھا ہتھ تے رکھ کے نیلم مرجان بیٹھا

روا نیک عملاں دی کسوٹی اتے کھوٹے کھرے دی کرے پہچان بیٹھا

غلام محمد گاموں (م - ۱۸۰۴ء)

پشاور کے مشہور ہندکو شاعر تھے - پشتو میں بھی شعر کہتے تھے - بڑے پہلوان اور جابر انسان تھے - ان کی دو حرفیاں دستیاب ہوئی ہیں - ایک درج کی جاتی ہے :

مرے دل حجر بیچ وس جاویں تا کـوئی خطرہ نـہ رہسی محبوب تینو

مرے جیندے جی کس دی مجال ہووے کرے زور دے نال مغلوب تینو

سارا خٹک قبیلہ بھی آ جاوے کر سکے نـہ کدی مرعـوب تینو

وخت آیا تا گامیوں دی طاقت دا پتہ چـل جاسی پھـر خوب تینو

مرزا عبدالغنی (م - ۱۸۱۰ء)

پشاور کے رہنے والے تھے - اپنی بیاض میں لکھتے ہیں کہ "میں موچیوں کا کام کرتا ہوں - باپ دادا کا بھی یہی کام تھا - لیکن ہم اصل کے لحاظ سے مغل ہیں" - مرزا عبدالغنی کے ایک رشتہ دار فردوس خان ہندکو اور پشتو کے شاعر تھے وہ ان کے دوست بھی تھے اور استاد بھی - فردوس خان جوانی میں فوت ہوئے تو مرزا نے ان کی تاریخ کہی :

شاعر پہنچیے نہ ہندکو دے اس جگہ   جس مقام تے ساڑا فردوس پہنچا
سن بارہ سو چوی ہجری وچ   غنی - استاد فردوس فردوس پہنچا

مرزا عبدالغنی کی بیاض کا ذکر پہلے ہو چکا ہے - آپ نے ہندکو میں کہانیاں بھی لکھی ہیں اور غزلیں اور حرفیاں بھی - ان کی غزلوں کے دو تین اشعار درج کیے جاتے ہیں :

پیسے والے دے جگ وچ ڈھول وجن   غریب ملا اذان چرگہ اذان اے

☆ ☆ ☆

بہت کھاسیں ارمان نوں جد پھسی پروردگار   خالق اکبر دی بندگی کر لے وقت سہار

☆ ☆ ☆

سب کم کچیے نبی ساڈے سچیے   جناں پکڑی ساڑی مہار

شیر غلام (م - ۱۸۵۶ء)

نامور پہلوان اور درویش صفت انسان تھے - ان کی ایک حرف درج کی جاتی ہے :

یک پیسہ تیرے ہتھ دتا ، ادے سودے لیاویں چار بیٹا
نالے ککھڑی لیاویں نالے لکڑی لیاویں نالے لیاویں پھلاں دے ہار بیٹا
نالے دودھ لیاویں پیسہ موڑ لیاویں کسی نال نہ کریں ادھار بیٹا
شیر غلام نے اکھیاں کھول کے تے سب دے ساہڑیں کیتا اظہار بیٹا

اس دور کے تقریباً تمام شعراء کے کلام میں زیادہ تر ہندی ، فارسی اور پشتو کے الفاظ کا غلبہ اور آمیختہ ہے - یہ اس لیے کہ ان میں سے اکثر فارسی ، پشتو اور اُردو کے شاعر گزرے ہیں - اس دور میں حاجی محمد سعید فکری ، جمعہ خان جمعہ ، عبدالعزیز خان عزیز وغیرہ اور بھی شاعر تھے - مگر عدم گنجائش کے باعث ان کا ذکر نہیں ہو سکا - اس دور کے کلام میں عموماً اسلامی رنگ غالب ہے یا پھر اصلاحی رنگ ہے - تصوف اور فلسفے کی چاشنی بھی ملتی ہے - عشق و محبت کی گھلاوٹ بھی پائی جاتی ہے مگر شاعرانہ اپج اور تفکر کا فقدان ہے - کلام زیادہ تر چار بیتہ اور حرف پر مشتمل ہے -

دوسرا دور

۱۸۴۴ء - ۱۹۴۷ء

سردار خان بردا (م - ۱۹۰۲ء)

پشاور میں ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے - آزاد منش واقع ہوئے تھے - اپنے چچا زاد بھائیوں سے بڑے نالاں تھے - ان کی وجہ سے انہیں در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں اور قید و بند کی مصیبت میں بھی مبتلا ہونا پڑا - اس کا ذکر انہوں نے اپنی کافیوں میں کیا ہے :

لگی لڑائی دو بھائیاں والی قید ہویا وے تیرے سال بردا
آ پڑی غربت دے ہتھو پریشاں ہو کے قید خانے ہویا بد حال بردا

بردا زبان و محاورے کے بادشاہ تھے - انہیں فارسی اور پشتو زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا - کچھ عرصہ پنجاب میں رہے جہاں ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد موجود ہے - ان کی حرفیاں مشہور ہیں - ایک ملاحظہ ہو :

بری مرض لگی بارو عشق والی دارو لگدے نئی طبیب والے
دنیا دارن دے مٹ جاسن سخن بھلسن نہ مجھ غریب والے
نال عاجزی دے کم کڈ لیندے ، رساں چوپ لیندے مٹھی جیب والے
کئی رکھاں دی راکھی کرے بردا میوہ پکے تاں کھان نصیب والے

جیسا کہ اس حرفی سے ظاہر ہے آپ کے بہت سے مصرعے ضرب المثل بن چکے ہیں -

میاں محمد دین (م - ۱۹۱۰ء)

پشاور کے نامور شاعر تھے اور بردا کے حریف تھے - لیکن آخر متاثر ہو کر ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے - ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے - پرگو اور بدیہہ گو شاعر تھے - کلام میں درد اور سوز ہے - معاملہ بندی میں خاص قدرت حاصل ہے - زندگی بھر صرف حرفی کہتے رہے - ان کے ہاں عموماً رومانوی رجحان ملتا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

ایسا دل کھوے ایسا دل چاوے ساڈے دوناں دا ہکا مکان ہووے
سونڑی سیج اتے موجاں خوب مارئیے ساڈے دوناں دی ہکا جان ہووے
ہک توں ہوویں ہک میں ہوواں تیجا کوئی بھی نہ درمیان ہووے
تینو ویکھ ویکھ کے تینو چم چم کے راتی دنے دین ہلکان ہووے

ان کی بعض حرفیوں میں طبقاتی شعور بھی پایا جاتا ہے -

محمد رمضان رمضو (م۔ ۱۹۰۹ء)

شیر غلام کے شاگرد اور سائیں احمد علی کے استاد تھے۔ عربی فارسی کے عالم اور اُردو فارسی اور ہندکو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ چار بیتہ بھی کہتے تھے لیکن ان کی صرف چند حرفیاں محفوظ رہ گئی ہیں۔ نامی گرامی شاعر تھے۔ سائیں احمد علی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر استاد رمضو کے متعلق کہتے ہیں:

سائیں رمضو استاد دی ہک حرفی تو
کران صدقے آ پڑا سب دیوان

رمضو کی حرفیوں میں حالات عالم پر تبصرہ ملتا ہے مثلاً:

فصل پکیا جس دا مارا جاوے اس تے چڑھے نہ پھر کیوں دریا آگ دا
سڑ پچھ کے کوئلہ کباب ہوون جدو موتیاں نو لگے تا آگ دا
گلاں دوستاں دیاں اے سنڑ کے تے دھواں مغز وچوں نکلیا آگ دا
رمضو کس نوں دساں کوئی محرم نئی ہک طوفان اے دلچ بہا آگ دا

سائیں احمد علی (م۔ ۱۹۳۷ء)

سائیں احمد علی ہندکو ادب کے باغ کا سدا بہار پھول ہے۔ ایک مکتبۂ خیال ہے، ایک ادارہ ہے، ایک تحریک ہے۔ مکتب یا مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود فارسی کے ہزاروں اشعار از بر تھے۔ لوگ بیدل اور ظہوری کے اشعار کا مطلب آپ سے آ کر سمجھا کرتے تھے۔ فارسی زبان سے اسی فطری مناسبت کی بنا پر آپ ہندکو کے اشعار میں بڑی حسن و خوبی کے ساتھ فارسی کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ اس لیے آپ کو ہندکو کا غالب کہا گیا ہے۔ اُردو اور فارسی میں بھی زندگی کے آخری ایام میں طبع آزمائی کی۔ ہندکو شاعر ہونے کے باوجود گفتگو ہمیشہ فصیح اُردو میں کیا کرتے تھے۔ اُردو کی نشر و اشاعت کے لیے آپ نے 'بزم سخن' کی بنیاد ڈالی، پشاور کے شعرائے اُردو کو یکجا کیا اور پبلک مشاعروں کا آغاز کیا۔ ارد گرد شاگرد جمع رہتے تھے۔ بڑے خود دار اور سیر چشم تھے۔ کوئی ان کی ستائش کرتا تو جھڑک دیتے۔ راولپنڈی کے سکھ رئیس سردار مکھ سنگھ ان کے مداح اور عقیدتمند تھے۔ انھوں نے کئی بار خدمت کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے بے نیازی برتی۔ ۱۸۵۱ء میں پشاور کے محلہ محمد داد میں پیدا ہوئے اور ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو فوت ہوئے اور شیخ حبیب کی

زیارت کے پاس 'لکھے دروازے' کے سامنے قبرستان میں دفن ہوئے۔ دو سو حرفیوں پر مشتمل ان کے کلام کا انتخاب گجرات سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر رضا ہمدانی نے سائیں کی پانچ سو حرفیوں کا انتخاب مرتب کیا ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گا۔ ان کے قلم اور تخیل میں بڑا زور ہے۔ ان کے کلام میں تبصرۂ حیات ملتا ہے :

عجب اے رسم انہاں ظالماں دی کرکے ظلم پھر ظلم دی داد منگدے
اناں پاس کوئی جائے فریاد لے کے سن فریاد تفسیر فریاد منگدے
دل دی کشت تے درداں دا ہل پھیر کے توسیع فصل دی ستم ایجاد منگدے
سائیاں کرکے ہلاک اے عاشقاں نو اجرت خونریزی دی اے جلاد منگدے

یہ کافی انگریزوں کے دور استبداد کی داستانِ درد بیان کرتی ہے۔ اس میں شہیدوں کا خون پکار رہا ہے۔

عبداللہ (م - ۱۹۳۰ء)

عالم فاضل شخص تھے۔ ہندکو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ سائیں کی طرح ان کے شاگردوں کا بھی شمار نہیں۔ سائیں اور عبداللہ میں چشمک تھی۔ عبداللہ کو بھی اپنی عظمت کا احساس تھا۔ ان کے بہت سے مصرعے ضرب المثل بن چکے تھے۔ نمونۂ کلام :

میں زمین آسمان نو چھانڑ آئیاں کدرے ازا نہ کوئی نشان ملیا
نہ ستاریاں تے ازی درک کوئی نہ ہواواں دے درمیان ملیا
پہنچے ہوئے بزرگاں نو ٹٹولیا وے خاناں اناں دا بھی ویران ملیا
جنے پایا نا وچ حدیث پایا، جنو ملیا تا وچ قرآن ملیا

طلا محمد موچی (م - ۱۹۲۸ء)

پشاور سے دو میل دور ڈھیری باغباناں کے باشندے تھے۔ تمام عمر چار بیتہ ہی کہتے رہے۔ عوامی شاعر تھے اور اپنے کلام میں نکوکاری کی ترغیب دیتے تھے۔

سیفی شاہ (م - ۱۹۳۹ء)

پشاور میں پیدا ہوئے۔ مذہبی تعلیم گھر پر پائی۔ فارسی عربی مکتب میں پڑھی۔ سائیں احمد علی کے شاگرد تھے اور ان کی طرح مذہباً اثنا عشری تھے اور منقبت، مرثیہ سلام سب کچھ کہتے تھے۔ ہر سال محرم میں ان کے سلام اور سوز سینہ زنوں کے جلوسوں

میں پڑھے جاتے ہیں ۔ عوامی شاعر تھے ۔ ان کے کئی مصرعے اور اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں ۔ ان کی ایک حرفی سنئے :

کوئی دم نہ آندا آرام منو نشتر غماں دی جگر نوں پھاڑ دی اے
مار مار عشق دی نار بھڑکے روز شب جو خون نو کھاڑ دی اے
اے تپش جدائی دی ہر ویلے میرے غم زدہ دل نوں ساڑ دی اے
سیفی عشق نے ایسا اجاڑیا اے جکو چمن نوں خزاں اجاڑ دی اے

میر احمد مٹھو (م ۔ ۱۹۳۲ء)

سیفی شاہ کے شاگرد تھے ۔ حرفی کے شاعر تھے ۔ زبان سادہ ، صاف اور بے داغ ہے ۔ انھوں نے اپنے نام کی رعایت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے ۔ مثلاً :

مٹھو مٹھو سارے کردے کوئی نہ چوری دیندا

ان کی ایک حرفی ملاحظہ ہو :

بت کج رو اےتو دس منو اج پیشانی تری کیوں چڑھی ہوئی اے
حسن رخ تنویر خلاف کیتا خودی تیرے دماغ اج وڑی ہوئی اے
یا رقیباں نینوں بد گمان کیتا یا چشم تری کدرے لڑی ہوئی اے
ذرا ہس کے مٹھو نل بول سونڑے لباں وچ گفتار کیوں اڑی ہوئی اے

جگر کاظمی (پ ۔ ۱۸۸۸ء)

ان کی ولادت پشاور میں ۱۸۸۸ء میں ہوئی ۔ لالی شاہ نام ہے ۔ جگر تخلص کرتے ہیں ۔ اُردو ، فارسی اور ہندکو کے مستند شاعر ہیں ۔ فارسی میں ان کا قصیدہ بلند ہوتا ہے ۔ ایک قصیدہ کے عوض سابق والئی چترال سے خلعت کے علاوہ خاقانیٔ سرحد کا خطاب پایا ۔ کلکتہ بھی رہے اور وہاں اُردو میں شمس کلکتوی سے اصلاح لیتے رہے ۔ ان کی ہندکو کی ایک حرفی درج کی جاتی ہے :

اے راز معلوم اے ہور کس نو سر حق دا رکھدیاں راز اکھیاں
اگے گیاں مقام محمود کولو ہوئیاں واقف راز و نیاز اکھیاں
اکھیاں جاوں قربان اناں اکھیاں توں جیڑیاں اکھیاں ہویاں ممتاز اکھیاں
جگر کیڑا دن ہوسی میرے دل لطف کرکے او ہویسی بندہ نواز اکھیاں

وحشی (م - ۱۹۵۲ء)

مائیں احمد علی کے شاگرد تھے ۔ تعلیم سے بے بہرہ رہے ۔ لیکن صحبتِ احباب میں بہت کچھ حاصل کیا ۔ حرفیوں کا ایک دیوان ان کی یادگار ہے :

مٹھیاں منو اور شہد کولو نیریاں کوڑیاں گلاں جو کھٹیاں نی
تیرا گھورنا متھے وٹ پا کے میرے زخمی دل واسے پٹیاں نی
منو لکھا تے اے بھی احسان تیرا جیڑاں غصے نال گلاں پلٹیاں نی
میں واں وحشی تیرا سنگسار کرنا میرے واسطے پھلاں دیاں چھٹیاں نی

مفلس (م - ۱۹۵۶ء)

وحشی کے شاگرد تھے ۔ بلند آواز سے مشاعروں میں پڑھے اور مجمع پر چھا جاتے تھے ۔ رنگ سخن قدیم ہے :

نیرے عشاق نے جان میری روز ازل سی بڑھی کتاب وکھری
بازی جیتی اس قیس فرہاد کولو اس دی صف ہوئی انتخاب وکھری
ہجر ہویا وے دشمن جان وکھرا نالے جان پے گئی وچ عذاب وکھری
تیری تیغ سی مفلس نوں ذبح ہو کے ملی عاشقاں وچ آب و تاب وکھری

محمد جی بنجارا (م - ۱۹۳۸ء)

مشہور چار بیتہ باز تھے - ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ ان کے ایک مشہور چار بیتے کے دو بند درج کیے جاتے ہیں :

کالی تیری چادر، کالے سر تیرے دے وال
کالی ڈبی کھول کے تو کالے لاویں خال
کالیاں تیریاں بھوواں تے کالیاں تیریاں اکھیاں
تو کالا سرمہ پا کے کجلے دے نال رکھیاں
کالے نے تندوڑے کالیاں زلفاں دی سر تے تانڑی
تینو ویکھ کے لوکی پچھن اے کیہڑے نگر دی رانی
دل ہو گیا پانڑی پانڑی
چٹیاں نی نوکریاں، چٹے ہتھاں وچ کڑے
چٹیاں پا کے پہنچیاں دل عاشقاں دے لٹ کھڑے

چٹا وی رومال کڑئیے تیرے گل گورے سفید
چٹا وٹا بدن تیرا منو کــر لے اس اچ قیــد
منو کر لے اس اچ قید کہ میں رواں تیرے نال
میں رواں تیرے نال کہ خوش آ گئی تیری چال
میں کس نوں جا کے دسا بس اے میری کہانڑی
دل ہو گیا پانڑی پانــڑی

ایک مقامی حسینہ کی تصویر اس سے بہتر اور کہیں نہیں ملے گی۔ مقامی لباس اور سامان آرائش پر بھی نگاہ ڈالیے۔ ان پر مستزاد شاعر کا جذبات انگیز اندازِ بیان ہے۔ صنعت تضاد کو کس فنی مہارت کے ساتھ برتا گیا ہے۔

عبدالحکیم اثر (م - ۱۹۵۴ء)

زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن اردو، فارسی اور پشتو پر خاصا عبور حاصل تھا۔ ہندکو میں ان کا قلمی سرمایہ حرفیوں پر مشتمل ہے:

کدرے نئی اے قائم مقام میرا، ایسا راہی راہ دراز میں واں
منو ہستی دی ہر اک چیز کہندی تو مضراب ہیویں تا ساز میں واں
نظر ہیوی نا نک لے جہاں میرا نور حق بہ رنگ مجاز میں واں
میرے دم سی قصر جہاں پختہ اثر ٹٹے ہوئے دل دی آواز میں واں

اس حرفی میں احساس ذات ایک انوکھی چیز ہے۔ انسان کی بدولت اسرار ہستی جس طرح کھلتے ہیں اور زندگی بنتی سنورتی ہے ان کا کیا عمدہ بیان ہے۔

محمد یونس یونس (پ - ۱۸۹۴ء)

محمد یونس ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ سائیں سے شرف تلمذ رہا ہے۔ ان کا تمام تر شعری اثاثہ بھی حرفیاں ہی ہے:

مــوڑ مہار آ ہک وار دل تیری طلب وچ بے قرار بھــڑکے
آ سیراب کر شربت دید سی تو لب خشک بھڑکن چشم زار بھڑکے
کیتا ہجرے دے تیراں غرباں ایسا جسم بھڑکے نہ رگ دی کوئی تار بھڑکے
تٹھا غش کھا کے آ تک حــال پیارے سر راہ یونس تیرا یار بھڑکے

غلام رسول گھائل (پ - ۱۹۲۸ء)

۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ سیفی شاہ کے شاگرد ہیں۔ امّی شاعر ہیں۔ صرف حرف کہتے ہیں۔ ہندکو کے پہلے شاعر ہیں جن کا دیوان ان کی زندگی میں طبع ہوا۔ ان کے استاد سائیں احمد علی کے شاگرد تھے۔ اس سلسلۂ نسب پر انہیں بڑا ناز ہے۔ ایک حرفی میں انہوں نے ہندکو کے عظیم استاتذہ کا ذکر کیا ہے:

شیر غلام، رمضو تے استاد بردا ہندکو ادب دیاں راہواں بنا گئے
استاد دین، گاموں تے سلطان یارو دوہے ہندکو دے ہتھاں نال لا گئے
عاصی، سائیں، عبداللہ ہشیار آئے پانڑی اماں بوٹیاں نو ہلا گئے
نانـــواں، ثالث فکاری نال ہندکـــو حرفی نـــو خوب سجا گئے

ایف - آر - برق (پ - ۱۹۱۹ء)

۱۹۱۹ء میں پشاور میں پیدا ہوئے، جوانی لاہور، دہلی، کلکتہ اور بمبئی میں گزاری۔ تھیٹر سے دلچسپی ہے۔ آغا حشر مرحوم کے زیر تربیت رہ چکے ہیں۔ حرفی کے شاعر ہیں۔

صنف شعر گوئی کے لحاظ سے ہندکو ادب کا دوسرا دور حرفی اور چار بیتے سے آگے نہیں بڑھ سکا لیکن فنی اور فکری لحاظ سے اس نے خاص ترقی کی۔ زبان میں صفائی اور نکھار پیدا ہوا۔ پشتو، فارسی، عربی اور ہندی کے غیر مانوس الفاظ خارج ہوتے گئے اور روز مرے، محاورے اور ضرب الامثال نے جگہ پائی۔ اس دور کی شاعری میں تفکر کا احساس ہوتا ہے اور کسی قدر حقیقت نگاری کی طرف بھی میلان نظر آتا ہے۔ اس دور کے شعراء میں سے خصوصاً بردا، دین اور سائیں احمد علی کی شہرت پنجاب میں بھی پہنچی چنانچہ وہاں کے ادبی حلقوں میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔

دورِ جدید

(۱۹۴۷ء سے اب تک)

مضمر تاتاری (پ - ۱۹۰۷ء)

۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ مکتب نہیں گئے مگر فطری جوہر کی بنا پر ہندکو اور اردو دونوں کے شاعر ہیں۔ آپ ہندکو کے پہلے انقلابی شاعر ہیں۔ ان کی سوچ گہری اور اسلوب منفرد ہے۔ انہوں نے ہندکو میں نظم بھی کہی ہے اور ان کی نظم 'سراپا' بہت مشہور

ہے ۔ ان کی نئی سوچ نے ہندکو کو جدید رجحانات سے آشنا کرایا اور پہلی دفعہ زندگی کی سچی تصویریں دکھائیں:

سچیے موتیاں نوں کوئی پجھدا نئی   جھوٹے موتی ہارا دے ہاروکدے

☆ ☆ ☆

کرو موت دے ساز خموش مضمر   کہ میں نغمے حیات دے گانڑ لگیاں

ایک حرفی ملاحظہ ہو:

خزاں لوٹ آئی کہ بہار بدلی او کے جانڑن وسن جو عہدیاں وچ
ساخ ساخ بن کے ناگ ناگ ڈسے ، نچیے اگ پئی گلاں دے پودیاں وچ
رکھن نوڑ کے پھلاں نوں بجلیاں تے اک دبدے برف دے تودیاں وچ
ایسے وڑیچ بپار تو باز آؤ کے کھٹیاں نئی انہاں سودیاں وچ

آغا محمد جوش (پ ۔ ۱۹۰۹ء)

جوش کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۹ء ہے ۔ حرفی کے شاعر ہیں ۔ سادگی، سلاست اور حلاوت ان کا وصف ہے:

مٹی دے بت سنگار کر کے میرے چھلے ولے دے کول نہ آ
اے بے درد زمانہ بدنام کرسی چھپے چوری اکلے دے کول نہ آ
میری شب بے داری دے راز نہ پچھ ، صبح صادق مصلے دے کول نہ آ
عمر بھر دے زہد نوں اگ لاسیں ویکھ جوش دل جلے دے کول نہ آ

رضا ہمدانی (پ ۔ ۱۹۱۴ء)

رضا کی تاریخ ولادت ۱۹۱۴ء ہے ۔ پشتو ، فارسی ، اردو اور ہندکو چار زبانوں کے شاعر اور ادیب ہیں ۔ اردو کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ۔ جدید ہندکو شاعری کے بانی مبانی ہیں ۔ اس میں نظم اور غزل کا اضافہ انہی نے کیا اور غم جانان سے گزر کر اسے غمِ دوراں سے آشنا کیا ۔ نظم 'گونگی' ان کا شاہکار ہے ۔ کس طرح گونگی بیچاری اپنی ماں سے محروسی کا ذکر کرتی ہے:

ہک انجان دی خاطر منسے   دل دے ہوئے کھولے ماں
رستہ تکدے تکدے بے گئیے   اکھیاں دے وچ پھولے ماں

منو کدے نظر نہ آئے   آسی دے اڑن کھٹولے ماں
کتھے او گلفام شہزادہ   پترے کھولے کھولے ماں
تھیاں سال پرایا ہو کے   پھر بھی تیرے کول اے ماں
داج دے کپڑے ہئے ہئے سڑ گئے   سڑ گئے گڈیاں پٹولے ماں
ٹوماں اتے الی لگ گئی   موتی ہو گئے کولے ماں
نکیاں وڈیاں دے ہر ویلے   کھا گئے منو چھولے ماں

ان کی غزل میں بھی بے پناہ تاثر ہے۔

فارغ بخاری (پ۔ ۱۹۱۷ء)

۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ میر احمد شاہ نام ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ ایک عرصہ سے ہندکو میں بھی نظم و نثر لکھ رہے ہیں۔ اردو میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہندکو میں نظم، غزل اور قطعات لکھتے ہیں۔ نظم آزاد کا بھی تجربہ کیا ہے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

لا کے بے درداں نال یاری   سولی تے ہر رات گزاری
تیرا ساڈا میل اے پیاری   خوشبو دے نال ہوا دی یاری
برس گئے بے خواب دریچے   کسے نہ اندر جھاتی ماری
آسی تالث دا مال آن یارو   لٹ دے جاؤ واری واری
ساڈا کے وے اسی پیارے   نہ سرکاری نہ درباری

جوہر میر (پ۔ ۱۹۳۴ء)

نام میر قربان علی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ اردو میں دو ناولوں کے منصف ہیں۔ ہندکو نظموں کا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ جوہر جدید ہود کے ذہین نمائندے ہیں۔ عام رجحان سے ہٹ کر کوئی نئی بات کہنے کی امنگ رکھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

کون چکاوے دل دا سودا میں کگا تو ڈوری
شالا پیار دا بوٹا لانڑے والا مالی سڑے

خاطر غزنوی (پ۔ ۱۹۲۵ء)

خاطر کی تاریخ ولادت ۱۹۲۵ء ہے۔ پشاور یونیورسٹی میں چینی اور اردو زبانیں پڑھاتے ہیں۔ مشہور شاعر، ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہندکو میں انہوں نے ابھی ابھی

لکھنا شروع کیا ہے لیکن وہ اپنے فنی تجربات اورنئی سوچ کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ ان کی نظم ، اجڑی بہار ، کا ایک بند پڑھیے :

ڈنگدا وے منو اج خالی خالی کہار
لہہ گیا وے دلو میرے ہار تے سنگار
اج لگدی اے منو کالے کجلے دی تہار
چھجے کڈے ہوئے کالے خونی ناگ ہار

شمیم پھیروی (پ ۔ ۱۹۱۴ء)

نام خواجہ عبدالطیف ہے ۔ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ مولد بھیرہ ہے اور رہائش پشاور رکھتے ہیں۔ اردو ، فارسی اور ہندکو کے شاعر ہیں ۔ نظم میں نئے تجربے کر رہے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم 'گونڑ' کے اشعار ملاحظہ ہو :

چھنک چھنک میرا چوڑا چھنکے ۔ ویکھ ویکھ مسکاواں
لچکن میریاں باواں
گیت سجن دے گاواں

ہونٹاں تے دنداسہ مل کے ۔ موتی پئی چمکاواں
بجلی نو شرماواں
گیت سجن دے گاواں

کالی بدلی چمکن تارے ۔ ٹھنڈیاں ٹھنڈیاں چھاواں
ہس ہس پیلاں پاواں
گیت سجن دے گاواں

بجلی کڑکے بوہا کھڑکے ۔ میں تکاں تیریاں راہواں
دل نوں پئی سمجھاواں
گیت سجن دے گاواں

فرید عرش (پ ۔ ۱۹۲۰ء)

نام غلام فرید ہے اور تاریخ ولادت ۱۹۲۰ء ۔ ان کے دادا حاجی محمد سعید فکری ہندکو کے مشہور شاعر گزرے ہیں ۔ نئی غزل کو رواج دینے میں فرید عرش کی کوششیں قابلِ ذکر ہیں ۔ ان کا ایک شعر ہے :

جنو دیکھو چھولی دے وچ پھل چنڑنے نو ٹریا
کوئی نی کردا کنڈیاں دے وچ ال جانڑے دیاں گلاں

عشرت ملک (۱۹۱۱ء—۱۹۶۸ء)

۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۸ء میں فوت ہوئے۔ اردو اور ہندکو کے پرگو شاعر تھے۔ حرفی کے استاد تھے۔ ان کے دو شعر ہیں:

دل نوں پہاڑ کے سینے آں — زہر دے گھٹ پینے آں
جیرے اتے مرنے آں — اسو دیکھ کے جینے آں

عزیز اختر وارثی (پ۔ ۱۹۱۶ء)

عزیز کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ عبدالعزیز نام ہے اور کوہاٹ کے رہنے والے ہیں۔ اردو کے بھی شاعر ہیں۔ ہندکو میں صرف غزل کہتے ہیں جس میں مقامی لہجے کی چاشنی ہوتی ہے۔ ان کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں:

غماں نی گرم بزاری ناز ور ٹٹ ویسی — بک ایجا وقت بھی آسی، بہار بھی آسی
نہ فکر کر کوئی اس گرد تے غبارنے بعد — ہزار رنگاں نی اختر بہار بھی آسی

سعید گیلانی (پ۔ ۱۹۴۲ء)

نام سعید احمد شاہ ہے۔ ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ اردو ہندکو کے نوجوان شاعر ہیں۔ نظم اور غزل خوب کہتے ہیں۔ ان کی نظم "ناچ" کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

جسراں کالے بدلاں وچ رہ رہ کے چمکے بجلی
جسراں باغ اچ پھلاں اتے اڈدی پھرے تتلی
جسراں کشتی پانڑی اتے وا آوے تا ڈولے
جسراں ام دے بوٹے اتے کوکو کوئل بولے
جسراں ڈار نو لبدی ہووے وچھڑی ہوئی مرغابی
نشے دے وچ ٹردا ہووے جسراں کوئی شرابی

محمد آصف ثاقب ہزاروی (پ۔ ۱۹۲۶ء)

محمد آصف ۱۹۲۶ء میں ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے تعلیم وہیں پائی اور اب وہیں گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اردو اور ہندکو زبان کے منجھے ہوئے شاعر ہیں۔

ہندکو میں گیت اور غزل کہتے ہیں جن میں ان کا مقامی لہجہ نمایاں ہے ۔ ان کے ایک گیت ”گونڑ“ کے دو بند مطالعہ فرمائیے :

ہن آیا نی ماہی میرا سج دج کے انوں ویکھن بہاراں پیئاں رج رج کے
جدوں آوے تے آ کے فر مڑ جاندا جدوں جاوے تے جا کے فر مڑ آندا
انو تکاں میں ویڑھے وچ بھج بھج کے
ہن آیا نی ماہی میرا سج دج کے
جدوں اٹھے تے جیویں آسماں ورگا جدوں نچے تے لگدا طوفان ورگا
جدوں بولے تے بولدا اے گج گج کے
ہن آیا نی ماہی میرا سج دھج کے

خادم ملک (پ ۔ ۱۹۴۱ء)

نوشہرہ میں ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے ۔ پشاور میں مقیم ہیں ۔ غزل کے شاعر ہیں ۔

ناز درانی (پ ۔ ۱۹۳۰)

چار سدہ کے رہنے والے ہیں ۔ سعداللہ جان نام ہے ۔ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے ۔ اردو ہندکو کے خوشگو شاعر ہیں ۔ غزل کہتے ہیں ۔

آتش فہمید (پ ۔ ۱۹۲۴ء)

ان کا نام محمد بخشیش ہے ۔ ۱۹۲۴ء تاریخ ولادت ہے ۔ ہندکو میں حرفی ، نظم ، غزل سب کچھ کہتے ہیں ۔ ان کا ایک شعر سنیے :

کدی خوشی دی خواہش نئی مول کیتی ایڈا غماں دے نشے وچ چور آں میں

نبی بخش گوہر (پ ۔ ۱۹۳۹ء)

نبی بخش کی ولادت ۱۹۳۹ء میں ہوئی ۔ اردو ، فارسی میں ایم ۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے ۔ پشاور یونیورسٹی میں ملازمت ہے ۔ ہندکو نظم و نثر میں جدید رجحانات کے علمبردار ہیں ۔

افضل چشتی (پ ۔ ۱۹۴۰ء)

ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۴۰ء ہے ۔ نام محمد افضل ہے ۔ ہندکو میں حرفی ، نظم ، غزل سبھی کچھ کہتے ہیں ۔ ایک غزل کا مقطع ہے :

اکھیاں انھیاں ہوئیاں چشتی دردر ٹھوکر کھاواں
کوئی نہ راہ تے پاوے منو کوئی نہ دے دلاسے

خالد خواجہ (پ۔ ۱۹۴۵ء)

نام خالد محمود ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ نئے دور کے ہونہار ادیب ہیں۔ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ دونو میں مقامی لہجے کی حلاوت پائی جاتی ہے۔ اپنی نظم ''چھلا'' میں کہتے ہیں:

دنیا کولوں کسراں نساں ، دنیا بچ میں کسراں بساں ، خوسیاں کس دے کولوں کھساں
کسراں عمر گزاراں اک اک پل اے پورا سال

اسمٰعیل اعوان (پ۔ ۱۹۳۸ء)

ان کا اصل نام محمد اسمٰعیل ہے۔ ہندکو کے نوجوان ساعر ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ آج کل انگلستان میں رہتے ہیں۔ دل مں انسانیت کا درد ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی نظم ''پھیرا'' میں بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ اس کا اقتباس دیا جاتا ہے:

ہک محل دے پچھلے پاسے ہلکا ہلکا ہویا اجالا
ہک کنواری سہمی سہمی جگ دا چن یا چن دا حالا
ہولے ہولے قدماں اتے پولے پولے باہر آئی
کالیاں اکھیاں بوجھل بوجھل جکرو ہوگئی نیند پرائی
ہک جھگی دے بوّے اتّے ہک بڈھے کول آ کھلوتی
چپ چپیتے اگے ودائی رات دی محنت دی کمائی
شہرے نو معلوم اے سب کج ساید او بھی جانڑی جانڑ لے

مجبوری دیاں ساریاں گلاں
اے کسبی نہ او لٹیرا
نہ اسدا اے پہلا فاقہ
نہ سونڑی دا پہلا پھیرا

یہ ساری نظم جدید رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔

ساحر مصطفائی (پ۔ ۱۹۳۵ء)

عبدالجلیل ساحر مصطفائی امی شاعر ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ولادت ہوئی۔ اردو ہندکو دونوں زبانوں میں صرف غزل کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ڈاڈی بن گئی میرے مولا — سڑ سڑ کے میں ہویا کولا
اکھیاں دے وچ اگ ہئی بلدی — دل سی اٹھیا غم دا شعلہ
دنیا دی اے ریت انوکھی — پل اچ ماسہ پل اچ تولہ

اس دور کی شاعری پر تبصرہ

پہلے ادوار میں ہندکو شاعری محض حرفی اور چار بیتہ تک محدود رہی' لیکن دورِ جدید کے شعراء نظم ، غزل ، قطعہ ، رباعی وغیرہ اصناف کو بھی اختیار کر چکے ہیں' چنانچہ دائرہٗ کار پھیل رہا ہے ۔ نوجوان شعراء کے ذہنوں میں فنّی اور سماجی شعور سے ایک تاریخی انقلاب پیدا ہوا ہے ۔ وہ نئے عزائم ، نئی لگن ، پوری توجہ اور بڑے انہاک سے لکھ رہے ہیں ۔ ادب و شعر میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں اور نئے افق دریافت کیے جا رہے ہیں ۔ اکثر شعراء ہندکو کے ساتھ اردو اور پشتو کے بھی معروف شاعر ہیں اسی طرح جہاں علاقائی زبان و ادب ، تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ترقی ہو رہی ہے وہاں قومی زبان کے نشو و ارتقاء کا بھی سامان ہو رہا ہے اور قومی سطح پر ایک تنومند معاشرے اور صحت مند کلچر کی آبیاری ہو رہی ہے ۔ یہ جدید شعور نئی ادبی تحریک کا عطیہ ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری ملّت ایک ترقی یافتہ دور میں داخل ہو رہی ہے ۔

ہندکو نثر کا ارتقا

ہندکو نظم کےمقابلہ میں نثر کا ذخیرہ بہت کم ہے ۔ ہندکو نظم کی ابتدا محمد دین مائیو سے بھی کی جائے تو بھی اس کی عمر دو سو سال بنتی ہے ۔ ہندکو نثر کا سب سے پہلا نمونہ ہمیں مرزا عبدالغنی کی بیاض 'گلدستہ' میں ملتا ہے ۔ مرزا کی نظم کے علاوہ گریئرسن نے نثر میں اس کی ایک کہانی کا نمونہ بھی دیا ہے ۔ اس اعتبار سے مرزا نہ صرف ہندکو نثر کا بانی مبانی ہے بلکہ ہندکو افسانے کا بھی وہی خالق ہے ۔ لیکن مرزا کےبعد دورِ جدید تک ہندکو نثر کے کوئی آثار نہیں ملتے، البتہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ، کچھ منظوم کھیلوں اور منظوم لوک کہانیوں میں بین السطور نثر کے کچھ ٹکڑے ملتے ہیں جن کے خالق اور سنِ تخلیق کا کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ البتہ اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خاص قدیم چیزیں ہیں جو کئی نسلوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی ہیں ۔ ان کےعلاوہ 'گلدستہ' کے مؤلف نے ''مائیو'' کے حالات میں اس کے ایک تذکرے 'چن تارے' کا ذکر بھی کیا ہے ۔ یہ کتاب اگرچہ اب نایاب ہے لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بقول مرزا خود مؤلف کے لڑکے نے اسے بتایا کہ 'چن تارے' کا مسودہ اس کے

پاس محفوظ ہے لیکن بعض نامساعد حالات کے باعث مرزا کو یہ مسودہ دیکھنا نصیب نہ ہو سکا ۔ مرزا نے اس تذکرے کی سنِ تالیف کے متعلق کچھ نہیں بتایا ، تاہم ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ بارھویں صدی ہجری کے ربع آخر کی تصنیف معلوم ہوتی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ مرزا نے اپنے دادا کے حوالے سے دو اور قدیم کتابوں 'دین کے چراغ' اور 'کالی کملی والا سائیں' کی نشاندہی بھی کی ہے جو اگرچہ اس کے بیان کی روح سے منظوم تھیں لیکن ممکن ہے ان کے دیباچے وغیرہ نثر میں ہوں ۔ ان کتابوں کو مرزا نے 'چن تارے' سے زیادہ قدیم بتایا ہے ۔ اس طرح ہندکو نظم و نثر کی تاریخ کی درمیانی خلیج کسی حد تک کم ہو جاتی ہے اور ان کی تاریخ کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لینے میں خاصی مدد ملتی ہے ۔

دورِ جدید کا آغاز ہندکو نثر کے حق میں نیک فال ثابت ہوا ۔ اس دور میں ہندکو کے نئے ادیبوں نے ہندکو ادب میں نثر کی کمی کو شدت سے محسوس کیا اور اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنی پوری توجہ صرف کر دی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں ہندکو افسانہ ، ڈرامہ ، فیچر ، ہلکے پھلکے مضامین ، تنقید اور طنز و مزاح سے ہندکو ادب کو مالا مال کر دیا ۔ ان کوششوں میں بلاشبہ ہندکو رائٹرز سوسائٹی پشاور کی تنقیدی نشستوں کو خاصا عمل دخل حاصل ہے ، جس نے نوجوان ہندکو ادیبوں اور شاعروں میں تنقیدی شعور پیدا کیا ۔ انہیں ادب کی نئی راہوں ، نئی قدروں اور نئے تقاضوں سے روشناس کرایا اور نئے ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کا خوشگوار فرض ادا کر کے انہیں زندگی آموز اور زندگی آمیز متحرک اور زندہ ادب کی تخلیق کی طرف متوجہ کیا ۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے دورِ جدید میں نئے ہندکو ادب کے معماروں میں جو نمایاں شخصیتیں نظر آتی ہیں ، قریب قریب سب کے سب اردو کے معروف نامور ادیب ہیں اور چند ایک تو ایسے بھی ہیں جو پشتو ، فارسی ، اردو اور ہندکو چاروں زبانوں میں نہ صرف لکھتے ہیں ، بلکہ نام و مقام بھی رکھتے ہیں ۔

دورِ جدید میں ہندکو نثر کی طرف سب سے پہلے اردو ، فارسی اور پشتو کے مشہور ادیب رضا ہمدانی نے توجہ دی ۔ ۱۹۵۰ء میں اس کا پہلا تنقیدی مضمون 'پنج دریا' کراچی میں شائع ہوا ۔ اس کے بعد وہ اب تک افسانہ ، فیچر ، تنقیدی خاکے مسلسل لکھتے آ رہے ہیں ۔ مظہر گیلانی پچھلے چار پانچ برس سے ریڈیو پاکستان کا پندرہ روزہ ہندکو فیچر 'بھوہ جانہ' لکھ رہے ہیں ۔ یہ فیچر کچھ عرصہ رضا ہمدانی ، جوہر میر ، احسان طالب ، کوکب تبریزی اور مختار علی نیر بھی لکھتے رہے ہیں ۔ سب سے پہلا ڈرامہ 'خیر و فضل' مختار علی نیر کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا ۔ جوہر میر ، فارغ بخاری ، سعید گیلانی ، جہانگیر تبسم آتش بیہمند ، خادم ملک ، صمد ہوش ، خالد خواجہ اور اسماعیل اعوان نے جدید افسانے

کی کمی کو پورا کیا ۔ تنقید میں رضا ہمدانی کو اولیت کا فخر حاصل ہے اس کے بعد جوہر میر، انسخ سعیدی اور راقم الحروف نے اس طرف توجہ دی ۔ طنزیہ مضامین، مزاحیہ خاکے اور ہلکے پھلکے انشائیہ کا آغاز بھی رضا ہمدانی نے کیا ۔ اب دوسرے نوجوان بھی ان میں دلچسپی لینے لگے ہیں ۔

صحافت کے میدان میں جوہر میر، مختار علی نیر اور سعید گیلانی کے نام لیے جا سکتے ہیں، جو روزنامہ انجام، روزنامہ حیات اور ہفت روزہ 'تنویر' پشاور کے ہندکو صفحے علی الترتیب ترتیب دیتے رہے ۔

دورِ جدید میں ہندکو نظم و نثر کے صاحبِ کتاب ادیب بہت کم ہیں ۔ طباعت و اشاعت کی دشواریوں کے باعث کسی ادیب یا شاعر کی کوئی کتاب اب تک نہیں چھپ سکی ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب 'نویاں راواں' ہے جو جدید ہندکو شعراء کے منتخب کلام پر مشتمل ہے ۔ یہ کتاب فارغ بخاری نے مرتب کی اور ہندکو رائٹرز سوسائٹی نے ۱۹۶۴ء میں اسے شائع کیا ۔ اس سال قدیم مکتبۂ فکر کے ایک شاعر غلام رسول گھائل کی حرفیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ۔ اور ۱۹۶۵ء میں مختار علی نیّر کی کتاب ''ہندکو نثر دی کہانڑی'' طبع ہوئی ۔ آخر الذکر کتاب ہندکو زبان اور رسم الخط کے متعلق ایک معلوماتی تصنیف ہے ۔

دورِ جدید کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں میں علاقائی زبان و ادب کی ترویج و ترقی کا شعور پیدا ہوا ۔ یہ شعور ترقی پسند تحریک کا عطیہ ہے ۔ اس تحریک نے جہاں زندگی اور ادب کے رشتے استوار کیے، وہاں اس حقیقت کا بھی فنکاروں کو احساس دلایا کہ علاقائی زبان و ادب، تہذیب و فن اور ثقافت کی ترقی درحقیقت قومی زبان و ادب اور ثقافت کے مترادف ہے ۔ علاقائی زبانیں قومی زبان کے لیے جڑوں کی طرح ہیں جو اس پیڑ کو سرسبز و شاداب رکھتی ہیں اور اس کی نشو و نما اور ترقی میں ممد ثابت ہوتی ہیں ۔ اگر یہ سوتے خشک ہو جائیں، تو قومی زبان کا پیڑ مرجھا کر رہ جائے گا ۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ راز ہمارے دانشوروں نے بھی پا لیا ہے اور اربابِ حل و عقد کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی ہے اور ان دونوں نے مل کر حقیقت پسندانہ طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں ۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں اور ادب و فن کی ترقی میں اب شعوری طور پر جو دلچسپی لی جا رہی ہے یہ اس شعور کا نتیجہ ہے جس کے خوشگوار نتائج جلد ہی ایک صحت مند معاشرے اور تنومند کلچر کی صورت میں ظہور پذیر ہونے والے ہیں ۔

دورِ جدید میں ہندکو ادب کی مجموعی طور پر ترقی حوصلہ افزا رہی ہے وہ ایک ترقی

یافتہ دور میں قدم رکھ رہا ہے ۔ اس وقت پانچ شعری مجموعے زیر طبع ہیں اور تین نثر کی کتابیں جو افسانہ ، ڈرامہ اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہیں طباعت و اشاعت کے مرحلوں سے گزر رہی ہیں ۔ ہندکو زبان نام سے ایک 'ماہنامے' کا ڈکلریشن حاصل کرنے کی کوشش جا رہی ہے ۔ ادھر ہندکو رائٹرز سوسائٹی پشاور میں ہندکو اکیڈمی کے قیام کے امکانات کا بھی جائزہ لے رہی ہے ۔ اس عظیم تجویز کو عملی جامہ پہنانا اگرچہ کوئی آسان کام نہیں' تاہم جن باہمت افراد نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے انہیں اپنے نیک عزائم پر پورا بھروسہ ہے اور اس بھروسے میں وہ اعتماد اور ہمت مردانہ بھی شامل ہے جو ''یزدان بہ کمند آور'' کا منصب پا لے تو کچھ عجب نہیں ۔

سرائیکی ادب

سیاسی اور معاشرتی پس منظر

مغربی پاکستان (صوبہ جات پنجاب اور سرحد) کا وہ علاقہ جس کے شمال مغرب اور مغرب میں کوہ سلیمان اور جنوب میں سندھ واقع ہے اور جسے مشرق میں جہلم اور چناب پنجابی زبان کے علاقے سے علیحدہ کرتے ہیں ، سرائیکی یا ملتانی زبانی کا خطّہ کہلاتا ہے ۔

تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں ایک قوم برِصغیر پاکستان و ہند کے مغربی حصے میں وارد ہوئی ۔ یہ قوم وادیٔ سندھ میں آباد ہوگئی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے یہاں ایک ایسے تمدّن کی بنا ڈالی جسے وادیٔ سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے ۔ بعض ماہرین ان لوگوں کو دراوڑی نسل سے منسوب کرتے ہیں ، مگر یہ ابھی تک متعین نہیں ہو سکا کہ وہ دراصل سامی النسل تھے یا کسی اور قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس تہذیب کا اب کوئی نشان نہیں رہا ۔ فقط جگہ جگہ آثارِ قدیمہ دریافت ہوئے ہیں جن سے ان کی وسعت و عظمت کا پتہ چلتا ہے ۔ ان کے دو بڑے درالسلطنت بھی دریافت ہوئے ہیں جن کے آثار میلوں کے گھیر میں ہیں ۔ ایک ضلع ساہیوال میں ہڑپہ کے مقام پر ہے اور دوسرا سندھ میں موہن‌جو ڈارو کی جگہ پر ۔ ماہرین نے ایسے کوئی سو سے زیادہ آثار ڈھونڈ نکالے ہیں ۔ یہ لوگ متمدّن زندگی بسر کرتے تھے ، لکھنے کے فن سے واقف تھے اور مدنیّت کے اصولوں سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی تہذیب کا تعلق قدیم عراق سے تھا اور قدیم عراق کا رشتہ مغربی ایران سے ملتا ہے ۔ البتہ موہن‌جو ڈارو اور ہڑپہ سے چند ایسی مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو ضارگن (۲۳۰۰ ق ۔ م) ، شاہ عکاد (وادیٔ فرات) کے زمانے کی مہروں سے مماثلت رکھتی ہیں ۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے لوگ وادیٔ دجلہ و فرات کے لوگوں سے سلسلۂ مواصلات رکھتے تھے ۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کا خاتمہ آریاؤں کے ہاتھوں ہوا ، جو دو ہزار قبل مسیح کے وسط میں وسط ایشیا سے نکل کر جنوب اور جنوب مغرب کی طرف پھیل گئے ۔ ان کا ایک ریلہ انہیں برِصغیر کے شمال مغربی حصے میں بھی لے آیا ۔ ان کے پنڈتوں کے پاس بھجن تھے جو بعد میں رگ وید کی شکل میں مرتب ہوئے ۔ ان بھجنوں اور مناجاتوں میں تسخیرِ سرحد اور پنجاب کا نشان ملتا ہے ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی

آمد سے کچھ پہلے ہی وادیٔ سندھ کی تہذیب زوال پذیر ہوچکی تھی ۔ کیونکہ ان کے بڑے بڑے شہروں کے بیرونی حصوں میں جانگلی یا کم تہذیب یافتہ لوگ آ بسے تھے ، جنہیں رگ وید میں بڑی حقارت سے یاد کیا گیا ہے ۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں آریاؤں نے سندھ وادی میں اپنا تسلّط جما لیا ۔ غالباً سندھ وادی کے لوگ اب صلح پسند ہو چکے تھے اور ان میں جنگجویانہ خصلتیں کم ہوگئی تھیں ۔ بہر حال غالباً ایک ہزار قبل مسیح میں آریا لوگ سندھ وادی پر پوری طرح چھا گئے تھے ۔

آریاؤں کی آمد کے بعد تاریخی لحاظ سے اہم واقعہ ۵۱۲ ق ۔ م میں پورے سندھ کے علاوہ پنجاب کے کچھ ملحقہ علاقوں کا دارا گشتاسپ کی سلطنت میں بیسویں صوبے کے طور پر شامل ہونا ہے ۔ سندھ ہخامنشی خاندان کے بانی سائرس کے زمانے میں فتح ہو چکا تھا ۔ اس زمانے میں یہ صوبہ بڑا آباد اور زرخیز تھا ۔ بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں کی آب و ہوا خشک نہیں تھی بلکہ چودھویں صدی عیسوی تک جب ابنِ بطوطہ یہاں آیا ، یہ علاقہ سرسبز تھا ۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے اواخر میں مہاتما بدھ نے گیا کے مقام سے اپنی تعلیمات کا پرچار شروع کیا ۔ مگر جب ۳۲۵ ق ۔ م میں سکندر اعظم جانباز مّلی قبائل سے لڑتا ہوا آگے بڑھا ہے تو ابھی اس طرف برہمنوں کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور برہمنوں کی طرف سے اسے کافی مزاحمت ہوئی ۔ سرائیکی علاقوں میں بدھ مت کی اشاعت پہلے اشوک (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق ۔ م) اور پھر کنشک (۱۲۰ء — ۱۶۲ء) کے زمانوں میں ہوئی ۔ ساتویں صدی عیسوی کا ثلث اول ختم ہو رہا تھا ، جب رائے خاندان کے راجہ سہراس رائے کے عہد میں چین کا مشہور بدھ سیّاح ہیون سانگ ملتان اور سندھ کی طرف بھی آیا ۔ یہ وہی زمانہ ہے جب عرب میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (۵۷۰ء — ۶۳۲ء) مبعوث ہو چکے تھے ۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ ان دنوں میں ملتان کے سورج دیوتا کے بت کا بے حد احترام کیا جاتا تھا ۔ ہندو زائرین دکن اور بنگال سے بھی یہاں آیا کرتے تھے ۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس طرف اندازاً دس ہزار بھکشو موجود تھے ۔ لیکن تمام کے تمام کاہل الوجود عیّاش اور عشرت پسند تھے ۔

۶۳۱ء میں سہراس رائے کے مرنے پر اس کا برہمن وزیر چچ ، تخت کا مالک بن گیا اسی سال ملتان کا صوبہ اور شہر بھی اس کے قبضے میں چلا گیا ۔ اسی چچ کا بیٹا راجہ داہر تھا ، جو نوجوان مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم کے ہاتھوں ۷۱۲ء میں مارا گیا ۔ عربوں کی آمد سے اس طرف اسلامی اثرات پھیلنے لگ گئے ۔ زبان اور تہذیب و تمدّن سب کچھ

متاثر ہوا ۔ نئے شہر آباد ہوئے ۔ ۸۷۱ء میں خلیفہ معتمد باللہ عباسی نے یعقوب بن لیث صفّاری کو دیگر علاقوں کے علاوہ سندھ کی بھی مسندِ امارت دی ۔ اس طرح ان اطراف میں فارسی زبان کے اثر و نفوذ کے مواقع بھی پیدا ہوگئے ۔ دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اچہ اور ملتان پر قرامطہ کا قبضہ ہوگیا ۔ جو انتہا پسند شیعی تھے ۔ ان کا قبضہ گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز (۱۰۱۰ء) تک رہا ۔ جب سلطان محمود غزنوی نے ملتان پر حملہ کرکے قرامطی حکمران داؤد بن نصر کو قید کر لیا ۔ غزنویوں کے زوال کے بعد اچہ ، سندھ اور ملتان میں سومروں کا اقتدار قائم ہوا جو قرامطہ کے پیروکار تھے ۔ آخر کار ۱۱۷۵ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ملتان پر لشکر کشی کی اور سومروں کو شکست دے کر قرامطہ کا زور توڑ ڈالا ۔ سرائیکی تہذیب و ثقافت والے علاقوں پر قرامطہ نے جو اثر ڈالا اس کے نشانات اب تک موجود ہیں ۔

۱۲۰۶ء میں سلطان محمد غوری کی وفات پر ان کے ایک سردار ناصر الدین قباچہ نے سندھ اور ملتان کی طرف خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ قباچہ علم دوست اور انصاف پسند بادشاہ تھا ۔ وہ ۱۲۲۸ء میں سلطان التمش کے حملہ آور ہونے پر کشتی میں دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا کہ ڈوب گیا ۔ جب غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء — ۱۲۸۶ء) کی مستحکم سلطنت قائم ہوئی تو اس نے اپنے مجاہد بیٹے شہزادہ محمد شہید کو ملتان کا حاکم مقرر کیا ۔ شہزادے کے دربار میں امیر خسرو اور حسن سجزی ایسے شعراء بھی موجود تھے ۔ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریاؒ کا وصال ۱۲۶۲ء میں ہوا تھا ۔ مفتوح منگول جو پنجاب میں آباد کر دیے گئے تھے ، ان کو اسلام سے متعارف کرانے اور قرامطہ کی درستیٔ عقاید کے سلسلہ میں آپ نے بڑا کام کیا تھا ۔ ان کے جانشینوں کی وجہ سے سہروردی سلسلۂ طریقت کے مبارک اثرات بدستور ادھر ادھر پھیلتے رہے ۔ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد مختلف گورنروں کی عملداری رہی حتیٰ کہ ۱۴۴۰ء (یا ۱۴۵۴ء) میں سندھ کا لنگاہ خاندان ملتان کی مسندِ اقتدار پر قابض ہوگیا ۔ یہ خاندان ۱۵۲۶ء تک حکمران رہا ۔ اس خاندان نے فوجی انصرام و انتظام کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن اور علم و ادب کی ترویج و ترقی پر بھی زور دیا ۔

مغلوں کے عہد میں بھی ملتان کی عظمت برابر قائم رہی ۔ بابر نے ملتان اپنے بیٹے مرزا عسکری کو عطا کیا اور ہمایوں نے مجبور ہو کر یہ شہر اپنے بڑے بھائی کامران مرزا کے حوالے کر دیا ۔ جب ہمایوں ایران میں تھا تو ملتان پر فتح خان بلوچ نے قبضہ کر لیا جسے شیر شاہ سوری نے شکست دی ۔ ابوالفضل نے ' آئین اکبری ' میں ملتان کو ایک عظیم

صوبہ قرار دیا ہے ۔ یہاں چاندی اور تانبے کے سکوں کے لیے ٹکسال تھی اور قاضی القضاۃ بھی رہے تھے ۔ مغلیہ دور میں ملتان پہلے کی طرح ایک اہم تجارتی اور تہذیبی و ثقافتی مرکز بھی تھا ۔

نادر شاہ کے حملۂ ہند (۱۷۳۹-۸ء) کے بعد زاہد خان سدوزئی افغانستان اور ملتان کا صوبہ دار مقرر ہوا ۔ چنانچہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں ملتان پر حملہ کیا تو سدوزئی قبیلہ کا نامور اور دلیر حکمران نواب مظفر خان وہاں دادِ حکومت دے رہا تھا اور اس نے سکھوں کے دو حملے ناکام کر دئیے ۔ جب تیسری دفعہ وہ شکست کھا گیا تو ایک صاحبِ ایمان مجاہد کی طرح تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ سکھ کم و بیش تیس برس یہاں حاکم رہے اور انہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن اور عقائد و اقدار کو نقصان پہنچانے کی بڑی کوشش کی ۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے ملتان اور اس کے نواح پر قبضہ کیا ۔ تو فرنگی تہذیب و تمدن کے اثرات شروع ہو گئے ۔ جدید رجحانات نے انداز فکر کے ساتھ زبان و ادب کو بھی متاثر کیا ۔ ۱۹۴۷ء میں دولتِ خداداد پاکستان کا قیام عمل میں آیا ۔ ہندو چلے گئے اور ان کی جگہ یو پی ، سی پی ، دکن ، راجستھان اور مشرقی پنجاب کے علاقوں سے مسلمانوں کے غول کے غول ہجرت کر کے آگئے ۔ سرائیکی علاقوں میں ایک نیا ماحول پیدا ہوا ۔ آنے والوں کی زبانیں سرائیکی سے مختلف ضرور تھیں مگر ان کے کم از کم چالیس فیصد الفاظ آج بھی سرائیکی میں مروج اور مقبول ہیں ۔

سرائیکی زبان کی ابتدا اور نشوونما

وادیٔ سندھ کی تہذیب نے ملتان کو جو زبان دی اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ اس زبان کے بچے کھچے الفاظ ضرور اب بھی استعمال ہو رہے ہوں گے ۔ برّصغیر میں آریاؤں سے پہلے کی جو اقوام موجود ہیں ان کے ذخیرۂ الفاظ میں وہ قدیمی اساسی الفاظ آج بھی یقیناً زیادہ تعداد میں ہوں گے ۔ ممکن ہے سمیری تہذیب نے بھی اس ذخیرے میں اضافہ کیا ہو ۔ لیکن وادیٔ سندھ کا رسم الخط جب تک پڑھا نہیں جاتا حتماً کچھ کہنا محال ہے ۔ البتہ آریاؤں کی آمد کے بعد یہاں کی زبان ویدوں کی زبان سے متاثر ہوئی اور اس طرح نظر آتا ہے کہ جب ملتان شہر ہندوؤں کا ایک متبّرک مقام بن گیا اور سورج دیوتا کی پرستش کا مرکز بنا تو یہاں برہمنوں کی کافی تعداد رہنے لگی ہوگی ۔ مگر چونکہ سنسکرت اہلِ علم کی زبان تھی ۔ اسی لیے عوام تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مہاتما بدھ نے سنسکرت کی بجائے عوامی زبانوں کو تبلیغ کا ذریعہ قرار دیا ۔ اور اس طرح ایک نئی زبان پیدا ہوئی جو پالی کہلاتی تھی ۔ اشوک کے عہد میں بدھ مت کو عروج حاصل ہوا تو ملتان

شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں بھکشوؤں کی ایک بھاری تعداد پہنچ گئی ۔ بعد میں کنشک کے زمانہ میں بدھ مت کو نئی زندگی حاصل ہوئی ۔ بدھوں کے مقامی زبانوں سے سروکار رکھنے کے باعث جہاں ادھر اُدھر کی مقامی زبانیں ترقی کر رہی تھیں ، لازماً سرائیکی زبان بھی ارتقاء کے مراحل طے کرنے لگی ۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے پالی کوئی خاص زبان نہ تھی بلکہ مقامی زبانوں کا ملغوبہ تھی ۔ یہ علیحدہ سوال ہے کہ اس میں بعض مقامی زبانوں کا زیادہ دخل تھا ۔ اس لحاظ سے پالی زبان نے بھی سرائیکی کو مزید فروغ عطا کیا ۔

برِصغیر میں ہر طرف پالی زبان کے پھلنے پھولنے اور مقامی زبانوں کے نشو و نما پانے کا مسئلہ علوم السنہ کے ماہرین کی توجہ کا مورد بنا رہا ہے ۔ یہ سب کچھ سنسکرت کے زندہ زبان کی حیثیت سے خاتمہ کے بعد ہوا اس لیے ہندو ماہرین زبان۱ مقامی زبانوں کے اس طرح نشو و ارتقاء کو حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور اسی عمل کو زبانوں کے بگاڑ سے تعبیر کرتے رہے ہیں ۔ ان کے خیال کے مطابق سنسکرت ایسی پوتر زبان کی بجائے چرواہوں ، کسانوں اور غیر متمدن دیہاتیوں کی زبان کا اختیار کرنا ''منہ کے بل گرنا'' ہے ۔ ان کی 'اپ بھرنش' اصطلاح کے لغوی معنے یہی ہیں ۔ اس مفروضے کی بنا پر انہوں نے ایک ''اپ بھرنش'' عہد مقرر کیا ۔ ''اپ بھرنش'' زبانوں کے انہوں نے مختلف نام رکھے اور ہندی ، پنجابی ، سرائیکی وغیرہ زبانوں کے مراحل ارتقاء پر بحث کی ۔ 'اپ بھرنش' کے لغوی معانی سے قطعِ نظر مقامی زبانوں کے ارتقاء کے متعلق ہمارے مذکورہ بالا خیالات حقیقت کا اظہار بہتر طور پر کرتے ہیں ۔ بنابریں یہ نظریہ کہ اپ بھرنش زبانیں یا پراکرتیں لازماً ادبی زبان کی بگڑی ہوئی شکل ہوتی ہیں ، غلط ہے اور یہ کہنا بالکل درست ہے کہ تاریخی اور تہذیبی تقاضے زبانوں میں ردّ و بدل کر کے انہیں زندہ رہنے کے اہل بناتے ہیں ۔ یہ ایک قدرتی عمل ہوتا ہے اور ہمیشہ جاری رہتا ہے ۔

جنوبی سندھ کے مشہور علاقہ ''لاڑ'' میں جھبیل یا جھبیر قوم کے ہزاروں افراد موجود ہیں ۔ بہاول پور ، ملتان اور پنجاب میں بھی اس قوم کے افراد پائے جاتے ہیں ۔ ان کا پیشہ زیادہ تر ماہی گیری ہوتا ہے ۔ یہ پساچ لوگ ہیں جو دردستان سے آئے ، جس میں کشمیر ، گلگت اور چترال کے علاقے شامل ہیں ۔ دردستان کے لوگ غیر آریا ہیں ۔ ہندوستانی اہلِ قلم نے انہیں نفرت کی بنا پر ''کچا گوشت کھانے والے دیو'' کہا ۔ ان کی زبان جو پساچی یا دردی کہلاتی ہے ، بعض مخصوص صفات رکھتی ہے ۔ یہ صفات ان نووارد پساچ لوگوں کی وجہ سے ادھر بھی نفوذ کر گئیں ۔ ہندوستان کی باقی تمام زبانوں میں ہم اور تم استعمال ہوتے ہیں مگر

۱- بھیرو مل مہر چند ، سندھی بولی کی ادبی تاریخ - ص ١٩ ، ٦٨ ، ٧٢ ، ٧٩ -
تقریرات بھنڈارکر (انگریزی) - ص - ٢٣٢ -

ملتانی ، سندھی نیز لہندا اور پنجابی میں خود دردی قسم کے ضمائر شخصی کا رواج ہے۔ ظاہر ہے دردی زبان کے اثرات سندھی اور سرائیکی دونوں زبانوں نے قبول کیے۔ اسی لیے سرائیکی زبان میں پساچی اپ بھرنش کے عناصر خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ ان کے ساتھ دراوڑی زبان کے بچے کھچے الفاظ (جن کی صحیح نوعیت ہمیں معلوم نہیں) بھی شامل کر لیے جائیں تو ہمیں سرائیکی زبان کی اساس مل جاتی ہے۔

دراوڑی ، پساچی ، سنسکرت اور پالی کے علاوہ سرائیکی زبان میں قربِ مکانی کی وجہ سے سندھی کے عناصر بھی موجود ہیں لیکن جن زبانوں نے سرائیکی کے ذخیرۂ الفاظ میں معتدبہ اضافہ کیا وہ عربی اور فارسی ہیں۔ عربی کے اثرات محمد بن قاسم کے زمانے سے شروع ہو گئے تھے اور مرورِ ایام سے گہرے ہوتے چلے گئے۔ جب یہ علاقہ یعقوب بن لیث کی مملکت میں شامل ہوا تو فارسی زبان کا اثر و نفوذ بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ غزنویوں کی آمد سے پہلے منصورہ اور ملتان میں فارسی بھی بولی جاتی تھی اور پھر غزنویوں کے بعد اٹھارھویں صدی کے اختتام تک ملتان فارسی زبان کا مرکز بنا رہا۔ سکھوں کی دفتری زبان بھی فارسی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی کافی عرصہ تک ملتان بلدیہ کی کاروائی فارسی زبان میں لکھی جاتی تھی۔ ان حالات کی بنا پر فارسی کے الفاظ سرائیکی میں برابر شامل ہوتے رہے اور مسلسل اور متواتر استعمال کی وجہ سے اس کا مستقل سرمایہ بن گئے۔ ملتان میں قرامطہ کی حکومت بھی رہی ہے۔ وہ شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ ان کی وجہ سے مرثیہ خوانی شروع ہوئی ، جو آج بھی اس علاقہ میں رائج ہے اور سرائیکی زبان کی فطری اثر انگیزی کی وجہ سے بڑا درد و سوز رکھتی ہے۔

مسلمانوں کا زمانہ آیا تو جلد یہ شہر اسلامی فقر و تصوّف کا مرکز بن گیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور شاہ رکن عالم کے مقبرے صرف ملتان کی عظمت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اس بات کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اس شہر کو فقر و تصوّف سے خاص مناسبت حاصل ہے۔ اسی مناسبت کی بنا پر سرائیکی زبان کو علی حیدر ایسا صوفی منش شاعر ملا۔ عہدِ حاضر میں بھی یہ خصوصیت قائم رہی اور سرائیکی زبان کے ایک نامور صوفی شاعر خواجہ غلام فریدؒ پیدا ہوئے جن کے کلام کی روح متصوّفانہ ہے اور جن کا اسلوب جمال آفرینی کرتا ہے۔ ظاہر ہے سرائیکی ادب کی نشو و نما میں تصوّف نے اہم کردار انجام دیا ہے۔

سرائیکی عہد بہ عہد

(ابتدائی عہد سے ۱۸۵۷ء تک)

قرونِ وسطیٰ میں طویل جملوں کو مختصر اور جچے تلے لفظوں میں ادا کرنے کا

عام رواج ہو گیا تھا۔ سرائیکی زبان اس سلسلے میں بر صغیر کی تمام زبانوں کی پیشرو نظر آتی ہے سرائیکی زبان کی کہاوتیں ، ضرب الامثال ، محاورات اور پند و نصائح آج بھی ہزاروں کی تعداد میں مقبول و مروّج اور زبان زد عام و خاص ہیں ۔ ان کہاوتوں میں بڑی بڑی فلاسفی سموئی ہوتی تھی ۔ نیز ان میں زندگی کے اصول و قواعد پنہاں ہوتے تھے ۔ سرائیکی زبان کی ایسی کہاوتیں یا سوتر اگر یکجا کیے جائیں تو بلا مبالغہ بیس ہزار (۲۰،۰۰۰) کے لگ بھگ ہوں گے اور بلاشبہ اتنی تعداد کسی بھی عظیم سے عظیم زبان کے الہامی جملوں یا حکمت و دانش سے پر ادبی ، علمی ، قومی، سیاسی اور طنزیہ ضرب الامثال کی نہیں مل سکتی، چنانچہ مغربی ماہرینِ لسانیات نے جو ضرب الامثال جمع کی ہیں ان کی تعداد بھی آٹھ ہزار(۸۰۰۰) سے کم نہیں ہو گی ۔ نمونہ کے طور پر ہم یہاں چند ضرب الامثال پیش کرتے ہیں ۔ ''آپ کلیجی نے ویڑے ڈوہ'' (بے شرم خود اور الزام محلے داروں پر)، ''اٹھ دا لاڈ کچاوا ترٹے'' (اونٹ نے تو لاڈ کیا اور محمل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی) ۔ ''ادھ ٹن کھوتی پنج ٹن بار'' (کمزور جان گدھی پر جس کا اپنا وزن آدھ من ہو پانچ من وزن لاد دیا)۔ ''بھاہ دا سڑیا ٹنڈانے کنوں ڈر جدا) (آگ کا جلا جگنو سے ڈرے) ، ''بکھا کراڑ پڑانیاں وہیاں پٹے'' (بھوکا ساہوکار پرانے بہی کھاتوں کو الٹے) ، ''دغلق وٹا و نگار سیداں سنج کیتی چودہار'' (سلطان تغلق نے تو کبھی کبھار بیگار لی مگر ساہانِ سادات یا تغلق کے سیّد منصبداروں نے بادشاہ کی دیکھا دیکھی روز کی بیگار لے لے کر چاروں طرف ویران کردیے) ''چٹی پئی مہراں تے مہراں رکھی شہراں تے'' (بادشاہ وقت نے نو تاوان جاگیردار مہروں پر ڈالا اور مہروں نے شہر والوں سے وصول کیا) ۔

ان کہاوتوں سے دوسرے نمبر پر سرائیکی ادب کی وہ قدیم صنف جسے سابق سندھ اور بہاولپور میں اب تک ''لولی'' اور ملتان ، مظفر گڑھ اور ڈیرہ جات کی طرف ''ڈوہڑا'' کہا جاتا ہے ۔ یہ دو مصروں کا قدیم لوک گیت ڈوہڑا یا لولی آج بھی اپنی قدیم ہیئتِ زبان اور موضوع کو جوں کا توں محفوظ کیے ہوئے ہے ۔ ماہرینِ لسانیات کے نزدیک قدیم زبان سے قدیم ادب کا نمونہ اس وقت یہی چند دو مصرعی دوہے (ڈوہڑے) موجود ہیں ،

یہ دوہے بلوچستان ، لس بیلہ ، کچھی ، تھرپارکر اور سندھ کے سرائیکی علاقوں سے لے کر صوبۂ سرحد کے ہندکو علاقوں تک ایک ہی ہیئت ، ایک ہی موضوع اور یکساں جذبات سے بھرپور ماہی گیروں ، کسانوں اور چرواہوں کی زندگی کی جان اور تنہائیوں کے ساتھی ہیں ، ان کے عہد کا تعیّن مشکل بلکہ ناممکن ہے ۔ البتہ زبان و بیان ، بعض الفاظ اور شعری ہیئت کی کہنگی سے یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ سرائیکی کے یہ لوک گیت پالی عہد کی قریبی اپ بھرنش سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لیجیے چند ایک

لولیاں یا دوہے نفتن طبع کے لیے حاضر ہیں۱ :

اڈیاں نی کونجاں ، وچ ساوی کونجے
ہک نڈا وچھوڑا ڈوجھی وطن دی مونجھے

☆ ☆ ☆

پٹ دی چولی گھت گوڈیں تے سیواں
منگاں دعائیں منگ تیڈی میں تھیواں

☆ ☆ ☆

کھوہ نیڈے تے کوئی گادھی اکانہہ دی
وسر نہ ویسم تیڈی بسانھہ سراندی

☆ ☆ ☆

اچی کھجی دیاں کوئی لبیاں جھڑیاں
درس نہ آیو کھڑے ویلھے دی کھڑیاں

یہ تو تھے سرائیکی زباں کے وہ قدیم نمونے جن کے بارے میں اگرچہ کسی محقق ، مورخ اور ماہر لسانیات نے یہ حتمی فیصلہ نہیں کیا کہ یہ فلاں عہد یا دور کی سرائیکی زبان کا نمونہ ہیں ، البتہ قیاس اس امر کی شہادت ضرور دیتا ہے ، کہ یہ ڈوہڑے پالی کی قریب العصر اپ بھرنس کی ادبی یادگار اور قدیم سرائیکی اقوام کا تہذیبی ورثہ ہیں اور جب تک کوئی موثر شہادت نہ ملے اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے -

اب ہم اس سے ذرا آگے چلتے ہیں تو ان قدیم نمونوں کی باری آ جاتی ہے ، جن کے بارے میں مستند تاریخی حوالے اور ماہرین لسانیات کی شہادتیں ملتی ہیں - سرائیکی زبان کے قدیم تحریری سرمائے کے بارے میں ہمیں جو با وثوق ذرائع سے معلومات ملتی ہیں ان کا تعلق ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی سے ہے - سرائیکی اور سندھی علاقوں میں آج بھی ایک ایسی قوم آباد ہے جسے چاڑن کہا جاتا ہے - جو قدیم خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب اور کبت سنا سنا کر دان وصول کرتے رہتے ہیں - ہو سکتا ہے کہ لفظ ''اچارج'' اسی چاڑن سے ماخوذ ہو کیونکہ دت لوگ بھی شجروں کو محفوظ رکھتے اور کبت گاتے سناتے تھے - بعض کتب سے روایت ہے کہ دت عرب میں بھی مدتوں رہے ہیں اور واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دینے کی وجہ سے یزیدیوں نے انہیں بلوچ اقوام کے ساتھ سر زمین عراق سے ایران میں دھکیل دیا -۲ سرائیکی زبان کے ایک محقق اختر وحید مرحوم نے ان دتوں کے وہ کبت اپنی ملتانی گرامر میں نقل کیے ہیں ، جو دتوں نے واقعۂ کربلا سے متعلق نظم کیے - اختر وحید مرحوم ان کبتوں کو بکرماجیتی عہد سے قریب یعنی ۶۸۱ء کی سرائیکی شاعری کا نمونہ قرار دیتے ہیں -۳ اور غالباً یہ صحیح ہوگا کیونکہ ان کی زبان آج سے ہزار بارہ سو برس قبل کی معلوم ہوتی ہے - وہ کبت حسب ذیل ہیں :

۱- ڈاکٹر مہر عبدالحق، ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق، ص ۲۶۱ (قلمی نسخہ مصنف) -
۲- بلوچوں کی تاریخ قبائل کے آئینے میں ، جلد اول ، قلمی نسخہ مقالہ نگار ص ۱۵۰ -
۳- اختر وحید ' در گوہر (ملتانی زبان کے قواعد اور فرہنگ) ص ۹ مطبوعہ ملتانی ریسرچ اکیڈیمی ملتان -

سدہ جھوجھا کی انش میں دت نام سلطان　　سدہ ویوگ جو بیرجی عرب کیو استھان
رائے پن پن آتمی کریں دیس جو دھیان　　دھارو، میرو جودت ہیں عرب کیو استھان

☆ ☆ ☆

جٹے دت جو بیر سار دو ٹوک مچائی　　سب شترو کو مار بیچ رن پھرے دہائی
بجے بھیر کو چوٹ فتح میدان جو پائی　　بدلہ لیا دین کا دھن دھن کرے لوکائی

(سدہ جھوجھا اسم باسمّی بادشاہ کے خاندان میں دت نام کا ایک سلطان تھا جو سدہ یوگ جی کا گدی نشین تھا۔ اس نے عرب کو اپنا مستقر بنایا، اسی دت سلطان کی اولاد سے نیک سیرت رائے پن، بہادر دہارو اور میرو بھی عرب ہی میں قیام پذیر تھے کہ اُموی سلطنت کے ظالموں نے جور و ستم کا آغاز کیا۔ دتوں نے امامِ برحق کا ساتھ دے کر دشمنوں کو قتل اور ان پر خوف طاری کیا، جب فتح ہوئی تو جنگی نقارے بجے اور دنیا امامؑ کو بہادر بہادر کہنے لگی)۔ ان کبتوں میں سدھ، انش، بیر، جیے (جس نے) کیو (کیا) پن (دان پن) آتم۔ دیس۔ جو (کا) — دھیان۔ رن یا رُن۔ بھیر، بجے یا وجیے، چوٹ، دھن دھن، لوک یا لوکائی ایسے الفاظ خاص توجہ اور تحقیق کے مستحق ہیں یہ اس دور کی سرائیکی کا پتہ دیتے ہیں جب موجودہ سندھی اور سرائیکی ایک ہی زبان تھی اور اپنی الگ الگ ہیئت نہیں بنا پائی تھیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ سندھی ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ سرائیکی سے علیحدہ ایک مستقل زبان بن گئی۔ اسی لیے سندھی کی پرانی تحریریں سرائیکی سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر قاضی قاضن کا یہ بیت دیکھیے:

کنز قدوری کافیہ کے کین پڑھیوم　　سو پارئی پیو جیئاں پرین ء لـدھوم

(میں نے کنز قدوری اور کافیہ پڑھ کر محبوب نہیں پایا وہ بانیں ہی اور ہیں جن سے ساجن ملا کرتے ہیں)۔

یہ قاضی قاضن ۱۵۵۱ء میں فوت ہوئے اور ان کے بعد سندھی ادب حضرت شاہ کریم (بلڑی والے) کا کلام جو چند دوہوں پر مشتمل ہے پیش کر سکتا ہے۔ شاہ کریم کی ولادت ۱۵۳٦ء اور وفات ۱٦۳۳ء میں ہوئی۔ غرض یہ کہ سرائیکی زبان کی دوسری عظیم ہمعصر زبان سندھی کا تحریری ادب بھی زیادہ سے زیادہ چودھویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر تک کا ملتا ہے اور بس۔

سرائیکی میں مذکورہ بالا دتوں کے کبتوں کے علاوہ ایک ترجمۂ قرآن اور بہت سی رزمیہ طویل نظموں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ترجمۂ قرآن کی بابت اعجاز الحق قدوسی اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ "۸۸۳ء/۲۷۰ھ میں ہمیں ایک اور عراقی عالم

کا پتہ چلتا ہے ، جو تھے تو عراق ، مگر انہوں نے سندھ کے مشہور شہر منصورہ میں پرورش پائی تھی اور سندھ ہی میں پلے اور بڑے ہوئے تھے - ۸۸۳/۲۷۰ھ میں راجہ مہروک بن رائک ایک ہندو راجہ نے منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ہباری سے خواہش کی کہ وہ اسلامی عقائد اور تعلیمات کو سندھی میں ترجمہ کرا کے بھیجے تاکہ وہ اسلام کی حقیقت کو سمجھ سکے - چنانچہ حاکمِ مذکور نے انہی عراقی عالم کا انتخاب کیا اور انہوں نے ایک قصیدے میں اسلامی عقائد و تعلیمات کو نظم کر کے بھیجا اور پھر راجہ کی خواہش پر اس زمانہ کی سندھی زبان میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۱'' - یاد رہے کہ اس زمانے میں سندھی اور سرائیکی مختلف زبانیں نہیں تھیں - اس عہد کی رزمیہ نظموں کے بارے میں ڈاکٹر حامد علی خان لکھتے ہیں کہ میری نظر میں ہندوستان کا سب سے پہلا بلند پایہ عربی شاعر ہارون بن موسیٰ ملتانی ہے - جاحظ نے اس کو ملتان اور اس کے گرد و نواح کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے - اس کے قصائد اور مختلف عربی اشعار جاحظ نے 'کتاب کیواں' میں نقل کیے ہیں۲ - تمام مورّخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہارون عربی کے علاوہ مقامی ملتانی زبان میں بھی شعر کہا کرتا تھا اور مقامی بولی کے اشعار بزم سے زیادہ رزم سے تعلق رکھتے تھے - اس لحاظ سے گویا ہارون بن موسیٰ ملتانی ساتویں صدی عیسوی کا عظیم مذہبی سرائیکی شاعر تھا۳ -

دوسری اور تیسری صدی ہجری یعنی آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کے ان مصدقہ سرائیکی نمونوں کے بعد ہمیں کوئی خاص چیز تاریخ میں محفوظ نظر نہیں آتی ، البتہ عہدِ قرامطہ یعنی چوتھی صدی ہجری (۹۸۳ء سے بھی قبل) کے آغاز ہی میں ملتان اور نواح کے لوگ شیعیت اور اسماعیلیت کی طرف راغب ہوئے تو ایک جدید علمِ کلام اور انوکھے نظریات و افکار کی تبلیغ تقریروں کے علاوہ تحریروں سے بھی ہونے لگی اور آج بھی ادبیاتِ سرائیکی کا پورا نصف حصہ اسماعیلی قرامطی اور شیعی افکار و نظریات پر مشتمل نظر آتا ہے - سرائیکی نثر کو تو زندہ ہی شیعہ حضرات نے رکھا ہے ، ورنہ شاید نثر کا کوئی نمونہ محفوظ نہ رہتا - قصائد و مراثی کی سینکڑوں کتابیں مدتوں سے چھپ رہی ہیں اور ایک ایک کتاب کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں - شیعی سرائیکی ادب کی اس کثرت کا آغاز یقیناً قرامطی اقتدار سے ہوا ہوگا اور محمود غزنوی کے حملوں تک سرائیکی زبان بس قرامطیوں اور اسماعیلیوں ہی کی خدمت انجام دیتی رہی -

---

۱- علمائے سندھ ، ماہنامہ آستانہ زکریا ملتان بابت ماہ جولائی ۱۹۵۸ء -
۲- ہندوستان کے عربی شعراء ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ جولائی ۱۹٦۸ء -
۳- ابو ظفر ندوی ، تاریخ سندھ ، ص ۳۵۸ تا ۳٦۰ مطبوعہ اعظم گڑھ -

محمود غزنوی نے پہلی بار جب ۳۸٦ھ/۱۰۰۵ء میں اور دوسری بار ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں ملتان اور اچہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرامطہ کا سیاسی اور تہذیبی اقتدار ختم کر دیا۱ تو سرائیکی زبان اور تمدن نے ایک نئی کروٹ لی اور عربی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ بشاری المقدسی جب یہاں وارد ہوا ہے تو ملتان اور نواح میں فارسی زبان کو مروج پایا۲۔ یہی وہ دور ہے جس میں مقامی بولی سرائیکی نے عربی فارسی کے ساتھ مل کر ایک نئی زبان ''ریختہ'' تیار کی جسے بعد میں سلاطین نے لشکروں میں عام مستعمل ہونے کی وجہ سے ''اردو'' کا نام دیا۳۔ غزنوی خاندان کے ایک شاعر مسعود سعد سلمان کے کلیات میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں سرائیکی زبان کے الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑا گیا ہے گویا امیر خسرو سے بھی قبل غزنوی دور کے شعراء نے سرائیکی اور فارسی کی آمیزش کا عمل شروع کر دیا تھا۴۔

محمود غزنوی کے خاندان کے زوال کے بعد نواحِ ملتان، اچہ اور سندھ پر بھٹی راجپوتوں کے ایک قبیلے ''سومرہ'' کا اقتدار قائم ہو گیا۔ یہ قبیلہ قرامطہ کی تبلیغ سے مسلمان ہوا مگر ان کی تہذیب و ثقافت ہندوانہ تھی۵۔ ان کی سرکاری زبان بھی غالباً سرائیکی تھی۔ کیونکہ ریاست بہاولپور کے ایک قدیم قلعہ ''مروٹ'' کے دروازے سے جو اینٹ برآمد ہوئی ہے اس پر دیوناگری رسم الخط اور سرائیکی زبان میں کندہ ہے کہ ''اس قلعہ پر جام سومرا کا قبضہ رہا ہے اور جام سومرا نے ۱۰۹۱ء میں اس قلعہ کی مرمت کروائی تھی'' ٦۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سومرہ حکمرانوں کے عہد میں ملتان اور سندھ کی سرکاری اور دفتری زبان سرائیکی تھی، ورنہ شاہی قلعوں اور یادگار عمارتوں پر سرائیکی زبان میں کتبات کندہ کرانے کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جا سکتی!

غزنوی عہد ہی میں برِصغیر کے ایک نامور بزرگ شیخ الاسلام غوث العالم

۱- معجم الامکنہ، طبقات ناصری، اور تاریخ یمینی۔
۲- بشاری، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع لیڈن ص ۴۸۱۔
۳- پیر حسام الدین راشدی، اردو کا مولد۔ مطبوعہ رسالہ ''اردو'' کراچی، اپریل، ۱۹۵۱ء۔
۴- ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کا مسعود سعد سلمان پر مقالہ مندرجہ اورینٹل کالج میگزین لاہور۔
۵- البیرونی، کتاب الہند۔
٦- مسعود حسن شہاب، خطۂ پاک اوچ ص ۲۹۷ مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹٦۷ء

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا خاندان غزنوی سلاطین کی دعوت پر ملتان کے نواح ''کوٹ کروڑ'' میں آ کر آباد ہوا - حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے ایک معتقد اور ان کے نامور پوتے حضرت قطب الاقطاب رکن عالم ملتانی کے خلیفۂ مجاز شیخ الاسلام مخدوم حمید الدین الحاکم الہنکاری کے تمام تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ سلطان شمس الدین التمش کی جانب سے اچہ اور بکھر کے درمیان کا علاقہ بطور جاگیر مخدوم الحاکم کو پیش کیا گیا جسے آپ نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ قاضی رفیع الدین عبّاسی کے مجبور کرنے پر قبول فرما لیا - آپ کا پایۂ تخت مئو مبارک تھا - جو سندھ کے قدیم قلعوں میں سے ایک تاریخی قلعہ ہے، اسی مئو کے نواح میں سے ایک قصبہ ولہر یا ولہار واہن تھا (جو ہو سکتا ہے کہ موجودہ ولہار ہو جو مئو سے قریب پڑتا ہے اور ریلوے اسٹیشن بھی ہے) ولہر یا ولہار واہن کی اراضی قاضی کبیر کے زیر کاشت تھی - چنانچہ حضرت حمید الدین الحاکم کے عاملوں نے قاضی کبیر پر کچھ سختی کی تو قاضی کبیر حضرت الحاکم کے مرشدِ طریقت حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس شکایت لے گئے - حضرت زکریا ملتانی نے مخدوم الحاکم کو ایک مکتوب لکھا جس میں ایک قطعہ یا ڈوہڑا (دوہا) ، رائیکی زبان کا بھی تفنّنِ طبع کے لیے لکھا - دونو بزرگ بہترین ذوق شعری کے مالک اور اپنے وقت کے بلند پایہ فارسی شاعر بھی تھے، اگرچہ یہ قطعہ ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز کا ہے اور کم سے کم پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کی سرائیکی زبان کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، مگر اپنی سلاست، زبان و بیان اور شعری ہیئت کے لحاظ سے موجودہ سرائیکی زبان و ادب سے بھی کافی مماثلت اور مطابقت رکھتا ہے - حضرت زکریا ملتانی کا دوہا اور حضرت الحاکم کا جوابی دوہا دونو پیش خدمت ہیں اور ان دونوں دوہوں سے آپ پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) سے ساتویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) تک کی سرائیکی زبان کی ہیئت ساخت اور کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں[۱] :

حاکم آپ ہیں، حکم آپ (کریں آپ) وچار جے دن گانوں سے کئی ولہر ولار
جے دن لدھیا مندے نہ ہار جیں ٹانگ نہ تو لہاسے کیو ید لنگھسن پار

حضرت حاکم کے جوابی دوہے کا ایک مصرعہ قدیم قلمی کتابوں میں نذر کرمِ کتابی ہوگیا باقی تین مصرعے جو محفوظ رہ سکے ہیں حسب ذیل ہیں :

۱- نور احمد خان ، سیرت حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رہ ، ص ۱۸۲ ، مطبوعہ قصر الادب جگو والہ ملتان ، بحوالہ ''تاریخ جلیلہ'' از پیر غلام دستگیر نامی و تذکرۂ حمیدیہ شیخ شہر اللہ و تذکرہ قطبیہ شیخ جمال الدین ابوبکر رہ -

حاکم آپ ہیوحکم کرو(کیہا) میں وچار جنہاں اللہ تعالیٰ منہا اتے نبی محمد ، یار
جنہاں ٹانگ نہ تو لہاسے بھی لنگھسن پار ۱ —— ؟ ——

(میرے حضرت! حاکم توآپ ہیں اور حکم بھی آپ کا ، میں بے چارا کیا غور کر سکتا ہوں۔ البتہ میں اہلِ دنیا کے برعکس اللہ تعالیٰ کو اس کے نبیؐ کو اور چہار یار رسولؐ کو دل سے مانتا اور ان کے طرزِ عمل کو اپناتا ہوں ۔ اگرچہ موت اور برزخ کے دریا کو پار کرنے کا ظاہری سامان کچھ بھی نہیں رکھتا ، مگر سنا ہے کہ کچھ بے سازوسامان لوگ بھی پار اتارے جائیں گے !)

حضرت زکریا ملتانی کی ولادت ۱۱۷۰ء/۵۶۶ھ اور وفات ۱۲۵۹ء/۶۵۸ھ میں اور حضرتِ حاکم کی ولادت غالباً ۱۱۷۴ء/۵۷۰ھ ہے ۔ گویا آپ ''ہیں''، ''وچار''، ''دن یا دنیا''، ''گانوں''، ''کئی''، ''ولارن''، '' جے''، ''لبھن''، ''مٹن''، ''ہارن''، ''ٹانگ''، ''تولھا''، ''کیویں''، ''لنگھن''، ''پار''، اور ''سے بھی'' ایسے خالص سرائیکی الفاظ جو آج بھی فصیح اور ادبی زبان میں استعمال ہوتے ہیں ۔ چھٹی صدی ہجری یعنی بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بھی مروّج اور مستعمل تھے ۔

انہی حضرت حمید الدین الحاکم کے پیرو مرشد اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نامور پوتے حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم کی تاریخِ وفات سرائیکی زبان کے ایک قریب العصر بلکہ ہمعصر شاعر نے کہی جو خاندان غوثیہ کے ایک نامور خلیفہ میاں محمد افضل نے اپنی قلمی کتاب 'خلاصۃ الاحباب' (مرتبہ ۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ) میں نقل کی ہے ۔ بدیں الفاظ کہ ''چنانچہ عزیزی'' در زبانِ ہندوی در تاریخِ وفات ایشاں یک بیت گفتہ است'' (چنانچہ ''عزیزی'' تخلص کے کسی بزرگ یا ان کے عزیزوں میں سے کسی ایک نے ان کی تاریخ وفات ہندوی زبان میں کہی ہے جو ایک دوہے کی شکل میں ہے) :

ست سیے پنجتریہا سن تے ستویں ماہ جمادی الاولیٰ
چلو تاں سنیہوں ویکھن جاووں ستّا شاہ جلولا ۲

''ست سیے'' (سات سو) ، پنجتریہ (پینتس) ، ستویں (ساتویں) ، چلو تاں (چلیے تو) سنیوں (سیّو سکھیو!) ، ویکھن یا ڈیکھن (دیکھنے) ؛ جاووں (چلیں) ، ستا یا لیٹیا (سو رہا یا لیٹ رہا ہے) یہ الفاظ آج بھی اسی ہیئت اور انہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں ۔

۱- نور احمد خان فریدی ' تذکرہ قطب الاقطاب شاہ رکن عالم ملتانی'' مطبوعہ قصر الادب جگو والہ ملتان طبع اول ص ۳۰۶ -

۲- محمد افضل خلیفہ ' خلاصہ الاحباب (قلمی نسخہ ملکیہ مقالہ نگار) سال ۱۱۶۶ھ ، ص ۱۷۲ و تذکرۂ قطب الاقطاب شاہ رکن عالمرہ ملتانی از نور احمد خان فریدی مطبوعہ قصر الادب جگو والہ ضلع ملتان ص ۲۵۷ -

اس دور کی مستقل تصانیف بلاشبہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گی کیونکہ سرائیکی زبان میں تصنیف و تالیف کے عام رجحانات کے ثبوت کثرت سے ملتے ہیں مگر ملکی انتشار ، خلفشار اور افرا تفری کے باعث کوئی بھی شاہکار اس وقت سوائے 'نور ناموں' و 'معراجناموں' کے نہیں ملتا ۔ 'نور نامہ' ایک ایسی مذہبی نظم ہے جس میں "تخلیقِ کائنات" کا اسلامی فلسفہ بیان کیا گیا اور حدیثِ لولاک کی تشریح کی گئی ہے ۔ شاعر نے نظم کے متن ہی میں سبب تصنیف کے ساتھ سنِ تصنیف بھی بیان کر دیا ہے ۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ :

پنج سے سال جو گذرئیے آہے ہجرت بعد رسولوں
ملاں کہے غریب وچارا کم علماواں کولوں
نیکی عمل نہ کتم کوئی سامنے نفس جھولوں
عمراں گذری تے پچھتانواں ، بہرہ لبھاں قبولوں
جو کجھ روئے زمین تے پیدا سب کجھ ہوسی فانی
نام نشان نہ رہسی کائی جز ایمان نشانی۱

قدامت کے لحاظ سے مستقل سرائیکی تصانیف میں 'نور نامہ' کو شرفِ اوّلیت حاصل ہے ۔ یہ ۱۱۰۷ء — ۱۱۱۱ء/۵۰۱ھ — ۵۰۵ء کے درمیان کی تصنیف ہے ۔ اس کے مصنف حضرت ملّا ایک اچھے قادر الکلام شاعر نظر آتے ہیں ۔ دوسری زبانوں کے ادبی سرمایہ سے اس کا تقابل کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے ۔ دیکھئے زبان میں کس قدر سلاست ، تخیل میں بلندی اور تشبیہوں میں پاکیزگی کی جھلک ہے :

شرم کنوں ڈوں اکھیں پیدا رنگ بہشتی عنبر
عبرت دے ڈوں کن سنوارئیے نبی رسولؐ پیغمبر
ڈوں لب نبی محمدؐ سندے بیدا از تسبیحاں
ذکر خدا زبان سنوارئیے ایہہ حدیث صحیحاں

'نور نامہ' کی دوسری قریب العہد نظموں میں سے پرگنہ چانڈکو (جسے میراں تالپور کے عہد میں پرگنہ بھونگ بھارہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جو اب ریاست بہاولپور تحصیل صادق آباد میں شامل ہے) کے ایک نامور چانڈیہ شاعر 'اعظم' کا 'حلیہ مبارک' اور اسی پرگنے کے ایک دوسرے چانڈیہ بزرگ حضرت میاں قبول کا 'معراجنامہ' اور دودے شاہ کا 'معجزۂ معراج' قابلِ ذکر ہیں ۔ ان تینوں مستقل نظموں کا اندازِ بیان ،

۱۔ نور نامہ سرائیکی (قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۸۰ھ ملکیہ مقالہ نگار ص ۱۵ ۔

موضوع ہیئت اور زبان چھٹی صدی ہجری یعنی بارھویں صدی عیسوی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور مقامی روایات بھی بتاتی ہیں کہ اعظم اور قبول حضرت پیر موسیٰ نواب علیہ الرحمۃ سہروردی کے خلفاء میں سے تھے اور حضرت پیر موسیٰ نواب غوث العالم شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے عم‌زاد بھائی تھے۔ حضرت موسیٰ نواب باتفاق راے۱۲۱۵ء/۶۱۲ھ میں یا اس سے کچھ قبل ملتان سے خرقۂ خلافت لے کر چانڈکو پرگنہ کے ایک قریبی تاریخی قلعے ''سیوراہی'' میں قیام پذیر ہوچکے تھے۔ جہاں اچہ سے لے کر ساحلِ مکران (پورے سندھ) تک کے لوگ ظاہری و باطنی فیوض کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اسی دوران میں چانڈکو کے سردار گھرانے میں سے محمد اعظم خان چانڈیو اور محمد قبول خان چانڈیو بھی حضرت سخی پیر موسیٰ نواب کی خدمت میں حاضر ہو کر سہروردی سلسلے میں بیعت ہوئے اور موتراشی کرائی، یہ دونو عظیم شاعر آخری عمر میں بیعت ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی نظموں کا دور چھٹی صدی ہجری بارھویں صدی عیسوی کا نصف آخر متعین کیا جا سکتا ہے۔ اب لیجیے سب سے پہلے اعظم کے 'حلیۂ مبارک' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور شاعر کے تخیل کی بلندی اور بندش کی پختگی کی داد دیجیے۱:

ویکھ جمال نبی سرورؐ دا سجھ تے چن شرماوں
حور ملائک صدقے جاون پریاں گھول گھماوں
بدن مبارک حضرت سرورؐ آہا عیبوں خالی
خالق خلقی سبھو سھنی صورت سوہنے والی

بلوچستان کے نامور قبیلہ ''چانڈیہ'' کے مردِ درویش اور حضرت موسیٰ نوابؒ کے خلیفۂ خاص حضرت قبول فقیر کا 'معراجنامہ' اور 'نورنامہ' سے بھی زیادہ فصیح و بلیغ ہے اور چھٹی صدی ہجری بارھویں صدی عیسوی کی سرائیکی شاعری کا نادر نمونہ ہے۔ البتہ اس میں 'حلیۂ مبارک' کی طرح عربی فارسی کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ اس دور میں مقامی بولی پر سب سے زیادہ رنگ انہی زبانوں کا چڑھ رہا تھا:

سبھو راز در راز نکتہ بیان — وہم آدمی دا کیا کرسی عیاں
سنبھالیں قبولا عقل! ہوش کن — نہیں جاہ تیری توں خاموش کن!
ڈھان گھٹ لکھ کاہل کیتی خدا — نبی محمدؐ کوں ڈتس جزاء
امت بخشا ولیا حبیب خدا — کنڈی ہلدی آہی پانی وہنداہا
الٰہی بحرمت محمدؐ رسول — ڈیویں بخشش سیتی ایمان قبول

۱۔ مجموعۂ حلیۂ مبارک و معراجنامہ وغیرہ مطبوعہ ملتان ۱۸۹۰ء، ص ۱۲، و قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۸۰ھ ملکیہ مقالہ نگار ص ۲۰۔

ساتویں اور آٹھویں صدی کے متفرق نمونے

چانڈکو ریاست کے ایک قریبی علاقے صادق آباد کی کارداری میں پتن پور یا پتن منارا کے نام سے ایک تباہ شدہ شہر کے کھنڈرات سے ایک کتبہ ملا ہے ، جس پر سرائیکی کے چند شعر مرقوم ہیں ۔ پتن منارا سومروں کا دارالخلافہ تھا اور ان شعروں میں ایک ہندو سوامی نے اپنا گھوڑا چوری ہونے پر سومروں کے نامور حکمران جمیر یا ہمیر کی ہجوکی ہے ۔ اشارۃً اس کے وزیر دھورا رائے کی بھی مذمت کی ہے ۔ یہ اشعار آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں لکھے گئے ہیں کیونکہ راجہ جمیر کی وفات ۱۳۵۱ء/ ۷۵۲ھ میں ہوئی ہے[1] ۔

ان اشعار کی زبان سندھی آمیز سرائیکی ہے ، اسعار اور ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے :

دھاڑی دھوڑا رائے جنہیں چڑن سان کھہیا
پتن پٹیپو پہو سندھ و ٹایو راہ
ہمبر آبورا راج نہ کندا سومرا

دھاڑا (ڈکیتی) ، جنھن (جس یا جو) ، کھہن (چھیڑ چھاڑ کرنا) ، پٹن یا پٹیجن (شہر کا الٹ جانا یا غرق ہونا) ، راہ وٹاون (راستہ تبدیل کرنا) ، راج کرن (حکومت کرنا) ، یہ تمام الفاظ آج بھی سرائیکی اور سندھی دونو زبانوں میں مستعمل ہیں البتہ ''بیو'' (دوسرا) ، سان (کے ساتھ) اور ''کندا'' (کریں گے) فقط سندھی میں مستعمل ہیں ۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اچوی ۱۴ شعبان المعظم ۱۳۰۸ء/۷۰۷ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۸۴ء/۷۸۵ھ میں ان کا وصال ہوا[2] ۔ آپ سے اگرچہ سرائیکی زبان کی کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں، البتہ آپ کے ملفوظات میں بہت سے سرائیکی فقرے اور جملے اب تک محفوظ چلے آ رہے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی میں نہایت شستہ و شگفتہ سرائیکی بولی جاتی تھی، بلکہ آپ کے خاندان نے تو احمد آباد (گجرات)، جونپور اور بہار وغیرہ میں بھی جا کر سرائیکی زبان کے علم کو بلند کیا ۔ سیاحتِ گجرات کے دوران جب آپ ''بٹوا'' پہنچے تو جہاں آپ نے قیام فرمایا اسی جگہ کے متعلق کہا کہ ''اتھاں اساڈے ہاڈاں دی خوشبو ہے ۔'' حسنِ اتفاق کہ اسی جگہ پر آپ کے پوتے حضرت قطب العالم کا مزار بنا[3] ۔ ایک مرتبہ ایک خاص مرید سے کہا ''آساں وی جہانیاں

۱- ڈاکٹر سہر عبدالحق، ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق (قلمی نسخہ) ص ۲۲۱ ۔
۲- مولانا غلام حسنین پھلواروی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت ماہنامہ '' آستانہ زکریا '' ملتان ۔
۳- مناقب برہانی (ملفوظات حضرت قطب العالم رح) سید عبداللطیف رح بٹوی (تصنیف ۱۰۰۰ھ قلمی نسخہ) ۔

تساں وی جہانیاں''۔ اپنے چھوٹے بھائی راجن قتالؒ سے فرمایا کہ ''اساں خواجے تساں راجے''۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ جہاں گشت جب دہلی تشریف لے گئے تو شاہی مہمان تھے۔ چنانچہ اسی قیام میں سلطان فیروز تغلق کی عیادت کرتے ہوئے دریافت فرمایا کہ '' کاکا فیروز چنگاں ہے؟''[1]۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالخلافہ دہلی میں بھی یہ عام بول چال کی زبان مروّج و مستعمل تھی۔ خاص طور پر سلاطینِ دہلی کے محلّات اور مہمان خانوں میں ورنہ حضرت مخدومؒ کو اس زبان میں عیادت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

حضرت قطب العالم برہان الدینؒ اپنے جد امجد حضرت مخدوم جہانیاںؒ جہاں گشت کا مشن لے کر احمد آباد گجرات پہنچے اور مدّت العصر وہاں تبلیغ فرما کر مدفون بھی ''بٹوہ'' میں ہوئے۔ آپ سے ایک فقرہ ملفوظات میں منقول ہے[2] جس میں آج کی سی سرائیکی کی سلاست موجود ہے۔ آپ نے اپنے کسی فرزند کی پیدائش پر فرمایا کہ ''اساں تھیں وڈا تساں تھیں وڈا مخدوم جہانیاں آیا''۔ سلطان محمد تغلق نے ۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ میں سندھ پر حملہ کیا، مگر ناکام رہا اس افراتفری میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے بھی صلح و امن کی گفتگو فرما کر فریقین کو ٹھنڈا کیا تھا۔ بہر حال ان حملوں کی یادگار ایک فقرہ اب تک تاریخوں میں محفوظ چلا آتا ہے۔ ''برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا''۔ شیخ زادہ یعنی مخدوم جہانیاںؒ کی برکت سے ایک تو مر گیا (محمد تغلق) اور دوسرا بھاگ اٹھا (فیروز تعلق)۔ اس فقرہ سے آٹھویں صدی ہجری چودھویں صدی عیسوی کے سندھ اور ملتان کی مشترکہ زبان کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے[3]۔ حضرت حاجی صدر الدین چراغ ہندی، خلیفہ حضرت شاہ رکن عالم ملتانی (م - ۱۳۷۲ء/۷۷۴ھ) کے پوتے کو دیکھ کر شیخ حسام الدین صاحب مانکپوریؒ نے فرمایا کہ ''انشاء اللہ بڈھا ہوسی'' (یعنی خدا نے چاہا تو بوڑھا ہوگا)۔

شاہ شمس سبزواری کی گربھیاں

شاہ شمس سبزواری اسمٰعیلی گروہ کے ایک نامور مبلّغ گزرے ہیں، جو ایران سے اسمٰعیلیہ شیعی مذہب کی اشاعت کے لیے پہلے کشمیر اور پھر پورے پنجاب کی سیاحت کرتے ہوئے ملتان وارد ہوئے۔ مدّتوں ملتان میں رہ کر اسمٰعیلی مذہب کو پھیلایا، قرامطہ اور فاطمیہ

۱- مخدوم جہانیاں جہاں گشت از مقالہ نگار مندرجہ ماہنامہ آستانہ زکریا ''خطۂ پاک اوچ'' مسعود حسن شہاب، مطبوعہ اردو اکیڈیمی بہاولپور، ص ۳۷۸، و ''تذکرہ قطب الاقطاب'' از نور احمد خان فریدی وغیرہ۔

۲- سید عبدالطیف بٹوی رحؒ مناقب برہانی (قلمی نسخہ)۔

۳- حافظ محمود شیرانی رحؒ، ''پنجاب میں اردو'' بحوالہ تاریخ فیروز شاہی و ''اردو کا مولد'' پیر حسام الدین راشدی مندرجہ رسالہ ''اردو'' ماہ اپریل ۱۹۵۱ء۔

تحریک کو از سر نو زندہ کیا اور بالآخر ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ میں وفات پا گئے اور ملتان میں مدفون ہوئے ۔ سرائیکی زبان میں شیعی اور قرامطی افکار و خیالات کو سمونے کی تحریک کے اوّلین علمبردار یہی شمس سبزواری تھے، جو خود بھی سرائیکی زبان کے شاعر تھے ، اسمٰعیلی لٹریچر کی مستند کتابوں میں ہمیں جناب شمس سبزواری کی چند گربھیاں ملی ہیں جو انہوں نے ہندوؤں کو اپنے مذہب کی دعوت دیتے ہوئے کہی۱ ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

مانو شاہ قاسم نور نین اے غافلو ، آل امام ۔ گل مانی ، تنی کلاتھی اے یارو غافل پیر شمس سوہی (اے غافلو شاہ قاسم نور کو مانو کہ وہ آل امام ہیں اور انہی کی بات ماننی چاہیے ، تمہیں مطلع کر رہا ہوں کہ غفلت چھوڑو اور پیر شمس کو پہچانو کیونکہ جس نے پیر شمس کو پہچانا گویا آل امام کو پہچانا) ۔

مانھو پتھر سوں جھو ہٹورے ہندوؤ　　آؤ ڈیکھو نر قاسم شاہ اوتار
کیک نگری مان رہے جھے رے ہندوؤ　　سے صاحب دور ڈاتار

(اے ہندوؤ خواہ مخواہ پتھروں سے سر کیوں ٹکراتے ہو ۔ آؤ تمہیں اوتار شاہ قاسم کی شکل میں دکھلاؤں جو کیک نگری میں رہیے ہیں اور دور و نزدیک والے سب پر دان احسان کرتے ہیں) ۔

کہتے ہیں جب پہلی مرتبہ ملتان آئے تو ایک مسجد میں چلے گئے ، نماز کا وقت ہوا ، شمس سبزواری بھی امام کے پیچھے نماز میں کھڑے ہو گئے مگر بیچ میں نماز توڑ کر بیٹھ گئے ۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو شعروں کی زبان میں جواب دیا کہ :

من میرا مصلیٰ اتے اللہ میرا قاضی اکایا ماڑی مسیتاں اندر بیہہ نماز گزاروں
مور کھ کیا جانے طاعت ہماری ! . . . .

شاہ شمس سبزواری ایرانی الاصل تھے مگر کشمیر پہنچے تو اس وقت کشمیر میں دردی زبان مروج تھی چنانچہ اسے خوب سیکھا اور پھر اسی زبان کو پورے ملک میں ذریعہ تبلیغ بھی بنایا ۔ اسی لیے مذکورہ بالا گربھوں میں دردی زبان کے اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں ۔ شاہ شمس سبزواری کی ان گربھوں نے سرائیکی شاعروں کو ایک نئی راہ سمجھائی اور عوام الناس ایسے ادب کے عادی ہوگئے جس میں اسمٰعیلی عقائد اور افکار کی بھرپور ترجمانی ہو ۔

۱۔ ''شاہ سبزواری'' از مقالہ نگار مندرجہ ماہنامہ ''آستانہ زکریا'' ملتان و ''فاطمی دعوت اسلام'' خواجہ حسن نظامی مرحوم ۔

مذہبی مثنویاں ، اور درسی کتب

'مثنوی سیف الملوک' ۱۷۸۰ء/۱۱۹۵ھ میں لکھی گئی۔ مگر اس سے پہلے مذہبی ، فقہی ، عوامی اور درسی منظومات اور مثنویاں اس کثرت سے لکھی گئیں کہ سرائیکی زبان کو چار چاند لگ گئے۔ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے حضرت بابا فریدرحؒ کے بعد امیر خسرو علیہ الرحمہ" کی جامع کمالات شخصیت نظر آتی ہے ، انہیں اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۱ ۔ مگر جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں اردو کی ابتدائی صورت بھی سرائیکی علاقوں میں ہی بنی ہے ، اور یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے کہ امیر خسرو پانچ برس تک ملتان میں مقیم رہے ہیں ، اس لیے بلاشبہ کہنا پڑے گا کہ امیر خسرو بھی سرائیکی شعراء میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ سرائیکی آمیز فارسی غزلیں یا دوہے بھی ان کی یادگار ہیں اور بعض خالص سرائیکی ''برج بھاشا آمیختہ'' ہے ، شاید پٹیالی ضلع ایٹہ میں نشو و نما پانے کی وجہ سے یہ اثرات غالب آئے ہوں بہر حال مندرجہ ذیل اشعار قابل غور ہیں :

اوہ گئے بالم اوہ گئے ندیوں کنار   آپ اتر گئے پار، ہم تو رہے اورار
بھائی رے ملاح ہم کو جو پار اتار   ہاتھ کا دیواں گی مندرا، گل کا دیووں ہار
چکوا چکواڈوں چنٹے ان کو مارے ندکو   جو مارے گھر تاڑ کے رین بچھوڑا ہو

☆ ☆ ☆

سن رے کیوڑے گانٹھ گٹھیلے میں توڑوں تیری ڈار
تجھ تلے میرا پیا سووے تو نے دی نہ پکار
گوری سووے سیجھ پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

یا یہ مصرعہ کہ ع

گفتا کہ درائے بانورے گفتم کہ ایہہ کیا ریت ہے؟

ان میں بہت سے الفاظ خالص سرائیکی کے ہیں۔ امیر خسرو نے ملتان کے قیام میں سرائیکی زبان کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے لب و لہجہ کو بھی اپنے اشعار میں سمونے کی

۱۔ ابوالحسن یمین الدین خسرو غالباً ۱۲۵۳ء/۶۵۲ھ میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان سے ہند تشریف لائے۔ شاعری کا جذبہ فطری تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ امیر خسرو ۱۲۸۰ء کے لگ بھگ شہزادہ محمد کی معیت میں ملتان تشریف لائے اور شہزادہ کی شہادت ۱۲۸۵ء تک وہیں مقیم رہے۔ اسی دوران سرائیکی زبان میں شاعری کے تجربات کا آغاز کیا اور ایک ''ریختہ'' کی بنیاد ڈالی۔ فارسی آمیز سرائیکی کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

اے دلی والے بتان سادہ ! پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

(''آب کوثر'' ص ۱۵۷، ''پنجاب میں اردو'' اور مقدمہ ''مثنوی ہشت بہشت'')

پوری کوشش کی - وہ ہفت زبان شاعر تھے اور سرائیکی زبان کی شیرینی و حلاوت نے انہیں موہ لیا - فرماتے ہیں :

مسن کہ بر سر نمے نہادم گل ۔۔۔ نو پرہ بر سرم نہاد و گفتا چل

اس شعر کا تو پرہ اپنی پ (مثنیٰ ب) اور چل اپنی چ (مکرّر با مثنیٰ ج) کے سبب سرائیکی نہ جاننے والوں کے لیے درد سر ہیں مگر امیر خسرو رح نے انہیں شعر میں نگینے کی طرح جڑا ہے -

امیر خسرو کے ان اشعار ، بیتوں ، دوہوں ، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کے علاوہ درسی نصاب کی ایک منظوم لغت 'خالق باری' بھی قابلِ دید چیز ہے - کہا جا سکتا ہے کہ 'خالق باری' سرائیکی فارسی یا فارسی سرائیکی لغت پر مشتمل ایک منظوم رسالہ ہے جس میں ٹھیٹھ سرائیکی کے الفاظ میں فارسی الفاظ ، اسماء اور اعلام کا معنوی بنایا گیا ہے - کہیں کہیں برج بھاشا یا ہندی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں - مگر تناسب کے لحاظ سے 'خالق باری' میں پچاس فی صد سے بھی زیادہ الفاظ سرائیکی کے ہیں - بعض حضرات نے اپنی تحقیق میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ 'خالق باری' امیر خسرورح کی تخلیق نہیں بلکہ عہدِ فیروز شاہی کے کسی دوسرے مصنف کی ہے[۱] - خیر امیر خسرو کی تصنیف نہ بھی تسلیم کی جائے تو عہدِ فیروز شاہی کی تصنیف ہونے پر تو محققین کا بھی اتفاق ہے - اس لحاظ سے گویا ۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ تا ۱۳۸۸ء/۷۹۰ھ میں سرائیکی زبان کے الفاظ درسگاہوں میں نصابی کتب کی افہام و تفہیم کا ذریعہ بنے ہوئے تھے[۲] - اور علماء تدریس و تعلیم میں اور صوفیہ ارشاد و تبلیغ میں ان سے بے نیاز نہیں تھے لیجیے - چند اشعار حاضر ہیں :

کاہ و ہیزم گھاس کاٹھی جانیئے ۔۔۔ اینٹ ، ماٹی ، خشت و گل پہچانیئے
دیگ ہانڈی ، کفچہ ڈوئی بے خطا ۔۔۔ تابہ و کزگان کڑاہی اور توا
مس ہے تانبہ روئیں کانسہ آہن لوہ ۔۔۔ تیشہ بسولا ، تبر کلہاڑا غدر دروہ
خدر خسارہ ہندوی بول جو کہیے گال ۔۔۔ آج امروز بدان فردا را گوئی کال
فارسی روباہ ہندی لومڑی ۔۔۔ ماکیان را نیز میخوان کوکڑی
سرگیں گوبر فلہ ہے پھوسی ۔۔۔ کدال کلند جو کہیے کسی

بہت سے خالص سرائیکی الفاظ ہیں اور برج بھاشا یا دوسری زبانوں میں بھی ادھر ہی سے گئے ہیں - امیر خسرو رح کی وفات حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی رح کے سانحہ ساتھ ۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ

۱- پروفیسر محمود شیرانی رح ، پنجاب میں اردو -

۲- قاری بشیر الدین پنڈت ، سلاطین تغلق (مسلسل) مندرجہ ماہنامہ ''آستانہ زکریا'' ملتان ۱۹۵۹ء -

میں ہوئی ہے ۔ مگر تواریخ میں ان کے ایک اور ہم عمر کا نام بھی ملتا ہے۔ جسے اس دور کی سرائیکی اپ بھرنش یا شور سینی سرائیکی شعراء میں جگہ دی جا سکتی ہے ۔ میری مراد سکھوں اور ہندوؤں کے نامور گرو بھگت نام دیوجی کی ذات سے ہے ۔

بھگتی تحریک پر سرائیکی اثرات

سلاطینِ دہلی کے زمانے میں بھگتی تحریک شروع ہوئی ۔ یہ در اصل اسلامی تعلیمات کا ردِ عمل تھا ۔ ہندو عوام گروہ در گروہ اسلام قبول کر رہے تھے ۔ توحید کے آسان قابلِ فہم مسلک اور مسلمان فقراء کی شخصیت سے متاثر ہو کر بالخصوص نچلی ذات کے ہندو بڑی تیزی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے چلے جاتے تھے ۔ بھگتی تحریک نے اشاعتِ اسلام کو روکنا چاہا ۔ عوامی مذہبی رہنما پیدا ہوئے ۔ انہوں نے عوام کی زبان میں اپنے خیالات کا پرچار کیا ۔ بھگت نام دیو، بھگت کبیر، گورو نانک، بھگت چھجو یہ تمام عوامی زبان میں شعر کہہ کر لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے تھے ۔ بھگتی تحریک کے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں سرائیکی کے الفاظ بڑی تعداد میں ملتے ہیں ۔ مثلاً بھگت نام دیو کے ان اشعار پر غور فرمایا جائے :

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھند کارا　　میں گریب میں مسکین تیرا نام ادھارا

☆ ☆ ☆

کریما رحیما اللہ توں گنی　　ھادر ھدور در پیس توں منی

یہاں اندھلے، ٹیک، گریب، گنی کو دیکھیں ۔ یہ سرائیکی کے الفاظ ہیں ۔ نام دیو کے یہ اشعار ''آدی گرنتھ'' میں موجود ہیں ۔ سندھ کے بھگت سدنا نام دیو بھگت کے معاصر ہیں ۔ ان کا ایک شبد بھی ''آدی گرنتھ'' میں محفوظ ہے ۔ اس شبد کا آخری شعر سنیے :

میں ناہیں کچھ ناہیں کچھ آہے نہ مورا　　اوسر لجّا راکھ لیھو سدھنا جن تیرا

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز سے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک سرائیکی زبان ہر طرف پھیل رہی تھی ۔ چنانچہ جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر ہوچکا ہے ۔ مانکپور کے مشہور بزرگ حضرت شیخ حسام الدین رح میں جب جونپور کے نامور سہروردی بزرگ حضرت حاجی صدرالدین چراغ رح ہند (م - ۸۷۷ھ) کی خدمت ہوتے کو دعا کے لیے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا ''انشاءاللہ بڈھا ہوسی'' تو ان کا نام ہی شیخ بڈھن پڑ گیا ۔ احمد آباد گجرات کے سہروردی پیر طریقت حضرت شاہ عالم رح (فرزند زادۂ حضرت مخدوم جہانیاں بخاری رح) نے اپنے صاحبزادے بھیکن شاہ کو ایک مرتبہ فرمایا کہ

"راجن جی پکڑو تے بدل پکڑو"۔ ان کی وفات ۱۴۷۵ء/۸۸۰ھ میں ہوئی ۱۔ سلسلہ میراں شاہیہ کے بانی مشہور سہروردی بزرگ حضرت میراں محمد شاہ المعروف موج دریا بخاری (م۔ ۱۶۰۴ء/۱۰۱۳ھ) کو جب کسی نے شیعوں کا یہ فقرہ سنایا کہ "سید سنی نہیں کاٹھ دی کتی نہیں" تو آپ نے جوش میں آکر ایک عجیب و غریب کرامت کا اظہار فرمایا ۲۔ اس دور میں سرائیکی اثرات دکن میں بھی پہنچ گئے۔ یہ کچھ نو وادئی سندھ کی قدیم دراوڑی اقوام کی ان علاقوں میں مستقل بود و باش کی وجہ سے پھیلے تھے اور کچھ علاءالدین خلجی اور محمد تغلق کے ان فوجیوں اور خدمتگاروں کے پھیلائے ہوئے تھے جن کو ان حکمرانوں نے سرائیکی علاقوں سے وہاں بھجوایا تھا۔ بہر حال دکن میں بھی سرائیکی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ میراں جی شمس العشاق (۱۴۹۶ء/۹۰۲ھ)، ابراہیم عادل شاہ (۱۵۹۶ء/۱۰۰۵ھ) ملا وجہی (۱۶۰۹ء/۱۰۱۸ھ) غواصی صاحب سیف الملوک (۱۶۲۵ء/۱۰۳۵ھ) اور دوسرے بہت سے دکنی شعراء نے سرائیکی زبان کے الفاظ اپنی منظومات میں استعمال کیے ہیں۔ دیکھیے ملتان اور سندھ سے کالے کوسوں دور بیٹھ کر دکن کے شعراء ٹھیٹھ سرائیکی الفاظ کس چابکدستی اور ہنر مندی سے استعمال کر رہے ہیں:

(۱) صفت کروں میں اللہ اکبری جے پوری بورن ہور
قادر قدرت رنگیکاروں نبڑے ہے نہ دور
(شاہ میراں جی شمس العشاقؒ)

(۲) سمدور ہے اک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں
باناں ہیں سو کروڑاں ولے ٹیک رسن ہے
(سلطان قلی قطب شاہ)

(۳) جیوں دیبک میں دسے نگینا مشک عنبر بچھائی انگنا
(ابراہیم عادل شاہ)

(۴) سجن مکھ شمے باجھ اجالا نہ بھاوے بھلایا ہے بنج جیو کوں او اجالا ۳
(سلطان ظل اللہ)

(۵) کدیں روتی، کدیں ہسنی وتی او کدیں چپ اور کدیں باناں کہتی او
(محمد امین دکنی)

۱، ۲ مولوی نور احمد خان فریدی، تذکرۂ قطب الاقطاب شاہ رکن عالم ملتانی مطبوعہ قصر الادب جکو والا ضلع ملتان ص ۵۷۲، ۶۴۴ وغیرہ۔
۳۔ نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو اور شعر الہند از مولانا عبدالسلام ندوی۔

شراب ہور صراحی حور ہے جام
ہوئے مست مجلس کے لوکاں تمام
بسر گئے ندیماں طرز بات کا
گنوائے خبر مطرباں دات کا
جو آیا جھلکتا سورج واٹ کر
اندھارا جو تھا سو گیا ناٹ کر
کدیں شہ کوں ٹک لاوے باتاں منے
کدیں بات دے شہ کے ہاتاں منے
کہ شاہاں کنے جھوٹ کہیا نہ جائے
بکے جھوٹ کے سو ہتیارا گنوائے
کہے ہد ہداں جسا سلیماں[۴] کوں
کہ شاہ دار آوے منگن دان کوں
(ازملا وجہی دکنی)

ستے دہرت پریوں منڈہیاں کاٹ کاٹ
سو کس کو سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ
سنیا تھا جو سوداگر اک بے نظیر
انھا اس کنے ایک[۱] راوان گنیر
(غواصی)

کن دھر کوں کاں جاؤں مجھ دل پہ بھل بھجرات ہے
اک بات کئے ہوں گے سجن یاں جیو بارہ بات ہے
(ابوالحسن تانا شاہ)

ہر پھر ولی تیرے کن آتا ہے جیوں کا سائل
تیرے مٹھے بیاں کا جب سوں پڑیا ہے چسکا
تیری کمر مصور چتریا ہے کس ادا سوں
کیتا ہے صرف اس میں ناز و نیاز گویا
ہر وقت نہ سٹ کحل تغافل کوں اکھیاں میں
یک مہر سوں اس طرف اے بے مہر نظر کر ۱
(ولی دکنی)

مندرجہ بالا اشعار میں کافی الفاظ سرائیکی زبان کے ہیں ۔ ان پر غور کرنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دکنی اُردو جب عالم وجود میں آئی تو اس میں سرائیکی کا کس قدر دخل تھا ۔

دسویں صدی ہجری سولھویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ حضرت شاہ ولایت ملتانی نے عربی صرف کے قوانین کو 'قوانین صرفیہ منظومہ ہندیہ' کے نام سے نظم کیا ۔ ان کے ابتدائی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے بھی کسی بزرگ نے (ہندی زبان) یعنی سرائیکی میں قوانین صرف کو منظوم کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو سرائیکی زبان پندرھویں صدی عیسویں/نویں صدی ہجری سے ذریعہ تعلیم بنی ہوگئی ۔ چنانچہ شاہ ولایت ملتانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں :

قانون صرف دے کہیں شخص نے "ہندی" وچہ بنائے
پر یاد کریندیاں مبتدیاں نوں اوہ بھی مشکل آئے

یہ رسالہ بڑی تقطیع کے چوبیس صفحات پر مشتمل ہے جسے "کتبخانہ خضر منزل ملتان"

۱۔ نصیر الدین ہاشمی ، دکن میں اردو "قطب مشتری" ملا وجہی مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، "شعر الہند" مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ ۔

نے سائع کیا تھا ۔ آخری شعر یہ ہیں :

قانون صرف دے مکتے یارو فضل کینا رب باری
نال فضل دے اللہ بخشے جو کوئی سامع قاری
شاہ ولایت عاصی بھارا کر امید دعائیں
شاید برکت کہیں صاحب دے بخش کرے رب سائیں ۱

اسی طرح ملتان کے ایک نامور واعظ ، درویش اور شاعر حضرت شیخ عبداللہ گزرے ہیں جن کا زمانہ ۱۶۷۹ء/۱۰۹۰ھ کے لگ بھگ متعین کیا گیا ہے ان کی ایک مشہور نظم ''پردیسی جنڈڑی'' کے عنوان سے سرائیکی علاقوں کے گھر گھر میں سدنوں سے پڑھی جاتی ہے اور حقیقت میں سرائیکی کے عوامی ادب کی نمائندہ اور شاہکار نظم ہے ۔ اس کا موضوع دنیا کی فنا پذیری اور نیکی کی رغبت دلانا ہے ۔ دو بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

ب   برادر بھائی تیرے   ہور سکے ہمراہی تیرے
گلوچہ پاسن بھائی تیرے   واں کوئی اسنگ کریسیا
سمجھ بندے توں نال فکر دے ایہہ جندری پردیسیا

م   ملاں بن سرع جگائیں   کر کر وعظاں خلق سنائیں
آپ نہ سدھے رستے جائیں   دوزخ رب ڈکھیسیا
سمجھ بندے توں نال فکر دے ایہہ جنڈڑی پردیسیا

یہ نظم صنف کے لحاظ سے سی حرفی ، ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے مخمس ہے ۔ اس حیثیت سے گویا حضرت شیخ عبداللہ ملتانی رح کی یہ نظم سرائیکی کی قدیم ترین سی حرفی بھی ہے اور قدیم خمسہ بھی ۲

اس دور کی یادگار بہت سے جنگ نامے ، معراج نامے اور نور نامے بھی ہیں ۔ پنجابی ادب کے محققین سب سے قدیم جنگ نامے حافظ برخوردار اور پیر محمد کاسبی کے قرار دیتے ہیں ۔ جن کا تعلق ۱۶۷۰ء/۱۰۸۱ھ سے ہے مگر سرائیکی کے ایک قدیم علاقے ''بھونگ بھارہ'' کے ایک درویش شاعر پیارا شہید ۱۵۸۶ء/۹۹۵ھ میں جنگ نامہ ، درد نامہ اور معراج نامہ تصنیف فرما چکے ہیں ۔ ان کی ہر سہ کتب کا کوئی قلمی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا البتہ ہر سہ کتب کے بہت سے اشعار زبان زد عوام ہیں ۔

۱- شاہ ولایت ملتانی ، قوانین صرفیہ منظومہ ہندیہ محشی بحواشی مفیدہ نوریہ مطبوعہ مکتبہ خضر منزل ملتان ۔

۲- حضرت شیخ عبداللہ ملتانی ، م ۱۰۹۰ھ ''ایہہ جنڈڑی پردیسیا'' ، مطبوعہ صدیقیہ کتب خانہ ملتان ۔

ان کا نام پیارے خان تھا ۔ قوم کے بلوچ تھے اور چانڈیہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس قبیلہ کی جو گوت چانڈ کو ریاست پر حکمرانی کرتی رہی ہے ۔ آپ اسی کے فرد۱ تھے۔ اور اسی کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوئے ۔ درویش طبع تھے اور سہروردی سلسلہ میں خلیفۂ مجاز بھی تھے ۔ آپ کے کلام میں تصوّف ، تحریکِ عمل ، جوشِ جہاد اور ولولۂ ایمانی ہے ۔ نمونہ کے طور پر ایک مشہور دوہا درج کیا جاتا ہے :

لگ گئی بیت تے بھل گئی ساری ذات صفات دی موانھیں
عشق دے رہ وچ خار ہزاراں تے میں مٹھڑی ان سوانھیں
سینگیاں سیّاں کرو دعائیں شالا سرڈے تھیواں اگوانھیں
لازم کفر پیارا ہوں تے جیڑہی راہوں نھئی پچھوانھیں

سترھویں صدی عیسوی یعنی گیارھویں صدی ہجری کے آخر تک غزل ، رباعی اور عوامی نظموں کے ساتھ ساتھ مذہبی، فقہی اور درسی مثنویوں کا سلسلہ بھی برابر چلتا رہا ۔ چنانچہ ۱۶۷۵ء/۱۰۸۶ھ میں ضلع جھنگ کے ایک عالم دین مولانا عبدالکریم نے 'نجات المومنین' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جسے سرائیکی ادب کے درمیانی دور کی امّہات الکتب میں جگہ دی جاتی ہے ۔ اس کے چنداشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں جن کی زبان خالص سرائیکی ہے :

سبھ ثناء خدائے نوں جیندا کل جہان، بہت درود رسولؐ نو لتّھا جین فرقان
کہاں درود بھی آل تے جس تے اوہ خوشنود ہووے ساریاں موماں لکھ ہزار درود
پھیر اصحاب رسولؐ دے جنہاں سرف عیاں وت دوست بجھ رسولؐ دے جملہ مسلمان

☆ ☆ ☆

ایمان اندر فرض ترے اول منن ذات	ڈوجھا وحدت ربدی تریجھا من صفات
پنج بناء اسلام دے کلمہ پنج صلواۃ	روزہ حج زکواۃ بھی کر تاں لبھیں نجات

مولوی عبدالکریم جھنگوی کے کچھ برس بعد ۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ میں ملتان کے ایک اور بزرگ حافظ محمد صاحب نے معراج پر ایک طویل مخمّس لکھا جو 'معراج نامہ' کے نام سے بہت مقبول و مروج ہوا ۔ گویا ''بھونگ بھارا'' کے قبول چانڈیہ اور حضرت پیارا شہید کے بعد سرائیکی زبان کا یہ تیسرا 'معراج نامہ' ہے جسے قبول عام حاصل ہوا۲ ۔ حافظ محمد کے ایک اور ہمعصر مولانا چراغ اعوان نے 'ہیر رانجھا' کو نظم کا جامہ پہنا کر گویا سرائیکی زبان میں عشقیہ داستانوں کا آغاز کر دیا ۔ اس سے پہلے کسی مستقل عشقیہ مثنوی کا سراغ نہیں ملتا ۔

۱- دیکھئے - روسائے پنجاب - جلد نمبر ۲ -
۲- ڈاکٹر مہر عبد الحق ، ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق قلمی نسخہ ، ص ۲۳۳ -

عشقیہ داستانیں

چراغ اعوان

سرائیکی کی نسبت پنجابی زبان میں عشقیہ داستانوں کا آغاز پہلے ہو جاتا ہے ۔ مثلاً حافظ برخوردار کو لیجیے ۔ آپ 'مرزا صاحباں' 'سسّی پنوں' 'ہیر رانجھا' اور 'یوسف زلیخا' چار مثنویوں کے مصنف ہیں ۔ 'یوسف زلیخا' ۱۶۷۹ء/۱۰۹۰ھ کی تصنیف ہے ۔ اس سے پورے اکتیس (۳۱) برس بعد ڈیرہ غازی خان کے ایک گوشہ نشین سرائیکی شاعر حضرت چراغ اعوان نے سرائیکی زبان میں 'مثنوی ہیر رانجھا' لکھ کر عشقیہ داستان گوئی اور مثنوی نگاری کا آغاز کیا ۔ مثنوی میں چراغ نے معظم شاہ کی حکمرانی کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ ۱۷۱۲ء/۱۱۲۳ھ میں فوت ہوا ۔ مگر اس کا اختتام ۱۷۹۹ء/۱۱۲۱ھ میں ہوا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

ہتّی ہیر تمام تھئی تاریخ پنجم شعبانی ‎ ‎ ‎ یارہاں سے سن سال اکویہیں سن مومن دل جانی
زمانہ شاہ بادشاہ معظم سچّا ملک ربّانی ‎ ‎ ‎ عالم فاضل عادل غازی رعیت وچہ احسانی

جس دور میں چراغ اعوان نے یہ مثنوی لکھ کر سرائیکی شاعری کی ادبی ثروت میں اضافہ کیا ، ہمارے اس شاعر نے اپنے دور کی تہذیب اور ثقافت و معاشرت کو مثنوی میں سمونے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے اور مثنوی کے تمام لوازمات اور خصوصیات کا بدرجۂ اتم خیال رکھا ہے ۔ 'ہیر رانجھا' کی داستان کو سب سے پہلے پنجابی زبان میں دمودر داس اروڑہ نے ۱۶۹۴ء/۱۱۰۷ھ کے لگ بھگ نظم کیا تھا ۔ چراغ اعوان سرائیکی زبان کا وہ اولین مثنوی گو شاعر ہے جس کے اثرات سرائیکی مثنوی نگاری پر نہایت گہرے اور دور رس ثابت ہوئے ۔ چنانچہ سرائیکی زبان کا ملک الشعراء اور سرائیکی مثنوی کا بادشاہ مولوی لطف علی بہاولپوری بھی مثنوی کی بحر اور تکنیک میں چراغ اعوان کا خوشہ چین نظر آتا ہے ۔ چراغ کی بحر شگفتہ و رواں ، اندازِ بیان دلکش اور زبان صاف ستھری ہے ۔ اس نے اپنے عہد کی تہذیب و تمدن اور طرزِ بود و ماند کو خوب اجاگر کیا ہے اور یہ خصوصیت اس سے پہلے کی مثنویوں میں نہیں ہے ، لیجیے اب چند اشعار مطالعہ فرمائیے ۱ :

پھوٹی ہیر بلوغت کوں جان آئی وچہ جوانی ‎ ‎ ‎ حوراں دست تعجب لب تے ڈیکھ پری ستانی
زلف سیا ڈسن خوش پلکاں ابرو مثل کمانی ‎ ‎ ‎ چشماں خوب فراخ منور بہت کشاد پیشانی
ڈند سفید ستارے چمکن دور مکنون قرانی ‎ ‎ ‎ لالی لال لباں تے سوہندی مونہہ سبھو نورانی

۱۔ چراغ اعوان ، مثنوی ہیر رانجھا مطبوعہ ملتان باہتمام خدا یار ملتانی ۱۲۹۵ھ نسخہ دوم مطبوعہ اینگلو اسٹیم پریس لاہور ، سویم نسخہ قلمی ملکیہ مقالہ نگار ۔

بینی ڈیکھ مثال الف دے نس کاتب گئے ہانی گردن صاف تے گلو بنائی خاص اوزاروں مانی
آبحیات مثال شہد دے شیریں سخن زبانی قد شمشاد صنوبر عرعر پشتی شکل دہانی
واہ گلزار بہار گلاں دی سیر چمن بستانی سنکر گیت خوشی بلبل دے گل بھی تھئے حیرانی
کبکاں ٹورو سار ڈٹی خوش ٹور ٹرن جریانی ماہ تھیا حیران اتھا گوں راہ جلبا اسانی

صدیق لالی

چراغ اعوان کے بعد سرائیکی مثنوی نگاروں میں قصبہ لالیاں ضلع جھنگ کا نامور شاعر صدیق لالی منظر عام پر آتا ہے ، جس نے ۱۷۲۵ء/۱۱۳۸ھ میں 'مثنوی یوسف زلیخا' لکھ کر بہت سے شعراء کے لیے راہ پیدا کر دی ۔ صدیق لالی سے تقریباً اسّی برس بعد اچہ شریف (ریاست بہاولپور) کے مولوی عبدالحکیم صاحب نے 'یوسف زلیخا' پر قلم اٹھایا۔ صدیق لالی کی زبان سادہ ہے ۔ بولی لہندی اور ملتانی کی ملی جلی ۔ ان کی مثنوی کا نمونہ ملاحظہ کیجیے :

قصہ عشق محبّت والا آپ الٰہی چنیا حال حبیباں تے محبوباں کل عالم وچ سنیا
تا ازل دی راگ اٹھایا کن پیا مشتاقاں مست پیالہ دلبر والا پی سٹے وح خاکاں

صدیق ایک فطری شاعر تھا اور اس نے اپنے جذبات کو سیدھے سادھے مگر سہل ممتنع انداز میں بیان کیا ہے ۔ وہ مشکل پسند نہیں اور نہ ہی گرانبار تراکیب کا قائل ہے ۔

صدیق لالی کے بعد ریاست بہاولپور کے قصبہ شیر گڑھ میں ایک عالم دین ہو گذرے ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ کی جاہلانہ اور غیر اسلامی رسوم کو دیکھ کر اصلاحِ معاشرت کے خیال سے ایک مثنوی لکھی جسے 'میّت نامہ' یا 'مسائل کفن و دفن' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ مصنف خالص سرائیکی علاقے کے ہیں اور زبان و بیان بھی سندھی آمیز سرائیکی ہے ۔ مولانا نور محمد نے نہ صرف یہ کہ میّت سے متعلق اسلامی فقہ کے مسائل بتائے ہیں بلکہ گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری یعنی سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے سرائیکی معاشرے میں میّت کے ساتھ جو رسوم اور شگون وابستہ تھے ان کی بھی نشاندہی کی ہے ، گویا ایک لحاظ سے مولانا نے مذہبی مثنوی میں بھی صنف مثنوی کی صفات اور فنّی باریکیوں کو نبھانے کی کوشش کی ہے ۔ مثنوی کے چند ابیات آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں :

حاجی نور محمد کہندا شیر گڑھ سندھ والی وچہ رہندا
جاں ڈٹھا میں ایہو حال تاں میں کیتا ایہہ کشال
وستیاں وچہ ملانے راہندے گھن خلقاں تھیں ٹھگیاں کھاندے
نہ جانن حیلہ نہ اسقاط نہ جانن غسل کفن دی بات
نور محمد آکھ سنایا ان سکھیاں ملیاں کو سکھلایا

حضرت علی حیدر ملتانی

۱۷۰۶ء/۱۱۱۸ھ میں سرائیکی زبان کے عمر خیام حضرت علی حیدر ملتانی کی ولادت ہوئی، جو سرائیکی کے نرقی یافتہ دوہے یعنی رباعی کے بادشاہ تسلیم کیے جاتے ہیں - یار لوگوں نے ان کی شخصیت اور ذات کو بھی معمہ و چیستاں بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ آپ کی خانقاہ موجود اور خاندان بدستور معزز و محترم ہے - ضلع ملتان میں عبدالحکم اور تلنبہ کے درمیان راوی کے دائیں کنارے ایک موضع "ہمجانہ" ہے جو آج کل ضلع لائلپور میں شامل ہے - آپ کی ولادت اسی موضع میں ہوئی اور آپ کا مزار بھی یہیں ہے - چراغ اعوان کے بعد علی حیدر کے دوہوں نے سرائیکی ادب کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں آنے کے قابل بنایا، آپ نے نہ صرف یہ کہ عشق و محبت کے جذبات و کیفیات کو نظم کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ اپنے معاشرے کے دکھوں کو بھی اشعار میں سمونے کی بھر پور کوشش کی - چنانچہ آپ کی شاعری اس دور کی معاشرت اور تمدن کا آئینہ ہے - علی حیدر سے پہلے (حضرت سلطان باہوؒ کے سوا) اور کوئی ایسا شاعر نہیں گذرا جس کے نعمات کو پورے پنجاب کے علاوہ سندھ اور دیگر سرائیکی علاقوں میں بھی قبول عام حاصل ہوا ہو - ان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں 'مجموعہ سی حرفیاں مع ہیر' کے نام سے مطبع مصطفائی لاہور میں چھپا اور اس کے بعد ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ میں 'مجموعہ مکمل ابیات علی حیدر' کے نام سے لاہور کے مشہور ناشر "اللہ والے کی قومی دکان" کی طرف سے شائع ہوا - ان مجموعوں میں چھ سی حرفیاں کم و بیش دو سو تہتر (۲۷۳) مختلف دوہڑے (رباعیات) ایک مولود (نعت) اور 'قصہ ہیر رانجھا' سی حرفی کے انداز میں ملتا ہے - سرائیکی ادب کو ان پر ہمیشہ ناز رہے گا - لیجیے ان کے چند دوہے حاضر خدمت ہیں :

خ - خوشی وسے اوہ دیس راوی جنھے وسدیاں کل کنواریاں نی
گھڑا گھن کے ڈھاکاں تے چا ٹرن او ناں دو نیناں دیاں ماریاں نی
ونج ونج وے نینگرا چھیڑ ناہیں ساں آون اساڈیاں واریاں نی
اوڑک عشق توں حیدر ایہہ حاصل جو جتیاں بازیاں ہاریاں نی

ن - نت نہ ماہی تے نت نہ منجھیں تے نت نہ ساوڑے تلڑے نی
نت نہ خوشیاں تے نت نہ غمیاں تے نت نہ کم سولڑے نی
نت نہ مینڈی تے نہ تینڈی تے نت نہ ونگڑے چھلڑے نی
علی حیدر آکھے کر لے عمل چنگے تینوں موت سنہڑے گھلڑے نی

ریاست بہاولپور کے ایک مثنوی گو شاعر غلام محمد نے بہاولپور کے عباسی خاندان کے ایک علم پرور رئیس جناب غازی محمد خان داؤد پوتہ کی فرمائش پر سندھ کی مشہور لوک کہانی

'لیلاں چنیسر' کو ۱۷۷۳ء/۱۱۸۷ھ میں نظم کا لباس پہنایا۔ غالباً سرائیکی میں 'لیلاں چنیسر' پر یہ پہلی اور آخری مثنوی ہے۔ یہ قصہ سندھی کے بہت سے قدیم و جدید شعراء نے نظم کیا ہے، مگر سندھ سے باہر صرف مولانا غلام محمد بہاولپوری نے ہی اسے موضوع سخن بنایا۔ مثنوی کی بحر رواں دواں اور زبان پاکیزہ اور شستہ ہے۔ مضامین میں ندرتِ فکر، اشعارات و تشبیہات اور بلند خیالی کی فراوانی ہے۔ بحر وہی ''چراغ اعوان'' والی ہیر کی ہے۔ جسے مولانا غلام محمد کے بعد ملک الشعراء لطف علی اور دیگر شعراء نے اپنایا۔ مولانا غلام محمد 'لیلاں چنیسر' کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جوڑیم شعر ''چنیسر لیلا'' خان غازی دے وارے
عدل احسان تہیں دے ہتھوں لکھ لہندے داد وچارے
دولت مسند سکندر ثانی دانش عظمت دارے
بخت بلند سخی سمجھیندا سیتی نہم قرارے
جیویں جند جوانی مانڑیں نال حسن گزارے
کرے دعا غلام محمد اس نوں دم دم شوق نہارے

''لیلاں'' جب فریب میں آ کر ایک ہار کے بدلے اپنے محبوب ''چنیسر'' کو فروخت کرتی اور علم ہونے پر افسوس کرتی ہے تو اس کی کفیت ملاحظہ کیجیے:

قہر گھتے رب تنہاں تے لیلاں نال سہیلی سکھی
جیں لکھی گنت چنیسر دی تیں قیمت مول نہ لکھی
سے لکھ ہار تصدق تیں توں جام وفا جیں چکھی
ویچ وٹا اول البیلی پچھے ملیں ہتھ مکھی
گذری گالہہ نہ پھوہمن گھوڑے اڈر تھیوں توڑے پکھی
لیلاں ماں بیٹھی ہن سائیں ہار سینے تے رکھی[۱]

حضرت خواجہ محکم الدین اسیر اویسی

اب ہم حضرت خواجہ محکم الدین اسیر اویسیؒ کا ذکر کرتے ہیں جن کا مزار معروف قصبے ''خانقاہ شریف'' ضلع بہاولپور میں ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مشہور چشتی بزرگ خواجہ نور محمد مہاروی المعروف قبلۂ عالم کے ساتھ مل کر لاہور میں حاصل کی۔ بقول مؤلف 'خلاصۃ الفوائد' ۱۷۴۹ء/۱۱۶۳ھ میں قبلۂ عالم اور خواجہ سیرانی لاہور کی کسی مشہور درسگاہ میں زیر تعلیم تھے[۲]۔ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات زندگی بھر بہترین اور

۱۔ مولانا عزیز الرحمٰن، لیلاں چنیسر، مطبوعہ ماہنامہ العزیز ماہ اپریل ۱۹۴۰ء
۲۔ حکیم محمد، خلاصۃ الفوائد، ص ۴۳ مطبوعہ دارالبلاغ لاہور۔

خوشگوار رہے ۔ خواجہ محکم الدین سیرانی ''اویسی المشرب'' ہونے کے باوجود صاحب ِ ذوق اہلِ سماع میں سے تھے ۔ آپ بارہا قوالوں کو تخلیہ میں بلا کر عشقیہ اور فراقیہ اشعار سنا کرتے تھے۔ اسی ذوق و شوق کے باعث آپ کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے ۔ چنانچہ آپ کی ایک سی حرفی مطبوعہ ملتی ہے، جسے آپ کے ملتانی عقیدتمند ناشروں نے چھاپا ہے ۔ یہ ''سی حرفی'' بارہا چھپ چکی ہے اور مقبول و مشہور ہے ۔ دو بند ملاحظہ فرمائیے :

ب ۔ بسم اللہ کہہ کر وڑساں پھرساں ڈھونڈ ہیندی بیلا
واٹاں گھاٹاں پچھدی وٹاں ڈیکھاں وقت نہ ویلا
نوں ماہی دی سک سہیں کوں کڈاں کریسیں میلا
بئسما نامر کم بہ ایمانکم جو ہورہا جی حیلا

د ۔ دیوانی ہو رہی مینوں گل نہ کائی سجھے
ماہی میڈے ویدن اہے ہور نہ کوئی بجھے
ایہو کھیڑا جھیڑا کر کر نال میڈے نت لجھے
دولۃ بین الاغنیاء منکم جو پڑہیم میڈا کوئی گجھے

حضرت محکم الدین سیرانیؒ کا دور سرائیکی ادبیات کا شاندار دور ہے ۔ اس دور کے شعراء نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرکے اپنے جوہر دکھائے ۔ چنانچہ ملتان کے ایک نامور شاعر محمد حسین جو پیشہ کے لحاظ سے نیلگر تھے اور جلد سازی کے فن میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے فارسی اور سرائیکی کے بلند پایہ تاریخ گو شاعر تھے ۔ انہوں نے اپنے دور کے تمام اہم واقعات پر بہترین تاریخی قطعات کہے ہیں ، مگر لطف کی بات یہ ہے کہ فارسی کے ساتھ ساتھ سرائیکی اشعار سے بھی تاریخی مادے استخراج کیے ہیں ۔ مولانا محمد حسین کا تخلص ''عبرت'' تھا اور یہ کچھ عرصہ نواب صاحب بھاولپور کے شاہی کتب خانے سے بھی متعلق رہے ہیں ۔ ذیل کے تاریخی مادے سرائیکی زبان میں ملاحظہ فرمائیے ۔ ملتان کے حکمران خاندان سدوزئیوں کے نامور نواب ''یٰسین خان سدوزئی'' کی وفات پر مصرعہ تاریخ کہا :

''خان سدھایا وت نہ آیا'' جس سے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء مستفاد ہوتا ہے ۔ ملتان کی ایک مشہور ''ڈیرے دارنی طوائف'' مری تو ان کے اعزہ کی فرمائش پر یہ تاریخی شعر کہا :

''اج پئی کوٹیندی یارو ! وے چھڑاؤ چوکیدارو !'' اور اس سے ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء نکالا ۱ ۔

حضرت مولانا لطف علی

بارھویں صدی ہجری اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں سر زمین بھاولپور کی

۱۔ مولانا عزیزالرحمن دبیر الملک مرحوم ، ملتان کا گمنام شاعر ، ماہنامہ ''العزیز'' ، ماہ ستمبر ۴۲ء

مردم خیز کوکھ نے اس فرزند کو جنم دیا جو اگر منصہء شہود پر جلوہ گر نہ ہوتا تو سرائیکی شاعری ''گل بے خوشبو'' ہوکر رہ جاتی ۔ میری مراد ملک الشعراء حضرت مولانا لطف علی مصنف 'سیف الملوک' کی ذات گرامی سے ہے ۔ آپ کی ولادت ۱۷۱۶ء/۱۱۲۹ھ میں ہوئی ۔ اور وفات کا سال ۱۷۹۴ء/۱۲۰۹ھ متفق علیہ ہے ۱ ۔ راقم سطور کے خیال کے مطابق حضرت لطف علی کا وطن مالوف قصبہ بہادر پور (نزد مئو) ضلع رحیم یار خاں ہے ، جس کے دلائل و شواہد ناقابل تردید ہیں ۔ مئو شریف (ضلع رحیم یار خاں) کا علاقہ خود مردم خیز رہا ہے ۔ مئو کے روحانی بادشاہ حضرت حمید الدین الحاکم رح ساتویں صدی ہجری تیرھویں صدی عیسوی میں سرائیکی اور فارسی کے عظیم شاعر تھے جن کا نمونہء کلام پہلے دیا جا چکا ہے ۔ ان کے بعد اس خاک پاک نے لطف علی ایسا بے ہمتا سخنور پیدا کیا ، جنہیں اگر سرائیکی زبان کا میر حسن کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا !

لطف علی نے اگرچہ بحر ، تکنیک اور انداز بیان میں اپنے پیشرو چراغ اعوان (مصنف ہیر رانجھا) کا تتبع کیا ہے ، مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی شہرت اور قبولیت عامہ کا سبب اس کی انفرادیت اور شعری لطافت ہے ۔ یہی سبب ہے کہ سرائیکی زبان کے رئیس المتغزلین خواجہ غلام فرید نے بھی لطف علی کو اپنا امام تسلیم کرتے ہوئے اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے ۲ ۔ غالباً اس مثنوی کا پہلا نسخہ مصنف کی وفات کے اٹھاسی سال بعد ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ میں کانپور کے کسی ناشر نے شائع کیا ۔ اس کے تقریباً تیرہ چودہ برس بعد دوسرا نسخہ روز بازار سٹیم پریس امرتسر میں چھپا ۔ ان دونوں نسخوں میں صحت کتابت کا خاص خیال رکھا گیا تھا ۔ مثنوی کی کہانی اور کردار اگرچہ برِصغیر ہند و پاک سے باہر کے ہیں مگر جس طرح انیس و دبیر نے واقعہء کربلا کے کرداروں کو ہند میں چلتا پھرتا دکھایا ہے بعینہ لطف علی نے بھی کمال چابکدستی کے ساتھ موقع و محل کی مناسبت سے اپنے علاقوں کی تہذیب و تمدن کو بھی اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے ۔ ہند و پاک کی زبانوں میں اس کہانی کو سب سے اول دکن کے ملاّ غواصی نے فارسی نثر سے دکنی نظم میں ترجمہ کیا ۔ ان کے بعد ۱۷۸۰ء/۱۱۹۵ھ میں لطف علی نے اپنی عدیم المثال 'سیف الملوک' کی تکمیل کی ۔ سرائیکی زبان کے اس دور کی اکثر مثنویوں، کافیوں (غزلوں) اور دوہوں (رباعی یا قطعہ بند) میں لطافت و خوبی ، روانی و سلاست ، الفاظ کی بندش ، تشبیہات و استعارات کے استعمال اور غنائیت و موسیقی کی فراوانی نظر آتی ہے ۔ ان خوبیوں کی

۱۔ مثنوی ''سیف الملوک'' مرتبہ و مترجمہ بشیر احمد ظامی ، مطبوعہ اردو اکادمی بہاولپور مقدمہ ص ۱۳ - ۱۴ ۔

۲۔ قابیس المجالس (ملفوظات خواجہ غلام فرید رح) قلمی نسخہ مملوکہ مقالہ نگار جلد چہارم ، ص ۲۷۵ ۔

مثال کے لیے بلا دریغ 'مثنوی سیف الملوک' کو پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اب اس مثنوی کے کچھ اشعار نمونہ" پیش کیے جاتے ہیں ، جن میں سیف الملوک کے والد شاہ عاصم کی دلہن کا ذکر ہے :

ناز بھری نرمل کوں شہ خود چاڑھ پلنگ بلہائے
چوڈس وانگ تجلّی کیتس رخ روشن چمکائے
نوری نین نھوڑن ناطر نرگس ناز نوائے
کیفوں باجھ کلوری کجلا مست متاع لٹائے
دہار کجل دی بھنی بھلے وہ سرمہ رنج رسائے
چھٹکے نار لٹاندی قہری نانگ وانگوں ول کھائے
بھنے وال عطرساں چوگٹھ بھنبھے جوڑ گندھائے
ڈنو صفادلبند اہوں گل گوہر گھول گھائے
سرخی لعل لباں تے سوہندی بیحد لعل لٹائے
منہدی ملک موہیندی جان او نازک دست رنگائے
جھمک سوہندے دھمک ڈیون واہ بینا مانگھ سہائے
پھلوالے ڈے جھالے جھولن حلقہ ہال ہلائے
کٹھمالہ کجھ کرے نہ ٹالا حکمی برہوں بچھائے
ہسی نال ونجھے دل کھسی ڈھولن پا ٹھمکائے
ڈینبھوں وانگ ڈنگیندا ڈوڈن دوروں ڈنگ چلائے
نیمہ کار نبولے کندن جان کندن ڈکھلائے[۱]

حافظ جمال اللہ مظہر الٰہی

لطف علی کے معاصرین میں ہمیں ایک اور شخصیت ملتی ہے جن کے ذکر کے بغیر یہ کہانی ادھوری متصوّر ہوگی ۔ یہ بلند و بالا شخصیت سرائیکی زبان کے صاحبِ طرز اور انقلابی شاعر منشی غلام حسن گامن شہید ملتانی کے روحانی مرشد حضرت حافظ جمال اللہ مظہر الٰہی کی ہے ۔ حافظ صاحب کی ذاتِ گرامی جامعِ کمالات تھی وہ نہ صرف جیّد عالم ، متبحّر فقیہ ، پاکباز صوفی اور علمبردار حرّیت مجاہد تھے بلکہ سرائیکی زبان کے باکمال رباعی گو شاعر بھی تھے ۔ حافظ صاحب کا روحانی سلسلہ سہروردیہ بھی تھا اور چشتیہ بھی ۔

۱- بشیر احمد ظامی ، (مرتب) مثنوی سیف الملوک ص ۱۰۵-۱۰۶ مطبوعہ اردو اکادمی بہاولپور۔

آپ کو اوّلاً حضرت شاہ رکن عالم ملتانی سہروردی کے مزار سے بطریق اویسی فیوض ملے اور پھر ان کی روحانی اجازت سے آپ نے قبلۂ عالم مہاروی سے خرقۂ خلافت حاصل کرکے عوام و خواص کو چشتیہ سلسلے میں بیعت فرمانا شروع کیا ۱ ۔ حضرت حافظ صاحب کا قیاسی سن ولادت ۱۱۷۵/۱۷۶۱ء ہ متعین کیا جا سکتا ہے ۔ آپ نے بارہا نواب مظفر خان شہید رحمہ کے ساتھ مل کر سکھوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور بالآخر ۱۲۲۶/۱۸۱۱ء ہ میں ۵ جمادی الاول کو سکھوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا ۔ آپ کی مشہور و معروف سی حرفی میں سے ایک بند پیش خدمت کیا جاتا ہے :

س ۔ سوداگر لڈ گئے سبھے کر کر ونج و پارے
کھٹی سوداگر لعلاں دے تے لاکھی صد ہزارے
لاتھے رہے بار تنہاں دے نو سو سٹھ ہزارے
رہے جمال کنگال بیچارا کھڑا ہتھ پسارے ۲

فقیر محمد یار

اسی عہد کی ایک اور مثنوی ملتی ہے جو مکاتب و مدارس میں شامل درس بھی رہی ہے ۔ یہ مثنوی جھنگ کے ایک قادر الکلام شاعر فقیر محمد یار کی 'نافع الصلواۃ' ہے ، جو ۱۲۰۲/۱۷۸۷ء ہ میں لکھی گئی ۔ فقیر محمد یار کا اندازِ بیان سرائیکی کی قدیم مثنویوں کا سا اور زبان جھنگوی سرائیکی ہے ، اور آپ کسی حد تک اپنے ہم وطن شاعر عبدالکریم جھنگوی (صاحبِ نجات المومنین) سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ 'نافع الصلواۃ' کے اشعار بطور نمونہ درج کرتا ہوں :

میں کہاں درود محمدؐ تائیں لکھ ہزار کروڑاں
ذرّہ صفت نہ ہووے مولے جے لکھ ورقاں جوڑاں
صفت نبیؐ دی بہت درازے بندہ کون بیچارا
صفت نبیؐ دی آپ اس کیتی جو ہے سر جنہارا
پھر کہاں درود ہزاراں واری جو پیغمبر سارے
آل اتے اصحاباں ساریاں جھڑے نبیؐ پیارے

☆ ☆ ☆ ☆

میں کراں بیان مسائل ہندی جیے رب دیوے قوّت
اوہو آن سکھالے مینوں جس دی مگر نبوّت

۱- پروفیسر خلیق احمد نظامی ، تاریخ مشائخ چشت ، نور احمد تذکرۂ قطب الاقطاب ۔
۲- "سی حرفی حافظ جمال ملتانیؒ" قلمی نسخہ مملوکہ مقالہ نگار ۔

ایہہ مسائل نظرے مینوں اندر فقہ عجیبا
لکھ غنیمت جان حیاتی جیے توں پڑہیں حبیبا ۱

عنایت

تکیہ شاہ مراد (جہلم) کے مشہور شاعر شاہ مراد (م - ۱۷۰۲ء) کے ایک مرید جن کا اسم گرامی عنایت ہے سرائیکی کے خوشگوار شاعر تھے - انہیں اپنے مرشد شاہ مرادرح سے اس قدر محبت تھی کہ اکثر اشعار میں اپنے تخلص کی جگہ ''شاہ مراد'' یا ''شاہ مردان'' استعمال کرتے ہیں - جس طرح مولانا رومیرح نے اپنے دیوان میں اپنے پیر و مرشد حضرت شمس تبریزیرح کا نام استعمال کیا ہے - عنایت درویش کی سی حرفی کے چند بند ملاحظہ کیجیے :

(الف) - اللہ تلوار عشق دی جنہدے سر تے آوے
جیکر چھلے نال صفائی لا خوف ہو جاوے
مونو اقبل ان تموتو ! وارد ہویس نان ے خوف کہاوے
کامل پیر عنایت کیتی نال ایہہ مطلب پاوے

(ج) جمال سہنے دلبر دا ہے. مثال ہے یارو
اپنے گھر تھیں ڈھنڈہیاں لبھدا دیر تے حرم وسارو
لطف کرم پیر کامل دے تھیں واقف ہو اسرارو
من عرف نفسہ فقد عرف ربہ دل دے نال وچارو

(غ) غرور کرکے بیلی تیں حق دا راہ بھلایا
آکھے لگوں نفس اپنے دے تائیں دیدار نہ پایا
من کان فی ھذہ اعمی تدہ آپیں کور سڈایا
باجھوں شاہ مردان دے اڑیا تیں ضائع جنم گنوایا ۲

حضرت نوشہ نول قلندر

ایک اور بزرگ حضرت نوشہ نول قلندرؒ (م - ۱۸۳۳ء/- ۱۲۴۸ھ) بھی فارسی اور سرائیکی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے - انہوں نے علم و فکر کے ساتھ قدیم ساہیوال کے علاقے میں سرائیکی زبان کی شاعری کو بھی بہت رواج دیا اور ان کی صحبتوں میں تصوّف و روحانیت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے مذاکرے بھی ہوتے تھے - افسوس کہ قلندر صاحب کا سرائیکی

۱- حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو ، اور مقالہ اردو زبان کے مختلف نام اورینٹل کالج میگزین لاہور مئی ۱۹۲۹ء

۲- ''سی حرفی درویش عنایترح'' قلمی نسخہ مملوکہ مقالہ نگار -

کلام سر دست میسر نہ آسکا ، البتہ ان کے ایک عاشق صادق اور نامور مرید میاں امام بخش کھوکھر کی ایک مثنوی اور ایک سی حرفی دستیاب ہوئی ہے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ اردو کے سخنور امام بخش ناسخ بھی حضرت قلندر کے مرید تھے اور سرائیکی کے سخن سنج امام بخش امام بھی انہی کے بیعت ہوئے[۱] ۔ لیجیے امام کا کلام ملاحظہ کیجیے :

ھ ۔ ہر دم ہوویں ہمدم دم دا دمبدم اس دم نوں غیر خدا تھیں یکدم ہم مدم
ایہہ دم ہے کل بساط اساڈی دمبدم دساں دا بھل کار اساں نہیں ہور کم
ہو اللہ یاد امام فھل من مدکر

ی ۔ یاد رہے دی کہہ کہہ کس نوں آکھدے اوہ پڑھدے ورد نماز اوہ روزے راکھدے
بن تابت کیتیں ، صاحب کت ول جھاکدے ایہہ تنہاں سلام قبول جو شہ تون بھاکھدے
اکھیں ویکھ امام پھیر سجود کر[۲]

منشی غلام حسن گامن

منشی غلام حسن گامن فارسی کے تو زبردست شاعر تھے ہی مگر سرائیکی زبان بھی ان کے نام اور کلام پر جتنا ناز کرے کم ہے۔ وہ وحدت الوجودی مکتب فکر کے مایۂ ناز سخنور تھے ۔ منشی صاحب ملتانی الاصل اور حضرت جمال ملتانیؒ کے خلیفۂ خاص تھے ۔ اپنے پیر و مرشد حافظ جمال کی طرح منشی غلام حسن بھی سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے کلام میں حسن تشبیہہ ، استعارات اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ سوز و گداز کی بھی فراوانی ہے ، ملاحظہ کیجیے :

لک چھپ آیا ، یار وہ وہ عجب تماشا ہر ہر طرف بہار ، وہ وہ عجب تماشا
آپے ویکھے آپ ویکھاوے رمز اسے دی کوئی نہ پاوے
شیشہ اپنا آپ بناوے آپ ویکھے دیدار ، وہ وہ عجب تماشا
لک چھپ یار پئیندا جھاتی ہر جھاتی وچ فیض حیاتی
جھاتی دی میں رمز پچھاتی ایہہ کوئی ہور اسرار وہ وہ عجب تماشا

اساں نی ہک جو گیڑا آیا کوئی صاحب حسن جمالے
اس جوگی نوں میں ہن لیکھیا ایہو تاں ساڈڑا مہینوالے
رانجھو دا مینوں پوندا بھلاوا بھلا جانوت مٹر کر بھالے
ما پیو چھوڑ لگی لڑھ اس دے بھلا لایاں دی لج پالے

۱۔ نور احمد فریدی ، تذکرۂ حضرت قطب الاقطاب ص ۳۵۷ ۔
۲۔ ''سی حرفی ، میاں امام بخش امام کھوکھو تلواڑیہ'' قلمی نسخہ مملوکہ مقالہ نگار۔

ڈاگاں اس توں گـول گھایاں   بـھـلا صـدقـے ڈاگاں والے
گامن بـاجھ جـمال انـہی رح   بھلا کون میڈے غم ٹالے ۱

کافیوں کے علاوہ منشی صاحب نے چند ایسی چیزیں بھی ایجاد کیں جنہیں قبولِ عام اورسند کی حیثیت حاصل ہوئی مثلاً سرائیکی زبان میں غالباً سب سے قدیم ''ڈھولا'' منشی غلام حسن کا ملتا ہے۔ اسی طرح ''گھڑولی'' بھی آپ ہی نے ایجاد کی۔ موسیقی سے خاص لگاؤ کے باعث امیر خسرو کی طرح بعض راگ راگنیاں بھی آپ نے ایجاد کیں۔ خاص طور پر ''خیال گامن'' جو کلاسیکل موسیقی کی جان ہے۔ منشی صاحب کی ایجاد ہے۔ جیسے ان کے صاحبزادے محمد یٰسین نے عروج تک پہنچایا۔ آپ کی بہت سی کافیاں مخصوص راگوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً خیال، راگنی جوگ، راگنی صبحی، خیال راگنی پیلو، خیال گامن وغیرہ میں آپ نے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کی ایک سی حرفی بھی ملتی ہے، ایک مکمل ڈھولا بھی موجود ہےاور چند دوہے بھی۔ آپ نے لوک ادب میں خاص طور پر اضافہ کیا۔ مثلاً ''بسنت''، ''مہندی''، ''بندگی بجناب امام حسن۲'' گھڑولی''، ''مجرا'' پر آپ کی سرائیکی نظمیں سرائیکی معاشرت اور تہذیب و تمدن کی کامل عکاسی کرتی ہیں۔ منشی صاحب کی ولادت ۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ کے لگ بھگ اور شہادت ۱۸۴۸ء/ ۱۲۶۵ھ میں ہوئی۔ مزار مبارک ملتان میں ہے۔ ''خیال گامن'' میں ایک کافی ملاحظہ کیجیے:

نیناندے نیڑے وس وے ماہیا   راویوں پار نہ چھیڑ مہیں نوں
نیناندے نیڑے وس ......

نیڑے ہو کر دور جلیندیں   کائی نہ ویدن ڈس وے ماہیا!
نیناندے نیڑے وس ......

ویـکھن دا سـدھرایا آہیوں   ہن کیوں کیتیا بس وے ماہیا!
نیناندے نیڑے وس ......

اسـیں کٹھڑے ڈون نیناندے   رحجاندے تیر نہ کس وےماہیا!
نیناندے نیڑے وس ......

مولانا عبدالحکیم

منشی غلام حسن کے ایک بزرگ معاصر اور ان کے پیر و مرشد حضرت حافظ جمال کے ہم عصر بلکہ پیر بھائی اچّہ (ریاست بہاولپور) کے ایک نامور شاعر اور جیّد عالم مولانا

۱۔ ''دیوان گامن'' قلمی نسخہ مملوکہ سجادہ نشین خانقاہ منشی غلام حسن ملتانی و ''شعر معجم فی الہند'' شیخ اکرام الحق ایڈووکیٹ ملتان و دیباچہ ''دیوان حسن فارسی'' مرتبہ سجادہ نشین مطبوعہ ملتان ۱۲۔

عبدالحکیم گذرے ہیں۔ جنہوں نے ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ میں 'مثنوی یوسف زلیخا' لکھ کر سرائیکی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ مولانا عبدالحکیم اچّہ شریف کے قدیم باشندے اور عبّاسی لاڑ تھے۔ علوم دینی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اچّہ میں ان کی درسگاہ پورے برِّصغیر کے طلباء کا مرکز بنی ہوئی تھی۱۔ مولانا قبلہؒ عالم خواجہ نور محمد مہاروی رح سے بیعت اور ان کے خلیفہؒ مجاز بھی تھے۲۔ ان کی مثنوی اپنے موضوع پر اگرچہ پہلی کوشش نہیں تھی، کیونکہ ان سے پہلے دکن میں ملاّ غواصی اور پنجاب میں حافظ برخوردار اور صدیق لالی 'یوسف زلیخا' لکھ چکے تھے لیکن وہ اپنی سادگی، سلاست، فطری اندازِ بیان اور ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کی سی کیفیت کے سبب شہرۂ آفاق اور لوک ادب کا جزو لاینفک بن کر رہ گئی۔ پروفیسر محمود شیرانی اپنی مایہؒ ناز تصنیف 'پنجاب میں اردو' کے اندر مثنوی کو بہت سراہتے اور شواہد و استدلال کے سلسلے میں اس سے کافی مدد لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'مثنوی یوسف زلیخا' سرائیکی زبان کی ''امہات الکتب'' میں شمار ہوتی ہے اور بارھویں صدی ہجری یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی بہاولپوری سرائیکی تہذیب و تمدن کی ایک زندہ جاوید تصویر پیش کرتی ہے۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر حاضر ہیں:

زلیخا کا بادِ صبا کو پیغام دینا۔

زلیخا بادِ خوش تائیں الاوے — سنیہے یار دی خاطر سناوے
گزر تیرا بھی ہے سارے جہاں تے — نظر تیری ہوے ہر ہر مکان تے
جتھاں توں جاوڑیں پھر کون ہوڑے — تیرے فرمان توں رخ کون موڑے
او کہڑا ہے گدا یا بادشاہے — جو تیڈی دوستی تائیں نہ چاہے
کریں جا کے عرض پیغام میڈے — خدا ڈیسی صبا انعام میڈے
جیکر پچھے ایہے پیغام کیہے — توں آکھیں درد منداں دے سنیہے
اول زانو ادب دے نال بہنا — پچھے ہتھ جوڑ کے احوال کہنا
اگے اس بادشاہ دے جا کھڑو ویں — میری گل یاد کر کے زار رو ویں۳

جیسا کہ پیشتر ازیں کہا جا چکا ہے سندھی زبان سرائیکی سے ۱۱۰۰ء میں الگ ہوچکی ہے مگر چونکہ خود سندھی شاعری کا باقاعدہ آغاز سترھویں صدی عیسوی کے آخیر میں یعنی شاہ عبداللطیف بھٹائی (ولادت ۱۶۹۰ء/۱۱۰۲ھ، وفات ۱۷۵۲ء/۱۱۶۵ھ) کے

۱، ۲- لطائف سیریہ (ملفوظات خواجہ محکم الدین سیرانی رح) مرتبہ مولوی علی مردان ملتانی، ص ۳۵ - ۳۶۔

۳- مولوی عبدالحکیم اچوی رح، مثنوی یوسف زلیخا ص ۸ - ۹ - مطبوعہ رائصاحب منشی گلاب سنگھ مطبع مفید عام لاہور ۱۹۱۳ء۔

دور سے ہوتا ہے اس لیے اب ہم مولوی عبدالحکیم اچّوی کے بعد سندھ میں سرائیکی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں ۔ سندھ میں سندھی زبان کا راج ہونے کے باوجود تقریباً ہر قابل ذکر شاعر نے سرائیکی میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی سے قبل کے شعراء دراصل وزن بیت کے طور پر شاعر مانے جاتے ہیں ، ورنہ ان کا کلام سندھی زبان کا سرمایۂ ادب نہیں ہے ۔ شاہ بھٹائی نے ٹھیٹھ سندھی زبان استعمال کرنے کے باوجود سرائیکی الفاظ ، محاورات اور ضرب الامثال کو کثرت سے استعمال کیا ہے ۔

سچل سرمست

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بعد سندھ کے قابلِ فخر فرزند حضرت سچل سرمستؒ کا نام نامی سرِ فہرست ہے ۔ وہ اصل و نسل کے اعتبار سے عرب کے مشہور خاندان فاروق کے چشم و چراغ تھے ۔ آپ کے اجداد محمد ابن قاسم کی معیت میں سندھ تشریف لائے ۔ پہلے سیوہان میں اور پھر خیر پور کے قریب درازان میں قیام پذیر ہوئے ۔ سچل سرمستؒ کی ولادت مشہور درویش میاں صاحب ڈنو کے ہاں ۱۷۴۰ء/۱۱۵۳ھ میں ہوئی ۔ آپ کا اصل نام عبدالوہاب تھا ۔ فارسی میں تخلص آسکارا اور سندھی ، سرائیکی میں سچّل یا سچو استعمال کرتے تھے ۔ آپ کو شاعرِ ہفت زبان تسلیم کیا گیا ہے ۔ ہندی ، سندھی ، فارسی اور سرائیکی میں تو ضخیم کلّیات موجود ہیں ۔ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے ۔ وحدت الوجود یا ہمہ اوست آپ کا خاص موضوع ہے ۔ زیادہ تر کلام اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہے ۔ سرائیکی زبان میں آپ کے کلیات سندھی ادبی بورڈ اور دوسرے اشاعتی اداروں کی طرف سے 'سچّل جو سرائیکی کلام' کے نام سے بارہا چھپ چکا ہے ۔ سرائیکی شاعری میں آپ مادھو لال حسین رحؒ بلہے شاہؒ اور حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ سچل سرمست سندھ میں سرائیکی شاعری کے ممتاز اور نمائندہ شاعر گزرے ہیں ۔ بطور نمونہ کچھ کلام پیش خدمت ہے :

لوک کنوں لج مول نہ آوے　　عشق گھہایاں گھٹیاں
طعنے تنکے تنہاندی زینت　　مول نہ تھیوں کھٹیاں
چھوڑ گھراں نوں گھمدیاں و تدیاں　　دشت جبل تے پٹیاں
پیتاں جناہاں خبر انہاں کوں　　ہور نہ جانن جٹیاں
پاند اڑا کے خلق کھلا کے　　ہو کے ڈیوں ہٹیاں
سچل او کیا سکھ نبھیسن　　جھڑیاں فراق دیاں پھٹیاں ۱

۱- ''سچل سرمست جو سرائیکی کلام'' ناشر ، سندھی ادبی بورڈ ، حیدر آباد و مقالہ رشید لاشاری مندرجہ ''اختر'' ملتان ۔

سچل کی سرائیکی شاعری نے پورے سندھ اور پنجاب کو متاثر کیا اور ان کے بہت سے پیروکار پیدا ہو گئے۔ ان کے ایک اور سندھی معاصر خلیل لاشاری ہیں، جو سرائیکی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا وطن مالوف گھوٹکی ضلع سکھر ہے اور وہ سندھ کے مشہور حکمران خاندان کلہوڑہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

کہہ کا گالھہ سنا واہ واہ	سودا سچ دا تھیا ٹھاہ پھاہ
چھاتی دے وچ جھاتی ہے	سانوں، فیض حیاتی ہے
لگی اڑگ تے جھنگ وساتی ہے	لگی بھڑک برہوں دی باہ باہ
جارج خارج کرے کرے	جاہ نہ لہندا ذرے ذرے
عشق دا پینڈا پرے پرے	گھیر، گھٹیاں ولٹے راہ راہ
محمود ایاز آیا شامل	وابو عشق کیتا کامل
نفس ندار پڑھن عامل	عشق بنان گمراہ گمراہ [۱]

روحل

تھر، سندھ کا ایک محبت آفرین اور عشق انگیز علاقہ ہے۔ مشہور عشقیہ داستان اور لوک کہانی ''عمر ماروئی'' اسی تھر کے علاقے ''امر کوٹ'' سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۷۳۳ء میں ''امر کوٹ'' کے ایک قریبی گاؤں میں بلوچ خاندان کے ایک معزز گھرانے میں سندھ کے بلند پایہ سرائیکی شاعر اور نامور بزرگ روحل فقیر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سندھ کے حکمران میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے توشہ خانے کی نگرانی پر مامور ہوئے۔ وہاں سے دل اچاٹ ہوا تو سندھ کے نامور صوفی بزرگ حضرت شاہ عنایت (جھوک والے) کے مرید ہو گئے۔ سب کچھ تیاگ کر درویشی اختیار کی اور سندھ میں سرائیکی شاعری کے ایک جدید مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ آپ کے بہت سے خلفاء، مریدین اور سجادگان سرائیکی زبان کے قابل ذکر شاعر گزرے ہیں، جن میں سے انور شاہ جہانپوری، فقیر در محمد صاحب، مراد فقیر، دریا فقیر، غلام علی فقیر اور خدا بخش فقیر صاحب دیوان شاعر تھے اور ان کا کلام محفوظ و موجود ہے۔ ذیل میں روحل فقیر اور ان کے چند خوشہ چین شعراء کے کلام کے نمونے درج کیے جاتے ہیں جو دلچسپی کا باعث ہوں گے:

دنیا ڈھونڈھ تے طالب کتے سبھناں مل کر تانی
ہڈی تے ہوڈا نہاندی وڑھدین عمر وہانی

۱۔ میمن عبدالحمید سندھی، ضلع سکھر کے شعراء مطبوعہ سندھی ادبی سوسائٹی، اسلامیہ کالج سکھر۔

— اندھیاں در اللہ دا چھوڑیا پئے ولوڑں پانی
روحل راہ ربانی باجھوں پئی سب کوڑ کہانی

☆ ☆ ☆ ☆

چپ چپاتی ویڑھے دیوچہ میڈے نوشہ آیا
نہ میں سرمہ سیندھ گندہائی نہ میں چندن لایا
لوں لوں دے وچ جھوک جھندی تھی راضی رنگ لگایا
میں مت پیر نمانی دا چا اللہ بھان وسایا ۱
(روحل فقیر)

☆ ☆ ☆ ☆

لاف مریندین لج نہں آندی عاشق نام سڈیندا
ہمّت ہندوی رن جتلی توں ناں نہوی کریندا
او مروِیندی مردے اتوں نوں دلبر تے نہیں ڈیندا
یار مراد منبٹسی اوہو جو جیندیں مر کر جیندا

☆ ☆ ☆ ☆

سب کوئی عاشق نوسہ دا کیا دانے کیا دیوانے
ہک بیٹھے پڑہن مسیتاں وچہ ہئے مست رہن میخانے
سوئی وستی دیوچہ وسدا سوئی وسے ویرانے
جھڑ جھنگ یار مراد ملیوسے سکرانے سکرانے ۲
(مراد)

☆ ☆ ☆ ☆

ہادی والا نکتہ ہکو صحیح کریں ہوں سارا اندر باہر سوہنا سائیں نرمل نور نظارا
جانیں ناں ہوں آپ سنجانیں بیا سب کوڑ پسارا
حسن اساں تے حملہ کیتا نینہہ مرینـد نعـرا
کل فقیر کوں سجدہ کیتم شـاہـو شـاہ ہـارا
غلام علی نوں ظاہر باطن مـاریں نیـنہ نـقـارا۳
(غلام علی)

☆ ☆ ☆ ☆

الف اللہ دی ذات اصل ہئی رنگ نہ کو بے رنگی
کن فیکون وچوں جگ جوڑیس بیرنگی نا زنگی
کتھاں ایرانی کتھاں عراق کتھ رومی کتھ زنگی
"خدا بخش" ہکا حق کنوں اسان ہک محبت منگی۴

۱- محمد اسماعیل احمدانی ، سرائیکی کے دو بلوچ شاعر ، ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان ستمبر ۱۹۶۸ء -
۲- محمد اسماعیل احمدانی ، سرائیکی کے دو بلوچ شاعر ، ماہنامہ بلوچی دنیا ، ملتان ۱۹۶۸ء -
۳ ، ۴- میمن عبدالجمید سندھی ، ضلع سکھر کے شعراء مطبوعہ سندھی ادبی سوسائٹی اسلامیہ کالج سکھر -

حضرت پیر پگاڑو

برصغیر کی تحریک حریت و آزادی کے سندھی علمبردار خانقاہ نشین مجاہد حضرت پیر پگارو علیہ الرحمہ کی ذات سے کون واقف نہیں۔ آپ کا نام حضرت پیر محمد راشد تخلص ''حسینی'' اور لقب ''روضہ دھنی'' (یعنی صاحب روضہ) تھا، آپ ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ میں آزادی وطن کی راہ میں شہادت پائی۔ دینی و مذہبی تعلیم سندھ کے مشہور مخادیم کھہڑا سے حاصل کی۔ باطنی فیوض اپنے والد ماجد سید محمد بقا اور مخدوم محمد اسماعیل علیہ الرحمہ سے حاصل کیے۔ ''خانقاہ پگاڑو'' کی بنیاد دراصل آپ نے رکھی اور اسے عالمگیر شہرت کا درجہ دیا۔ سندھ کے مشہور خلفاء خلیفہ محمود کھہڑالی رح خلیفہ نبی بخش لغاری رح اور خلیفہ گل محمد ہالائی صاحب ارشاد درویش اور سندھی اور سرائیکی کے شاعر بھی تھے۔ پیر صاحب پگارو خود بھی قادر الکلام، نازک خیال اور بلند پایہ سرائیکی و سندھی شاعر تھے۔ سچل سر مست آپ کے ہم عصر تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ان سے بھی متاثر ہوئے۔ آپ کے کلام بلاغت نظام کا ایک شہ پارہ بطور نمونہ درج ذیل ہے:

عشق نہ پچھندا ہے کوئی ذات   جتھاں دل لگ گئی اتھ مستان بنایا وے
عشق نپل کوں آن دھوبی کہلوایا   سسی نوں روہیں دیوچہ رلوایا
عسق نہ سندا ہے کہیں دی بات   کشتں کرکے ڈوہاندا قبرستان بنایا وے[۱]

صدیق فقیر

سندھ کے حکمران خانوادے سومرہ کے ایک مرد درویش جو دودہ اور حمیر سومرہ کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے، صدیق فقیر تھے۔ صدیق فقیر کا اصل نام محمد صادق اور تخلص صدیق تھا۔ ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ میں تولد ہوئے۔ وطن مالوف کچھ یا کچھی تھا، مگر بعد میں نقل مکانی کر کے تھرپاکر میں آباد ہو گئے۔ صدیق فقیر جھوکے شاہ عنایت سے بیعت تھے، گویا مشہور تھری درویش و شاعر روحل فقیر کے پیر بھائی تھے۔ سندھی کے علاوہ سرائیکی کے زبردست شاعر تھے۔ کلام میں سادگی شیرینی اور سوز وگداز ہے۔ کافیاں اور دوہے خوب کہتے تھے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

دوہا۔
ساتھی ہاندھی چھوڑ گئے چھوڑ گئے ملک دے راجا
سے بھی چھوڑ گئے صادقا پیر پیغمبر خواجا
صورت رانجھیے والی نت بلندی وچہ بیلے
پیر ویچاری کیا کرے عشق نپی دل بھیلے[۲]

۱۔ میمن عبدالحمید سندھی، ضلع سکھر کے شعراء ص ۴۰ تا ۴۳، مطبوعہ اسلامیہ کالج سکھر

فقیر غلام حیدر شر

میرانِ تالپور کے دارالخلافہ خیر پور کے قرب و جوار میں فقیر غلام حیدر شر سرائیکی کا صاحبِ دیوان شاعر گزرا ہے ۔ یہ بلوچوں کے ایک قبیلے ''شر'' میں پیدا ہوا اور رہزنی سے درویشی تک جا پہنچا ۔ سندھ کے نامور درویش ''نانک یوسف'' کے ہاتھ پر توبہ کی ۔ اس لیے اس کا عہد ۱۷۸۳ء سے ۱۸۵۳ء تک متعین کیا گیا ہے ۱ ۔ سندھی اور سرائیکی دونوں زبانوں میں کافی کلام یادگار چھوڑا ہے ۔ کلام میں دردِ محبت ، جذباتِ ہجر و فراق ترکِ دنیا کی تلقین اور سوز و گداز کی فراوانی ہے ۔ نمونہ درج ذیل ہے :

اے جگ سارا ڈھونڈھ رہی سے پاک پلبتاں جائیں
ہر کنہن دیوچہ وسدا ہیں تو سن اے میڈا سائیں

نحن اورب تینوں ویکھیم سوہنا سنج صباحیں
غلام حیدرا ، غیرنہ چھوڑیں نوبت نینہہ وجائیں۲

حمل خان لغاری

انیسویں صدی کے آغاز میں سندھ نے ایک ایسے انمول ہیرے کو جنم دیا جسے اگر سندھ کے سرائیکی گو شعراء کا سرتاج کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا ۔ میری مراد حمّل خان لغاری رح کی ذات سے ہے جن کی سندھی اور سرائیکی کلیات مشہور محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سندھی ادبی بورڈ سے چھپوائی ہے ۔ حمّل خان سندھ کا لطف علی تھا ۔ اس کے کلام میں زورِ بیان ، شوکتِ الفاظ اور محاورات کا حسین امتزاج ملتا ہے ۔ بلندیٔ تخیل ، سوز و گداز بالیدگیٔ فکر اور وحدتِ الوجود اس کے کلام کی خصوصیات ہیں ۔ حمل خان میر علمبردار خان تالپور کے دربار سے بھی وابستہ رہا ہے ۔ سندھ کا یہ ملک الشعراء ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں تولّد ہوا اور ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ میں راہیٔ ملکِ عدم ہوا ۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے : ۳

سو سو صدقے ساہ کراں ہک دلبر دے دیدار اتوں
کبکاں بھی قربان ڈھولن دی ڈھلک ٹرن دی دیار اتوں

قمری کوئل صدقے سجن دی گویا خوش گفتار اتوں
حمل اے سر گھول گھمایا پیراں دی پیزار اتوں

سٹھنا وقت صبح دے ڈٹھم دوست مٹھا دل جانی پاک پیشانی
موہنہ مہتاب منور مہ رخ جلوہ جوت جوانی یوسف ثانی

۱- سہ ماہی مہران حیدرآباد سال ۱۹۶۹ء ۔
۲- غلام نبی میمن ، فقیر غلام حیدر ۔
۳- ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (مرتب) - کلیات حمل لغاری

پھر لٹ دل فقیر کتوئی توں در کھڑے سوالی ڈیو ڈکھالی
دوست تیڈا دیدار منگوں پی مایا ملک نہ مالی ڈیو ڈکھالی
بوسے دے چا بھیک ڈیوو تاں سوالی ونجے نہ خالی ڈیو ڈکھالی
حمل دا کجھ حال پچھو جو پھر دا مست سوالی ڈیو ڈکھالی

یوں تو اس دور کے سرائیکی گو شعراء سندھ میں اور بھی بیسیوں گزرے ہیں، جیسے مخدوم غلام محمد بگائی، مخدوم محمد اسماعیل کھہڑائی اور جلال کھتری (رنگریز) یا تالپور عہد کے مرثیہ گو سید ثابت علی شاہ، خلیفہ نبی بخش اور جھوک کے چند درویش، مگر اتنی گنجائش نہیں کہ یہاں ان سب کا تعارف کرایا جا سکے۔ دکھانا صرف یہ مقصود ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول تک بھی سندھ سرائیکی شاعری کا ایک عظیم مرکز رہا ہے۔ اس دور کے دو بہاولپوری ملتانی شعراء کا تذکرہ نہ کیا جائے تو ظلم ہوگا۔ یہ احمد یار اچوی اور گل محمد چشتی ہیں۔

احمد یار اچوی اور گل محمد چشتی

اول الذکر اچہ شریف ریاست بہاولپور کے باشندے قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی کے مرید و معتقد اور نواب محمد بہاول خاں ثالث (م۔ ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ) کے درباری شاعر تھے[۱]۔ فارسی اور سرائیکی دونو میں شعر کہتے تھے، نمونۂ کلام یہ ہے:

روز قربانی آکھیا جانی میں نوں گھول گھیتویں، آکھم اینویں
جڈوں تیر برہوں دا لگی ہر گز رخم نہ سیویں، آکھیم اینویں
ہر پیالہ عشقی والا شربت کر کر پیویں آکھیم اینویں
احمد یار جیویں فرمائے توں بھی منّیں اینویں، آکھیم اینویں

ثانی الذکر گل محمد چشتی رح "شیرو" ضلع ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ 'گلزار فریدی' اور 'حدیقۃ الاسرار' ان کی معروف ترین کتابیں ہیں۔ یہ سرائیکی کے بھی خوشگوار اور قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' مقبول و مشہور رہے۔ وہ اپنی مثنوی میں زبان و بیان، تکنیک اور نگارش کے لحاظ سے مولوی عبدالحکیم اچوی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہی سادگی، وہی شیرینی، وہی صفائی و چابکدستی اور وہی سوز و گداز ان کے ہاں بھی ہے۔ 'مثنوی لیلیٰ مجنوں' کا سال تکمیل ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ ہے۔ انگریز اس دور میں پورے پنجاب پر قابض ہو چکے تھے۔ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ ڈتو یار سہندا جوڑ سر تے　　　وچھوڑے دی ڈتو پنڈ تروڑ سر تے
جھڑی قسمت آہی پلّے پیوسے　　　جو وس بے وس رضا رب سر چتوسے

۱۔ دبیر الملک مولانا عزیزالرحمن، عزیز احمد یار اچوی، ماہنامہ "العزیز" بہاولپور ماہ اپریل ۱۹۴۱ء۔

کڈاں راتیں ہجر دیاں تروڑناں کہ یا ساری عمر اینویں نبھیاں
خدا سیڈی ایہا قسمت بنائی میڈے متھے دہروں لکھی جدائی
نساڈے عشق لائی جوڑ کانی رہے حیران گرداں دل نمانی ۱

اس دور کی خصوصیات میں مذہب پرستی، عقیدہ میں پختگی، سادگی و سلاست، توکّل و غنا اور ترکِ دنیا کی تلقین کے ساتھ ساتھ تفریحی شاعری بھی تھی، جو گرمئی محفل اور میلوں ٹھیلوں کی رونق بنتی تھی۔ نیز عربی و فارسی تراکیب سے بھی بے پناہ رغبت کے رجحانات اس دور میں عام ملتے ہیں۔ گویا ۱۸۵۷ء سے قبل کی سرائیکی شاعری کے ڈانڈے محمد ابن قاسم اور محمود غزنوی کے عہد کے افکار و نظریات سے مسلسل ملے ہوئے نظر آتے ہیں جنہیں انگریزی عہد نے آ کر یکلخت توڑ دیا۔

(۱۸۵۷ء کے بعد)

سرائیکی ادب کی نشاۃ ثانیہ کا دور

ملکی حوادث اور سیاسی انقلابات کا اثر عوام کی زندگیوں پر ہی نہیں بلکہ ان کے سماجی کردار اور ثقافت و تمدن پر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تغلّب اور تسلّط کے اثرات بر صغیر کے ہر گوشے اور علاقے پر یکساں نظر آتے ہیں۔ تحریکِ آزادی شروع ہوئی تو انگریزوں کے خلاف سرائیکی علاقوں میں بھی جنگ لڑی گئی اور خوب لڑی گئی۔ انگریزوں نے ۱۸۴۸ء میں ملتان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اہلِ ملتان نے بھی انگریزی اقتدار کے خلاف ٹکر لی اور مٹھی بھر مجاہدین آخری سانس تک لڑتے رہے۔

ریاست بہاولپور کے نواب نے ۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے روابط قائم کر لیے تھے، اور ۲۲ فروری ۱۸۳۳ء میں کمپنی کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کر لیا تھا۲۔ عوام اور علماء اس معاہدہ کے خلاف تھے اور نصرانیوں کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے تھے، خاص طور پر ریاست کے شمال مغربی علاقے ''بھونگ بھارہ'' کے بلوچ قبائل نے تالپور بلوچوں کی قیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ کاشمور سے قلات تک کا علاقہ بھی جہادِ حریّت میں سربکف نظر آتا ہے۔ ۱۸۷۹ء میں جب نواب میر محراب خان والئی قلات انگریزوں کے خلاف جنگ

۱۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق، ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق، ص ۳۴۶، ۳۴۷، (قلمی نسخہ مصنف)۔

۲۔ خان رضوانی، تحریک آزادی اور خواجہ فرید مطبوعہ ''اختر'' (سرائیکی) مئی ۱۹۶۸ء۔

گرتے ہوئے شہید ہوگئے تو یہ پورا بلوچی علاقہ میدان کار زار بن گیا ۔ اسی طرح جب ۱۸۳۸ء میں مسٹر برٹس نے بکھر کا قلعہ بوڑھے میر رستم خان نالپور سے بزور شمشیر لے لیا تو مجموعی طور پر پورے سندھ میں تحریک جہاد آزادی کا علم بلند کیا گیا ۔ جگہ جگہ مجاہدین نے مورچے قائم کر لیے اور پوری رعایا تالپور حکمرانوں کے دوش بدوش انگریزوں سے نبرد آزما ہوگئی۔ بالآخر سرچالس نیپئر نے ۱۸۴۳ء میں پورے سندھ پر قبضہ کر لیا ۔

ان وقائع و حوادث کے سرائیکی تہذیب و تمدّن پر اور سرائیکی دانشوروں کے افکار و نظریات پر دور رس اثرات مرتسم ہوئے، چنانچہ سرائیکی زبان کے بعض جیّد علماء اور نابغہ شعراء نے توکھل کر انگریز کی مخالفت کی ، اس سلسلے میں سب سے اوّلین نظم غالباً حیدر خاں دھڑوائی کی ہے[۱] ، جو ۱۸۴۲ء کے ایک معرکے سے تعلق رکھتی ہے اور ہر چار مصرعوں کے بعد ٹیپ کا بند یہ ہے :

اح گھٹ گھنسوں بھنگ بھـــارا   مارو ''دم حیـــدر'' دا نعـــرا

ان کے بعد ضلع مظفر گڑھ کے ایک دور افتادہ علاقے کا نامور ساعر اور خواجہ فرید کا بزرگ معاصر مولوی اللہ بخش جانباز اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے :

نصرانیاں دی فوج نے سونجبر کتنا ساڈا وطن [۲]
سوریں دے ایڑے نے بھرا پدھر کیتا ساڈا وطن !

خواجہ فرید (م–۱۹۰۱ء) جو اس دور کے ملک الشعراء اور سرائیکی کے عظیم شاعر شمار ہوتے ہیں ، کے علاوہ گل محمد فائی ملتانی (م–۱۹۰۰ء) نے انگریزی تسلّط و تغلّب اور انگریزی تہذیب و تمدّن کی خامیوں اور برائیوں کے متعلق ایک طویل نظم کہی ۔

بہر حال سرائیکی ادب کی نشاہ ثانیہ اور تحریک تجدّد کا ہنگامہ خیز اور زرّیں دور اس پس منظر میں طلوع ہوا اور اسلامی عہد اور مسلم تہذیب کی نوحہ خوانی کے ساتھ ساتھ نئے دور کی کچھ برکات اور جدنوں کی نوید بھی لایا ۔ اس دور کے شعراء حسب ذیل ہیں :

سید اکبر شاہ

اس دور کے سب سے اوّلین شاعر غالباً سید اکبر شاہ (م–۱۸۵۸ء/۱۲۷۵ھ) ہیں ، جن کا آبائی وطن موضع جمرانی ریاست بہاولپور تھا۔ مگر اکبر شاہ نے ساری عمر تبلیغ کرتے ہوئے موضع گٹھ برابر ملتان میں گزار دی ۔ انگریزی تسلّط کے فتنے کو آنکھوں سے دیکھا اور

۱- حیدر خان چانڈیو المعروف دھڑوائی از بیاض ماسٹر احمد علی خان چانڈیو میر پور ماتھیلو (سندھ)

۲- مخطوطہ قصہ بیزن منشیرہ و قصہ جانباز عالم مصنفہ اللہ بخش جانباز مملوکہ محمد نواز خوشتر ججوی ۔

مغربی تہذیب کی بھرپور مخالفت کی۔ آپ کی سی حرفی 'داڑھی' بہت مقبول ہے۔ جس میں ریش و بروت صفا صاحب بہادروں کی دلنشین اور جچیے تلے انداز میں موعظمت کی ہے۔ 'جنگ نامہ اکبر'، 'سسّی پنوں اکبر'، 'مرزا صاحباں اکبر'، 'قصہ مصری اکبر' کئی سی حرفیاں اور سینکڑوں ڈوہڑے آپ کی یادگار ہیں۔ اندازِ بیان صاف ستھرا، زبان بامحاورہ، تشبیہات و استعارات دلنشیں اور مضامین میں جدّت ہے۔ 'قصہ سسّی پنوں' میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ سرائیکی معاسرت کی عکاسی کی ہے:

کر نوکل پڑھ کر فاتحہ کرن بلوچ نباری
اطلس، ململ، جامے گل، سرچیرے گل اناری
سرخ جیرے سرخ بیج سناری مرواریدہ رمالاں
لک نلواریں بند بہاتی تنہالاں منہالاں
دست کماناں، ترکس لٹکن بھمن لٹکن ڈھالاں
بازو بند سناری کنگن جڑھیے جواہر لعلاں
مست ستی کھسوری ہیڑی لگا معطر دالاں
ڈیکھ ہوتاں دی لٹک سسی دل بایا وچہ خیالاں

اللہ داد تونسوی

استاد اللہ داد تونسوی تونسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سال وفات ۱۸۵۹ء ہے۔ آپ کے کلام میں سوز و گداز، عشق و محبت کی چاسنی اور ہجر و فراق کی کسک کا اظہار خوبصورت پیرائے میں ملتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے:

سانون آیا رناں مڑیاں لگیاں یار دے نانویں سڈن
سبڑھ پئے دریانواں، کوں لگے بٹ کون سیبے لگن
ساوا ساتوک سبز جھکوں لگیاں سبزیاں دل کوں ٹگھن
آکھ اللہ داد پچھو سجناں توں جھوک و سیسو کڈن

مخدوم شاہ محمود

آپ خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے صاحبِ سجادہ تھے۔ آپ کا دور ۱۸۰۰ء سے ۱۸۶۹ء تک شمار ہوتا ہے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے کلام سے تلاشِ بسیار کے بعد ایک مرثیہ ملا ہے۔ خیالات پاکیزہ اور زبان صاف ستھری ہے۔ ملاحظہ ہو:

مرینداباں علمبردار رہیا
پانی آنن کان تیار رہیا
جیں خیمے وچہ احمد لاوے کچاری
جیندی کرن فرشتے چوب برداری
ڈینہ عشرے دے امت دی نرواری
سڑدا اوہ خیمہ اطہار رہیا
توڑویں عابد ہاتپ توں تنگے
ضعف توں ہو گیا پیلا رنگے
بیمار تے کیتا ظلم نسنگے
چھکدا شام تائیں او مہار رہیا

خان بہادر نواب سردار کوڑے خان جتوئی

ضلع مظفر گڑھ کا یہ نامور فرزند بلا مبالغہ سرائیکی علاقے کا سر سبد اور حاجی شریعت اللہ کہلانے کا مستحق ہے ۔ سردار کوڑے خان ایک بلوچ سردار خان جتوئی کے گھر ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ۔ سکھا شاہی کا دور بھی دیکھا اور انگریزوں کے تسلّط و تغلّب کا بھی مشاہدہ کیا ۔ انہوں نے اپنے علاقے میں انگریزی مدارس کھلوا کر قوم کو جدید تعلیم سے مستفید ہونے کی ترغیب دی ۔ علی گڑھ ، حمایت الاسلام لاہور اور انجمن نصرت الاسلام ملتان ایسے اداروں کو تادم زیست گراں بہا عطیات دیتے رہے ۔ وفات سے قبل اپنی زرعی جائیداد کا تیسرا حصہ جو پندرہ ہزار ایکڑ کے قریب تھا نونہالانِ وطن کی تعلیم کے لیے بذریعہ وصیت وقف کر دیا ۔ کوڑے خان سرائیکی کا عظیم شاعر بھی تھا ۔ وہ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے ۔ وصال ۱۸۹۶ء میں ہوا اور مزار جتوئی ضلع مظفر گڑھ میں ہے ۔ ان کے کلام سے ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ کیجیے :

تیں باجھوں دل سنگ یارا ہیوں آج کل ڈاڈھے تنگ یارا
کوڑے خان ! سٹ فخر وڈائی بن دو نہیں دار ملنگ یارا

والیان خیر پور (سندھ)

تالپور اُمراء نے سرائیکی زبان و ادب کی خوب سر پرستی کی ہے کیونکہ سرائیکی ان کی مادری زبان تھی ۔ سندھ کے سرائیکی شعراء زیادہ تر اس دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ شہدادانی سرکار (حیدر آباد) مانکانی سرکار (میر پور خاص) اور سہرا بانی سرکار (سہراب پور موجودہ خیر پور میرس) کے اکثر حکمران و شہزادگان خود بھی فارسی کے ساتھ ساتھ سرائیکی میں طبع آزمائی کرتے تھے اور ان کے درباری شعراء بھی سرائیکی زبان کو مالا مال کرتے رہے ۔ میر رستم خان فرزند و ولیعہد میر سہراب خان (بانی خیر پور میرس) سندھی اور سرائیکی کے نغز گو شاعر تھے ۔ ان کے چچا میر زنگی خان بھی فارسی اور سرائیکی کے قادرالکلام شاعر تھے ۔ میر سہراب خان کے دوسرے فرزند میر مبارک خان بھی ان دونوں زبانوں کے بلند پایہ غزل گو تھے ۔ اس طرح میر رستم خان ولیعہد کے فرزندان میر محمد حسین خان حسن (م ــ ۱۸۶۷ء/۱۲۸۳ھ) اور میر علی اکبر خان (م ــ ۱۸۵۹ء/ ۱۲۷۶ھ) بھی ان زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے ۔ خیر پور کے چمنستانِ ادب میں میر علی مراد خان کو گل سر سبد کی حیثیت حاصل ہے ۔ وہ خود بھی شاعر تھے ۔ فارسی میں علی اور سرائیکی و سندھی میں مجروح تخلص کرتے تھے ۔ ان کا دربار شاہانِ سلف کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ اس وقت کے عظیم شعراء صلحاء ، علماء اور مفکرین میر صاحب کے درباری اور ہمنشین

تھے ۔ آخری دور میں میر فیض محمد خان عاجز ، میر امیر علی خان امیر اور میر علی نواز خان ناز (متوفی ۲۰ دسمبر ۱۹۳۵ء) سرائیکی زبان کے بلند پایہ اور قادرالکلام شاعر گزرے ہیں ۔ عاجز سرائیکی غزل کے پیشرو سعراء کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے :

مطلع
ایڈا نہ کر تکرار وے — ساڈے نال ظالم یار وے
رت آئی مانگھ بہار دی — بلبل ہزار پکار دی
ساکوں تانگھ گل رخسار دی — کڈیں ویڑہے آسم یار وے

دائی پھاپھل حفظانی

یہ خاتون ایک نامور بلوچ طبیب حضرت حکیم محمد کبیر خان شاکر کے ہاں ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئیں ۔ والد سے قرآن مجید حفظ کیا ، شعر گوئی موروثی تھی ۔ حفظانی (حافظہ) تخلص اختیار کیا ۔ حضرت خواجہ خدا بخش سے بیعت کی ۔ محترمہ حفظانی سرائیکی زبان کی قادرالکلام ساعرہ تھیں ۔ حفظانی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے نامور بزرگ اور سرائیکی کے ملک الشعراء خواجہ فرید کو اپنے گود میں کھلایا ۔ دودھ پلایا اور سرائیکی میں دلبعزاد لوریاں نظم کر کر کے خواجہ کو جھولے میں سناتی رہیں، انتقال ۱۸۷۰ء میں ہوا ۔

سرائیکی لوری کا نمونہ ملاحظہ کیجیے :

الا اللہ دی جوت جگانواں ، لولی ڈیواں لال کوں !
محبوب مٹھل دے بال کوں نندڑے قطب کمال کوں !
فریدن سائیں لجپال کوں ، حفظانی دی من کاہل کوں !
جند پیا جیویں ، حق دا عاشق ! عرض اے ذوالجلال کوں !
الا اللہ دی جوت جگانواں ، لولی ڈیواں جوان کوں !
عشق دے پہلوان کوں ، محبت دے سلطان کوں !
مرشد جمل جہاں کوں ، حفظانی پیر مغان کوں !
مانڑیں جنڈ جوانی جانی عرض ہے رب رحمان کوں !
الا اللہ دی جوت جگانواں لولی ڈیواں خورشید کوں !
فخر جہان دی عید کوں عالم حافظ سعید کوں !
سوہنے پیر فرید کوں حفظانی دی امید کوں !
پنیکھا لوڈاں لولی ڈیواں ، لاج ہے رب حمید کوں !

صالح محمد مسکین

صالح محمد مسکین (م - ۱۸۸۰ء) ضلع ملتان کے مشہور قصبے باگڑ سرگانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قوم کھوکھر کا فرزند ہے۔ اس کے ایک منظوم رسالے 'نیم ملّا خطرہ ایمان' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلط کار پیروں اور دین فروش ملّاؤں سے نالاں ہے۔ مسکین کی شہرت کا باعث مثنوی 'سسی پنوں' ہے۔

آٹھ سو ننانوے مصرعوں پر مشتمل یہ مثنوی مسکین نے ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں چھ ماہ کی محنت سے مکمل کی۔ مثنوی کی بحر اور اوزان میں مولوی لطف علی کی 'سیف الملوک' کا اتباع کیا ہے۔ ''سسی'' مسکین کا پسندیدہ موضوع تھا کیونکہ مسکین کے جو چند دوہے دستیاب ہوئے ہیں وہ بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ مثنوی کا انداز ملاحظہ ہو:

جیشاں خوب کیتے دل پرزے زلفاں دام نبائی
مژگاں نمر خدنگ ظلم دے خونی رنگ حنائی
ابرو، قوس، کمان کمانی مرگوں تیر چلائی
گردن طول کلنگ وانگوں رفتار کبک دی پائی
کمر باریک نہایت سسی حسنوں بہت سوائی
نازک دست حنائی رنگلے سانگ ملولیاں لائی

سعدئ سرائیکی مولانا برخوردار خوشدل

خوشدل کا سال وفات ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ ہے۔ ابا عن جد خواجہ فرید کے خاندان والا تبار کے اتالیق اور تعلیمی نگران رہے ہیں۔ فارسی کا بہت اعلیٰ اور صاف ستھرا مذاق رکھنے کی وجہ سے سعدئ ثانی کہلائے۔ ان سے ایک سی حرفی ڈھولہ اور کچھ متفرق کلام سرائیکی میں بھی یادگار ہے۔ سی حرفی ڈھولن کے چند ابیات بطور نمونہ پیش ہیں:

ظ۔ ظالم برہوں تن لایاں سانگاں میں تاں راتیں ڈینہاں بیٹھی ڈھولے نوں تانگھاں
تیڈے درد دیاں ڈھولہ بیٹھی لکھدیاں کانگاں ڈھولہ اجن نہ آیا شہریں ملیاں بانگاں

ک۔ کانگ اڈانواں، بیٹھی غم نوں کھانواں راوی تار غماندی لنگھ کینویں میں آنواں
قصہ درد ہجر دا کینوں آکھ سناواں خوشدل نال ہجر دے بیٹھی لہندیاں لانواں

سید امیر حیدر المعروف میرن شاہ

سید امیر حیدر شاہ میرن بستی کرنا، موضع راؤ بیلہ شرقی تحصیل کوٹ ادو

ضلع مظفر گڑھ کے بخاری سادات میں ۱۸۰۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ بہاولپور میں گزرا۔ میرن شاہ معاملہ بندی میں سرائیکی ادب کے مومن ہیں۔ ان کی شہرت کا باعث ان کی مختصراً مثنوی 'ہیر رانجھا' ہے۔ میرن شاہ کو مشہور سرائیکی لوک گیت ''چھلہ'' کی ایجاد کا بھی شرف حاصل ہے۔ 'آننس عشق' (مجموعہ کلام) اور 'قصہ کالی و گوری' ان کی مطبوعہ یادگاریں ہیں اور غیر مطبوعہ کلام بھی کثرت سے ملتا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے۔ خیال چھلہ جو میرن شاہ کی ایجاد اور سرائیکی کلاسیکل موسیقی کی جان ہے میرن شاہ کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

چھلہ یار نشانی ڈِتا ولول ڈیہدیاں چھلے نوں

چھلہ ڈیکر یار اساڈا کھس دلڑی ونجہ ہویا دور اڈا
ہیں بن ہور نہیں کوئی ساڈا، ولول روندیاں رلے نوں! چھلہ الخ
چھلہ ڈیکھ کےمن پرچانواں، بھڑے دل نوں بہہ سمجھانواں
شام سحر چم اکھیاں لانواں، پٹیاں بنھ دل سیلے نوں! چھلہ الخ

جیون خاتون نکمّی

نکمّی حضرت مولانا حکیم محمد کمر شاکر بلوچ کی چھوٹی صاحبزادی بھاپھل خاتون حفظانی کی بہن اور حضرت خواجہ محمد بخش نازک (فرزند و سجادہ حضرت خواجہ فریدؒ) کی داسہ تھیں۔ ان کی ولادت ۱۸۳۰ء میں اور وفات ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ نکمّی بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ تھیں۔ ذوق شعر ان کو ورثے میں ملا تھا، جسے خواجہ نازک کی پاکیزہ علمی و ادبی صحبتوں نے اور جلا بخشی۔ 'سانون نامہ' (ساون نامہ) نکمّی کی مقبول ترین نظم ہے جو اس نے فراقِ مرشد میں کہی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سائیں نہ آیا سانوں آیا لڑھدے آئے نی ہل عشق مرشد دے نکمّی کیتا ول آ مرشد ول
سکھ نہ آیا سانوں آیا لڑھدے آئے نی گھاہ نکمّی جان تے رول گنوئیں واہ وے مرشد واہ
سبھ کجھ بھل گیا سانوں آیا لڑھدے آئے نی اک نکمّی کوں نت تانگھ نساڈی دردیں کیتا ککھ

'سانون نامہ' کے علاوہ نکمّی کا 'کونج نامہ' بھی خاصے کی چیز ہے۔ یہ دونوں سرائیکی لوک گیتوں کی مقبول ترین اصناف میں سے ہیں۔ ان کی ایجاد و اختراع کا سہرا جیون خاتون نکمّی کے سر ہے۔ 'سانون ناموں' میں بہار کی رت اور ساون کے مناظر سے متاثر ہو کر جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے اور 'کونج ناموں' میں کونجوں (قازوں) کی ڈاروں کو پیش نظر رکھ کر، ہجر و فراق کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ 'کونج نامے' کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اڈریں نی کونجاں مو ہر والی ہے ساوی نکمّی فالاں پاوے شالا مرشد آوی

اڈریں نی کونجاں موہر والی ہے کالی   نکّمی اللہ میلے مٹھا عرب دا والی
اڈریں نی کونجاں موہر والی اناری   نکّمی توڑ پچیسی رب رسول دی یاری
اڈریں نی کونجاں ، مـــوہر والی اصیلے   میڈا ہادی پیارا سہنے ربدا خلیلے

قادر بخش بیدل

بیدل فقیر محمد محسن قادری کے گھر روہڑی شریف (سندھ) میں ۱۸۱۴ء/۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ مزار روہڑی میں ہے۔ سچّل سرمست کے بعد بیدل وحدت الوجود کے سب سے بڑے علمبردار نظر آتے ہیں۔ سندھی ، فارسی اور سرائیکی میں صاحبِ دیوان تھے۔ رندی و سرمستی کا انداز ملاحظہ کیجیے :

جنہیں نوں عشق بتاوے راہ   اوں نوں کون کرے گمراہ
مذہب دا سٹ کوڑا جھگڑا   وحـــدت دا گھـــن راہ
مذہب دین دیاں باناں اورے   عاشق ویندے اگے وو اگے!

عشقِ حقیقی بیدل کا خاص اور پسندیدہ موضوع ہے۔ عشق سے متعلق ان کے افکار مطالعہ ہوں :

عشق ہے پیر پیغمبر میرا   عشق ہے ہادی رہبر میڈا
عشق ہے حیدرؑ صفدر میڈا   عسق ہے میڈی پشت پناہ

عمر خان شاہد

محمد عمر خان شاہد مولوی محمد حسن خان گوپانگ بلوچ کے گھر ۱۸۲۵ء میں بمقام دبلی کبیر خان (نزد شیدانی شریف ضلع رحیم یار خان) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا محمد کبیر خان صابر بلوچ سے حاصل کی اور شاعری میں بھی ان کے تلمّذ کا شرف حاصل کیا۔ شاہد زندگی بھر ملک الشعراء خواجہ فرید کی صحبت میں رہے اور دیارِ عرب میں بھی ان کی رفاقت کی۔ بالآخر ۱۹۱۲ء میں فوت ہو کر کوٹ مٹھن میں مدفون ہوئے۔ کلام میں ادبی خوبیاں ، علمی نزاکتیں اور فنّی محاسن موجود ہیں۔ بلاشبہ وہ سرائیکی زبان کے عمرخیّام ہیں۔ ایک رُباعی ملاحظہ کیجیے :

روہ پتھر پڑتال ویساں ، رکھ بھال وصال پنل دی
صحیح سنجاتم پیر پنل دے راہوں کیویں ول دی
کن وچہ کیچ دا ڈاج ڈھم « تے سوغات ازل دی
شاہد ہمت مول نہ ہاریں اوہ کیچ دی باہ پی بل دی

ہمت علی شاہ رضوی

ہمت علی شاہ روہڑی کے رضوی سادات کے نامور فرزند ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ولادت ۱۸۴۰ء اور وفات ۱۸۹۰ء میں واقع ہوئی ہو گی۔

سندھی اور سرائیکی کے قادرالکلام عوامی شاعر ہیں۔ مشہور عوامی لوک گیت ''لولی'' (لوری) اور 'گھڑولی' کی صنف میں اُن کی دو سی حرفیاں یادگار ہیں۔ 'گھڑولی' سندھ کے سرائیکی شعراء نے بہت ہی کم کہی ہے۔ سچل سرمست کے بعد ہمیں پورے سندھ میں سے دوسرا 'گھڑولی نامہ' محض ہمت علی شاہ کا ملا ہے۔ لیجیے 'گھڑولی نامے' کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

(الف) اللہ ہے صاحب ستاری صدقے نبی دوں جان پیاری
علی دی تے ہے لاج ہمارے گولی ہاں میں ننھں در دی
وو مولیاں گھڑولی بھر دی آہیاں، میں نان گھڑولی

(ب) بتولؓ پیغمبر زادی پاک دامن ہے سا سہزادی
بطھیمر کُم ہے صاحب ردادی توہ تہیندی میں تردی
''رو مولیاں گھڑولی بھر دی''

غلام فقیر

مولانا غلام محمد فقیر بلوچوں کے قبیلے لغاری سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ تحصیل ڈیرہ اسماعیل خاں کے قصبے ڈھکی میں ولادت ہوئی اور ۱۰ مئی ۱۹۳۸ء مطابق ۹ ربیع الاول ۱۳۵۷ء میں دارالبقا کو سدھارے۔ غلام فقیر فارسی، اردو اور سرائیکی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے پوتے منشی بہاء الحق نے 'مجموعۂ غلام فقیر' کے نام سے کئی مجموعے چھپوائے ہیں۔ مجھے ان میں سے 'مجموعہ غلام فقیر نمبر ۲' دستیاب ہوسکا۔ اس میں سے ایک انوکھی چیز پیش خدمت کی جاتی ہے۔ ''سوال و جواب گھڑا'' سرائیکی ادب کا ایک قدیم اور مقبول عام موضوع ہے۔ دیہات کی الھڑ دوشیزہ دو تین گھڑے سر پر اور ایک گھڑا بغل میں لے کر جب پنگھٹ پر جاتی ہے تو عاشق نامراد بھی کہیں راہ میں کھڑا ہوتا ہے وہ اپنی بدقسمتی اور گھڑے کی خوش بختی پر دو آنسو بہاتا ہے اور گھڑے سے مخاطب ہو کر یوں اظہار جذبات کرتا ہے:

سوال نمبر ۱: آوے گھڑا بھن ٹوٹے کرائیں تیں یار دی چیلھ رنجائی
ہک وی بھاراس پانی والا ڈوجھا ویندیں جان، رلائی
عجب نصیب تساڈے گھڑا اساں مفتی عمر ونجائی

جواب گھڑا نمبر ۲ :

مار نہ مینوں کر نہ ٹوٹے اساں بھارے بھار لنگھائے
پہلے کپے نال کہیاں دے وت گھر کمہار دے آئے
ماراں ، سخت کمھاراں والیاں جھل چک تے سر کپوائے
بعد اس دے وچہ آتش دے اساں سارے تن جلائے
جہڑے سنگی کھوٹے اساڈے تھی ٹوٹے گل سڈائے
اتنے اوکھ گزرئیے اساں ، تڈاں ہتھ محبوباں لائے
غلام فقیرا اوکھاں باجھوں کہیں ہرگز وصل نہ پائے

مولوی فیروز

انیسویں صدی کے مرثیہ گویوں میں مولوی فیروز کو اوّلیت اور پیشوائی کا شرف حاصل ہے ۔ سرائیکی ، شیعی ادب میں نظم و نثر کے امتزاج کا سراغ ہمیں اولاً مولوی فیروز مرحوم کے ہاں ملتا ہے ۔ ان سے قبل بھی نظم کے ساتھ نثر کا رواج جاری ہو چکا تھا ۔ مگر باقاعدہ فن کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ مولوی فیروز کے منظوم مراثی اور نظم و نثر کے مرقعوں پر مشتمل کئی مجموعے شائع ہوئے اور اب تک مرثیہ خوانوں اور ذاکرین و واعظین کی حرز جان بنے ہوئے ہیں ۔ جن میں سے 'مجموعہ' فیروز' ، مشتمل بر ہشت اجزاء کو تو قبول عام اور بقائے دوام کی سند ملی ہے ۔ فیروز غزل اور رُباعی میں بھی ایک منفرد مقام رکھتا ہے ۔ تلاش کے باوجود ان کی غزلیات نہ مل سکیں البتہ چند رباعیاں میسر آئیں ، جن میں سے ایک تبرکاً پیش خدمت ہے :

(الف) آ ماہی کیوں چر لائی گھر آ تماشاں ٹلیاں نی!
وسر گیوں جھولی امڑی والی پردیس دیاں واٹا ملیاں نی
کیہاں ایر پیوونج دیر لائیو رتیں چیتر بہار دیاں ولیاں نی
فیروزا باغ نبوت دے کئی وائیں خزاں دیاں کھلیاں نی

صید علی شاہ ملتانی

صید علی ملتان میں ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور تقریباً پون صدی تک سرائیکی علاقوں میں مرثیہ گو اور تقریر خوانی کرتے رہے ۔ ان کا اکثر کلام ان کے ایک ہم نام مرثیہ گو سید علی شاہ چھنیوی کے کلام میں گڈ مڈ ہو کر مدتوں چھپتا رہا ۔ ویسے ان کے

اپنے نام سے ، 'تقریراتِ صید علی' ، 'واقعاتِ غم' اور 'انس الذاکرین' کے مجموعے مدت سے مطبوع اور متداول ہیں ۔ ہم ان کے ایک مرثیہ کا بند درج کرتے ہیں :

تیکوں ، کنہن ، پائی زنجیر وو پردیسی قیدی !
کس جرم دے وچہ تھیوں اسیر وو پردسی قیدی !
ڈیکھ کے تیڈا جاہ جلالے دل وچ پوندے سے سے خیالے
بلوے پوندے ساہاں والے کہیں ڈیس داہیں تہ امیر وو
پردیسی قیدی !

غلام سکندر خان غلام

غلام سکندر خان غلام ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مشہور قصبے ''بکّھر'' کے ایک ذی علم بلوچ گھرانے میں ۱۸۱۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوا ۔ مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا اور سلطان الشعراء کا لقب حاصل کیا ۔ مراثی کی بحروں اور ہئیت میں خوشگوار جدّتیں پیدا کیں ، مراثی میں نظمِ مسلسل کا آغاز غلام ہی نے کیا ۔ منظر نگاری ، زورِ بیان اور جوشِ خطابت کے ساتھ الفاظ کی مینا کاری بھی اس کے اسلوب کی خوبی ہے ۔ مراثی اور نوحہ جات کے بیسیوں مجموعے یادگار چھوڑے ۔ مذہبی کتب کے علاوہ 'واربھل' ، 'مثنوی یوسف زلیخا' اور 'قصہ گیراوباز' بھی اس سے یادگار ہیں ۔ غلام دراصل نظم اور رُباعی کا شاعر تھا ۔ 'مجموعہ تحفۃ العشاق' میں غلام کے صرف اکیس دوہڑے طبع ہوئے ہیں حالانکہ غلام کے سینکڑوں دوہڑے اب بھی صاحبِ ذوق سخن سناسوں کے بیاض میں مل جاتے ہیں ۔ ذیل میں غلام کی مشہور عالم شہر آشوب نظم ، 'واربھل' سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

بکھر کے آس پاس تھل میں غلام بدوسعور سے کچھ عرصہ قبل زبردست قحط پڑا ۔ غلام نے جب آنکھیں کھولیں تو اس قحط کے آثار ابھی باقی تھے، اس حسّاس اور جذباتی شاعر نے اپنے بزرگوں سے قحط کی پوری روداد سنی اور اسے نظم کا جامہ پہنایا :

سر تے بوچھن ، لیراں لیراں کھتے نقس مونہاندے
ہکی ہلیک ککیاں بٹیاندے آ جھلے چیر سراندے
ڈیکھ وطن دے حال بے حال نگال وہن اکھیاندے
پل وچہ شاہ گدا کرے تے گدا وللی ملکاندے

☆ ☆ ☆ ☆

بہوں تعجب تھل داراہی ڈیکھ توائی
اگے کال بیحال کیتا بیا گھتیا مار انائی
بھیڈاں لیلے مردے ونجن ہتھ نہ آوے کائی
ٹھالیاں والے وتن تھل ہک ہک اگوں لائی

کمال مگسی

منشی محمد کمال خان بلوچوں کے مشہور قبیلے مگسی سے متعلق ہے۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں ڈیرہ اسمعیل خان کے ایک قصبے ''نواں کوٹ'' میں پیدا ہوا۔ مکتب کی ابتدائی عربی فارسی تعلیم کے ساتھ اس نے مروّجہ تعلیم بھی حاصل کی۔ پہلے معاش کے لیے ملتان کچہری میں عرائض نویسی اختیار کی، بعد میں مرثیہ گوئی اور سوز خوانی اختیار کی۔ جدت پسند طبیعت نے یہاں بھی نئی راہیں ایجاد کیں۔ کمال بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور کلام میں سادگی، شیرینی اور سلاست ہے۔ اس کے مراثی کا ایک مختصر سا مجموعہ 'مجموعۂ مرثیہ بحر غم' کے نام سے طبع ہوا۔ کافیوں کا کچھ حصہ 'مجموعہ کافیاں کمال خان' کے نام سے چھپا تھا۔ کمال کا ایک مرثیہ اپنے ہمعصر بزرگ اور سرائیکی و فارسی کے بلند پایہ شاعر حضرت مولانا عبیداللہ ملتانیؒ سے متعلق 'اظہار الم' کے نام سے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کافیوں (غزلوں) کا نمونہ نذر قارئین کیا جاتا ہے:

مطلع شام صبح انتظار نی گھر یار نہ آیا — ہویم بہوں لاچار نی، درداں مار مکایا

بن دلبر دے درد ہزاراں — کھا گیاں مونجھاں لیل نہاراں

ول آ ڈھولن ہن گھر باراں — تھیواں میں باغ بہار نی

باجھ کمال دیوانی تھیاں — ما پیئو سینگیاں یاد نہ رہیاں

تانگھ سجن وچہ سکدی پیاں — کھا گئے درد آزار نی

فیض مشہدی

مولوی فیض احمد فیض اُچ کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ مولوی فیروز، غلام سکندر غلام اور کمال مگسی کے چھوٹے معاصر تھے۔ عربی، فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نہایت زور گو اور پر گو شاعر تھے۔ فطری رجحان نظم کی طرف تھا۔ البتہ دوہڑے (رباعیاں) بھی خوب کہتے تھے۔ سارا زور طبع مرثیہ گوئی پر صرف کیا۔ 'چشمۂ فیض' ان کے مراثی و تقریرات کا مشہور گلدستہ ہے۔ 'مصائب الحسین' بھی ان سے یادگار ہے۔ 'چشمۂ فیض' سے ایک مسدس کا بند ملاحظہ کیجیے۔ سرور کائنات سے مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں:

ہے غرض میڈا شاہا مسلمان بناؤ — توحید دے کلمے میکوں لجپال سکھاؤ

اسلام دی دولت کنوں دلشاد کراؤ — در آئے دیاں دربار دے وچہ عزتاں ودھاؤ!

تھی شاد ونجاں دولت ایمان توں شاہا

تعلیم ونجان گھن تیڈے قرآن توں شاہا

امام الدین امام ہزاروی

شیخ امام الدین فقیر سرائیکی زبان کے پوٹھوہاری اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ قصبہ تلوکڑ میں پیدا ہوئے، جو ہری پور سے میل سوا پرے ہے۔ ان کے بزرگ چھچھ ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ امام اپنے وقت کے نامور شاعر تھے۔ ہمیں صرف ان کے دو منظوم رسالے مل سکے ہیں، جو معجزاتِ نبوی پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ایک یمن کے یہودی بادشاہ ولید کے مسلمان ہونے کا واقعہ ہے اور دوسرا ایک جنگل کی ہرنی کو حضور کی ضمانت پر جال سے خلاصی ملنے کے واقعات پر مشتمل ہے۔ امام کی زبان سیدھی سادی، صاف ستھری اور اندازِ بیان شاعرانہ سے زیادہ عالمانہ ہے۔ لیکن اس میں بھی بیحد روانی اور چاشنی ہے۔

حضور سرور کائنات کا سراپائے مقدس امام ہزاروی کی زبان سے سماعت کیجیے:

صورت چندر بدر دے وانگوں جھال نہ جاوے جھلی	وانگ سمع پیشانی اس دی ڈیسے نور تجلّی
ایڈا سان پیغبر باجھوں ہور کسے نہ پایا	قمروں جیوں ہن نور فلک دا اتر زمیں تے آیا
رنگ سفیدے سرخی مائل بینی الف آمادہ	چشماں سندر وچہ حیاتے متھا بہت کسادہ

حضرت مولانا عبیداللہ ملتانی

سرزمینِ ملتان جن ہستیوں پر ناز کر سکتی ہے ان میں سے مولانا عبیداللہ ملتانی کی جامع کمالات شخصیت بھی سرفہرست نظر آتی ہے۔ آپ حضرت مولانا خواجہ خدا بخش ملتانی ثم خیر پوری کے خلیفۂ مجاز تھے۔ سرائیکی کے نامور شاعر اور بزرگ حضرت خواجہ حافظ جمال اللہ چشتی ملتانیؒ آپ کے دادا پیر تھے۔ مولانا عبیداللہ عربی، فارسی کے جیّد عالم اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان کے بھی قادر الکلام اور خوش گو شاعر تھے۔ افسوس کہ ان کا اکثر کلام غیر مطبوعہ ہے اور پوری کوشش کے باوجود میسر نہ ہوسکا۔ مطبوعہ کلام میں سے اس وقت رسالہ 'تحفۂ زنان'، 'رسالۂ عیوب النفس' مجموعہ 'مولود شریف'، 'چھڑیاں و تیر' اور 'ہیر رانجھا' میرے پیش نظر ہے۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سرائیکی زبان کی تمام اصنافِ سخن پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے اور ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی فرماتے رہے۔

مولانا نے 'تحفۂ زنان' میں اولیاء خواتین کے حالات اور ان کے حسنات کے قصے لکھ کر مسلمان عورتوں کو دینداری، مذہب پرستی اور ذکر الٰہی کی طرف راغب کیا ہے۔ اور 'رسالۂ عیوب النفس' میں اپنے دور کے مسلمانوں کی گمراہی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس

رسالہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

عالم مفتی قاضی وڈے رشوت کھاون سب ضعیف روایت تے عمل کریہن رشوت لوں جھب
وچشہراں دے صوفی رہندے کردے اوہ دلا لی محراب متھے تے وڈے ہوون کردے ٹھگی دلا لی
سید اتے قریشی بھوں کرن گمراہ خلائق کفر دے کلمے آکھن اوہے عمل کرن نالائق
صوفی وڈیاں مجلساں لاون کڈھن او دکان حالناں کھیڈن ٹپے مارن اللہ دے پہلوان
واعظ وعظ دانساں کریہن لا بہسن بازار کوڑ بتاکاں وچہ مسیتاں، مارن اوہ لاچار

شاہ ولایت ملتانی

ملتان کے جن بزرگوں نے عربی، فارسی کی درسی کتب کو سرائیکی میں ڈھال کر نصاب کو آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش کی ان میں خاندان حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نامور فرزند شاہ ولایت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ہمیں ان کا صرف ایک منظوم رسالہ مل سکا ہے، جو عربی صرف کے قوانین پر مشتمل ہے۔ شاہ ولایت ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور قبرستان حسن پروانہ میں مدفون ہیں۔ دو ہمزوں کی یکجائی سے متعلق صرف کا قانون ملاحظہ فرمائیے :

ڈوں ہمزے ہکی جائی ہووں پہلا ساکن بجھ ثانی ہمزہ یاء سنگ بدلے شک نہ آنی کجھ

(یعنی اگر عربی کے کسی ایک کلمے میں دو ہمزے متصل آ جائیں اور پہلا ہمزہ ساکن ہو تو دوسرے کو وجوباً یا سے بدل دیا جاتا ہے)

آخر میں شاہ ولایت ''تمت باالخیر'' یوں فرماتے ہیں :

قانون صرف دے مکّے یارو فضل کیتا رب باری
نال فضل دے اللہ بخشے جو کوئی سامع قاری
شاہ ولایت عاصی بھارا کر امید دعائیں
شاید برکت کہیں صاحب دے بخش کرے رب سائیں

مولوی محمد بخش محمدن بہاولپوری

محمدن بہاول پور شہر کے ایک محلے ''ٹالی والا'' میں ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ محمدن بہاولپور کے ایک نمائندہ اور قابل ذکر شاعر ہیں۔ ایک مختصر سا مجموعہ 'مجموعہ فراق عشق' کے نام سے پچاس ساٹھ سال ادھر بہاول پور سے شائع ہوا۔ جو اب نایاب ہے۔ محمدن کے کلام میں پختگی اور غضب کی چاشنی و روانی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر کافی کہنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے دوہڑوں (رباعیات) میں بھی فن کے تمام

محاسن ملے ہیں۔
سی حرفی رباعیات میں سے ایک رباعی ملاحظہ کیجیے :

ن۔ ناز نہوری بار سجن دے میں ، تاں لٹی وے لوکو لٹی
خونیں، خنجر نیں ماہی دے میں تاں کٹھی وے لوکو کٹھی
وسدے شہر برباد بھیوم میں تاں مٹھی وے لوکو مٹھی
محمدن فوجاں عشق دیاں چڑھیاں دھاڑ ترٹی وے لوکو ترٹی

گامن کروڑی

کوٹ کروڑ ملتان میں ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ سرائیکی کا قادرالکلام مزاحیہ شاعر ''گامن'' پیدا ہوا۔

گامن اپنے قصبے کے ایک ہندو دکاندار ''جندے مل'' کے گھوڑے کا سراپا مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہے :

گھوڑا گدھا جندے مل — کلّے دوں نہیں سکدا ہل
آ گھوڑے دیاں دھاں پیاں — شہر بازاراں بوہے لیاں
خان کوں بازیاں خبراں گیاں — ابھے لمے پیا تھرتھل
آ ڈیکھو گھوڑے دا زور — خواہ مخواہ مچاوے شور
نروڑ نہ سکدا کچی ڈور — عصے کولوں ویندا جل
ٹور گھوڑے دی ڈیکھو سائیں — کوہ کرے ڈینھ لتھے تائیں
جے مارن ڈھے پوے اتھائیں — ٹرے نہ مول کھڑے پڑ

ناطق ملتانی

ناطق ملتان کے ایک صوفی منش درویس گزرے ہیں۔ ۱۸۴۰ء کے قریب پیدا ہوئے خاندان حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید و معتقد تھے۔ کافیوں اور دوہڑوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ چھوڑ کر ۱۸۹۹ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ ان کی سی حرفی کا انداز ملاحظہ کیجیے :

ج۔ جان پیاری جیویں وانگ بلورے رلسیں نال مٹی دے تھیسیں سے بھورے
شمسیں فرش مٹی دے کھاسن کیڑے مکوڑے ناطق سمجھ نہ کیتو کوڑے لوک نہ وڑے

قادر یار سندھو

قادر یار انیسویں صدی کے نصف آخر کی پیداوار ہے اور ملتان کے نواحی علاقے کی

مشہور جٹ قوم سندھو میں پیدا ہوا ۔ اس کی تعلیم و تربیت ایک ماچھی گھرانے میں ہوئی ۔ فطرت نے اسے شاعرانہ صلاحیتوں سے فیاضی کے ساتھ نوازا تھا ۔ اُس کی شہرت کا باعث اگرچہ 'پورن بھگت' کا قصہ ہے مگر اس نے 'روزہ نامہ'، 'معراج نامہ' اور 'رسالو' کا قصہ بھی یادگار چھوڑا ہے ۔

'روزہ نامہ' قادر یار کی شاہکار نظم ہے ۔ ذرا تمہید کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے :

چن چڑھیا مہ رمضان دا　　اساں فرض دیتاں سلطان دا
اساں عذر نہیں قرضائیاں　　جنہیں کانگاں سریں چڑھائیاں
میں رجوع ہوئی ہتھ بنھ کے　　سب دولت ہے سرکار دی
اس خط دنا ہتھ آئے کے　　وچہ مطلب سنو پڑھائے کے
اساں لے لفافہ کھولیا　　من کنب گیا دل ڈولیا
اساں مہر سنجاتی قادرا　　ایہہ چٹھی ہے سرکار دی

مولوی خدا بخش

مولوی خدا بخش ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ شہر ملتان میں پیدا ہوئے ۔ مروّجہ علوم میں دستگاہ کامل حاصل کی اور پھر ملتان ہی میں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا حشر آنکھوں سے دیکھا اور ملّت کی فلاح تعلیمی ترقی میں دیکھی ۔ ان کی مشہور ترین کتاب 'نصابِ ضروری' مدتوں داخل درس رہی ۔ امیر خسرو سے منسوب شدہ 'خالق باری' کے بعد جو مقام 'نصابِ ضروری' نے حاصل کیا وہ کسی اور منظوم لغت کو کم ہی ملا ہے ۔

چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :

شوہر ، گھوٹ ، عروس ، کنوار　　سبالہ ، آنہر ، محبت ، پیار
خواستگاری ، منگیوا ، علامت نشانی　　ولیمہ ، طعام ، ضیافت ، مہانی
بکر و دوشیزہ کنواری ، کوڑی　　رنجیدہ روٹھی ، مطلقہ ، چھوڑی
حنا ، مہندی ، وطن ہے ، دیس　　خانہ ، گھر ، خضاب ہے کیس
زفاف ، مکلاوہ ، شنگچہ ، چولی　　منکوحہ جوئے ، حجلہ ، ڈولی
آئینہ ، آرسی ، شانہ کنگھی　　سرمہ دان، سرمے دانی، گذشتہ، لنگھی
تنہا ، اکلا مجرد ، چھڑا　　ہمتاہ ثانی ، استادہ ، کھڑا

میاں واصل

میاں واصل انیسویں صدی کے نصف اول میں ضلع جھنگ کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر کافیاں کہتے رہے۔ ان کی ایک نادر کافی ملی ہے۔ جس کا کچھ حصہ تبرکاً درج کیا جاتا ہے:

چھان چھنڈک کر سنھرے دانے / سمجھ دھیا! سگھڑائی نی!
نکاّ بہہں، سگھڑ سڈلیسیں، / تھسیں جگ سبھائی نی!
آدھیا! کجھ سمجھ کریجے / سارا گھر سمبھال رکھیجے
نکاّ کت کے ڈاج سنیجے / نا تھیویں شرمائی نی!
سھنی انگن ڈے بوہاری / کر ستھریاں تھی بیاری
وت سمبھال رکھیں بوں ساری / نہ ڈبسیا سہنا کائی نی!
جان جان پکا شہر جھلسبں / اوڑک ساہورے گھر نوں ویسبں
سگھڑ ہو اسیں، حوش جلیسیں / انھ ہسو سیاماء پرائی نی!
جے گن پلے شوہ کوں بھاسیں / اوگنہاری تے غم کھاسیں
ایہو ویلھا مول نہ لاہبں / ہتھ نہ آسبا کائی نی!

سید غلام غوث

پیر کوٹ شاہانہ ضلع جھنگ کے سادات خاندان میں آپ کی ولادت ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ ہوئی۔ آپ کی بعیت سلسلۂ قادریہ میں تھی اور اس سلسلے کا فیض آپ نے پورے علاقے میں پھیلا دیا۔ آپ فارسی، اردو اور سرائیکی کے مایۂ ناز شاعر تھے۔ مگر افسوس کہ کلام طباعت سے محروم رہا۔ سید غلام غوث سی حرفی میں حرف ''ص'' کے تحت حضرت غوث الاعظمؒ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:

صاف سنہ کر میراں میرا اس کینے تے حسد نفاق کنوں
اوتاں وانگ پانی دے صاف ہووے باجھوں خس خاشاک کنوں
اتے وانگوں شیشے دے روشن ہووے باجھوں غسل غاشاک کنوں
غلام غوث نوں دے امان میراں، توں ایس زمانے ہلاک کنوں

عبدالغفور طالب

ملتان کے نواحی قصبے چاہ بھورے شاہ والا میں مولوی تاج محمود صاحب کے گھر طالب ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مروّجہ میں مہارت حاصل کی، تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ سرائیکی اور فارسی میں مشقِ سخن کرتے تھے ایک مختصر کتابچہ — مجموعہ کافیاں و ڈوہڑہ

جات مع سوال و جواب عشقیہ پدر و پسر' ــ مطبوعہ ملتا ہے۔ طالب کے اشعار میں سادگی اور جذبات میں خلوص پایا جاتا ہے۔ دوہڑوں میں عشقِ حقیقی کا رنگ غالب ہے۔ 'سوال و جواب پدر و پسر' ملاحظہ کیجیے :

سوال پدر: ش
شرم و حیا ادب رکھ پوری سٹ گھٹ کوڑی چالے
زری اتے زربفت ہنڈا خود ریشم خاص دوشالے
سے محبوب کراں میں حاضر صورت شمس مثالے
نوکر نال نقیباں ، پترا کھاتوں ، چرب نوالے

جواب پسر: ص
صبر حیادی غرض نیں میکوں تانگھ سجن دی رہندی
سیجھ سونہاری باجھ رانجھن ہے ہرگز سول نہ بھندی
ڈکھڑےسوز فراق ماہی دے سہج کنوں دل چھندی
ولول یہ سمجھیندیں بابو گالھ نہیں ایہہ پھندی

باغ شاہ قریشی

کروڑ لعل عیسن ضلع مظفر گڑھ کے قریشی خانوادے سے تعلق رکھتے اور حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کے جیّد عالم اور فارسی ، سرائیکی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ غزل (کافی) میں عوامی زندگی کو اجاگر کرنے کی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ''کافی پیلوں'' ان کی مقبول ترین کافی ہے جس میں انہوں نے پیلو چننے کے منظر اور سرائیکی علاقے کی زندگی کے اس جاندار پہلو کو بڑی صنّاعی اور چابکدستی سے اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے 'شاہنامہ فردوسی' سے 'قصہ بیژن منیژہ' بھی سرائیکی نظم میں لکھا۔ اس مثنوی کی تاریخ اختتام شاعر کی زبانی ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ ہے۔ ''کافی پیلوں'' کے کچھ بند ضیافتِ طبع کے لیےدرج ہیں :

واہ راوی دیاں نازک کڑیاں — پیلوں ڈیلھے ، چنن کوں ٹریاں
سوہنیاں جٹیاں ، حسن دیاں صاحب — ٹھم ٹھم ٹر دیاں چال عجائب
مٹھڑی موہنی گالھ غرائب — بھنے وال خم و خم کھڑیاں
اٹھدیاں دھمیں ، نال سویلے — چھیڑ ٹرن کئی بھیڈاں لیلے
بھج بھج چنڈیاں پیلوں ڈیلھے — سیر جنگل کر گھر مڑیاں
باغ - جٹیاندے ویکھ ظہورے — لگڑی اسانوں پریم ٹھنکورے
کیتا مار برہوں ٹک چورے — لکھیاں لوح قلم دیاں وڑھیاں

سید جلال شاہ کلیم

سید جلال الدین شاہ کلیم حسینی البخاری بدلی ضلع رحیم یارخان کے ایک سادات گھرانے میں ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ علومِ ظاہری کی تکمیل والد ماجد سے اور علومِ باطنی کا اکتساب حضرت سید موسن شاہ صاحب بکائنی (ضلع رحیم یارخان) سے کیا۔ خواجگان کوٹ مٹھن (خانوادۂ خواجہ فرید) سے بھی حد درجہ عقیدت تھی۔ فطری طور پر غزل گو شاعر تھے۔ اپنے والدِ گرامی کی فرمائش پر 'سسّی پنوں' کا مشہور واقعہ نظم کیا۔ مثنوی کی زبان سستہ' اور اندازِ بیان بلیغ ہے۔ کلیم نے یہ مثنوی ۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ھ میں ختم کی۔ ''سسّی'' کی جب پنوں سے شادی ہونے لگتی ہے تو شاعر مشہور ''سرائیکی لوک ناچ جھمر'' کا ذکر یوں کرتا ہے:

عجب بنیا ابھاں چرچا جھمر دا — قتل چرچا کئی جانباز کر دا
چڑھا فوجاں، حسن دیاں ساہ پریاں — بنا مرچی مقابل آن کھڑیاں
پہن زربفت سر چیرے دو سالے — تھئے داخل جھمر دیوچہ دخالے
پنڑ سسّی بنا بیدل جے-ڑھوئی — کٹاون سر جھمر وچہ آ کھڑوئی
جڑی میدان دے وچہ جنگ بازی — تھئی جاری قتل دی کارسازی
نگہ کر ناز بھریاں دے تھورے — قتل کر ول رکھن احسان تھورے
بہادر سرکنوں بزار بسانکے — مرن رن وچہ دلاور مار دھانکے
وجن رن وچہ نفیران ناد نڑیاں — کرن دھڑ بڑ تمامی دھونس دھڑیاں
مرن کیتے پھرن ماندے متارے — پون پڑ وچہ بہادر مار نعرے

گل محمد فائق

بیرون دہلی دروازہ ملتان کے ایک علمی خانوادے میں گل محمد فائق ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا۔ علومِ مروّجہ کی تعلیم مدرسہ خانقاہ حضرت غوث بہاءالدین زکریا رح میں حاصل کی۔ فنِ خطّاطی میں بھی کافی دسترس تھی۔ فائق ایک احساس اور انقلاب پسند شاعر تھا، اس نے انگریزی اقتدار میں مسلمانوں کی بے بسی، بے حسی اور مغربی تمدّن سے ان کی مرعوبیّت کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور انہیں اپنے فن کے ذریعہ جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ ''تیرھویں صدی'' اس کی مشہور و مقبول طویل نظم ہے۔ جس میں مغربی افکار و تہذیب کی تباہ کاریوں کا رونا اور اسلامی اقدار کے مٹنے کا دکھ بلیغ انداز میں ادا کیا گیا ہے۔ فائق نظم اور غزل دونو پر قابو رکھتا تھا۔ اس کی ایک مشہور غزل کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے:

دلدار دلداری کرو — ڈکھیاندی غم خواری کرو
ایڈی نہ ہن خواری کرو — چھا دور، بیماری کرو
جوسی کجا رملی کجا — اے حکمت عملی کجا
دل کملی تے رملی کجا — رل مل حکم جاری کرو
سینگیاں دی ٹولی ہک طرف — خلقت دی بولی ہک طرف
دل کملی بھولی ہک طرف — ہک دی طرف داری کرو

مولوی اللہ بخش جانباز

تحصیل علی پور ضلع مظفر گڑھ کے ایک قصبے ''ملک ارائیں'' کے مشہور پٹھان خاندان میں سردار غلام مصطفیٰ خان افغان کے گھر اندازاً ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ علوم ِ متداولہ میں دستگاہ حاصل کرکے سرائیکی زبان کے ملک الشعراء خواجہ فریدؒ کے مرشد اور برادر بزرگ حضرت خواجہ فخر الدین اوحدی المعروف ''فخرِ جہاں'' کی خدمت میں منازلِ سلوک طے کیں۔ شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا۔ انہوں نے بھی 'شاہنامہ' فردوسی' کی مشہور عشقیہ داستان 'بیژن منیژہ' کو سرائیکی نظم میں ڈھالا۔ اس مثنوی کے علاوہ ''جانباز'' نے اپنی محبت کی داستان بھی 'قصہ جانبازِ عالم' کے نام سے نظم کی۔ مثنوی 'بیژن منیژہ' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

عاشق تے معشوق جڈاں، بیدار تھئے خوش خوباں
آن کنیز حمام تپایا مشک عبیر گلابوں
دھووں نئی بیژن دے اعضاً خادمململ صابوں
بعد ازاں پوشاک پھراون تار جڑی زر نابوں
کنچنیاں، کنچندیاں آیاں نور بھریاں مہتابوں
تاب کہیں مہتاب کوں تنہاں تابگئی افتابوں
پاء یشواز اواز کرن پئے ساز وجن ہر بابوں
تن تن توم تنن تن چھن چھن ہوش کھسن اربابوں
ناچے گاوت باجے باجت ہکبئے نال خطابوں
تارا تے نت مارن تاڑی چٹکی عجب حسابوں
سارنگی سارنگ کنوں ہم زیر وجے مفرابوں
طبلے طبلک تھاپ لگی دھم دھام اٹھی مفرابوں

نوچیاں نچ نچ ناچ کیتا مچ ناچ کرن دل قابوں ،
کھا بھیری تھی ڈھیری ویندیاں دل گھیری اصحابوں

میاں محمودن

میاں محمود بخش محمودن ریاست بہاولپور کے مرکزی علاقے قدیم کاردارئی خانبور کا رہنے والا تھا ۔ اس کی ولادت ایک بلوچ گھرانے میں ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل طے ہو رہے تھے کہ ایک ہم سبق سے محبت ہو گئی جو عمر بھر رہی ۔ محمودن بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اس کا کلام مدتوں اہلِ درد کے دلوں کو گرماتا رہا ۔ اس کا صرف ایک بارہ ماسہ مطبوعہ ملتا ہے ۔ تا حال محمودن سے پہلے کسی سرائیکی بارہ ماسے کا سراغ نہیں ملا ۔ محمودن کے بارہ ماسے کا مختصر انتخاب پیش خدمت ہے :

جیٹھ ۔
جیٹھ ماہ جھکڑ گھلیئے ڈھانڈیاں گھلاں یک لس
ہک ناری نم سا سوہ نمی اگ جلدیاں بیوس
کوٹھے دے اندر بہہ رووان میڈے نین نکرن بس
ہک میں محمودن ماندیاں ولدی نہ کوئی ڈس

ہاڑ ۔
ہاڑ آیا براماں بھوئیں تتی ساڑے زمین سر پیر
چھاں تے دھپ ڈوہیں کھوہریاں گرمی ڈسیجے ڈھیر
کوٹھے دے اندر بہہ رووان مبدا سنجواں نال وہیر
گیا ہاڑ ماہ محمودنا جانی نہ پایم پیر

ساون ۔
گج گج وسندی ساونڑی کن من وسن بے ڈینہ
بیں ، یں ، پوکارے پوپٹی وسدے ملا ہرے میہنہ
جیڑا اداسی ہو گیا چوٹاں چلایاں نینہ
گیا ساون ماہ محمودنا شوہ بن حویلی شینہ

شاہ محمد دیدڑ

فقیر شاہ محمد خاندان ''دیدڑ'' کا چشم و چراغ ہے ۔ ولادت اپنے آبائی گاؤں ''دیڈر'' تحصیل قنبر ضلع لاڑکانہ میں ۱۸۲۹ء کے قریب ہوئی ۔ اس نے حمل خان لغاری کا لطفِ صحبت بھی اٹھایا ۔ اپنے عہد کا نامور رباعی گو تھا ۔ زیادہ تر سی حرفیاں اور بحریں (واریں) یادگار چھوڑی ہیں ۔ شب خمیس ۱۶ رمضان ۱۸۸۹ء/۱۳۰۶ھ کو واصل بحق ہوا ۔ ایک بحر (وار) حاضر ہے :

سندر سجنڑی سینده سہنی کیتا سر کر کنڈھی سینگار میاں
زلف سیاہ سیسہر اتھ ہے بھونر سندی بھنکار میاں
قد صنوبر سر سوہنے دا ماکھی ہے لب لار میاں
لیث لکھینی لاڈلڑے بازو بند بنیئے زری دار میاں
پیر پٹونڑین پالبھردے ہن چاسینگر چمکار میاں
مور کبک ، ہنج وارن ونگیئے رانل دی رفتار مباں
کوئل درد اول نہ ولّے سن گوہر دی گفتار مساں
شل جد اہ جالے ہکدم جگوچہ دبدڑ کنوں دلدار مساں

خان محمد چنجنی

حاجی خان محمد نام خانن تخلص اور چنجنی قومیت ہے۔ آپ ۱۸۳۰ء میں تولد ہوئے۔ ان کا آبائی گاؤں ''فریہ میاں داد چنجنی'' تحصیل وارہ ضلع لاڑکانہ ہے۔ انہوں نے سرائیکی کافیوں ، دوہڑوں ، سہروں ، مدحیات و مناقب اور سی حرفیوں کا بہت سارا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ وفات ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ ایک سہ حرفی میں سے ایک بند ملاحظہ فرمائیے :

برسر ہے بار اڑانگا — مرسل میر دا عشق مہانگا
مار خودی دا کیڑ کانگا — تھی کڈھ کڑی بھنجھر بھانگا
بے کم بے غم تھیوے نہ نانگا — سدا سکھی تھی کریں نہ سانگا
ترن پیوئی تار آئین تانگھا — اون بھر چل توں ڈیسین اوڑ
پوکھ پکی ہئی پیہا جوڑ
معنی مخفی منہ نہ موڑ

صوفی نبی بخش

مولانا صوفی نبی بخش تلنبوی ۱۸۳۰ء کے قریب ملتان کے مردم خیز قصبے تلنبہ کے ایک متوسط حال صنعت کار درویش خاندان میں پیدا ہوئے۔ چشتی مسلک سے وابستہ ہونے کی بنا پر وحدت الوجود کے قائل اور داعی تھے۔ غزل کے شاعر ہیں اور اس کے ذریعے انہوں نے اپنے مذہب و مسلک کی خوب تبلیغ کی۔ وحدت الوجود کے بیان میں بھی اکثر و بیشتر سرائیکی رسم و رواج اور معاشرت سے متعلق اصطلاحات سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً فصلوں کی کٹائی (لائی) کرنے والوں مزدوروں (لاوے)

کو سامنے رکھ کر اس مسلک کو بیان کرتے ہیں :

تیرے عشق کرائیاں لائیاں ۔۔۔ بٹھ پہان نی فخر وڈائیاں
جڈوں لا دی ڈاتری چائی ۔۔۔ کھبتی حد دی کب ونجائی
رہی میں وچہ "مں" نہ رائی ۔۔۔ حڈوں ضرباں عشق چلائیاں

☆ ☆ ☆ ☆

لا حول ولا دا چاویں مونہاں ۔۔۔ تھیسیں الا اللہ دا سونہاں
اللہ منصب ڈتڑے روحاں ۔۔۔ ان اولیاء اللہ فرمائیاں

حسین دیڈڑ

قریہ دیڈر تحصیل نبر صلع لاڑکانہ میں ۱۸۱۵ء کے قریب پیدا ہوئے ۔ حسین فطری شاعر تھا ۔ اس کی کافیاں اور سی حرفیاں مشہور و مقبول ہیں ۔ وفات ۱۸۷۰ء میں ہوئی ۔ 'سی حرفی نصیحت نامہ' کا ایک بند بطور نمونہ پیش خدمت ہے :

الف ۔ ادا اے سن توں گال ۔۔۔ سمجھ سیانا ہوش سنبھال
ہے جگ فانی خواب خیال ۔۔۔ جیوں دنیا وچہ جنجال
کر کا سعیا[1] چھوڑ خمار
ڈاڑھی صاحب دی سرکار

بخش علی جتوئی

بلوچوں کے نامور قبیلے "جتوئی" کا یہ فرزند مراد علی خان جتوئی کے گھر اپنے آبائی گاؤں " تھرڑی چھٹے والی" تحصیل و ضلع لاڑکانہ میں ۱۸۱۸ء/۱۲۳۴ھ کو پیدا ہوا ۔ اپنے عہد کے سرائیکی شعراء میں ممتاز مقام حاصل کیا ۔ کافیاں دوہڑے ، مولود اور سی حرفیاں سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ۔ ایک بند 'سی حرفی عشقیہ' سے ملاحظہ کیجیے :

ھ ۔ ہمیشہ رمز رندی رکھ رقصی ذوق ضروری
جذبی حالت برہ وفا پی پیالہ مئے سکوری[2]

۱۔ سعی کا سرائیکی تلفظ (نامہ نگار) ۔

۲۔ سُکر سے سرائیکی انداز میں ڈھالا گیا ہے منازل سلوک میں صحو (ہشیاری) کے مقابل سکر (مستی) ہوتا ہے ۔

تنہن پس نزد معارف محفل منہن کرنی منظوری
بخش علی دکھ دور تھیئے جان یار ملیا مہجوری

مخدوم الملک سید

شمس الدین نام سید تخلص اور مخدوم الملک لقب آپ حامد محمد شمس الدین سادس کے لقب سے اچہ شریف کی خانقاہ قادریہ جیلانیہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ فارسی ، اردو اور سرائیکی زبان کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ سرائیکی میں کافیوں ، دوہڑوں ، مولودوں ، اور سی حرفیوں کا ایک ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا۔ آپ کی وفات ۱۸۸۰ء/۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

تارے گن گن رات نبھانواں میں — نہ سیجھ تے پاسہ لانواں میں
تھی بسمل پئی نڑپانواں میں — کراں رو رو نت برسات سائیں
میکوں قید غماں وچ سٹ گیوں — کیوں سانول جھوکاں پٹ گیوں
ڈس سوہنا کیا کجھ وٹ گیوں — ول پایو مول نہ جھات سائیں

دیوان خوشدل

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری اچوی کی اولاد امجاد سے تعلق رکھتے تھے اور اچہ شریف سے نقل مکانی کرکے جلال پور پیر والا ضلع ملتان میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ حضرت خوشدل خواجہ ، حضرت محکم الدین سیرانی اویسی کے سلسلۂ رشد و ہدایت میں بیعت ہوئے اور تا دم زیست خانقاہ اویسیہ کے حلقہ بگوش رہے۔ ایک اندازے کے مطابق ولادت ۱۸۳۰ء میں ہوئی۔ اپنے دور کے صاحب طرز سرائیکی شاعر تھے۔ انہوں نے سرائیکی دوہڑہ (رباعی) میں نام پیدا کیا۔ بلا مبالغہ وہ علی حیدر کے بعد سرائیکی دوہڑہ گویوں میں سب سے بلند مقام شاعر ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے :

آؤ سیو رل کانگ اڈاروں پردیسی ڈھولہ آوے
روندی راہ بھلیندی نوں ڈھولا آوے آن رہاوے
وتھری سیج رنگیلی نوں ڈھولہ آوے آن سوہاوے
خوشدل ہو قبولیم تینوں ماہی آوے تے گل لاوے
سانوں ماہ سہیلا آیا پاند لیاں دے رتے
رج رنوئیں اتے رج روایو اتے ہجر لایوئی متھے

نہ ٹکدی روح ٹکانے وچہ سے جوگی جوگ کمتے
خوشدل مول، نہ وسرم دل نوں رخ ماہی دے ہتے

غلام قادر

خاندان حضرت غوث العالمین بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے نامور فرزند ہیں ۔ موضع لابرم نواح ملتان میں ۱۸۳۶ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ۔ خاندانی روایات کے تحت ارساد و ہدایت اور تبلیغ کو زندگی کا نصب العین بنایا ۔ ساعری سے فطری لگاؤ تھا ۔ فارسی اور سرائیکی دونو میں کافی منظوم ذخیرہ چھوڑا ۔ اگرچہ کافیاں اور دوہڑے بھی ان سے یادگار ملتے ہیں، لیکن ان کا اصل موضوع مذہبی مثنوی ہے ۔ 'معراج نامہ' منظوم اور 'تولّد نامہ' منظوم ان کی یادکار طویل مثنویاں ہیں ۔

'تولد نامہ' میں ولادت سے نبوت تک کے حالات تفصیلاً صحیح روایات سے نظم کیے ہیں ۔ یہ مثنوی ۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ میں مکمل ہوئی ۔

حضرت حلیمہ سعدیہ جب دودھ چھڑا کر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ لانے لگیں تو آپ راستے میں غائب ہو گئے ، اس وقت حلیمہ سعدیہ کی حالت کیا تھی :

آکھیو نے لڑکا کون ہے تیرا — جس نوں ڈھونڈھیں ایڈ بتھیرا
آکھیم اے حبیب خدا — محمد ابن عبداللہ دا
ڈاڈا عبدالمطلب اس دا — باعث کون و مکان ہے جس دا
آکھیو نے اساں ونکھیا ناہیں — دوڑیس ڈھونڈھن کرکے دعائیں
جس دی برکت رزق فراخ — مہرا سی اوہ دل دی شاخ
کھیروں بال کیتم پرورده — لیایم سیاں کراں سپرده
پچھے میرے ہویا گم — کتھے ہوسی واللہ اعلم
جیے نہ لدھا مینوں پھیر — آپ نوں سٹ پہاڑوں زیر
پرزہ پرزہ کرساں جاں — ہویس کیوں غافل نادان

مستن ملتانی

ملتان شہر کے باکمالوں میں مست علی خاں مستن ملتانی کا نام زندہ جاوید رہے گا ۔ مستن ۱۸۳۹ء میں تولد ہوا اور ۱۹۰۰ء کے قریب اس دار فانی سے کوچ کر گیا ۔ سرائیکی زبان کا صاحبِ طرز غزل گو تھا ۔ نمونۂ کلام :

رات ڈینہاں غم کھانواں　　آکھ ڈھولن کن جانواں
یاری لایم سکھ نہ پایم　　ہن میں پئی پچھتانواں
سول ہزاراں جندڑی کاہڑی　　کیوین جان بچانواں

جہاں شاہ مجروح

ریاست بہاولپور کے اولین پایہ تخت اللہ آباد (ضلع رحیم یار خاں) کے میاں جہاں شاہ سادات گیلانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلاف بغداد سے سندھ اور پھر وہاں سے نواب بہاولپور کی دعوت پر اللہ آباد میں آکر مقیم ہوئے۔ کچھ جاگیر بھی ورثے میں ملی۔ میاں جہاں شاہ کو قسّام ازل نے شعر و سخن کا خوب ملکہ عطا فرمایا۔ وہ کافی (غزل) اور دوہڑہ (رباعی) دونو پر استادانہ دسترس رکھتے تھے۔

مجروح ''حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی'' سے بیعت تھے مگر خواجہ فرید رح سے بھی بہت اچھے مراسم اور نیاز مندی تھی۔ خواجہ فرید رح سے تبرکاً اصلاح بھی لی تھی۔ ۲۷ رمضان ۱۸۹۱ء/۱۳۰۸ھ کو ساٹھ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے:

پئے باجوں نہ جیاں ڑی　　مٹھی مرخاک تھیاں ڑی!
ہمیشہ پچھدیاں جو سی　　مٹھی ڈس کے تئیں روسی!
کوئی ڈینہہ وصل دا ہو سی　　سہاگن جگ سڈیساں، ڑی!
ہتھاں پیراں کنگن کڑیاں　　سیاں سیجھاں تے ونج چڑھیاں!
اساں کرماں دیاں سڑیاں　　کروں کیں نال ریساں ڑی!

سید نباہو شاہ افگار

ٹبی جھلن ضلع رحیم یار خاں (قدیم کارداریٔ خانپور) کے ایک اہلِ علم معزز سادات گھرانے میں ''افگار'' ۱۸۳۸ء کے قریب پیدا ہوئے۔ قدیم خیالات رکھنے کے باوجود شاعری میں جدّت پسند واقع ہوئے تھے۔ کافیاں اور دوہڑے ان کے پسندیدہ اصنافِ سخن تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے:

نظر سہر دی بھال پیارا تیں ول کھڑی اڈیکاں
چھوٹیں چھوٹیں پکبر ہوتیں لگیاں تیڈیاں لیکاں
سہنس سوالی حسن تیڈے دے میں بھی منگدی بھیکاں
یار افگار تے بار برہوں دا دردوں نکن چیکاں

احمد یار

ریاست بہاولپور کے قصبے گڑھی اختیار خاں (ضلع رحیم یار خاں) کے ایک سرائیکی الاصل خاندان ''سیال'' میں مولانا احمد یار ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مروّجہ میں دستگاہ کامل حاصل کرنے کے بعد خاندانِ چشت کے نامور سلسلے سلیمانیہ چشتیہ میں تونسہ شریف جا کر بیعت کی۔ حضرت خواجہ فریدؒ آپ پر بہت مہربان تھے، بلکہ آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ احمد یار پر اکثر مجذوبانہ حالت طاری رہتی تھی۔ بلا کے حسن پرست تھے۔ وہ سرائیکی دوہڑہ کے ماہر ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے:

و۔ ونگ پتے ساوڑے رنگ انوں اررنگ بھبھوت ملنگ ہوئے
انہاں بشبر تلھیر کالباں نوں گھر چھوڑ دیوانڑے جھنگ ہوئے
انہاں نکھاں سز نگاہاں نوں سے ٹوٹے ہزار کرنگ ہوئے
انہاں نازک ونباں دستیاں نوں احمد یار حیاتی نوں ننگ ہوئے

ح۔ حرف حکایت یار باجھوں بیا کوڑ کہانیاں کتھڑے نی
کئی کعبے گئے، کئی دیر و حرم ڈتے ننہ نسانباں نتڑے نی
ابرو یار بنان محراب مساجد کوڑ گساون متھڑے نی
احمد یار سوہنے دیاں جھاڑیاں ہاں، ناڑ کریندیاں گتھڑے نی

ڈتن ملتانی

میاں اللہ دتہ ''ڈتن ملتانی'' ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ غیر مقلد اہلحدیث علماء سے زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کی مذہبی نظموں کا مجموعہ 'بحار المومنین مطلوب الشائقین' کے نام سے دو حصوں میں طبع ہوا۔ ان کی طویل سرائیکی نظم 'قصہ معجزہ ہرنی' بہت مقبول ہے۔ نعتیہ سی حرفی کے چند بند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

ج۔ جیون اساڈا وچہ ملتان نہ بھندا وطن چھوڑ کے سائیں ملاں آن کے جیند
ذ۔ ذکر تبڈے دا ڈھولا ذوق اساں کوں سرے خاک قدم دا پاون‌شوق اساں کوں
س۔ سک تساڈی ڈھولا ملو کـڈاہیں نت سڈ میں ماراں کر کے لمبیاں بانہیں
ڑ۔ اللہ بخشے ڈسن سکوں نـالا گنہگار دا والی توں ہیں بخشن والا

صوفی رکھیل شاہ

سائیں رکھیل شاہ مشہور بزرگ حضرت سید نور محمد شاہ کے گھر فتح پور (علاقہ

گنداواہ سابق بلوچستان) میں ۱۸۴۵ء/ ۱۲۶۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے اسلاف شیراز سے نقل مکانی کر کے بارھویں صدی ہجری یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہاں آباد ہوئے تھے۔ رکھیل شاہ نے اپنے ہی خاندان کے ایک نامور بزرگ حضرت میاں عبدالنبی شاہ سے فیض حاصل کیا ۔ سرائیکی اور سندھی کے خوش گو شاعر تھے ۔ ان کا متفرق کلام مختلف رسائل میں چھپا ہے ۔ ۹۷ برس کی عمر پا کر یہ صوفی شاعر ۱۹۴۰ء/ ۱۳۵۹ھ میں واصل بحق ہوئے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے :

وس نہیں چل دا حجت نہیں ہل دی	رت رووان ہتھ دھوواں جند پئی جل دی
پھوک بالن تے اتھالن اج نہیں کل دا	کراں زاری سو واری عشق نہیں ٹل دا
کراں کیویں و نجاں کیڈے پندھ بھاری تھل دا	میں عذابی ہیریں بیادی اکھیاں رو رو مل دی
نینھ لاون پیچ پاوں دل ڈاڈھی ڈردی	رات ساری ہے اندھاری میں مٹھی دھر دی
ہے وچھوڑا پندھ ڈوڑا ساعت نہیں سردی	ہکواری دلداری سوہنا ڈیویں ول دی

حضرت خواجہ غلام فریدؒ

ملک الشعراء حضرت خواجہ غلام فریدؒ خانوادۂ چشتیہ کے نامور بزرگ ہیں ۔ ان کے آبا و اجداد اسلامی عسا کر کے ہمراہ عرب سے سندھ میں وارد ہوئے ۔ پھر ملتان کے سہروردی مشائخ (سلسلہ حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی) کی کشش انہیں نواحِ ملتان میں کھینچ لائی ۔ وہاں سے کوٹ مٹھن (ضلع ڈیرہ غازی خان) کے راستے چاچڑان (ضلع رحیم یارخان) جا پہنچے۔ حضرت خواجہ فرید ۱۸۴۵ء مطابق ۲۶ ذیقعد ۱۲۶۱ھ میں حضرت خواجہ خدا بخش الملقب بہ محبوبِ الٰہی کے گھر متولد ہوئے ۔ کم سنی ہی میں قرآن مجید حفظ کیا اور علومِ متداولہ میں دستگاہِ کامل حاصل کی ۔ ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت اپنے برادر بزرگ حضرت خواجہ فخرالدین ”فخر جہاں“ المتخلص بہ اوحدی سے حاصل کی اور ان کی وفات پر ستائیس (۲۷) برس کی عمر میں مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے ۔ حضرت خواجہ غلام فرید سرائیکی زبان میں ایک مستقل دبستانِ فکر کے بانی ہیں۔ انہیں اگر سرائیکی کا ملک الشعراء کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہیں ہو گا ۔ اس زبان میں انہیں وہی حیثیت حاصل ہے جو سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور پنجابی میں وارث شاہ کو حاصل ہے ۔ ان کا کلام پنجاب، سرحد ، بلوچستان ،سندھ اور راجپوتانے تک پہنچا ہے ۔ (خواجہ صاحب کی صوفیانہ شاعری سے پنجابی صوفی شعراء علاقائی ادبیات جلد اول باب چہارم میں دوسرے صوفی شعراء کے ضمن میں بحث کی گئی ہے) ۔

حضرت خواجہ فرید اول وآخر غزل (کافی) کے شاعر تھے۔ انہوں نے دوہڑوں (رباعیات وقطعات) قصیدوں ، بحروں اور مثنوی کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا ۔ وہ کافی (غزل) کے بادشاہ تھے،

اور بلا شبہ انہوں نے سرائیکی کافی کو معراج کمال تک پہنچایا ہے۔ انہوں نے فن کے لحاظ سے اس صنف میں بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی بند کے مصرعوں میں مختلف بحروں کے اوزان و ارکان کو ربط دے کر موسیقی کی نئی نئی دھنیں نکالی ہیں۔ خواجہ فریدؒ خود موسیقی کے ماہر تھے۔ ان کے سوقِ موسیقی کو دیکھ کر ان کے کئی مقلد شعراء نے باقاعدہ ملتانی سرائیکی راگ اور راگنیوں پر مشتمل پورے دیوان مرتب کیے۔

زبان کے لحاظ سے حضرت خواجہ فرید کا کلام سند کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے اشعار لطفِ زبان کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اکثر اوقات وہ محض زبان کے سحر سے کیفیات کا طلسم باندھ دیتے ہیں۔ قریب المعنی الفاظ کو وہ اس انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے معنوں کے باریک فرق از خود نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے بھی ان کے کلام میں ٹھیٹھ سرائیکی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب کے موضوعات

خواجہ صاحب کے مرغوب موضوعات تین ہیں۔ تصوّف، مناظر قدرت اور عشق و محبت۔ تصوّف میں ان کا مسلک وحدت الوجود ہے۔ انہوں نے خلوص اظہار اور زورِ بیان سے اس عقیدہ کو مؤثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہِک ہے ہِک ہے ہِک ہے   ہِک دی دم دم سک ہے
ہِک ہے ظاہر تک ہے باطن   بیا سب کچھ ہالک ہے
جیڑھا ہِک کوں ڈون کرجانے   او کافر مشرک ہے

اسی عقیدہ نے قلبِ انسانی کی عظمت کا احساس بھی خواجہ صاحب کے دل میں پیدا کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

دل لب ہے کون مکان دا   دل غایت اصل جہان دا
دل مرکز زمین زمان دا   بیا کوڑ پلال حجاب ہے

معلوم ہوتا ہے کہ اکثر فلاسفہ کی طرح خواجہ صاحب قلب (Mind) کو اصلِ کائنات سمجھتے تھے۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خواجہ صاحب کے افکارِ تصوّف میں ایک اور بات بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ وحدت کی اس فضائے قُدس کے دلدادہ ہیں، جس میں تخلیق سے پہلے تمام کائنات ذاتِ احد کے خیال میں موجود تھی۔ آپ اسی فضا کی یاد میں درد بھرے شعر کہتے ہیں، اس لیے کہ اس وقت زمان کی حدود سے ماوراء، انہیں دائماً محبوبِ ازل کا قرب نصیب تھا۔ مثال کے طور پر ان کی ایک کافی کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

تون باجھ تھے سنج ویڑھے وو یار
ول وس وو سجــن آ نیـڑے وو یار
قدسی گھر وچ کول بلہا کے　　اپنا محــرم راز بنــا کے
کیتو سخت پــریــرے وویــار

کہتے ہیں اب تخلیق کے بعد دوری کی اتنی بڑی خلیج حائل ہے کہ اسے عالمِ تصور میں بھی نہیں پاٹا جا سکتا ۔ یہ وہی درد ہے جو رومی کے ہاں مہجوری کی شکایت کے طور پر نظر آتا ہے ۔ البتہ خواجہ صاحب کے ہاں استعارے مختلف ہیں ۔ ذاتِ احد کے لیے ان کا محبوب استعارہ ''پنل'' ہے، اور ازل کی وحدت پرور فضائے قدس کو وہ ''کیچ'' کہہ کر پکارتے ہیں ۔

منظر نگاری کے لحاظ سے خواجہ صاحب منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے علاقے کے اکثر مناظر کے بڑے دلآویز نقشے کھینچے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر انسان روہی ، تھل ، بار اور نخلستان کی زندگی کا مکمل عکس دیکھ سکتا ہے ۔ برسات کے ایام کی دلربا روئیدگی اور چرند پرند کی کیفیت نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ صحرائی اور دیہاتی زندگی کی ایسی صحیح تصویریں آپ کو شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں نظر آئیں ۔ جیٹھ ، اساڑھ کے مہینوں میں جب بار میں پیلو کا پھل پکتا ہے اور عورتیں گروہ در گروہ چننے کے لیے جاتی ہیں ، ذرا وہ منظر دیکھیں :

آ چنون رل یار پیلو پکیاں نی وے
کئی بگــڑیاں کئی ساویاں پیلیاں　　کئی بھوریاں کئی پھکـڑیاں نیلیاں
کئی اودیاں گلنار ، کٹیاں رتیاں نی وے
پیــلو ڈیلھیــاں دیــاں گلــزاراں　　کہیں گل ٹوریاں ، کہیں سر کھاریاں
کئی لا بیٹھیاں بار ، بھر بھر پچھیاں نی وے

خواجہ صاحب کے کلام میں اسی طرح چولستان ، تھل اور روہی کی سرور آگیں زندگی کے مناظر بھی دیکھے جا سکتے ہیں ۔

خواجہ صاحب عشق و محبت کی کیف پروری کا اظہار بڑے جذبات انگیز پیرائے میں کرتے ہیں اور دردِ عشق کو دوئی اور کثرت کی تمام فکری اور عملی امراض کا علاج سمجھتے ہیں :

درد فــرید ہمیشــہ ہــووے　　سارے پاپ دوہی دے دھووے

آپ کے خیال کے مطابق عشق ہی منزلِ مقصود کی طرف راہبری کرتا ہے :

کیچ ڈون تنڑساں جے تائیں جیساں　　جــے ول ولساں کافــر تھیساں
گل وچ پــایم پــریت مہــار

اور آپ فرماتے ہیں کہ عشق ایک ہی جست میں تمام فاصلے طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے:

تھل مارو دا پینڈا سارا تھیسیم ہک بلھانگ

یہی عشق خواجہ صاحب کے مردِ قلندر کی تکمیلِ ذات کرتا ہے۔ جو اپنی صفات کے اعتبار سے اقبال کے مردِ کامل سے مشابہت رکھتا ہے۔ ذرا نگاہ دوڑائی جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ خواجہ صاحب کا تصورِ عشق اور ان کے افکارِ تصوف ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

آپ کے کلام میں تغزّل

اسی عشق و محبت نے خواجہ صاحب کے کلام میں تغزّل کی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ ایک مہجور کی طرح درد اور شوق سے فالیں نکالنے کا ذکر بھی آپ کرتے ہیں اور کبھی منتیں مانتے نظر آتے ہیں کہ کسی طرح محبوب ہمیشہ پاس رہے:

واٹ نہاراں کانگ اڈانواں پنڈت جوشی دے کن کھانواں
سو پنج پاراں فالاں پانواں اوسی مدا یار کڈاہیں

☆ ☆ ☆ ☆

خواجہ پیر دے ڈیساں چھنے ایہے ڈینہہ ابھایں بھنے
جیندیاں سبھ دل کیتیاں منے وسم سدا گھر باراں

ساون کی چاندنی راتوں میں سہیلیاں صحرا میں اکٹھی جا کر کھیلتی ہیں، تالابوں میں نہاتی ہیں، ہار سنگار کرتی ہیں، مگر دکھوں بھری مہجور راہ تک رہی ہے:

چاندڑیاں راہیں، برہوں براہیں سیاں کھیڈن گیاں
رت ساون دی مینہہ برسائیں دل مل دھانوں پیاں
سیاں دھانوں گانوں گانوں سہجوں ہار سنگار سہانوں
مانگ بناوں دھڑیاں گندھانوں میں سر ڈکھڑے باری وے

ان ابیات میں حسنِ جذبات اور لطفِ بیان کا امتزاج دیکھئے۔

خواجہ صاحب بحیثیت ترجمانِ غم

خواجہ صاحب ترجمانِ غم بھی ہیں۔ عوام کی مفلوک الحالی اور پریشان روزگاری آپ کے لیے ہمیشہ تکلیف کا باعث رہی۔ چولستان میں عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ محنت

مزدوری کرتی رہتی ہیں۔ تھک جاتی ہیں۔ ہاتھ پاؤں کی نسوں میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔ مگر وہ بیچاری مشقت جاری رکھتی ہیں:

تھک تھک ہٹ ہٹ ہارڑی ہتھڑیں ، پیرڑیں کڑول

عورت کی زندگی غموں سے بھری ہوتی ہے گویا غم اسے گھٹی میں ملتا ہے اور دکھ جہیز میں:

ڈتڑی جمدین امڑی کھتھڑی غم گھٹڑی ڈکھ ڈاں

یہاں عورت ہمہ گیر مظلومیت کی علامت ہے اور یہ کلفت زدہ اور حرماں نصیب عوام کی بد حالی اور کس مپرسی کا صحیح نقشہ ہے۔ اس لحاظ سے خواجہ صاحب نے عوام کی ترجمانی عمدگی سے کر دی ہے۔

سرائیکی تمدن اور ثقافت کی عکاسی

سرائیکی شاعری میں پہلی بار خواجہ غلام فریدؒ کے ہاں ہمیں اپنے علاقہ کے لوگوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کی مکمل تصویریں ملتی ہیں۔ سطور بالا میں جو اشعار دیے گئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام سرائیکی معاشرہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ خواجہ صاحب کے کلام سے لوگوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور کام کاج کرنے کی مکمل تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنے مویشیوں سے کس طرح محبت ہوتی ہے، نقل و حمل کے ان کے کیا ذرائع ہیں، ان کی تفریحات کیا ہوتی ہیں، اس قسم کی باتیں ان کے کلام میں اکثر ملتی ہیں رسوم و رواج کا پتہ بھی لگ جاتا ہے۔ مثلاً عورتوں کے زیورات وغیرہ کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے:

بولا بینسر کس نوں پانواں ڈھولن کیتا نامنظور
کتھ نوں بینا مانگھ بنانواں کجلہ پاوان سرخی لانواں
یار تتی دا وسدا دور

حرفِ آخر

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ موضوعات کا تنوع، معاشرے کی عکاسی، حسنِ بیان، جذبات انگیزی، سب کچھ آپ کے کلام میں ملتا ہے۔ آپ کا شمار اعلیٰ درجے کے شعراء میں ہو سکتا ہے۔

خواجہ فرید کے بعد - ۱۹۰۰ء تا ۱۹۷۰ء

مولوی نور دین مسکین

مولانا نور دین ضلع مظفر گڑھ کے ایک قدیم خاندان ''اوڈھانہ'' میں اپنے وقت کے ایک جیّد عالم اور درویش صفت بزرگ حافظ محمد عمر کے گھر ۱۸۴۵ء کے قریب پیدا ہوئے - آپ کا آبائی گاؤں ''آلودے والی'' آپ کے قائم کردہ دینی مکتب کی وجہ تمام سرائیکی علاقوں کے طلباء کا مرکز اور مرجع رہا ہے - مولانا نور دین جیّد عالم ، مفتئ دین اور اپنے وقت کے مقبول بزرگ تھے - شاعری اگرچہ ان کا ذریعۂ عزت و شہرت نہیں مگر جو بھی دو چار چیزیں انہوں نے یادگار چھوڑی ہیں' خاصے کی چیز ہیں۔ حضرت خواجہ غلام فرید ان کے ہم عصر تھے اور ان سے مسکین کے گہرے مراسم اور قریبی روابط تھے - حضرت مسکین نے سب سے پہلے مولوی لطف علی کی مشہور مثنوی 'سیف الملوک' کی بحر میں 'سسّی پنوں' کی داستان منظوم کی جو ان کی شاعرانہ خوبیوں کو اُجاگر کرنے میں خشتِ اوّل ثابت ہوئی - یہ داستان انہوں نے ۱۸۹۵ء/۱۳۱۳ھ میں مکمل کی - اس بعد 'ہیر رانجھا' کو نظم کا جامہ پہنایا - جس نے ان کی شاعرانہ شہرت کو چار چاند لگا دیے - یہ دونو مثنویاں ان کی زندہ جاوید یادگار ہیں - ان کے علاوہ ایک سی حرفی ہیر رانجھا ، ایک سی حرفی ڈھولا ، چند کافیاں اور ایک طوطا نامہ بھی ملتا ہے - 'داستان ہیر رانجھا' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے - کپاس چگنے کا بہانہ کرکے ہیر اپنی سہیلیوں کے ہمراہ کپاس کے کھیت میں جاتی ہے :

ایہو حیلہ کیتا منظور مائی ہیر — جولی ونواڑ نوں ایہہ کرکے تدبیر
جلی مائی ہیر عشقوں جام پی کر — جولیا زمرہ زنانہ نال تھی کر
آیاں کڑیاں نوازوں ناز بھریاں — تھیوں خوشحال وچہ ونواڑ وڑیاں
کرن پیلاں حمیلاں ہار پاکے — چنن پھٹیاں سوہے واگی سوہاکے
تھیوں ٹولیاں کرن بولیاں چبولی — جیوین وچہ باغدے بلبل سمولی
چنن سہجوں سہیلیاں، بندھ کے جھولی — ٹرن ٹھم ٹھم جیویں پریاں دی ٹولی
بھرن جھولیاں چنن نھی کر سمولیاں — ڈھن ہک بئے اتے کملیاں تے بھولیاں
پھرے مائی ہیر تن تنہا بربرے — چنے کڑیاں کنوں تھی کر اگیرے

دیوان ولایت حسین سید

سید السادات جلال الدین سرخ میر بخاری اچّوی کے خانوادے کے یہ نامور فرزند

۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے ۔ سہروردی الاصل ہونے کے باوجود حضرت خواجہ غلام فرید کی بے پناہ محبت کے باعث چشتیوں کے حلقہ بگوش بنے ۔ سید صاحب سرائیکی زبان کے قادرالکلام اور لازوال شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام 'گنج عرفانی دیوان لاثانی' کے نام سے ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ میں چھپا ۔ وہ شاعری میں اگرچہ خواجہ فرید کے مقلد اور پیرو ہیں ، مگر اشعار میں ان کی اپنی انفرادیت بھی جھلکتی ہے ۔ 'دیوان لاثانی' میں سید مرحوم کی ۱۰۹ کافیاں کم و بیش ۶۵ دوہڑے اور ایک بارہ ماسہ شامل ہے ۔ بارہ ماسہ کے چند ابیات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں :

اسوج
اسوں مہینہ خیر دا شبنم پوسائے گاہ
اجڑے ٹبے چڑھ چڑھ کھڑاں بھالاں میں تیڈا راہ
گزریئے ڈیہاڑے ڈینہہ گھنے آیا نہ میڈا شاہ
ہک جگ ڈھیلی میں پھراں توں بن حویلی باہ

کاتک
کئی مہینہ سینگیاں کتن ہن کر ستھہ
سرتے دوپٹے سوسنی ہتھ چوریاں ، نک نتھ
پیڑھے بسنتی پیلڑے کئی لال چرکھے ہتھ
ہک جگ ڈوہیلی میں پھراں رو رو بھرایم پتھہ

محمد مٹھا

میاں محمد مٹھا تحصیل شجاع ملتان کے علاقے چاہ چکووالہ میں ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے ۔ وہ موضع قطب پور کے ایک اہل علم زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ شعر و شاعری سے انہیں فطری لگاؤ تھا ۔ ایک سی حرفی 'بے نمازاں' اور قصہ 'نینگر و نینگور' (داستان یکے جوان و دوشیزہ) ان سے یادگار ہیں ۔ 'قصہ نینگر و نینگور' کا مرکزی خیال داستان ہیر و رانجھا سے ماخوذ ہے ۔ چند بند ملاحظہ کیجیے :

ص ۔
صاف جواب توں سن وے نینگور کیوں پھر دین مست موالی
انہاں تلاں وچہ تیل نہ کوئی مغز مریندیں خالی
زوری نینہ نہ لگنے وے نینگور بھانویں تھیویں ولایت والی
ویڑھے اساڈے آویں نہ نینگور متاں تھیوے جنگ جدالی

ض ۔
ضرور نہ ہٹاں ڑی نینگر جے تائیں وچہ حیاتی
ما پیو کنوں اگے انج تھی آیاں سر ملامت چاتی
گھر وچہ منگ کنواری چھوڑیم ویم جھاتی
آڑی نینگر گل لگ ملا ہیں کیوں ہیں چپ چپاتی

منشی نیغ علی کمتر

تحصیل شجاع آباد کے ایک متوسط الحال گھرانے میں یہ عوامی شاعر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۶ء میں فوت ہوا ۔ عام مروّجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد حیوانات کے علاج کو ذریعہٗ معاش بنایا ۔ طبیعت فطرتاً باذوق تھی ، شعر و شاعری سے زندگی بھر شغف رہا ۔ اپنے وقت کے سرائیکی سعراء نورور ، کمتر ، خادم ، وغیرہ سے گہرے دوستانہ مراسم تھے ۔ کمتر غزل سے زیادہ نظم کے ساعر تھے اور عوامی زندگی دیہات کے مناظر اور زندگی کے مسائل اس کا پسندیدہ موضوع تھے ۔ چنانچہ کافیوں سے زیادہ ان کی عوامی نظموں کو شہرت نصیب ہوئی ۔ ساس اور بہو کا جھگڑا روایتی جھگڑا ہے جو دنیا کی ہر قوم ہر ملک اور ہر خاندان کا عمومی مسئلہ ہے ۔ چنانچہ کمتر نے ''جھگڑا نونہہ و سس'' لکھ کر صرف سرائیکی علاقوں کی نہیں بلکہ بین الاقوامی برادری کی نمائندگی کی ہے ۔ ذیل میں ہم اس کے چند اشعار بطور نمونہ دیتے ہیں :

جے میں آکھاں ہیکوں کج   کتّی وانگوں ویندیں سُج
کوڑی جا مچایو لُچ   میڈے وچ ہے کیا گناہ

آڑی نونہاں روٹی کھاہ
نال تتی کوں ولول نا

ہر ہیڈا ہانت نت لجّھے   دھی ہیڈی نت ڈھوے بجّے
نوں طعنے پئی ماریں گُجّھے   خود خصم جو گیم کل

میڈا اٹاناں پئی مل
لگی ویساں پیکیاں ول

حال میڈے کوں نڈاں جانے   دھی کوں پٹھیں ڈیس بیگانے
سس نناہیں ڈیونس طعنے   درد میڈے دی پووس کل

میڈا اٹاناں پئی مل
لگی ویساں پیکیاں ول

خواری شہرت ساری چیسیں   پیو ڈاڈے داناں بوڑیسیں
میڈا کیا نقصان کریسیں   نہ توں گھر گھر یار بنا

آڑی نونہاں روٹی کھاہ
ناں تتی کوں ولول نا

ڈ"رہ نہ توں مُنہ کوں روکیں   تھوڑی گل توں اچی بوکیں
جھڑا بولے اوں کوں روکیں   گندہ کیتوئی جا بجاء
آڑی نونہاں روٹی کھاء
نال تتی کوں ولول نا

مبارک شاہ

یہ قادر الکلام سرائیکی شاعر احمد پور شرقیہ کے ایک معزز سید خاندان میں ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مروّجہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد نواب بہاولپور کے میگزین میں اہلمدرھتہ خانہ مقرر ہوئے۔ وہ فطری شاعر تھے اور بلا کے زود گو۔ ان کا اکثر کلام تاحال طباعت سے محروم ہے۔ مگر ایک مختصر سا مجموعہ 'داغ جگر' کے نام سے ان کی زندگی میں ۱۹۰۹ء میں چھپا تھا۔ کافیوں سے زیادہ ان کے دوہڑوں کو قبول عام ملا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

ساری عمراں لوہندیاں گزری اجساں نہ آیسا شامے
راتیں روندیاں ڈینہہ تھیوے ڈیہاں روندیاں تھہندی شامے
دھرتی ساری بھول رھیم کیا بلخ، بدخشاں، شامے
سید مبارک اوڑک رہساں دلبر یار دی شامے

شاہ نصیر الدین نقشبندی

وادئ سندھ کا یہ صاحب طرز سرائیکی شاعر مردم خیز شہر نوشہرہ فیروز کے ایک صاحب علم و فضل بزرگ سید عبدالحی کے گھر ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوا۔ علوم اسلامی میں دستگاہِ کامل حاصل کرنے کے بعد 'جھوک میراں پور' کے نامور نقشبندی بزرگ حضرت شاہ فضل اللہ قلندر کا مرید ہوا۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ شاہ نصیر کی وفات ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں ہوئی۔ کافیوں اور نظموں کے علاوہ اس کی سی حریفوں کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے:

الف   آوے یار جڈاں اگن میرے تڈاں تھیوں بھوں بھوں شادیاں جی
سبھے جھیڑے سیالیاں ہے چک پوں ویڑھے ویڑھے جی
سبھے کھیڑے خر خراب تھیوں حاصل ہووں من دیاں مرادیاں جی
سارا لوک ودھایاں ڈیوے میکوں تھیوں ملک و ملک منادیاں جی

ب بات میکوں نہ بی اوت وئے طلب تات چناب دے پار دی ڑی
جنھدی نار مکوں بیمرار کینا خار خار ہے و نجھلی تنوار دی ڑی
زار و زار روواں ہنجوں پار پوواں ایہو ہار گھتاں گل یار دی ڑی
نوڑے ہاڑ ہوے سوڑے چست رہاں سر عشق دا ڈھارا ڈھار دی ڑی

نصیر الدین خرم

خرّم احمد پور شرقیہ میں ۲۷ رمضان ۱۸۵۵ء/۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوا۔ اس کے آباو اجداد ضلع ڈیرہ غازی خاں کے اہلِ علم بلوچوں سے تعلق رکھنے تھے۔ والد ماجد نواب بہاولپور کے اتالیق رہے۔ خرم سرائیکی شاعری کا بلا مبالغہ 'فصیح الملک داغ' ہے۔ وہی نازکِ بیانی، اور وہی الفاظ کی مینا کاری ہے۔ خرّم بُر گو ہی نہیں بلکہ نغز گو بھی تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ول سانوں رلسے سہاؤں ہــا !

ول سانوں رلئے ساؤن ہــا	انب کھاؤن ہا نالیاں دہاؤن ہا
جھوٹیاں دے جھوٹیاں کیتے	اچے ببلاں پینگھاں پاؤن ہا
گھٹ سیوے کھیر ملائیاں	ول کلفے انویں جاؤن ہا
ول انــویں ںلا زردیاں دیاں	کئی دیگاں ونج کھڑکاؤن ہا
ڈینــڈا بنــڈ ججّے کولوں	انب احمد پوروں منگاؤن ہا
بھونیاں دیاں کڈھ کڈھ بوٹیاں	ہک بئے کون کھڑے چکھاؤن ہا
ہک بئے دے سر وچ جندڑی	ول اونویں تبل رساؤن ہا
رکھ گــوڑے انے گــوڈا	رل مینگھ ملہاراں گاؤن ہا

محمد محسن بیکس

سندھی اور سرائیکی زبان کے مشہور شاعر حضرت قادر بخش بیدل کے گھر محمد محسن بیکس کی ولادت ۱۸ جمادی الثانی ۱۸۶۰ء/۱۲۷۵ھ میں ہوئی۔ بیکس اپنے والد کی طرح علومِ اسلامی کا ماہر، جید عالم اور صوفی منش شاعر تھا۔ ساری زندگی تبلیغِ حق میں گزری۔ پورا کلام وحدت الوجود کے اسرار و رموز کی تفسیر و تشریح سے عبارت ہے۔ بیکس کی وفات رمضان ۱۸۸۱ء/۱۲۹۸ھ میں عین شباب میں ہوئی۔ مجموعہ کلام بارہا چھپ کر قبول عام

حاصل کر چکا ہے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے :

میں ہوں فقیر حقیر ۔۔۔ توں صاحب تخت ہزارا
دردی کیتی دل میڈی کوں ۔۔۔ ڈے کا ساہ سدھیر ، میڈا یار پیارا
توں ہیں سرور سرّ سارے دا ۔۔۔ میں ہوں پر تقصیر ، بیوس ویچارار
کمینی کنیزک در تیڈی دی ۔۔۔ میں ہوں دامنگیر ، بیکس بیکارا

نو روز

میاں محمد بخش نوروز ریاست بھاولپور کے ایک قصبے مبارک پور میں ۱۸۰۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ۔ یہ آزاد منش اور قلندر صفت شاعر سرائیکی زبان کا شہنشاہِ سخن کہلانے کا مستحق ہے ۔ کافی ، دوہڑہ ، قصیدہ ، مرثیہ اور نعت تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر جو شہرتِ دوام اور قبولِ عام نوروز کے دوہڑوں کو ہوئی وہ دوسرے کلام کو نصیب نہ ہو سکی ۔ نوروز خواجہ فرید کا ہمعصر ہی نہیں بلکہ ان کا پسندیدہ اور محبوب شاعر بھی تھا ۔ خواجہ فرید گھنٹوں ان کا کلام سنتے اور سر دھنتے تھے ۔ مطبوعہ کلام میں مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' اور کافیوں کے دو مجموعے 'شعلۂ دلسوز' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔ 'دوہڑہ جات نوروز' بھی شائع ہوئے تھے ۔ جواب نایاب ہیں ۔ یہ جامع کمالات نغز گو سرائیکی شاعر ۱۹۷۱ء میں و اصل بحق ہوا :

ساون آیا روہی وٹھڑی گھاہ لوارے کھاون بے من بھاون
ٹوبھے پلیر پانتیاں تے پئے جھوکاں لوک بناون من پرچاوں
تھی بے تاب اڈیکاں کھڑ متاں یار سندھو چڑ آون آ گل لاون
نو روز ایہے ڈینہہ مٹھرے بن سجناں گزر نہ جاوں کئی سکھ پاون

مولانا نور محمد کھتر

کھتر مرحوم تھہیم قوم کے ایک متوسط الحال خاندان کے بزرگ میاں محمد بخش ندآف کے گھر ۱۸۷۱ء کے قریب پیدا ہوئے ۔ ضلع مظفر گڑھ کا مشہور قصبہ 'سبائے والہ' آپ کا وطن مالوف تھا ۔ عربی ، فارسی کی تمام متداول کتب حضرت علامہ غلام حسین اور مولانا اللہ بخش سے پڑھیں ۔ عشقِ رسول رگ رگ میں رچا بسا تھا ، لہذا شاعری میں بھی نعت گوئی کو ترجیح دی ۔ ان کی سرائیکی نعتیں آج بھی اسلامی جلسوں اور روحانی محافل کی جان اور روحِ رواں ہوتی ہیں ۔ بہت سی کافیاں اور دوہڑے بھی یادگار چھوڑے ۔ یہ بلند پایہ نعت

گو شاعر ۱۹۳۱ء میں اللہ کو پیارا ہوا - ۹، ۱۰، ۱۱ ماہ ہاڑ کو ہر سال عرس ہوتا ہے -
نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :

بیشک باری بارہن دلڑی سہہ ونج سہہ ونج سہہ ونج
نہ رل مفتی روہ جبل وچہ رہ ونج رہ ونج رہ ونج
بن فرہاد پہاڑ خودی کون ڈہ ونج ڈہ ونج ڈہ ونج
رکھ ہک بانگھ ملن دی کہتر بہہ ونج بہہ ونج بہہ ونج

☆ ☆ ☆ ☆

ہول میکوں وڈا منزل دا پلے راہ دا خرچ تیار نہیں
اگوں او کھیاں گھاٹیاں راہ لمے ڈوجھانال سیڈے میڈا یار نہیں
انھاں نقد بازار دا ہے سودا ہوونا گھڑی دا ہک ادھار نہیں
کہتر جگ تے فخر ہزار ولے نال ونجن جو کوڈیاں چار نہیں

اللہ ڈیوایا پرجوش

منشی اللہ ڈیوایا پرجوش تحصیل شجاع آباد کے ایک زمیندار خاندان میں ۱۸۷۰ء کے اواخر میں متولّد ہوئے - قسّامِ ازل نے انہیں شاعرانہ صلاحیتیں کمال فیاضّی سے عطا کی تھیں - وہ کافی اور دوہڑہ دونو اصناف پر قدرت رکھتے تھے - ایک مختصر سا مجموعہ کافیوں کا اور ایک مجموعہ دوہڑوں کا زندگی میں چھپ چکا تھا ، جو اب نایاب ہے - پرجوش کے کلام پر خواجہ فریدؒ کے رنگِ تغزّل کی چھاپ نمایاں ہے - نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے :

مطلع

(۱) درداں دی ماری دلڑی علبلے ۔۔۔ سوہنا نہ سندا ڈکھاں دی اپیلے
سے سے کتو سے حیلے تے چارے ۔۔۔ مفتے رلیو سے در در اوارے
سوہنیاں دے گھر ہن اصلوں وسارے ۔۔۔ ڈکھڑے نہ تھیندے ہک دم پسیلے
چھوٹی عمر وچہ دیداں نہ لیندی ۔۔۔ ایہہ گیڑ گل وچہ اصلوں نہ پیندی
چالاک ہوندی تاں دو کھے نہ چیندی ۔۔۔ واہ واہ جو تھیاں جڑ جڑ ذلیلے

فقیر محمد خان کھتراں

غلام حیدر خان کھتراں زمیندار 'بودانی کھتراں' تحصیل ہالا ضلع حیدرآباد سندھ کا فرزند ہے اور ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوا - علوم مروّجہ میں دستگاہِ حاصل کرنے کے بعد

حضرت پیر پگارو علیہ الرحمہ سے بیعت ارشاد اور بیعت جہاد کی ۔ اپنے مرشد کے حکم پر انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا ۔ یہ مجاہد شاعر نواب ولی محمد خان لغاری اور مخدوم حیدر ہالائی کا ہمعصر اور ہم صحبت بھی تھا ۔ ۱۹۴۰ء/۱۳۵۹ھ میں فوت ہوا ۔ نمونہٗ کلام ذیل میں درج ہے :

۱۔ چھلّا ب دی بازی ، کھل کھیڈن غازی
چھوڑ قبل ماضی ، وحدت والی ویڑھے ، تھی نینہہ نیڑے

۲۔ چھلّا ج نوں جوگی ، بھو بھگا بھوگی ، رنج لتّھا روگی
ہن نعرے نینہے ، گالھ کراں کیہے

۳۔ چھلّا س سک ہے لوں لائی لک ہے ، وچہ چھاتی چھک ہے
میم معنے مانی جان عجب جائی

یتیم

بلوچوں کے نامور قبیلے جتوئی کے فرزند سردار غلام حیدر خاں یتیم ''جتوئی'' ضلع مظفر گڑھ کے ایک زمیندار گھرانے میں ۱۸۹۴ء کے قریب پیدا ہوا ۔ مڈل سکول جتوئی سے فائنل پاس کیا اور پھر ایس ، وی کرکے مدرس ہو گیا ۔ بالآخر محکمہٗ تعلیم سے فارغ ہوکر اپنا زمیندارہ سنبھالا ۔ یتیم بلاشبہ سرائیکی زبان کا 'شاعرِ انقلاب' ہے ۔ اسے ضلع مظفر گڑھ کے ایک دانشور ڈپٹی کمشنر نے 'فردوسیٔ ملتان' کا خطاب دیا تھا ، جو آج تک اس کے نام کا جزو بن کر رہ گیا ہے ، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی زبان کا فردوسی ہے ۔ اس نے اپنی شاعری میں ٹھیٹھ سرائیکی الفاظ کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا ہے نیز اس موضوع کے بھی ہمیشہ سے سرائیکی معاشرہ اور سرائیکی تہذیب و تمدّن رہے ہیں ۔ حال ہی میں اس کا ایک مختصر سا مجموعہٗ کلام 'دُرِّ یتیم' کے نام سے چھپ کر مقبول عام ہوا ہے ۔ مختصراً نمونہٗ کلام درج ذیل ہے :

طبلے تے لگی تھاپ تے ڈھولک تے ٹھنگورے — چڑھ آئے مکاناں تے بدل کالے تے بھورے
بدلی وٹھی کالی تلے برسن پئے کرورے — ہتھ ڈیکھ حنائی لگے یاراں دے کھنگورے

گھوڑیاں پیاں ہنڑکن تے سواریں دی سلامی
وسّی دا تماشا ہویا یاریں دی سلامی

ہک ویل توں بئی ویل کڑا ویل ٹھکاویل سر نال پکارے پیا نقلی دی ولا ویل
سردار، ملک، خان، آ کھےول ولی ریہہ ساویل منڈا پیا نچ نچ تے سہاوے پیا سوا ویل
بلبل دی نگاہ گل تے بہاریں دی سلامی
وستی دا تماسا ہویا یاریں دی سلامی

اس کے دوہڑوں کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے:

درداں آن دھاں گھتی ہے درتے جیناں چھڑ دے، زوری لڑدے
بازوں بھن بھن باراں ڈیون بغل مروڑ ولہڑدے، زوری لڑدے
جبن پاسے منہ پھر نساں، رکھ ویرا گوں آ کھڑ دے، زوری لڑدے
درد یہم دوا بھی لگن درد اساڈے دھڑدے، زوری لڑدے

صالح محمد صالح

میاں محمد بخش لکھویرا کے گھر ریاست بہاولپور کے پہلے پایہ تخت اللہ آباد ضلع رحیم یار خاں میں ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ ابھی چھٹی جماعت میں تھا کہ باقاعدہ تعلیم ترک کر دی۔ اس کے بعد مولوی رحیم بخش مسرور ساکن علاقہ احمد پور شرقیہ کی علمی ادبی صحبتوں نے صالح کو شاعرانہ نزاکتوں سے روشناس کرایا۔ صالح بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔ سرائیکی زبان کے موجودہ شعراء میں صالح کا ہم پلہ کوئی غزل گو شاعر نہیں۔ اس کی زبان پاکیزہ و شیریں، اسعار پر لطف اور مترنم، استعارات و تشبیہات دلکش اور قریب الفہم ہوتے ہیں۔ غرض صالح غزل گو شاعر ہے اور شعر عوام کی زبان میں کہتا ہے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

رٹھے یار ڈاڈھے اوکھے منیندن — چارے کریندن سے تن مریندن
ملاں نے بھوپے جوسی پچھیندن — پھالاں ہویندین پوتھیاں ڈکھیندن
حیلے حوالے صدقے کڈھیندن — خواجے خضر دے ڈیوے بلیندن
ٹھاکر دوارے متھے ٹکیندن — بہہ مورتی کوں ڈکھ سکھ سنیندن

فقیر بخت علی

فقیر بخت علی کے آباو اجداد پنجاب کے نامور زمیندار خاندان ''نون'' سے تعلقِ نسبی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ پنجاب سے نقلِ مکانی کر کے قدیم پرگنہ بھونگ بھارہ' کی کارداری احمد پور لمہ' آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ بخت ۱۹۱۳ء کے قریب 'رانا نبی بخش خاں

نون کے گھر متولّد' ہوا ۔ تعلیم سے بالکل عاری رہا ۔ قلعی گری کا پیشہ اختیار کیا ۔مگر حضرت خواجہ پیر سیرانی علیہ رحمۃ نے ایسا صیقل عشق سے چمکا دیا ۔کہ اپنے علاقے میں ملک الشعراء مشہور ہوا ۔ یہ امی مگر قادرالکلام شاعر تمام اصنافِ سخن پر استاداللہ قدرت اور کامل مہارت رکھتا ہے ۔ کم و بیش ایک لاکھ اشعار پر مشتمل کئی سرائیکی مجموعے زیر ترتیب ہیں ۔ بخت فقیر نے کافی ، دوہڑہ ، نعت ، مرثیہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے ۔ مگر اس کی شہرت کا باعث اس کی عشق نبی سے معمور اور وجد آفرین نعتیں ہیں ۔ بخت نرا شاعر ہی نہیں بلکہ سالکِ راہِ طریقت اور درویشِ کامل بھی ہے ۔ بطور نمونہ ایک دوہڑہ ملاحظہ کیجیے :

باغ اندر مرغاں چمن بہہ مٹھڑی بولی بولن
کر اولے ہوں ، ڈھولے کارن شجر ثمر کل پھولن
ستاں لکھیا خط یار ہووے ہتھ مار جڈاں پن چولن
بخت علی ہر کلی کلی توں جان شودے پئے گھولن

ادارہ

سرائیکی نثر[1]

سرائیکی نثر کا سرمایہ کیا بلحاظ مقدار اور کیا بلحاظ نوعیت بڑا کم ہے ۔ اس زبان میں خالص ادبی نثر کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے ۔ مذہبی نثر کافی عرصہ سے موجود ہے ۔ مثلاً حافظ برخوردار کا 'بوہل نامہ' اور 'پکی روٹی' ، 'مٹھی روٹی' جیسے رسالے مدت کے لکھے ہوئے ہیں ۔ ان رسائل کا انداز تحریر سوالاً جواباً ہے ۔ مولوی عبدالکریم کی مشہور کتاب 'نجات المومنین' کی شرح بھی سرائیکی نثر میں لکھی گئی تھی اور بڑی مقبول ہوئی ۔ ذاکر صاحبان کی نثر میں لکھی ہوئی تقریریں بھی کافی عرصہ سے چلی آتی ہیں ۔ علاوہ بریں جیسا کہ اوبرائن نے لکھا ہے سرائیکی زبان میں قصہ کہانی ، چیستانوں ، بجھارتوں ، محاوروں اور ضرب الامثال کا بہت بڑا ذخیرہ ملتا ہے لیکن ابھی تک اسے مرتب نہیں کیا گیا اور نہ ہی سرائیکی نثر میں اس قسم کی تخلیقات اور تحریرات ملتی ہیں جن کا دوسری زبانوں میں آج کل بڑا

---

(۱) تقریباً تمام معلومات سرائیکی شاعری از کیفی جام پوری سے ماخوذ ہیں ۔

رواج ہے ۔ تاہم اس طرف توجہ ہو رہی ہے اور امید پیدا ہو چکی ہے کہ جس طرح سرائیکی شاعری میں خاص قسم کا سوز اور دلآویزی ہے ، سرائیکی نثر بھی اسی طرح مؤثر اور کارآمد بن جائے گی ۔

فاضل امام بخش امام (م ۔ ۱۹۱۷ء) نے سرائیکی زبان کی خدمت ادا کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا ۔ آپ نے 'امام اللغات' کے نام سے ایک فارسی لغت مرتب کی جس میں فارسی الفاظ کی تشریح سرائیکی زبان میں کی ۔ اسی طرح آپ نے 'ملتانی میزانِ طب' بھی سرائیکی نثر میں لکھی ۔ مگر یہ دونوں کتابیں ۱۹۵۳ء میں دریائے سندھ کی طغیانی کی نذر ہوگئیں ۔

مولوی گل محمد عاشق ملتانی (م ۔ ۱۹۳۳ء) نے اہلِ بیت رسول کے مصائب مقفیٰ نثر میں بیان کرنے شروع کیے ۔ اس سے پہلے اندازِ بیان بالکل سیدھا سادا تھا ۔ عاشق کی نثر میں الفاظ کی برجستگی اور جملوں کی بے ساختگی سننے والوں کو مسحور کر دیتی تھی ۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> ''محبان حسین ! روز عاشور سادات کیتنے سخت ہا ڈوپہر دا وخت ہا
> میدان کربلا وچ مبتلائے نبی دا لخت ہا ۔ توڑے جو ریت گرم ہئی
> حسین سمجھیا تخت ہا ۔ نبی دا دلربا کجا ، کربلا دی گرم ہوا کجا ! ''

سرائیکی نثر نگاری کے اعتبار سے عاشق ملتانی کے بعد ان کے شاگرد مولوی محمد رمضان بہار ملتانی (م ۔ ۱۹۶۶ء) کا ذکر آتا ہے ۔ تقاریر عزاداری کے علاوہ سوانحعمری 'دوازدہ معصومین' اور 'سفر نامہ عراق' سرائیکی نثر میں ان کی یادگار ہیں ۔ آپ بھی اپنے استاد کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ بعض اوقات استاد اور شاگرد کی نثر میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

حاجی نبی بخش شوق (ز ۔ ۱۹۶۹ء) بھی سرائیکی نثر میں نام پیدا کر رہے ہیں ۔ آپ نے سیرت رسول لکھنا شروع کی ہے اور سنہ پانچ ہجری تک کے واقعات پانسو صفحات میں قلمبند کیے ہیں ۔ نمونۂ نثر :

> ''دوستو! ہزار حمد ہے اوّل رب المنان دا ۔ جین اساکوں زیب عطا فرمایا ہے
> انسان دا ۔ کیا مقدور ہے ایں زبان دا ، جو شکر کرے یزدان دا ۔ ہر ادنیٰ تے
> اعلیٰ قائل ہے اوندے کرم اتے احسان دا ۔ منگے بغیر رزق عطا فرماوے ایہ
> شیوہ ہے اوں رحمان دا ۔ حسب دار بناپس اساکوں نبی آخرالزماں دا ۔ کرم ہے
> اساں عاصیاں تے اوں سبحان دا ۔''

نثر کے اس نمونے پر غور فرمایے۔ عاشق ملتانی کی طرح مقفیٰ اور مسجّع عبارت ہے۔ زبان تکلّف سے لبریز ہے۔ ظاہر ہے سرائیکی میں سادہ اور رواں زبان کا اختیار کرنا ابھی شروع نہیں ہوا۔ علمی زبان بننے کے لیے اسے ذاکر صاحبان کا خطیبانہ انداز ترک کرکے بے تکلّف طرزِ تحریر اختیار کرنا ہوگا۔ افسانہ نگاری، ناول نویسی اور صحافت سے بھی اسالیبِ نگارش میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ جب سرائیکی زبان کے ادیب ان اصناف کی طرف زیادہ توجہ دیں گے تو لازماً سرائیکی نثر بھی سندھی، پشتو اور پنجابی زبانوں کی طرح جدید قسم کا سادہ اور سبک رنگ اختیار کر لے گی۔

بلوچی ادب

جغرافیائی اور تاریخی پس منظر

مغربی پاکستان کا صوبہ ہے جو کوئٹہ ڈویژن اور قلات ڈویژن پر مشتمل ہے ۔ انگریزوں کے عہد میں بھی اسے بلوچستان کہا جاتا تھا ۔

محل وقــوع

بلوچ قبائل کا مرکزی وطن بلوچستان ہے ۔ یہ برِ اعظم ایشیا کے جنوب میں اور مغربی پاکستان کے انتہائی مغربی کونے میں واقع ہے ۔ آج ہمیں دو بلوچستان ملتے ہیں ۔ مغرب میں ایرانی بلوچستان اور مشرق میں پاکستانی بلوچستان ۔ پاکستانی بلوچستان کے شمال میں یاغستان اور افغانستان اور شمال مشرق میں صوبہ سرحد ، مغرب میں ایران ، جنوب میں بحیرہ عرب اور مشرق میں صوبہ سندھ اور پنجاب ہے ۔ بلوچستان کا کل رقبہ ۱۸۹۰۰۰ مربع میل ہے ۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۱۷۴۰۳۶ تھی ۔ اب بھی اس کی آبادی ۱۵۴۰۰۰۰ نفوس سے زیادہ نہیں ۔

طبیعی حالات

یہ پہاڑی علاقہ ہے ۔ مشرق میں کوہِ سلیمان اور کوہِ زرغون اس کو پنجاب سے ، اور ہالار ، کھیرتھر اور پب اس کو سندھ سے علیحدہ کرتے ہیں ۔ شمال میں ٹوبہ کاکڑ اور درمیان میں بروہی پہاڑ ہے ۔ مکران سے پہاڑوں کے سلسلے قطار در قطار جنوب تک جاتے ہیں ۔ ساحلِ سمندر پر کوہ ''تالار'' کی شاخیں اور مغرب میں کوہ سیاہان کی شاخیں ہیں ۔ ان سلسلہ ہائے کوہ میں سب سے بلند چوٹی سطح سمندر سے تقریباً ۱۲۰۰۰ فٹ بلند ہے ۔

بلوچستان مندرجہ ذیل اضلاع پر مشتمل ہے:

ژوب ، لورا لائی ، کچھی ، کوئٹہ ، پشین ، چاغی ، خاران ، سراوان (جس کو بلوچ خراسان بھی کہتے ہیں) جھالاوان ، کیچ مکران اور لس بیلہ ۔

نام

قدیم زمانہ میں اس علاقہ کا ایک نام نہیں تھا ۔ سنسکرت کی کتابوں میں اس علاقہ

کے مختلف حصوں کے الگ الگ نام ملتے ہیں ۔ یونانیوں نے اس کے بعض حصوں پر اپنے نام رکھے، عربوں نے انہی حصوں کو اپنا لب و لہجہ عطا کیا ۔ مثلاً یونانی مؤرخ اس کے الگ حصوں کو اس طرح نام دیتے ہیں :

آرکوسیا (سراوان ، کچھی اور قندھار) ، ڈرنگیانا (سیستان) ، گیوروشیا (جھالاوان ، مکران) کیز (کیچ) ، کالا (کلمت) ، ڈگا سیرا (گوادر) گل سکرڈ (قصر قند) وغیرہ ۱

انہوں نے مکران والے حصے کو (Ichthyophagoi) بھی کہا ہے ، جس کے معنی ہیں : ''ماہی خوروں کا ملک'' ۲ ۔ سنسکرت کتابوں میں مکران کا نام ''موکارا'' یا ''مکا ارینا'' آیا ہے ۳ ۔ عرب اسے ''ماکران'' سے موسوم کرتے ہیں ۔ ایرانی اسے ''ماہی خوراں'' کہتے ہیں ۴ ۔ حمزہ اصفہانی لکھتے ہیں کہ مکران پر یہ نام موکران بن فرخ بن سام بن نوح کی وجہ سے پڑا ۶ ۔ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ مکران فارسی ''ماہی خوراں'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۶ ۔

کیچ کو یونانی اور عرب دونوں ''کیز'' لکھتے ہیں ۔ کچھی کو سنسکرت والے خواہ عرب دونوں ''بدھا'' لکھتے ہیں ۔ ''گنداوہ'' کو قندابیل اور ''خضدار'' کو ''قصدار'' کہتے ہیں ۷ ۔ ''خاران'' کا اصل نام ''کاران'' ہے ۔ ابوالفضل نے بلوچستان کے تذکرہ میں ایک سلسلۂ کوہ کا ذکر کیا ہے جس کا ایک سرا علاقہ کیچ سے ملحق ہے اور اس کا نام اس نے ''کوہِ کاران'' بیان کیا ہے ۔

قدیم تاریخوں میں ''بلوچستان'' کا لفظ نہیں ملتا ۔ زیرِ بحث علاقہ کا یہ نام جدید ہے اور گذشتہ دو صدیوں سے استعمال ہونے لگا ہے ۔ جی ہسٹن نے لکھا ہے کہ یہ نام اٹھارویں صدی کی ایجاد ہے اور نادر شاہ نے ملکی انتظام کے لیے اسے تجویز کیا تھا ۔ اس کے معنی ہیں : ''بلوچوں کا ملک'' ۔ سی ۔ ای بڈلوف نے لکھا ہے کہ '' بلوچستان'' کا نام انگریزوں کی ایجاد ہے۸ ۔

---

(1) "The *Gates of India:* "Sir T. H. Holdich, London 1910, P. 7, Introduction.

(2) Baluchistan District Gazetteer series : Vol : VII Makran ; R. Hughes Buller, Bombay 1906, p. 4.

3 (*a*) (Brihat Sanhita). (Vareha mihirira).

3 (*b*) Mohd Sardar Khan; "History of Baluch Race", p. : 23).
"Ancient India" میں اولڈ برگ نے "History of Ancient Sanskrit Literature.

(4) Makran Gazetteer : R. Hughes Buller, Bombay 1906, p. 4.

(۵) ایضاً ص ۴

(۶) ایضاً ص ۴

(7) R. Hughes Buller, Baluchistan District Gazetteer, Makran, Bombay 1966 p. 4.

(8) C. E. Bidluph : "Our Western Frontieer" pp. 8-15, London, 1887.

آثار قدیمہ

بلوچستان سے جو آثارِ قدیمہ ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان میں بھی وہی تہذیب رائج تھی ، جو وادئی سندھ میں قائم تھی - بلکہ بلوچستان ، سندھ کا ایک صوبہ تھا ، جب برِّصغیر دو حصوں ، سندھ اور ہند میں منقسم تھا - جس طرح قدیم زمانہ میں سندھ کی طبعی حالت بدلی ہوئی تھی ، اس طرح بلوچستان کی حالت بھی مختلف تھی - قدیم زمانہ میں بلوچستان کی آب و ہوا موجودہ زمانے کی نسبت مرطوب تر تھی - بلوچستان کے آثارِ قدیمہ تین قسموں کے ہیں - قدیم مقبرے ، غار ، بند ، قلعے ، گودام ، کاریزیں - (۲) مقبروں کے کتبے ، جن کے رسم الخط کا پتہ لگ سکتا ہے - (۳) سکے ، برتن وغیرہ — قدیم زمانہ میں فنیقی ایک تاجر قوم رہی ہے - جنھوں نے ایشیا ، یورپ اور افریقہ میں تجارتی منڈیاں قائم کی تھیں - ''خاران'' میں ایسے مقبرے ہیں جن میں فنیقیوں کی قبریں ہیں - ان میں سے بعض میں قبروں کے اندر اور بعض میں قبروں کے بغیر لاشیں رکھی ہوئی ہیں - ہر لاش محفوظ ہے - بعض قبروں کے اندر سیر اور دوسرے جانوروں کی مورتیاں ہیں اور دیواروں پر انسانی اعضاء کی تصویریں ملتی ہیں - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنیقی اس علاقہ میں باقاعدہ رہے ہیں - پہاڑوں کی وادیوں میں برساتی پانی جمع کرنے کے لیے عظیم الشان پتھر کے بند موجود ہیں - جن کو بلوچ ''گبر بند'' کہتے ہیں - مٹی کے جو برتن دستیاب ہوئے ہیں ، وہ سندھ کے ''موہن جو دارو'' سے برآمد ہونے والے برتنوں سے مشابہت رکھتے ہیں - آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ مشہور پہاڑوں کھیر تھر اور بب کے سندھ اور بلوچستان والے حصوں میں بڑے وسیع شہر آباد تھے - '' تھل'' کے بلند ٹیلہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ بدھ کے زمانے کا ہے - سبی میں بدھ کا عظیم استوپ تھا ، جس کی مشہور چینی سیاح ہیون تسانگ یاترا کرنے آیا تھا - ماہرین کا خیال ہے کہ قدیم زمانہ میں جو تہذیب مغربی ایران ، عراق اور سندھ میں رائج تھی اس کا اثر بلوچستان پر بھی پڑا تھا - سندھ کی ثقافت کا اثر نسبتاً زیادہ واضح ہے - دستیاب شدہ اشیاء اور دیگر شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ ''موہن جو دارو'' کے تاجر جنوبی بلوچستان میں موجود تھے - خیال ہے کہ سندھ کے قدیم تمدن کے خاتمے کے ساتھ ہی بلوچستان کے تمدن کا بھی خاتمہ ہوا ہے -

ایران کے مشہور بادشاہ سائرس اول کے زمانہ میں (۵۵۲—۵۲۸ ق - م) مکران اس کی

۱- فنیقی (Phoenicians) ملک شام کے مغربی ساحل کے قدیم باشندوں کو کہا جاتا ہے - یہ لوگ سیاح ، تاجر اور فاتح بھی تھے اور ان لوگوں نے کارتھیج (ٹیونیسیا) میں ایک عظیم سلطنت قائم کر لی تھی - (ادارہ)

وسیع ترین مملکت کا ایک حصہ تھا ۔ ۳۳۲ ق ۔ م میں سکندر مقدونی دارا کو شکست دے کر سندھ اور ہند کی طرف بڑھا ۔ واپسی پر وہ مکران سے گزرا ۔ سکندر کے مرنے کے بعد یہ علاقہ سیلوکس کے ہاتھ آیا ۔ اس کے بعد سات صدیوں تک اس علاقے کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ عام اندازے کے مطابق دو صدیوں تک مکران ساسانیوں کے قبضے میں رہا ۔ کیونکہ خسرو پرویز (۵۹۱ء - ۶۲۸ء) کے عہد میں مکران میں بغاوت کا ذکر ملتا ہے ۔

جب ساتویں صدی عیسوی میں سندھ میں برہمنوں کی حکومت قائم ہو گئی تو اس زمانہ میں موجودہ سندھ کے علاوہ بہاولپور اور ملتان بھی حاکمِ سندھ کے زیرنگین تھے اور سندھ کی حدود میں شمار ہوتے تھے ۔ ایرانی شہنشاہیت باہمی جنگ و جدال کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی، راجہ چچ بن سلائج اس وقت سندھ کا راجہ تھا ۔ اس نے یہ موقعہ مناسب خیال کیا اور مکران اور کرمان کی سرحد کو مستحکم کرنے کے لیے آگے بڑھا ۔ لس بیلہ وارد ہوا تو وہاں کے سرداروں نے اطاعت کی تجدید کی ۔ صحرا عبور کر کے مکران پہنچا اور مکران سے گزرتا ہوا ایک پرانے قلعہ کن پور کے پاس پہنچا ۔ راجہ چچ نے قلعہ ازسرنو تعمیر کرایا ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھا اور اس دریا کے کنارے پہنچ گیا، جو مکران اور کرمان کے درمیان واقع ہے یہ ہی دریا تھا جو اس کی سلطنت کی مغربی سرحد قرار پایا ۔ دریا کے کنارے اس نے کھجور کے درخت اور ایک کتبہ نصب کرایا ۔ اس ندی کا نام دشت ندی تھا ۱ ۔

بلوچستان کے ساتھ عربوں کے تعلّقات ظہورِ اسلام سے پہلے ہی استوار تھے ۔ کیونکہ ان کے تجارتی قافلے اکثر بلوچستان ہی کے راستے گزرتے تھے ۔ حضرت عمرؓ کے آخری دور (۶۴۲ء — ۶۴۳ء) میں عبداللہ بن عامر نے مکران فتح کیا ۔ مکران سندھ کا حصہ تھا ۔ اس لیے سندھ کا راجہ اسلامی لشکر سے لڑنے کے لیے تیاری میں مصروف تھا ۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی لشکر کو مکران سے آگے بڑھنے کی ممانعت کر دی تھی ۔ حضرت علی کے زمانہ میں حارث بن مرۃ العبدی نے سندھ کی سرحد پر فوج کشی کی ۔ جس میں فتح اسلام ہوئی ۔ لیکن حارث بن مرۃ العبدی شہید ہوئے ۔ اسی مقام یعنی موجودہ نل پرعہد معاویہ میں صلیب بن ابی صفرہ کو جنگ لڑنی پڑی ۔ اس کے بعد عبداللہ بن سوار العبدی کو سرحد سندھ کی ذمہ داری سپرد کی گئی ۔ انہوں نے قیقان پر (موجودہ نل) حملہ کیا ۔ پہلے فتح ہوئی لیکن دوسری جنگ میں وہ شہید ہو گئے اور قیقان آزاد ہو گیا ۔ اس کے بعد رشید نے قیقان پر حملہ کر کے فتح حاصل کی اور علاقہ کچھی تک جا پہنچا ۔ یہاں وہ میدوں سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ رشید کے بعد سنان بن مسلمہ مکران کا والی مقرر ہو کر یہاں آیا ۔

۱۔ داؤد پوتہ، علامہ (مرتب) چچ نامہ (فارسی)، ص ۱۸ ۴۹، مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدر آباد دکن ۱۹۱۹ء ۔

اس نے قصدار کا علاقہ فتح کیا ۔ اس کے بعد ابوالاشعث والی مقرر ہوا ۔ جس نے بوقان اور نیقان پر حملے کیے۔ قصدار (خضدار) والے باغی ہو گئے تھے اس لیے اس کو دوبارہ فتح کیا گیا ۔ اس کے بعد ابن الحری الباہلی والی ہو کر آیا ۔ اس نے بہت سی جنگیں کیں اور فاتح رہا ۔ عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں سعید بن اسلم ززعتہ الکلابی مکران کا والی ہوا۔ حارث علافی کے بیٹوں معاویہ اور محمد نے اپنے قبیلہ کو لے کر سعید پر خروج کیا ۔ اور اس کو قتل کر کے سرحد پر قابض ہو گیا ۔ حجاج نے مجاعہ بن سعرالتمیمی کو بھیجا جس نے قندابیل (گنداوہ) کے اطراف و جوانب فتح کیے ۔ ایک روایت ہے کہ اس کو بھی علافیوں نے ہی قتل کیا ۔ اس کے بعد محمد بن ہارون کو والی مقرر کیا گیا ۔ جو مکران کا ہی باشندہ تھا ۔ ایک روایت ہے کہ رندوں اور لاشاریوں کا جد اعلیٰ میر جلال خان ، محمد بن ہارون کی اولاد میں سے ہے ۔ ان دنوں سندھ پر راجہ داہر کی حکومت تھی ۔ اس کی حکومت میں دیبل کے قریب سندھ کے بحری قزاقوں نے مسلمانوں کے جہاز کو لوٹا ، جو سراندیپ سے آ رہا تھا ۔ علاوہ ازیں راجہ داہر نے عرب علافی فسادیوں کو اپنے ملک میں پناہ دی ۔ اسلامی حکومت کے توجہ دلانے پر بھی راجہ نے کوئی پروا نہ کی تو حجاج نے اپنے چچا زاد بھائی محمد بن قاسم کو سندھ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا ۔ مکران کے گورنر محمد بن ہارون نے اس کی مدد کی ۔ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ کو ملتان تک فتح کیا اور عرب گورنر خضدار میں رہنے لگا ۔ عربوں کے زمانے کے کچھ کتبے بھی چٹانوں پر کندہ ملے ہیں ۔

عربوں کا عہد

بلوچستان کا سارا علاقہ بنی امیہ کی خلافت کا حصہ بن گیا اور ان کے بعد بنی عباس کے زیرنگین آ گیا ۔ نویں صدی کے آخر میں یعقوب بن لیث نے ایران کے مشرق اضلاع سے خروج کیا اور رفتہ رفتہ وہ نصف ایران اور بلوچستان بلکہ سندھ پر بھی قابض ہو گیا ۔ بلوچستان ان دنوں دو حصوں میں بٹا ہوا تھا ۔ جنوب کے حصے کو مکران کہتے تھے اور شمالی حصہ کو سجستان ۔ زمانۂ قدیم میں بھی اس سارے علاقے کے کئی حصے تھے۔ مگر اس کی اور اس کے خاندان کی حکومت دیر پا نہ تھی ۔ ۹۰۸ء کے قریب یہ سب علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا ۔ انہی دنوں قرامطہ نے یہاں پاؤں جمانے شروع کر دیے ۔ ملتان ، بھکر اور سندھ میں بھی انہوں نے اپنے اڈے بنا لیے ۔ ایک سو سال تک یہ علاقہ چھوٹی بڑی راجدھانیوں میں بٹا رہا ، تا آنکہ سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۰ء کے قریب سندھ کو فتح کر لیا ۔

سلطان محمود سے پہلے سلطان سبکتگین نے جھالاواں کو فتح کر لیا ہوا تھا اور محمود کے بعد اس کے بیٹے سلطان مسعود بن محمود نے مکران تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سلطان غیاث الدین غوری کے زمانہ میں ملک تاج الدین مکران پر حکمران تھا۔ ان ہی دنوں میں خوارزم کے حکمران نے کرمان پر حملہ کیا اور اسے فتح کرنے کے بعد مکران کو بھی فتح کیا۔ ۱۲۲۳ء میں چنگیز خاں کے لڑکے چغتائی نے بلوچستان پر قبضہ کیا اور مکران پر منگولوں کا ایک نمائندہ ''بوراک'' کچھ دنوں کے لیے مسلط رہا۔ ۱۲۳۶ء میں التتمش نے بلوچستان کو فتح کیا۔ امیر تیمور کے زمانہ میں کرمان میں امیر اودھ گوئی برسراقتدار آیا جس کی پشت پناہی امیر تیمور کر رہا تھا۔ اس نے حدودِ ملک کی توسیع کی اور کیچ پر قبضہ کیا۔

قلات پر جو ہندو سیوا خاندان کی حکومت تھی، وہ چنگیزیوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی۔ بروہیوں نے انہی چنگیزیوں کا ساتھ دیا اور موقع پا کر بروہیوں کے سردار میرو نے قلات پر قبضہ کر لیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں میر جلال خان کی اولاد میر مسُہک کی سرکردگی میں مکران سے نکل کر کچھی میں آباد ہوگئی۔ اس کے بعد بلوچوں کے دو سردار بڑے طاقتور ہوئے۔ میر چاکر خان جس کا پایہ تخت ''سبی'' تھا اور میر گوہرام خان جس کا صدر مقام ''گنج آباد'' تھا۔ ان دونوں سرداروں نے مل کر بروہیوں سے قلات بھی چھین لیا۔ میر عمر لڑائی میں مارا گیا اور میر مند و رند کو قلات کا حاکم مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد میر عمر کے لڑکے بجار نے خواجہ خیل قبیلہ اور بروہیوں کی مدد سے قلات پر قبضہ کر کے میر مندو کو قتل کر دیا۔ اس نے کئی لڑائیوں میں جدغالوں (جت گالوں) سندھیوں کو شکست دے کر جھالاواں تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ انہی دنوں میر چاکر خان رند اور میر گوہرام خان لاشاری کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوئی۔ جس کی لپیٹ میں تمام بلوچ قبائل آ گئے۔ بلکہ غیر بلوچوں نے بھی طرفین کی مدد کی۔ یہ جنگ ۱۴۰۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۵۲۰ء میں ختم ہوئی۔ اس جنگ کی وجہ سے بلوچ قبائل پنجاب، سندھ اور گجرات تک میں پھیل گئے۔ ان ہی دنوں ازبکوں کے سردار محمد خان شیبانی نے تیموری شہزادوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس میں سے صرف ہرات پر سلطان حسین بائیقرا حاکم تھا۔ بابر بھی وسط ایشیا سے شکست کھا کر کابل پر قابض ہوگیا تھا۔ امیر ذوالنون شاہ بیگ ارغون قندھار کا حاکم تھا، جس سے بابر نے قندھار کا مطالبہ کیا۔ اس لیے شاہ بیگ ارغون سندھ اور بلوچستان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے آسانی سے رندوں کو شکست دے کر سبی اور کچھی پر قبضہ کیا۔ ۱۵۵۶ء میں ایران کے صفوی بادشاہ بلوچستان پر قابض ہو گئے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کی بدولت یورپی ممالک دنیا میں پھیل

رہے تھے۔ ان اقوام میں پرتگالی بھی شامل تھے - جنھوں نے ہندوستان کے ساحل پر جگہ جگہ نو آبادیات قائم کیں۔ گوادر میں کوہ باطل پر پانی کے لیے انھوں نے بند بھی تعمیر کیا تھا ، لیکن بلتی بلوچوں کی وجہ سے انہیں استحکام حاصل نہ ہوسکا۔ ۱۵۸۱ء میں جاتے ہوئے پرتگالیوں نے گوادر کو نذرِ آتش کر دیا ۔

۱۵۹۵ء میں اکبر نے کچھی اور بالائی بلوچستان پر قبضہ کر کے کچھی کو بکھر سرکار اور بالائی بلوچستان کو قندھار سرکار کے ساتھ شامل کر دیا ۔ اس دور میں ابو سعید بلیدی نے سقط سے نکل کر مکران پر حملہ کیا اور اٹھارویں صدی میں گچکیوں نے بلسیریوں کو شکست دے کر مکران پر قبضہ کیا ۔ نادر شاہ کے قتل ہونے کے بعد خان قلات نصیر خان اول ۱۷۵۰ء–۱۷۹۵ء میں سارے بلوچستان پر قابض ہو گیا ۔

خوانینِ قلات کا عہد (۱۶۶۰ء-۱۸۹۰ء)

بروہیوں کی حکومت سے پہلے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ، قلات پر سیوا خاندان کی حکومت تھی ۔ بروہی ان کی فوج میں ملازم تھے ۔ جب سیوا حکومت چنگیزیوں کے حملوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی ، تو بروہیوں کے سردار میرو نے قلات پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد اس کے فرزند میر عمر تخت نشین ہوئے ۔ اس کے زمانہ میں سولھویں صدی کے شروع میں لاشاریوں اور رندوں نے مل کر قلات پر حملہ کیا اور میر عمر لڑائی میں مارا گیا ۔ اس وقت اس کا بیٹا میر بجار چھوٹا تھا ، چنانچہ میرعمر کے قتل کے بعد اس کی بیوی بچے کو لے کر ایک بلوچ سردار کے ہاں پناہ گزیں ہو گئی ۔ میر بجار جب بڑا ہوا تو اس نے قلات پر حملہ کیا اور لاشاریوں کے نائب میر مندو کو قتل کر کے قلات پر قبضہ کر لیا مگر کچھ ہی عرصہ بعد ہر علاقے کے سردار کو اس کے قبیلے کا مالک و مختار بنا کر خود تخت سے دست بردار ہو گیا ۔ موقعہ غنیمت جان کر مغلوں نے قلات پر قبضہ کیا مگر کچھ عرصہ بعد بروہیوں نے بغاوت کی اور مغلوں پر حملہ کر کے ان کو بھگا دیا ۔ میر حسن کو خان قلات مقرر کیا گیا ۔ یہ شاہجہان کا زمانہ تھا ۔ رندوں اور لاشاریوں کی طاقت ختم ہو چکی تھی اور سندھ میں کلہوڑے طاقت پکڑ رہے تھے ۔ میر حسن ۱۶۶۶ء میں لا ولد مر گیا ۔ اس کے بعد میر احمد خان اول خان قلات ہوا ۔ اس نے بستی کے باروزئیوں (پٹھان قوم) سے اٹھارہ لڑائیاں لڑ کر ان کو کمزور کر دیا ۔ ۱۶۹۵ء میں اس کی وفات ہوئی ۔ اس کے بعد میر محراب خان اول قلات کے تخت پر بیٹھا ۔ سندھ کے سردار نور محمد کلہوڑا سے اس کا مقابلہ ہوا ۔ جس میں اس کو گولی لگی اور تین دن کے بعد وہ مر گیا اور اس کا بھتیجا میرسمندر خان ، خانِ قلات ہوا ۔ اس کے زمانہ میں (۱۶۹۸ء)

ایرانیوں نے بلوچستان پر حملہ کیا۔ جس میں اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۷۱۴ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد میر احمد خان دوئم ۱۷۱۵ء میں، عبداللہ خان ۱۷۳۰ء میں محبت خان ۱۷۵۰ء میں، نصیر خان ۱۷۹۳ء میں، محمد خان اول ۱۸۱۶ءمیں اور محراب خان ثانی۱۸۳۹ءمیں، شاہ نواز خان ۱۸۴۰ءمیں، میر نصیر خان ثانی ۱۸۸۳ءمیں اور خداداد خان شیر دل خان ۱۸۹۳ء میں خوانینِ قلات ہوئے۔

انگریزی عہد کا تاریخی پس منظر (۱۸۴۱ء — ۱۹۴۷ء)

۱۸۳۹ء میں انگریزی فوج کچھی، گنداواہ اور بولان کے راستہ کوئٹہ پہنچی۔ خان نے انگریزی وفد سے معاہدہ کیا، جس کی رو سے خان نے شکار پور سے کوئٹہ تک کے راستہ کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ اس کے باوجود نومبر ۱۸۳۹ءمیں انگریزوں نے قلات پر حملہ کیا، خان شہید ہوئے۔ انگریزوں نے قلات کے قلعہ پر قبضہ کیا اور لوٹ مار کی۔ آخر انہوں نے محبت خان کے خاندان سے شاہ نواز خان کو تخت پر بٹھایا۔ ۱۸۴۰ء میں بلوچوں نے قلات پر قبضہ کیا۔ میر شاہ نواز خان بھاگ گیا اور قلات پر انگریزوں کا نمائندہ لیفٹیننٹ لوڈی قید ہوا۔ میر نصیر خان دوئم کو تخت پر بٹھایا گیا۔ دسمبر میں انگریزی فوج نے ڈھاڈھر میں خان کے کیمپ پر حملہ کیا۔ خان کو شکست ہوئی اور انگریزی فوج نے کوئٹہ سے نکل کر بغیر کسی لڑائی کے قلات پر قبضہ کر لیا۔ کرنل سیٹپی قلات کا پولٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا، اور ۱۸۴۱ءمیں خان سے معاہدہ ہوا۔ ۱۸۴۳ءمیں انگریزوں نے سندھ کو فتح کر لیا۔

انگریزوں کی حکومت کے زمانہ میں بلوچستان تین حصوں میں تقسیم ہو گیا:

برٹش بلوچستان، جس کا رقبہ ۹۴۷۶ مربع میل تھا۔ ۱۸۷۹ء کے معاہدہ کے مطابق خان قلات نے یہ حصہ برٹش حکومت کے حوالے کیا۔ دوسرا حصہ ایجنسی کے سپرد تھا اور اس کا انتظام انگریز عملداروں کے ہاتھ میں تھا۔ اس حصہ کا رقبہ ۴۴۳۴۵ مربع میل تھا۔ تیسرا حصہ ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ایک ریاست قلات جو خانِ قلات کو ملی۔ دوسری ریاست لس بیلہ جو جاموں کو ملی۔ یہ سندھ کے حکمران خاندان سمہ کی نسل سے ہیں۔ خاران ایک الگ ریاست تھی۔ جس کا سربراہ میر حبیبُ اللہ تھا اور مکران کی ریاست لس بیلہ سے الگ تھی۔

بلوچی حسب نسب

بلوچستان میں افغان، بلوچ اور بروہی تین بڑی اقوام رہتی ہیں۔ بلوچ نسل کے متعلق کچھ اہلِ قلم کی رائے یہ ہے کہ بلوچ قوم دو حصوں میں منقسم ہے، بلوچ اور بروہی۔ اس لیے ان دونوں کو ایک ہی نام ''بلوچ'' سے پکارنا چاہیے۔ ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ

بلوچ قوم حسباً نسباً سامی الاصل ہیں ۔ یہ نظریہ میر رحیم داد خان مولائی شیدائی ۱ ، میر گل خان نصیر۲ ، صالح محمد پری ۳ اور پروفیسر انور رومان ۴ کا ہے ۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بلوچ اور بروہی نسباً الگ ہیں اور بروہی دراوڑ نسل سے ہیں ۔ یورپین محققین کی اکثریت اور کچھ ملکی مؤرخین نے بروہیوں کو دراوڑ نسل کی باقیات میں شمار کیا ہے جو کسی نہ کسی طرح تقریباً دو ہزار سال ق۔م میں آریوں کی دستبرد سے بچ کر بلوچستان کے پہاڑوں میں سے آ بسے تھے ۔ لیکن جن تاریخ نویسوں نے اس نظریہ کو رد کیا ہے اور بروہوں کو بلوچ کہا ہے ان کا کہنا ہے کہ بروہی بلوچوں کا طائفہ اول ہے ۔ جو بلوچوں کی عام ہجرت سے کم و بیش سات آٹھ صدیاں پیشتر ایرانی حکومت کے ناخت و تاراج کی وجہ سے نقل مکانی کر کے یہاں وارد ہوئے ۔ یہ کوہ البرز کے رہنے والے تھے اس لیے مقامی لوگ انہیں بوز کوہی پکارنے لگے ۔ جو بعد میں بگڑ کر ''بروہی'' بن گیا ۔

خاص بلوچوں کے حسب نسب پر بھی بہت بڑا اختلاف ہے ۔ پوٹنگر کا خیال ہے کہ یہ نسلاً ترکمان ہیں ۵ ۔ خانیکوف اور سن لیسر لگس کا بھی یہی خیال ہے ۔ برٹن۶ ۔ سید جمال الدین افغانی۷ یسین ، اسپگل اور ڈیمز کا خیال ہے کہ یہ ایرانی نسل سے ہیں ۸ ۔ ٹی سولڈچ کا خیال ہے کہ نسلاً عرب ہیں ۹ ۔ ڈاکٹر پیلو نے لکھا ہے کہ نسلاً راجپوت قبیلہ بالئچا سے ہیں ۱۰۔ ڈاکٹر کروک اور چند دیگر صاحبان اس معمہ کا حل سنسکرت لفظ ''ملیچا'' میں تلاش کرتے ہیں ، جس کے معنی بہادر کے ہیں ۔ سلطان الملک عماد الدین اسماعیل بن افضل کرمان کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قف پہاڑوں کے قریب

۱۔ مختصر تاریخ بلوچستان (سندھی) ص ۱۱-۱۴ ، ۱۹۶۱ء

۲۔ تاریخ بلوچستان (اردو) ج اول ، ص ۱ سے ۱۵ ، ۱۹۵۲ء

۳۔ ہسٹری صالح محمد ، بلوحستان ، ۱۹۵۵ء

۴۔ نوکین دور مکران نمبر ، ص ۴۰

(5) Pottinger's Travels in Baluchistan, pp. 268-269.

(6) Burton's Sind Revisited, 1877, Vol : II, p. 159.

۷۔ میجر جارج واٹر گابرٹسن کے دیباچے کا اردو ترجمہ ، بلوچی دنیا ، جولائی ۱۹۶۳ء ص ۱۷

۸۔ بحوالہ بلوچ قبائل ایل ڈیمز ، اردو ترجمہ ، ص ۲۰

(9) Mohd Sardar Khan :
"History of Baluch Race & Balochistan, P. 2; Journal of the Anthropological Institute, Vol : XXIX, P. 18.

(10) Ethnography of Afghanistan by H. W. Bellow c. s. i. 1891, pp. 171, 172 and 175-18,

بلوچوں کے پہاڑ ہیں ، جن کی زبانی ہندوستانی زبانوں کے خاندان میں سے ہے اور وہ نسلاً جتوں سے ملتے ہیں ۱ - پروفیسر کین کا کہنا ہے کہ ان کی نسل تاجک قوم سے ملتی ہے ۲ ما کلر نے ثابت کیا ہے کہ بلوچ مکران کے قدیم باشندوں کے باقیات ہیں ۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''رند'' بلوچ نہیں ہیں ۔ بلکہ نسلاً عرب ہیں اور الحارث علافی کی اولاد میں سے ہیں ۳ - سردار محمد خان نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ بلوچ کلدانی اور بابلی ہیں اور مشہور حکمراں نمرود کی نسل سے ہیں ۴ - یوں تو بلوچوں کا ذکر فردوسی کے 'شاہنامہ' میں بھی ملتا ہے اور یہ تاریخی بات ہے کہ نوشیرواں نے یہ علاقہ اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا تھا ۔

نسل کے متعلق کتنا بھی اختلاف ہو ، لیکن یہ بات آثار قدیمہ سے ثابت ہوتی ہے کہ بلوچ اپنی انفرادی خصوصیتوں کے ساتھ اسی سرزمین میں قدیم زمانہ سے رہتے چلے آ رہے ہیں ۔ خود ایک بلوچ اہل قلم میر خدا بخش مری نے لکھا ہے کہ ''اگر ہم بلوچوں کے متعلق فردوسی کے قول کو تاریخی اہمیت دیں جو ہر لحاظ سے اہمیت کے قابل ہے ، تو یہ ماننا پڑے گا کہ کچھ قبیلے شمالی ایران میں بحیرہ خضر کے ساحلوں مرو اور ہرات میں ۵۰۰ ق-م میں آباد ہو چکے تھے ۵ - ظہور اسلام کے بعد جب مسلمان ایران سے آگے بڑھے تو انہوں نے مکران فتح کیا ۔ یعنی اس زمانہ میں بھی بلوچ مکران میں رہتے تھے ۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ کسی زمانہ میں بھی لوگ یہاں اور کسی جگہ سے نقل مکانی کر کے اس سرزمین میں آباد ہوئے ۔ اس علاقہ میں اس زمانہ میں بھی لوگ رہتے تھے جب ''موہنجوداڑو'' کا قدیم شہر آباد تھا ۔ اس کے بعد کے جو آثار اور تاریخی حقائق ملتے ہیں ، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے یہ علاقہ مسلسل آباد چلا آ رہا ہے ۔ یہ وہ ہی لوگ ہیں ، جو اب بھی آباد ہیں ، جن کو بلوچ کہا جاتا ہے ۔ ان میں کچھ دوسری نسل کے لوگ بھی

۱- سلطان الملک از عماد الدین ، تقویم البلدان بحوالہ تاریخ بلوچ قوم اور بلوچستان از سردار خان ، ص ۲

۲- بحوالہ تاریخ بلوچستان از سردار خان ، ص ۲

۳- بحوالہ تاریخ بلوچ قوم ، ص ۲ ، ۳

۴- سردار محمد خان ، تاریخ بلوچ قوم اور بلوچستان ، ص ۱۶

۵- از بلوچ ص ۵۰ - ایک روز بلوچ واحد بخش خان بلوچ نے لکھا ہے کہ بلوچوں نے آریاؤں کے دانت کھٹے کر دئیے تھے ۔ اور آریاؤں نے اس قوم کو اپنے سے زیادہ طاقتور پا کر ان کو ''بل ساوچ'' کا خطاب دیا ۔ جس کے معنی ہیں اونچے بل والا یعنی زیادہ طاقتور (ماہنامہ بلوچی دنیا ۔ فروری ۶۳ء ، ص ۱۷) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچ اس سرزمین میں آریاؤں سے پہلے موجود تھے ۔

شامل ہوگئے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے باقیات میں سے ہیں، جو یونان، ایران اور عرب حملوں کے بعد یہاں بس گئے تھے یا کسی بغاوت کے سلسلہ میں بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے لیکن اب سب بلوچ ہیں۔ بلوچستان میں قدیم زمانہ سے بہت سے ''جت'' قوم کے خاندان بھی رہتے تھے۔ آج وہ بھی خود کو بلوچ کہلواتے ہیں۔

بلوچستان کے قبائل کے تمدنی اور معاشرتی حالات

بلوچ قبائل کی معاشی و معاشرتی زندگی کا تجزیہ فردوسی نے 'شاہنامہ' میں کیا ہے اور عرب مؤرخوں اور سیاحوں کے ایسے بیانات بھی ملتے ہیں، جن سے بلوچ ثقافت کی انفرادیت واضح ہوتی ہے۔ اصطخری نے 'مسالک الممالک' میں صفحہ ۱۲ پر اس سلسلے میں کچھ وضاحت پیش کی ہے۔ بشاری مقدسی نے 'احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم' میں ان کے لباس اور طرزِ بود و باش پر چند سطور درج کی ہیں۔ شریف الادریسی (۱۰۹۹ء—۱۱۶۴ء) نے 'نزہت المشتاق فی افتراق لآفاق' میں ان کی عادات و خصائل پنج گور، کیچ کیزکان (قلات) وغیرہ کے جغرافیائی حالات اور لباس و رہن سہن کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بیشتر بلوچ آبادی خانہ بدوش ہے۔ موسم گرما میں یہ پہاڑی علاقوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ جہاں میدانی علاقوں کی نسبت موسم سرد ہوتا ہے۔ اور گھاس بھی با افراط ہوتی ہے۔ جاڑوں کے موسم میں پہاڑی علاقوں سے ہجرت کر کے کچھی اور سندھ تک کے بعض علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ پہاڑوں، صحراؤں اور دشت و دمن میں بسر اوقات کرتے رہتے ہیں، اس لیے ان کے مزاج میں صحرا نوردی کے نمایاں اثرات موجود ہیں اور ان کے معاشی و معاشرتی حالات بھی انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں۔

سرداری نظام

بلوچ قبائل مختلف قبائلی تنظیموں، فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک گروہ یا فرقے کا اپنا علیحدہ سردار ہوتا ہے جن کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا یا بھائی سردار بن جاتا ہے۔ جو گروہ دس ہزار پر مشتمل ہوتا ہے اس کے سردار کو تمندار کہتے ہیں۔ تمندار کا مرتبہ سردار سے زیادہ ہوتا ہے۔ کسی دوسرے تمن کا آدمی بھی اس تمن میں رہ سکتا ہے اور اس کی حفاظت تمن کا سردار اور پوری قوم کے ذمہ ہوتی ہے۔ تمن کا ہر فیصلہ تمندار ہی کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بڑا فیصلہ

ہو تو جرگے کے ذریعہ کیا جاتا ہے[۱] ۔ ہر قبیلہ مستقل طور پر الگ ہونے کے باوجود اپنی روایت میں ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے ۔ قبائل کی رسومات میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے لیکن ثقافت کی بنیادی اقدار ایک ہیں ۔ یہ قبائل اگرچہ باہم متصادم ہوتے رہتے ہیں ، لیکن دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ متحد ہو جاتے ہیں ۔

حال

بلوچ قبائل کی سماجی زندگی میں ایک اہم ترین رسم یہ ہے کہ دورانِ سفر دو اشخاص آپس میں ملیں یا کوئی مہمان آئے تو ایک دوسرے کے حالات دریافت کرنا ان دونوں کے فرائض میں داخل ہے ۔ بلوچی ثقافت کے اثر سے یہ رسم سندھ میں بھی رائج ہے ۔ اس رسم کا اس قدر احترام کیا جاتا ہے کہ حال نہ معلوم کرنا یا اپنا حال نہ بتانا سماجی بد اخلاقی سمجھی جاتی ہے ۔ سب سے پہلے حاضرینِ مجلس نو وارد کی مزاج پرسی کریں گے ۔ جس کو بلوچی میں ''دو بروراہی'' کہا جاتا ہے ۔ میر مجلس ہر ایک سے کہتا ہے ''حال پوچھو'' ان میں سے ہر ایک یہی کہے گا : ''آپ پوچھیے'' اس کے بعد میر مجلس حال پوچھتا ہے ۔ جواب میں مہمان اپنے علاقے کے حالات سے لے کر منزل تک پہنچنے کے تمام واقعات بیان کرتا ہے ۔ اپنا حال سنا کر وہ بھی جواباً حال معلوم کرتا ہے ۔ اس رسم سے یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ ایک علاقہ کی خبریں دوسرے کو ملتی ہیں ۔ اس کے ساتھ ذاتی و انفرادی حالات سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے ۔ سید جمال الدین افغانی نے لکھا ہے کہ بار بار مہمان سے حال پوچھنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ مہمان کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ۔ اگر سواری کی ضرورت ہو تو میزبان اس کو اونٹ یا گھوڑا دیتے ہیں ۔ اگر زادِ راہ کی ضرورت ہو تو چندہ جمع کر کے مالی امداد کرتے ہیں ۔ اگر مہمان مجرم ہو تو اس کی حفاظت کرنا بھی وہ اپنا فرض[۲] سمجھتے ہیں ۔

مہمان نوازی

مہمان نوازی کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ ایک طرح سے اسے مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے ۔

---

۱ - جرگے کے معنی ہیں : جماعت - یہ ترکی لفظ ہے اور ماوراء النہر کے خانہ بدوش ترکوں میں رائج تھا - مغربی پاکستان کے بلوچ قبائل اور افغان قبائل میں بھی یہ ہی نظام رائج ہے - جرگوں میں فیصلہ کرنے کے لیے ہر قبیلہ کا سردار حصہ لیتا ہے ، کیونکہ سردار قبائلی ملکیت اور حقوق کا محافظ ہوتا ہے -

۲ - سید جمال الدین افغانی ، تاریخ افغانستان (اردو ترجمہ) ص ۱۳۳ ، ۱۹۲۳ء -

بلوچ خود بھوکا سو کر اپنے مہمان کی خاطر کرتا ہے۔ مہمان دشمن بھی ہو تو خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا۔ اگر کسی مقام پر ایک سے زائد گھر آباد ہوں تو مہمان کے قیام و طعام کا بندوبست ایک جگہ ہوگا، لیکن خرچ مشترک ہوگا۔ اگر کوئی کسی بلوچ کے ہاں پناہ لے تو سر کی بازی لگا کر بھی اسے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ پناہ لینے والے کو ''باہوٹ'' کہا جاتا ہے۔

وعدہ کی پابندی

وعدہ کی پابندی بلوچیوں کا شعار رہا ہے۔ وعدہ کی تکمیل کے لیے یہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بلوچی روایات سے ایسی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔

کچہری

ہر کوچہ اور گاؤں میں ایک خاص گدان (جھونپڑا) ہوتا ہے جو مہمان نوازی اور مجلس کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ شام کو جب لوگ کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں تو آپس میں مل کر گدان میں مجلس منعقد کرتے ہیں۔ اس مجلس کو کچہری کہتے ہیں۔ بعض کچہریوں میں لوڑی اور ڈوم اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مجلسوں میں منشیّات کا استعمال بھی ہوتا ہے۔

ہمسایہ کے حقوق

قدیم تاریخ بتاتی ہے کہ ہمسایہ کے جان و مال کے تحفظ کے مسئلے نے بلوچ قوم کی تاریخ کا رخ ہی موڑ دیا۔ ان واقعات میں سمی اور گوہر کے واقعات قابل ذکر ہیں جس کی وجہ کر کچکیوں اور بلسیریوں[۱] میں جنگ چھڑ گئی۔ رندوں اور لاشاریوں میں بھی ہمسایہ کے تحفظ کی وجہ سے جنگ چھڑی تھی۔ جو تیس سال تک جاری رہی۔

بجار پھوڑی

اگر کوئی غریب آدمی شادی کرنا چاہے لیکن اس کے پاس پیسے نہ ہوں یا مقدمہ کے لیے رقم نہ ہو تو وہ خود یا اس کے عزیز و اقارب قبیلہ کے لوگوں سے امداد طلب کرتے ہیں۔ جسے ''پھوڑی یا بجار'' کہتے ہیں۔ بجار اور پھوڑی میں فرق یہ ہے کہ پھوڑی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے ہاں جانا پڑتا ہے لیکن بجار قبیلہ کے لوگ

۱۔ دیکھیے فصل سوئم میں مکمل واقعات کے لیے۔

خود بخود اپنے عزیز و اقارب کو دیتے ہیں۔ امداد باہمی کا یہ ایک کامیاب طریقہ ہے۔ کہیں کہیں یہ بھی رواج ہے کہ شادی کے موقع پر دولہا کا کوئی رشتہ دار میٹھی چیز لے کر اقربا اور احباب کے گھر جاتا ہے اور تنبول وصول کر لاتا ہے۔

انتقامی جذبہ

مسلسل جنگ و جدل کے باعث انتقام لینا ان کے مزاج کا جزو بن گیا ہے۔ وہ خون کا بدلہ کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کے ہاں انتقام نہ لینا طعنہ و تشنیع کا موجب بن جاتا ہے۔ خون کا بدلہ لینے کے لیے کوئی مدت یا میعاد مقرر نہیں۔ اتنا انتقامی جذبہ رکھنے کے باوجود بھی مندرجہ ذیل صورتوں میں انتقامی آگ کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔

۱۔ وہ قصوروار کو معاف بھی کر دیتے ہیں اگر قصوروار خاندان کی کوئی عورت معافی کی خواستگار بن کر آ جائے۔

۲۔ جنگ کے دوران میں اگر کوئی عورت یا سید مرد اپنے سر پر قرآن شریف اٹھا کر آ جائے۔

دورانِ جنگ وہ عورت، ہندو، لوڑی اور نابالغ لڑکے کو قتل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ جس شخص نے دورانِ جنگ مسجد میں پناہ لی ہو یا امارہ طلب کی ہو اسے مارنے یا گزند پہنچانے سے گریز کرتے ہیں۔ انتقامی جذبہ کو ختم کرنے کے لیے قاتل کے خاندان کی ایک دو لڑکیاں مقتول کے خاندان کے لڑکوں سے خون بہا کے عوض بیاہ دی جاتی ہیں۔

سیاہ کاری

اس کے معنی ہیں ''زنا کاری'' بلوچوں میں بدکار مرد اور عورت کی سزا لازمی طور پر قتل ہے۔ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ برموقع پکڑ لیتا ہے تو فوراً قتل کر دے گا۔ یہ خون معاف ہے۔ بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ کچھ بلوچ قبائل کی روایت کے مطابق مجرم مرد اگر بھاگ جائے تو عورت کو سردار کے حوالے کر دیتے ہیں اور مجرم کو تین سے چار ہزار روپیہ تک جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ یہ رقم بھی سردار کو پیش کی جاتی ہے۔ وہ کچھ حصہ اس مرد کو بھی دے دیتا ہے جس کی عورت نے سیاہ کاری تھی تاکہ وہ شادی کر سکے کہیں یہ رواج ہے کہ عورت کو باپ یا بھائی کے سپرد کیا جاتا ہے جو اس کو اپنے ہاتھ سے سزا دیتا ہے۔

لباس

بلوچ مرد اور عورت اپنی ستر پوشی کا بڑا خیال کرتے ہیں ـــــ مردوں کا لباس لمبا کرتا ہے جو چوڑے لبادے کی شکل کا ہوتا ہے جس کو ''پشک'' کہتے ہیں۔ شلوار بڑی گھیر دار ہوتی ہے۔ سر پر دس پندرہ گز لمبی پگڑی باندھتے ہیں عام طور سے سفید لباس پہنے ہیں۔ رنگین لباس کو برا سمجھتے ہیں۔ لیکن اب یہ بات کم ہوتی جا رہی ہے اور شلوار و قمیض دونوں ایک ہی رنگ کی پہننے کا رواج ہوتا جا رہا ہے ہتھیاروں کے بغیر ان کا لباس نامکمل ہے۔ پگڑی کے علاوہ نوجوان اور بچے ایک مخصوص قسم کی ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ کچھ بلوچ مخصوص قسم کی صدری بھی پہنتے ہیں اس صدری کی تراش خراش دوسروں سے جداگانہ ہوتی ہے اور اس پر تلے یا کڑھائی کا کام بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عموماً سردیوں میں گرم چادر اوڑھنا بھی ان کے لباس میں شامل ہے اس کو بلوچی میں ''پشتی'' کہتے ہیں۔ وہ سر کے بال نسبتاً بڑے رکھتے ہیں۔ اور ان کو پگڑی کے اندر بند کرتے ہیں۔ ان کی ڈاڑھی بھی بڑی ہوتی ہے۔ کچھ ڈاڑھی کے بالوں کو گھنڈیدار بنا دیتے ہیں۔

عورتوں کا لباس اور کام

بلوچ عورتوں کا ایک مخصوص کرتا ہوتا ہے جس کو ''گھگھا'' گھگھو کہا جاتا ہے یہ زیادہ تر سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ ''گھگھو'' میں ایک لمبی جیب ہوتی ہے جو سامنے کی طرف سے پیٹ سے لے کر دامن تک ہوتی ہے۔ اس کو بلوچی میں ''پست'' کہتے ہیں۔ گھگھو کی اس لمبی جیب، اس کی آستین اور اس کے سینے پر ریشمی یا سوتی کڑھائی کا کام ہوتا ہے۔ بلوچ خواتین سیاہ کپڑے کو ماتم کی نشانی تصور کرتی ہیں، لیکن خاران اور مکران کی بعض عورتیں کالے گھگھے پہنتی ہیں امیر طبقہ کی عورتیں اطلس اور کمخواب کے گھگھے زیب بدن کرتی ہیں۔ جس پر اعلیٰ زردوزی اور کلابتوں کا کام ہوتا ہے۔ عورتیں بھی مردوں کی طرح بڑے بڑے گھیر کی شلواریں پہنتی ہیں۔ دوپٹہ اوڑھتی ہیں، جو موٹے کپڑے اور گہرے رنگ کا ہوتا ہے۔ بال لمبے رکھتی ہیں اور چوٹی باندھتی ہیں اونٹ کی کھال یا گھاس یا کھجور کے پتوں کے پیش (جوتے) پہنتی ہیں۔ صرف اُمراء کا طبقہ پردہ کرتا ہے۔ ان میں حد درجہ خود اعتمادی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی موجودگی یا غیر حاضری میں مہمان کی خاطر و مدارات کرتی ہیں۔ بڑی محنتی ہوتی ہیں۔ گھریلو کام کاج کے علاوہ جانوروں کو چراگاہوں میں لے جانا، پانی

بھر کر لانا، فرصت کے اوقات میں کڑھائی اور بنائی کرنا، بھیڑ بکریوں کی اُون سے نموئے، رسیاں، اناج کے بورے اور اونٹوں کی پالان اور گھوڑوں کی زین بناتی ہیں۔ بین الاقوامی نمائش جو امریکہ میں منعقد ہوئی تھی، اس میں بلوچی کشیدہ کاری کو اولین درجہ دیا گیا۔

شادی بیاہ کی رسومات

شادی کے سلسلہ میں ان میں بدل کا رواج ہے یعنی لڑکی کے عوض میں اپنی یا کسی قریبی عزیز کی لڑکی دوسرے فریق کے لڑکے کو دی جاتی ہے۔ اگر کسی کے ہاں لڑکی نہ ہو تو جب بھی لڑکی پیدا ہوگی دینی ہوگی۔ جب رشتہ طے ہو جاتا ہے تو کسی بھی صورت میں لڑائی نہیں کرتے۔ اگر فریقین میں لڑائی ہو بھی جائے تو رشتہ نہیں توڑا جاتا۔ کہیں یہ رواج ہے کہ لڑکی کا والد لازمی طور پر کچھ رقم لیتا ہے اس کو ''لب'' یا ''لابھ'' کہا جاتا ہے۔ بعض جگہ لڑکی کی ماں بھی کچھ لیتی ہے اس کو شاناگ'' کہا جاتا ہے۔ شادی کے بعد دولہا سات دن تک دلہن والوں کے ہاں رہتا ہے۔ تاریخ مقرر ہونے کے بعد لوگ رواج کے مطابق نقد، جنس یا مال کی صورت میں بجار پیش کرتے ہیں۔

کھیل اور تاریخ

ان کی تفریحات میں شمشیر زنی، شہ سواری اور شکار کے علاوہ کھیل بھی ہیں۔ کھیلوں کے سلسلہ میں انہوں نے سندھی اثر قبول کیا ہے۔ کشتی لڑنے کا مخصوص رواج سندھ میں ہے جس کا اثر بلوچیوں نے بھی لیا ہے۔ جس کو ''ملھ'' کہا جاتا ہے دوسرا مخصوص نمونہ کشتی کا ''بلھاڑو'' ہے، جس کو بلوچی ''جو'' کہتے ہیں۔ بلوچ موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان کے اپنے مخصوص ساز ہوتے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

(۱) رباب۔ (۲) دنبورا۔ (۳) سندا۔ (۴) تاری۔ (۵) چنگ۔ (۶) نڑ۔ (۷) چار تارہ۔
ان کا رقص بھی خاص نوعیت کا ہوتا ہے اور دیہی علاقوں کی طرح اور دیہی تہذیب کے مطابق لوگ مختلف موسموں اور تقاریب پر اپنی خوشی کا اظہار ناچ اور گانے سے کرتے ہیں۔ چنانچہ موسم کے مطابق اور موقع کی مناسبت سے ناچ کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے اور اس کے ساتھ جو گانا منسلک ہوتا ہے اس میں بھی مناسب طربیہ یا حزنیہ عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر طبلہ یا ڈھول اور نئے قسم کا کوئی اور

آلہ' موسیقی ضرور استعمال ہوتا ہے۔ یک تارہ یا دو تارہ بھی اکثر ساتھ دیتا ہے۔ جہاں معاشرے میں ٹھہراؤ، سنجیدگی اور وقار زیادہ ہو تو سارنگی کی قسم کا آلہ بھی موسیقاروں نے اپنا لیا ہوا ہے۔

توہمات

بلوچ سیدوں اور پیروں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں قدیم زمانہ کے مختلف قسم کے توہمات بھی موجود ہیں۔ استداد زمانہ کے ساتھ یہ توہمات ان کی سماجی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان میں علاج معالجہ کے بھی دلچسپ طریقے مروج ہیں۔ وہ جھاڑ پھونک کے قائل ہیں اور بیماری میں پیروں اور ملاؤں سے دم کراتے ہیں۔ بلوچ ماہرین بھیڑ بکریوں کے شانے کی ہڈیوں کی لکیروں سے پیشینگوئیاں کرتے ہیں۔ حلف اٹھانے کے عجیب و غریب طریقے ہیں۔ مثلاً آگ میں سے گزرنا، آگ یا گرم لوہا ہاتھ میں اٹھانا وغیرہ۔ یہ رسومات قدیم زمانہ میں سندھ میں بھی رائج تھیں۔

فصل دوم

(الف) بلوچی زبان

چونکہ بلوچی زبان ، فارسی زبان سے اثر پذیر ہوتی رہی ہے اس لیے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ بلوچی فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے۔ ایران کی سرحدوں کے قریب رہنے والے بلوچوں کی زبان پر فارسی زبان اور لب و لہجہ کا اثر ضرور ہے۔ لیکن اس کے باوجود قدیم زمانہ سے ہی بلوچی زبان کی اپنی انفرادیت رہی ہے۔ ہیروڈوٹس نے بلوچی زبان کو مکوئی (Mykot) اور مکرانی کو میکنس (Mykans) کہا ہے ۱۔ یہاں بلوچی سے مراد مشرقی بلوچی اور مکرانی سے مراد مغربی بلوچی ہے۔ اس زمانہ میں بھی بلوچی کا الگ وجود تھا۔ عرب سیاحوں کے بیانات موجود ہیں ، جو مکرانی (بلوچی) کو فارسی سے الگ زبان سمجھتے تھے۔ اصطخری لکھتا ہے ''مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۲ ''۔ فارسی تاجر لوگ بولتے ہوں گے جن کے ایران کے ساتھ تعلقات تھے۔ شریف الادریسی (۱۰۹۹ء-۱۱۶۴ء) نے بھی لکھا ہے کہ مکران کی زبان فارسی اور مکرانی ہے ۳۔ ابن حوقل کا بھی یہی بیان ہے ۴۔ اس بیان کی تصدیق مارکو پولو بھی کرتا ہے۔ سیاح مارکو پولو چین جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مکران میں ایک خاص قسم کی زبان بولی جاتی ہے چنانچہ بلوچ ماہرینِ علمِ تحقیق کا خیال ہے کہ ''بلوچی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ کئی کتباتِ بیستون بلوچی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۵۔''

بلوچستان سے جو قدیم کتبات ملے ہیں۔ ان میں چند ایسے الفاظ موجود ہیں جو بلوچی میں ملتے ہیں۔ لیکن تحریر کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ بات قیاس سے بعید نہیں کہ بلوچی اور پہلوی زبان کا ماخذ ایک ہی زبان ہے ۶۔ جس طرح اکثر ہند

---

(1) Cambridge History of India, Vol : 1, p. 339

۲۔ المسالک الممالک ، ص ۱۲

۳۔ نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق۔

۴۔ سفر نامہ ابن حوقل۔

۵۔ میر عبدالصمد امیری کا مقالہ ، ماہنامہ بلوچی کراچی ، میر شیر محمد مری کا جو اس نے اپریل ۱۹۶۱ء میں لاہور میں منعقد علاقائی زبانوں کی کانفرس میں پڑھا اور ''بلوچی زبان و ادب و تاریخ'' کے عنوان سے کاردار بلوچی اکیڈیمی کراچی سے شائع ہوا۔

۶۔ جرمن کی کیل (Kiel) یونیورسٹی کے پروفیسر انڈرز کی رائے ہے کہ بلوچی پہلوی کی شاخ ہے۔

R. Hughes, Buffer, Makran p. 80). (Kiel) Dr. Andrees

آریائی زبانوں کا ہے - بلوچی مشرق ایران کی ایک زبان ہے ، جس کا سرچشمہ مشرق ایرانی شاخ ہے اور بعض چیزوں میں آوستا سے کہیں زیادہ قدیم فارسی سے مماثلت رکھتی ہے - گریئرسن کے بھی چند بیانات سے یہی بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ بلوچی بہ نسبت دوسری زبانوں کے فارسی سے قریب تر ہے - وہ لکھتا ہے ''دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ یہ ایک قبیلے کی طرزِ گفتگو ہے جو اپنے طور پر ہی پنپی ہے اور دورِ قدیم سے موجود ہے - لیکن اس کے ساتھ ہی ادبی فارسی سے اثر انداز بھی ہوتی رہی ہے - اسی مناسبت سے اکثر بلوچوں میں یہ خیال مشہور ہے کہ یہ (بلوچی) بگڑی ہوئی فارسی ہے - لیکن یہ وہ اشخاص ہیں جنھیں اپنی زبان کی اہمیت کا علم نہیں ہے اور یوں وہ اپنی زبان کی تحقیر کرتے ہیں ۱ -''

کیونکہ بلوچی کے صوبیات اور صرف و نحو میں انفرادی خصوصیات ہیں ، اس لیے بلوچی قدیم اور انفرادی زبان مانی جا سکتی ہے - گریئرسن اس سلسلے میں بھی ہماری راہنمائی کرتا ہے - ''اگرچہ یہ (بلوچی) فارسی سے قرابت رکھتی ہے لیکن اس کو پرکھنے کا یہ طریقہ غلط ہوگا - کیونکہ بلوچی زبان ایرانی زبانوں میں سے ایک قابل فہم اور انفرادی حیثیت کی مالک ہے - اس معاملے کی صحیح حالت پر اچھی طرح سے روشنی ڈالنے کے لیے پروفیسر گائیگر (Geiger) کا حوالہ دیا جاتا ہے - تمام مقامی بولیوں میں سے وہ بلوچی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس بنا پر کہ اس کی اصوات نمایاں طور سے عہد قدیم کی ہیں اس زبان نے اپنی تمام حالتوں میں اپنے پرانے طور طریقے محفوظ رکھے ہیں - حتیٰ کہ اس کے کچھ حروف علت اپنی جدا گانہ حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ حروف صحیح بھی اس کے اپنے ہیں - اس لحاظ سے یہ فارسی کی قدیم شکل پہلوی کی طرح ہے - فارسی زبان میں حروف علت اور صاف اور رواں حروف کے بعد بے صوت وقفوں کا صحیح حرفوں کی صورت اختیار کرنا تیسری اور چھٹی صدی عیسوی میں ہوا - قصہ مختصر صحیح حروف کے نظام کے اعتبار سے بلوچی زبان بلحاظ لسانی ارتقاء ایک ایسے مرحلے کی نشان دہی کرتی ہے ، جہاں فارسی زبان نے اسے کوئی پندرہ سو سال گزرے چھوڑ دیا تھا'' ۲ - زبانوں پر پڑوسی زبان کا اثر لازمی امر ہے - اس لیے مکران میں بولی جانے والی زبان (بلوچی) پر قدیم زمانہ سے فارسی کا اثر رہا ہے - لیکن مشرق علاقوں کی زبان پر فارسی کی بجائے ہمسایہ زبانوں ، سندھی اور سرائیکی کا اثر ہے - خاص طور پر سندھی کا تو بہت بڑا اثر ہے - مشرق بلوچی میں سندھی زبان کے بہت سے الفاظ

۱- گریئرسن ، لینگوایسٹک سروے آف انڈیا ج ۱۰ ص ۳۳۳

۲- گریئرسن ، لینگوایسٹک سروے آف انڈیا - ج ۱۰ - ۳۳۳ بحوالہ -
Professor Geiger in the Grundriss der Iranischen Philologie. Vol. I, II, p. 417.

ملتے ہیں۔ لسانیاتی نقطہ نگاہ سے ہجوں کو آسانی کے لیے مری بلوچی، رخشانی بلوچی، مکرانی بلوچی اور خاوری بلوچی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دراصل اس کے دو بڑے گروہ ہیں۔ مشرقی بلوچی اور مغربی بلوچی۔

۱- مشرقی بلوچی

یہ مشرقی بلوچستان کی زبان ہے۔ یہ زبان کوئٹہ ڈویژن ضلع ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور کہیں کہیں سندھ میں بولی جاتی ہے۔ اس میں جگہ جگہ الفاظ کی ادائیگی میں کچھ فرق ہے۔ مری بگٹی قبائل کی زبان اور دوسری مشرقی بلوچی میں بھی بہت فرق ہے۔

گریئرسن نے اس سلسلے میں ڈیمز کا ایک بیان بطور حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''دونوں میں (مغربی بلوچی و مشرقی بلوچی) بڑا واضح فرق موجود ہے۔ لیکن موازنہ کرنا چاہیں تو دونوں میں ایک قسم کا ربط بھی نظر آئے گا [۱]۔'' مشرقی بلوچی میں سندھی اور ''لہندا'' کے الفاظ شامل ہیں۔ اور مغربی بلوچی میں فارسی کے الفاظ کی شمولیت نظر آتی ہے۔

۲- مغربی بلوچی

یہ مغربی بلوچستان کی زبان ہے اور مکران، قلات، جھالاوان، خاران، لسبیلہ اور کوئٹہ ڈویژن کے ضلع چاغی میں بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہی زبان افغانستان، ایران اور روس کے بلوچی علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ اس زبان پر فارسی کے علاوہ پشتو کا بھی اثر ہے۔ گریئرسن کا بیان ہے کہ بلوچی براہوی سے متاثر نہیں ہے۔ لیکن براہوی مروجہ بلوچی سے متاثر ضرور ہے۔

مشرقی اور مغربی بلوچی میں جو لسانی فرق ہے۔ اس کو ذیل میں واضح کیا جاتا ہے۔

۱- مشرقی بلوچی میں ''غ'' استعمال ہوتا ہے اور مغربی میں اس کی جگہ ''گ'' استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''داغ'' (کھانا) اور داگ۔

۲- مشرقی بلوچی میں سندھی کے زیر اثر '' ڈہ '' آتا ہے اور مغربی میں '' ڈ '' استعمال ہوتا ہے۔

۳- مشرقی میں ''ف'' اور مغربی میں اس کی جگہ ''پ'' استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آف

۱- گریئرسن، لینگوایسٹک سروے آف انڈیا، ج ۱۰ ص ۳۲۹

Dames, op. Cit., P. 3, Note I.

(پانی) — آپ ۔ شف (رات) — شپ

۴۔ مشرق میں ''ث'' اور مغربی میں ''س'' استعمال ہوتا ہے مثلاً ماث (ماں) — ماس براث (بھائی) — براس

۵۔ مشرق میں بعض موقعوں پر ''خ'' کی جگہ ''ح'' استعمال ہوتا ہے ۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ۔

٦۔ مشرق بلوچی میں زیادہ اختصار پایا جاتا ہے جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہے ۔ شی (کہتا ہے) — گشی اور رو (جاتا ہے) جبکہ مغربی میں روت کہتے ہیں ۔

۷۔ مشرق بلوچی میں کہیں ''گ'' کی جگہ خالص سندھی اور سرائیکی صوتیہ ''گ'' استعمال ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ مشرق بلوچی میں ''ن ط'' کا صوتیہ بھی مستعمل ہے جو سندھی زبان کے زیر اثر آتا ہے ۔ سندھی ہی کے زیر اثر مشرق بلوچی میں ''ک'' اور ''ب'' کی جگہ ''کھ'' اور ''بھ'' بھی مستعمل ہے ۔

انگریزی نظام حکومت میں برٹش عملدار دیسی زبانوں میں دلچسپی لینے لگے ۔ بعض عملداروں نے بلوچی زبان پر تحقیقی کام بھی کیا ۔ ارنیسٹ ٹرمپ سندھی ، بلوچی اور پشتو کا بڑا ماہر تھا ۔ اس نے شاہ لطیف کا رسالہ جرمنی سے شائع کیا اور بلوچی زبان کی گرامر بھی مرتب کر کے شائع کی ۔ میجر ماکلر بڑے عرصے تک گوادر کا پولیٹیکل ایجنٹ رہا ۔ اس نے مغربی بلوچی کا گرامر تیار کر کے اسے ۱۹۱۲ء میں لاہور سے شائع کیا ۔ آر ۔ ہیوز ۔ بلر نے مکران گزٹیئر تیار کیا جس میں بلوچی زبان پر تحقیقی مواد پیش کیا ۔ اس نے اس میں لکھا ہے کہ بلوچی زبان پہلوی زبان کی بہن ہے[۱] ۔ لیکن کیل (Kiel) کے پروفیسر ڈاکٹر اینڈ ریز (Dr. Andreas) کا خیال ہے کہ بلوچی پہلوی کی شاخ ہے[۱] ۔

ڈیمز نے بلوچی زبان و ادب پر بڑا کام کیا ہے ۔ اس کا خیال ہے ۔ ''بلوچی مشرق ایران کی ایک زبان ہے جس کا سرچشمہ مشرق ایرانی شاخ ہے ۔ ہر چند بعض چیزوں میں آوستا سے کہیں زیادہ قدیم فارسی سے مماثلت رکھتی ہے ۔[۲] '' ۱۹۱۰ء میں انگریزی بلوچی لغات کلکتہ سے شائع ہوئیں ۔

---

(1) Hughes. Buller. R: Makran Language, P. 80. (1)

۱۔ بحوالہ ہیوز Hughes (1) The country Baluchistan, ch: IV, P. 11

۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، باب ، بلوچستان ۔

(ب) بلوچی شاعری کی خصوصیات

بلوچی شاعری کو قلمبند کرنے کے سلسلہ میں بھی سب سے پہلے مستشرقین ہی نے تحقیقی کام کیا۔ انہوں نے بڑی محنت اور توجہ سے بلوچی اشعار کے مختلف متن اور تلفظ کا تقابلی مطالعہ، محاکمہ اور تبصرہ کیا ہے۔ یہ ایک تحقیقی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے اس طرح کی بے شمار چیزیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوئیں اور ان پر بحث بھی ہوئی۔ فوک لور سوسائٹی کے رسالہ ''فوک لور'' لندن میں بھی کچھ چیزیں شائع ہوئیں۔ کپتان لیچ نے بلوچی اشعار ''Sketch of Baluchi Language'' کے عنوان سے ۱۸۴۰ء میں جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں شائع کروائے۔ یہ اشعار بلوچوں کے حسب و نسب کے متعلق ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں برٹن کی کتاب Sindh شائع ہوئی، اس میں تین بلوچی نظموں کا ترجمہ ہے۔ ۱۸۸۰ء میں ایل۔ ڈیمز نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں ''Sketch of the Northern Baluchi Language'' کے عنوان سے کچھ بلوچی، اشعار معہ ترجمہ شائع کروائے۔ ۱۸۹۱ء میں ایل۔ ڈیمز کی کتاب ''بلوچی ٹیکسٹ بک'' شائع ہوئی۔ اس میں بھی کچھ بلوچی اسعار ہیں۔ کچھ بلوچی اشعار سر۔ رچرڈ۔ ٹیمپل کی کتاب ''Legends of the Punjab'' میں بھی آ گئے ہیں۔ ٹی۔ ایم۔ میٹر نے بھی ''Baluchi Classics'' شائع کی جس میں انہوں نے کئی بلوچی اشعار مع ترجمہ دیئے۔ ۱۹۰۷ء میں لاہور سے اردو میں ہیتو رام کا بلوچی نامہ شائع ہوا۔ اس میں بھی کچھ بلوچی اشعار تھے۔ اسی سال ڈیمز کی مشہور کتاب ''Popular Poetry of the Baluchees'' رایل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی۔ ''جنگ نفسک'' پر گیدو ڈوم نے ایک ہزار ابیات پر مشتمل رزمیہ نظم لکھی تھی۔ میر مراد بخش خان غزنی نے ان میں سے سو اشعار اس کے پوتے ''عطو'' کی زبانی قلمبند کر کے مع ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں شائع کروائے۔ ان سب میں ایل۔ ڈیمز کی کتاب زیادہ محققانہ ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں بلوچی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''بلوچی شاعری میں نہ تو ایرانی نمونے کی غزلیں ہیں نہ دیوانوں کی ترتیب ملتی ہے۔ بلوچی شاعری مضمون اور اظہار بیان کے اعتبار سے سادہ اور سلیس ہے اور ان کی زندگی کی و ملکی ماحول کی سچی عکاسی کرتی ہے۔ یہ عین قدرتی عمل ہے کہ بے آب و گیاہ چٹیل پہاڑوں اور ریگستانوں میں زندگی گزارنے والا شاعر ہمیشہ بارش اور باد و باراں کے طوفان کی تمنا کرتا ہے اور سرسبزی و شادابی کا آرزومند رہتا ہے۔۔۔۔ اپنی خواہش کے مطابق خشک دریاؤں کو پانی سے لبریز

دکھاتا ہے اور چٹیل میدانوں اور پہاڑوں کے بے آب و گیاہ دامنوں کو سبزہ کے قالینوں میں منتقل کر دیتا ہے''۔

اجتماعیت کے ساتھ ساتھ اس میں انفرادیت بھی ہے۔ البتہ خارجی عنصر زیادہ ہے۔ اس میں ماحول کی حقیقت پسندانہ نوع میں عکاسی بھی ہے اور جنگ و جدل کے مناظر کی تصویر کشی بھی عام ہے، جنگی سورماؤں کے کردار ان کے افعال اور بیانات سے پوری طرح واضح کیے جاتے ہیں۱۔ بلوچ شاعری میں خود داری، انانیت، قوم پرستی اور عسکریت کا سبق ملتا ہے اور قوم لفظ قبیلہ کے معنی میں ملتا ہے۔ بلوچی شعراء قبائلی نظامِ حیات کے مختلف اخلاق اور تہذیبی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور جنگ کے محرکات اور عوامل پر بحث کرتے ہیں۔ قدیم بلوچی شاعری زیادہ تر خارجی ہے۔ لیکن اس میں فطری جذبات اور احساسات کی ترجمانی سادہ اور حقیقت پسندانہ نوع کی ہے اس میں تلواروں کی جھنکار بھی ہے اور محنت کش دلوں کی پکار بھی۔ یہ کامیابی و فتح، ناکامی اور مایوسی، بہار اور خزاں، غرض زندگی کے ہر اچھے برے پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ بلوچی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں قصیدہ گوئی نہیں ملتی اور اس کے علاوہ بلوچ شاعر کسی مادی شے کی پرستش نہیں کرتا۔ وہ گھوڑے، کبوتر شہداء کی تعریف کرے گا۔ لیکن کسی سردار یا حاکم کی تعریف کرنا وہ عار سمجھتا ہے۔ وہ بہادر دشمن کی تعریف کرنا پسند کرتا ہے لیکن محض کسی سردار یا حاکم کی تعریف نہیں کریگا۔ بلوچی کی رزمیہ نظموں میں جن سورماؤں کا ذکر آتا ہے اس خوبی سے آتا ہے کہ اس کی ایک ایک حرکت کا خیالی نقش ہمارے ذہنوں میں اجاگر ہو جاتا ہے۔ عشقیہ شاعری کے ضمن میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بلوچی شاعری کا محبوب مافوق الفطرت نہیں ثابت ہوتا بلکہ اسی زمین کی مخلوق نظر آتا ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ اشعار میں مخصوص طبقے کی ثقافت کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ جام ورک کی شاعری میں جس تہذیب کی جھلک پائی جاتی ہے، وہ اونچے طبقے کی ہے۔ اس نے حسیناؤں کا سراپا بیان کیا ہے اور ''ڈھاڈھر کا بازار'' میں امراء کی زندگی، طور طریقہ، رہن سہن، لباس اور زیورات کو پیش کیا ہے۔ یہ ہندی ''نثر نگار رس'' اور سندھی ''سینگار'' کا اثر ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''سندھی سینگار'' کے ابیات سے متاثر ہوا ہے۔

بلوچی شاعری مندرجہ ذیل چھ حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے:

---

(1) M. L. Dames : "Popular Poetry of the Baluchees," Vol : I, 1907, Introduction, pp. XVII, XVIII.

۱- قدیم رزمیہ نظمیں

بلوچی شاعری میں رزمیہ شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ نظمیں بلوچی شاعری کا قدیم ترین اور اہم سرمایہ ہیں۔ اگر یہ مکمل طور پر جمع کر کے قلمبند کی جائیں تو یونانی اور ہندی رزمیہ داستانوں کی طرح عالمی ادب میں وہ ہی درجہ حاصل کر لیں جو انہیں حاصل تھا۔ ایل۔ ڈیمز نے کچھ نظمیں جمع کر کے اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ جن کا تعلق بلوچوں کی ابتدائی تاریخ کے جنگی واقعات، ان کی ہجرت اور آباد کاری سے ہے۔ ان میں بلوچوں کے شجرہ نسب کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں۔ حسب نسب پر زیادہ تر فرضی قصے ہیں۔ بیشتر حصہ ان نظموں کا ہے جو رندوں، لاشاریوں اور دوسرے قبائل کی باہمی جنگوں کے متعلق ہے۔

۲- رزمیہ نظمیں جو قدیم رزمیہ نظموں کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے

یہ رزمیہ نظمیں بلوچوں کی قبائلی جھڑپوں اور منظم جنگوں کی داستانیں ہیں۔ جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک جاری رہیں۔ یہ نظمیں اپنی وضع، انداز بیان، زبان و مکان کے اعتبار سے متذکرہ بالا نظموں سے مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض رجزیہ نظمیں ہیں۔ جو جوش اور ولولے سے بھرپور ہیں اور بعض سورماؤں کی فہرستوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ گو ان کی زبان قدیم نظموں کی زبان سے مختلف ہے لیکن پھر بھی اندازِ بیان قدیم ہے۔ ان میں سندھی اور سرائیکی الفاظ کی آمیزش بھی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بلوچوں میں آپس میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ جس کی وجہ سے ان کی طاقت ختم ہوتی گئی۔

۳- عشقیہ داستانیں

یہ نظمیں فنی لحاظ سے منفرد ہیں مگر بلحاظ زبان صاف اور سادہ ہیں۔ "لیلیٰ مجنوں" کی کہانی بلوچ شاعروں نے عربی سے لی ہے۔ لیکن اسے خالص بلوچی رنگ دے دیا ہے اور جو ماحول پیش کیا ہے وہ بلوچی ہے۔ اس میں منظر نگاری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اسی طرح دوسری رومانوی داستانوں "دوستین اور شیریں" میں بھی منظر نگاری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ "ہرات اور شیریں" کے متعلق بھی مختلف

۱- مجھے (مقالہ نگار) کو خود لوڑیوں کی زبانی ایسی بہت سی نظمیں ملی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان رومانوی داستانوں پر بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔

منظوم داستانیں ہیں۔ یہ ایرانی رومانی داستان ہے لیکن بلوچ شاعروں نے اس کو بھی بلوچی رنگ دے دیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی نظمیں ہیں جو رومانی داستانوں پر مبنی ہیں۱۔

۴۔ عشقیہ گیت

یہ گیت بیانیہ نہیں ہیں۔ بلکہ تغزّل سے بھرپور ہیں۔ فنّی لحاظ سے اس قسم کے گیتوں کا انداز مختلف ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں رومانی داستانوں اور عشقیہ گیتوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ رومانی داستانوں کے جن حصوں میں نغمگی اور ترنّم اور حسن و عشق کا بیان آ جاتا ہے، وہ حصے عشقیہ گیت ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے بعض گیتوں میں خالص عشقیہ مضامین ہیں اور بعض میں تصوّف کی جھلک بھی ملتی ہے اور اس طرح مجاز کے پردے میں حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یعنی بلا واسطہ طور پر مذہبی رجحانات اور انداز فکر کا بیان ہو جاتا ہے۔ عشقیہ نظمیں لکھنے والوں میں ''جام ورک'' کا نام سر فہرست ہے۔ شاعر ''مست توکلی'' کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔

۵۔ مذہبی اور اخلاقی نظمیں

اس قسم کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی عقائد کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں حضور سرور کائنات، حضرت علی اور درویشوں کے متعلق قصے ہیں۔ مذہبی شاعری میں اخلاقی اقدار کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ڈیمز نے اسی سلسلہ میں مناظرے کی صنف کی نظمیں بھی دی ہیں۔

٦۔ مختصر نظمیں

جن میں لوریاں، دستک۱، منظوم پہیلیاں اور لطیفے شامل ہیں۔ لوریوں میں ماں بلوچی معاشرے کے مطابق اپنے بیٹے کو بہادروں اور جنگجوؤں کا سردار دیکھنا چاہتی ہے۔ دستک اکثر بلوچوں کے مخصوص ساز نڑ کی سنگت میں گائے جاتے ہیں۔ یہ مختصر ہوتے ہیں لیکن محبت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ منظوم پہیلیاں اور لطیفے بلوچی زبان کا خاص حصہ ہیں اور بلوچ ان سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۱۔ اس صنف شاعری کو ''دوستانہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ جو مختلف لہجے کی وجہ سے ہے

(ج) بلوچی عروض

قدیم بلوچی شاعری قطعاً علم عروض پر مبنی نہیں ہے ۔ نظموں میں بندوں کی کوئی پابندی نہیں اور نہ ہی مصرعوں کا کوئی تعین۔ مصرعوں میں ایک قسم کا وزن ضرور ہوتا ہے لیکن اس میں بھی ارکان یا ماتراؤں کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ایک ہی بند کے کسی ایک مصرع میں کم اور کسی میں زیادہ ماترائیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ اکثریت سے مصرعے لمبے ہوتے ہیں۔ کیونکہ بلوچی شعر گانے کے لیے ہے اس لیے فقط ''لے'' یا الحان کا خیال رکھا جاتا جاتا ہے۔ بعض نظموں میں ردیف اور قافیے کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔ بلوچی عروض پارسیوں کی دینی کتاب ''آوستا'' کے منظوم ''گاتھاؤں'' اور سنسکرت ''چھندوویا'' سے ملتا جلتا ہے۔ جو 'رگ وید' میں مستعمل ہے۔ سب سے قدیم شعر صرف الحان پر ہی مبنی ہے۔ لیکن بعد میں مخصوص اصنافِ سخن کے لیے مخصوص بحریں مقرر کر دی گئیں۔ ان کا بھی اگر فنّی تجزیہ کیا جائے تو ماتراؤں کے گھٹانے بڑھانے کا رجحان عام ملے گا۔ اس کے بعد عربی عروض کا دور آتا ہے جب مـلّاؤں نے بلوچی میں شعر کہے۔ موجودہ دور میں کسی کسی شاعر کے ہاں علم عروض کی پابندی نظر آتی ہے اور کئی ایک بلند پایہ شاعر اب بھی قدیم نوع کی شاعری پر ہی طبع آزمائی کرتے ہیں، گو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں قافیہ کی پابندی کی جانے لگی تھی۔

(د) بلوچی لوک گیت

بلوچی لوک گیت عوامی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں۔ وہ عام لوگوں کے احساسات و رجحانات کا مرکز ہوتے ہیں۔ لوک گیت بلوچی قوم کے معاشی و معاشرتی حالات کے آئینہ دار ہیں۔ انہی گیتوں سے ان کے صحیح مذہبی رجحانات و عقائد، ذہنی معیار اور قومی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلوچ سیاست و ثقافت کا بھی ان گیتوں میں نمایاں عنصر ہوتا ہے۔ جس طرح ہر زبان کے عوامی گیت قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ محفوظ چلے آئے ہیں۔ اسی طرح بلوچی لوک گیت بھی قدیم زمانہ سے صدری خزانوں میں محفوظ ہم تک پہنچے ہیں۔ قدیم لوک گیتوں میں گیت بنانے والے کا نام نہیں معلوم ہو سکتا۔ حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ گانے والے ایک آدھ مصرعہ بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور کچھ کم بھی کرتے جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کو عوامی گیت کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ عام لوگوں کے بنائے ہوئے، عام لوگوں کو محفوظ کرنے کے لیے اور عام لوگوں کی

زندگی کے ترجمان ہیں۔ بلوچی لوک گیت، بلوچوں کی زندگی کے پوری طرح مظہر ہیں۔ ان میں واقعات نگاری، کردار نگاری اور بلوچی ماحول کے دلنشین نمونے ملتے ہیں۔ ہر طبقے کے دل کی دھڑکنیں یعنی داخلی جذبات و احساسات، خارجی حالات و کیفیات کی صحیح تصویریں ہیں۔ ان کا مطالعہ پڑھنے والے کو بلوچوں سے قریب تر لے جاتا ہے۔ بلوچستان خشک بلند پہاڑوں اور چٹیل وسیع میدانوں کی سر زمین ہے، نہ صرف یہ کہ اس کی آب و ہوا مختلف جگہوں پر مختلف ہے۔ کوئی حصہ سرد ہے، تو کوئی بہت ہی گرم کہیں گھاٹیاں ہیں تو کہیں سپاٹ میدان اور یہ سر زمین خانہ بدوشوں، شتر بانوں دہقانوں اور چرواہوں کی ہے۔ جن کو نغموں سے فطری لگاؤ ہے۔ گھر میں ہوں، کھیتوں میں کام کر رہے ہوں یا راتوں کو اونٹوں پر سوار ریگستانوں کا سفر کر رہے ہوں ہر وقت کوئی نہ کوئی گیت الاپتے رہتے ہیں۔ یہ خطہ جغرافیائی حالت، نسلی اور معاشی وجوہات کی بنا پر منفرد مزاج کا حامل ہے اور بلوچی لوک گیت اس ثقافت کے حقیقی نقش ہیں۔ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے بلوچی کے مختلف لہجے ہیں۔ اس لیے ایک ہی لوک گیت مختلف لہجوں میں علیحدہ تلفظ کا حامل ہوتا ہے۔ ان کی اہم خصوصیات ان کی دھن یا گت ہے۔ کوئی ایک گیت جو معنوی لحاظ سے کسی ایک صنف سے متعلق ہے لیکن گت یا مخصوص طرز آہنگ اسے کسی دوسری صنف میں مقبول بنا دیتا ہے۔ بلوچی لوک گیتوں کی بہت سی اقسام ہیں۔ ذیل میں ان کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱- لوئی

یہ لوری کی ہی ایک قسم ہے اور بچوں کو سلاتے وقت لحن سے گائی جاتی ہے۔ مکرانی بلوچ اس کو "لیلو" کہتے ہیں۔ لولی مغربی پاکستان کی اور زبانوں میں بھی ملتی ہے۔ لیکن بلوچی لولی میں عموماً بہادرانہ اور شجاعانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک لولی میں ماں اپنے بچے سے مخاطب ہے:

تو جلدی بڑا ہوکر تلوار اٹھا لے،
دل کو سنبھالے، میں اس دن کی منتظر ہوں،
(جب تو) باپ کے خون کا بدلہ حریفوں سے لے گا!

اس سے بلوچ ماں کی تربیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ کہ تلوار کا دھنی بنے اور خون کا بدلہ خون سے لے۔ اور بلوچوں کی فطرت اور مزاج کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی

طرح بلوچ ماں اپنے بیٹے کی بہادری پر ہی خوش ہوتی ہے خواہ وہ جنگ میں لڑتا ہوا مر جائے۔ اس کے نمونے بھی لولی میں ملتے ہیں۔

۲۔ نازنگ

یہ گیت شادی یا منگنی کے موقعہ پر بہن گاتی ہے۔ اس میں وہ اپنے بھائی کے حسن و جمال کی تعریف بھی کرتی ہے، تو بہادری کے گن بھی گاتی ہے۔ دلہن کی سہیلیاں نازنگ میں دولہا کی فرضی کمزوریوں کا ذکر کر کے اس کی خوب گت بناتی ہیں یہ گیت صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں اور دوسرے خوشی کے مواقع پر بھی گائے جاتے ہیں۔

۳۔ لاڈو یا لاڈوک

ان گیتوں میں لڑے، لاڑے، لاڑ، لڑو، لاڈو وغیرہ الفاظ کی برابر تکرار رہتی ہے اس لیے اس صنف کا، لاڈو یا لاڈوک" کا نام پڑا ہے۔ اس میں وصال کے لیے فریاد ہوتی ہے۔ یہ مغربی اور وسطی بلوچستان میں بہت مقبول ہے۔

۴۔ زہیروگ

اس کو زہیرگ، زہیریک یا زئروک بھی کہا جاتا ہے۔ زہیر کے معنی ہیں یاد۔ اس صنف میں عام طور پر دکھ، درد، انتظار، ہجر و وصال وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ اس میں سوز اور محرومی ہے اور یہ غمناک ترنم کے ساتھ گائی جاتی ہے۔ عورتیں عام طور سے چکی پیستے ہوئے اور مرد مکران کے علاقے میں شتر بانی کرتے ہوئے اسے گاتے ہیں۔ زہیروگ بلوچی کی ایک خاص طرز موسیقی کو بھی کہا جاتا ہے، جو المناک بھی ہوتا ہے۔

۵۔ لیکو

اس کو لیکو، لئیکو یا ڈئیکو بھی کہا جاتا ہے۔ یہ گیت بھی طویل مسافرت میں بلوچ ساربان گاتے ہیں۔ خاص طور پر خاران کے علاقے میں مقبول ہے اور اکثر موسم بہار میں گایا جاتا ہے۔ یہ گیت نہ صرف مرد گاتے ہیں بلکہ عورتیں بھی اسے اظہار محبت کا ذریعہ بناتی ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے یہ زہیروگ سے کچھ مماثلت رکھتا ہے، لیکن اس کی مخصوص دھن اسے زہیروگ سے ممیز کرتی ہے۔

٦- ہالو

اس میں ''ہالو ہلو'' کی مسلسل تکرار ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کا یہ نام پڑا ہے یہ شادی بیاہ کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ اس کا رواج مغربی اور وسطی بلوچستان میں عام ہے۔

۷- مورو

اس میں عورت کے عشقیہ اور فراقیہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ہر بند کے بعد مندرجہ ذیل فقروں میں سے ایک کی تکرار ہوتی ہے۔

''مورو گا رہی ہوں'' یا ''مورو دے رہی ہوں''۔ یہ خالص سندھی لوک گیت ہیں جو سندھی سے بلوچی میں مروج ہوئے ہیں۔

۸- سوت

بلوچی لوک گیتوں میں مقبول ترین صنف ہے اور تمام علاقوں میں مستعمل ہے۔ یہ گیت شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے علاوہ فصل کاٹنے کے موقعہ پر بھی گائے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر لاڈو اور سوت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ان میں مسرت کے جذبات کے علاوہ محبوب کے دیدار، وصل، درد، فراق اور اس کے حسن کا بیان بھی ہوتا ہے۔ مشترکہ متضاد احساسات اور جذبات کا پرخلوص اظہار اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ ہے۔

۹- سپت

''صفت'' کی بدلی ہوئی صورت ''سپت'' ہے۔ اس میں عام طور حمد، نعمت اور مناقب سے متعلق مضامین ہوتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کے موقعہ پر عورتیں زچہ کے لیے گاتی ہیں۔ اس میں ساز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ یہ مکران کا مقبول لوک گیت ہے اس کا مضمون سندھی مداح اور بنگالی مرشدی سے ملتا جالتا ہے۔ یہ ایک دو شعروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۰- لیلڑی

اس میں لفظ لیلڑی کی تکرار ہوتی ہے، اس لیے اس پر یہ نام پڑا ہے۔ گیت کے الگ الگ مصرعوں کا مطلب تو واضح ہوتا ہے، لیکن پورا گیت اکثر غیر مربوط ہو جاتا ہے۔ سندھی میں بھی اس کا رواج ہے۔ فنی لحاظ سے ہر بند مثنوی کے نمونہ پر دو مصرعوں کا ہوتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

''سیوی ہے سلطان ، لیلڑیاں لا ، اور تو ہے ملتان ، لیلڑیاں لا ''

۱۱- لیلی مور

یہ بلوچی کےعلاوہ براہوی میں بھی پایا جاتا ہے ، وسطی بلوچستان کا یہ ایک مقبول گیت ہے اور اس میں ہر قسم کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے ۔ اس کو اس کی مخصوص دھن سے پہچانا جاتا ہے ۔

۱۲- ڈیہی

یہ مشرق بلوچستان کا مقبول لوک گیت ہے ۔ ''ڈیہ'' کے معنی ہیں ''وطن''۔ یہ سندھی لفظ ہے لیکن یہ گیت صرف وطن کے تذکرے تک محدود نہیں ہے ۔ مضمون کے لحاظ سے یہ ''سوت'' اور ''لاڈوک'' سے مشابہ ہے ۔ اس میں ڈیہی لفظ کی تکرار بھی ہوتی ہے اور اس کی اپنی مخصوص دھن بھی ہے ۔ اس میں ہجرو وصال کا ذکر بھی خاص طور پر کیا جاتا ہے ۔

۱۳- موتک

اس کو بلوچستان کے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے ، مثلاً موتیک موتک اور مورگ ۔ ان میں مرنے والے کے لیے رنج و غم کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ اس کی ہیئت زہیروک سے مماثلت رکھتی ہے ۔

۱۴- دستانہ

اس کو دستنک بھی کہا جاتا ہے ۔ اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے ۔ یہ بلوچی ساز ''نڑ[۱] '' پر گایا جاتا ہے اور مختصر ہوتا ہے ۔ اس کی ساخت ہندوی ''دوہو'' اور سندھی ''ڈوہیڑہ'' سے مشابہ ہے[۲] ۔ یعنی اکثر دستانہ دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور قافیہ ہر مصرعہ کے آخر میں آتا ہے ، کچھ دستانے تین سے لیکر چودہ مصرعوں تک بھی ہوتے ہیں ۔

۱- نڑ کو ''نل'' یا ''گدلو'' بھی کہتے ہیں ۔

۲- ڈیمز (ص ۱۸۳) نے لکھا ہے کہ ان کی ساخت مغربی پنجابی کے ڈوہیڑوں جیسی ہے جن کے نمونے O'Brien کی کتاب میں ملتے ہیں ۔ برٹن (Sindh, 1851, P. 79) کے حوالہ سے لکھا
Glossary of the Multani language Lahore, 1903, Introduction, p. X)
ہے کہ مضمون کے لحاظ سے سندھی شاعری کی صنف ''سنیٹرو'' کے مشابہ ہے ۔ ڈیمز نے یہ بھی لکھا ہے کہ اطالوی صنف Stornelli سے بھی اس کی ساخت ملتی ہے ۔

یہ محبت کے مختصر گیت ہیں ، جو سُسراس میں دیئے جاتے ہیں - ان کی تعداد ۲۰-۳۰ کے درمیان ہوگی - یہ کئی سو سالوں کے بنائے ہوئے ہیں اور بلوچوں کے سب قبیلوں میں مروج ہیں - مضمون کے لحاظ سے اس میں محبوب کی تعریف ہوتی ہے ، اس کے علاوہ کسی بہادر کی بہادری کی تعریف بھی ہوتی ہے ، قبیلے کے سردار کی موت پر بھی دستانہ کہے جاتے ہیں -

۱۵- مناظرے

یہ سندھی اور بلوچی دونوں زبانوں کی لوک شاعری میں موجود ہیں - اس میں دو اشیاء کے مناظرے ہوتے ہیں ، ہر چیز اپنی زبانی اپنی تعریف کرتی ہے - اپنی خصوصیات بیان کرتی ہے ، دوسری چیز کے حملہ کا جواب دیتی ہے - جیسے ٹوپی اور پگڑی کی لڑائی - جانوروں کے بھی مناظرے ہوتے ہیں - اس میں مقالے ہوتے ہیں -

۱۶- ہجو

یہ طنزیہ گیت ہوتا ہے ، بلوچی شعراء جب کسی سردار سے ناراض ہوتے تو ہجو کہتے ہیں - یہ ہجویہ گیت جلد زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں -

۱۷- بتل

یہ بلوچی ضرب الامثال ہیں - اکثر ایک مصرع کی شکل میں ہوتے ہیں - لیکن بعض ایک سے زیادہ مصرعوں پر مشتمل شعر کی صورت میں بھی ہوتے ہیں - ان میں بلوچوں کے تجربات ، معاشی و معاشرتی کا عکس اور دانائی کے نکات ہوتے ہیں -

(ھ) بلوچی لوک کہانیاں

ہر زبان کا قدیم ترین ادب لوک گیت اور لوک کہانیاں ہوتی ہیں - لوک کہانی ہر عہد میں موجود رہی ہے - اس لیے اس میں ہر دور کا تھوڑا سا رنگ مل جاتا ہے - اس میں فطرت کا حسن بھی ہے اور انسان کی بے لوث سادگی ، پُر خلوص محنت اور زندہ رہنے کے لیے جدوجہد بھی ہے - لوک کہانی کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں مقامی رنگ ملتا ہے - ہر سرزمین کی لوک کہانی کا اپنا مزاج اپنا رنگ اور اپنا تاثر ہوتا ہے - اس لیے کسی ملک ، کسی قوم ، کسی قبیلے کی صحیح تصویر اس کی لوک کہانی میں ملتی ہے - بلوچی لوک کہانیوں میں بھی اپنی انفرادیت ہے - ان میں بلوچی معاشرت اور مجلس زندگی کا عکس بھی مل جاتا ہے

اور بلوچی اخلاقی اقدار بھی سامنے آ جاتی ہیں ۔ بلوچی لوک کہانیوں میں بعض وہ ہیں ، جو ویدک ادب سے متاثر معلوم ہوتی ہیں ۔ اس سلسلہ میں ایک کہانی ''پرو'' کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے ۱ ۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جب دیس پر بیرونی حملہ ہوتا ہے تو اسی سرزمین کے ایک خطہ کا بادشاہ ہمت ہار کر دشمن سے صلح کر لیتا ہے ۔ اسی طرح ایک ویدک کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ راجہ پرو اپنے دیس کے اتحادیوں اور اپنے ہی عوام کے منشاء کے خلاف حملہ آور سے مل جاتا ہے ۲ ۔ کچھ لوک کہانیوں میں تو ویدک دور سے قبل کے تصورات بھی موجود ہیں۳ ۔ کیونکہ ان میں مافوق الفطرت کردار ملتے ہیں ۔ ان کہانیوں کے کردار ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں ، جن کا کرنا انسانی قوت اور طاقت سے باہر ہوتا ہے ۔ اس دور کی کہانیوں میں حسن اور صنف نازک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مگر ساز اور موسیقی کا تذکرہ مقابلتاً کم ملتا ہے۴ ۔ ان لوک کہانیوں میں انسان موت سے برسرپیکار نظر آتا ہے اور آخر کار اس کشمکش میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔

کچھ لوک کہانیوں میں بدھ کے فلسفے کا رنگ نظر آتا ہے اور کچھ زرتشت اور آگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں ، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ سرزمین قدیم زمانہ سے آباد چلی آ رہی ہے اور یہاں کی زبان ، ادب اور ثقافت پر آریہ ، بدھ اور زرتشت کے مذہبوں اور ثقافتوں کا اثر پڑا ہے ۔ بعد میں یہ سرزمین اسلام کے نور سے منوّر ہو گئی ۔ کچھ لوک کہانیوں میں اسلامی تصورات کی جھلک بھی ہے ۔ ہر کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے ۔ ''ایک تھا بادشاہ ، بادشاہوں کا بادشاہ اللہ ، لیکن یہ بھی ایک بادشاہ تھا ——''

خشک بلند پہاڑوں کی اس سرزمین میں زندگی بڑی سختی سے گزرتی ہے ۔ بھوک اور افلاس کے بارے میں چند لوک کہانیاں ہیں ۔ یہاں ایک پہاڑ کا نام ''چلتن'' ہے ۔ اس کے متعلق ایک لوک کہانی ہے کہ ایک شخص کے چالیس لڑکے پیدا ہوئے ۔ جن میں سے انتالیس بچے اس نے دل پر پتھر رکھ کر قریب کے پہاڑ کے دامن میں پھینک دیے ۔ ان چالیس بچوں کی وجہ سے اس پہاڑ کا نام ''چہل تن'' پڑ گیا جو بگڑ کر ''چلتن ہو گیا ہے ۔ ایک کہانی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اپنا شوہر خود منتخب کرتی تھیں ۔ تمام امیدوار محل کے سامنے جمع ہوتے تھے ، لیکن یہاں کی لڑکی ہار پہنانے کی جگہ پانی چھڑک دیا کرتی تھی ۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوک کہانیاں ممکن ہے آریہ دور سے چلی آ رہی ہوں ۔

---

۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ۔ شیر محمد مری کا مقالہ ''بلوچی اساطیر'' پجار ، ص ۲۷ ، ۱۹۶۸ء

فصل سوم

بلوچی ادب کے مختلف ادوار

۱- عرب دور (۶۴۴-۱۰۲۵ء)

اس دور کا کوئی بلوچی شعر اب تک دستیاب نہیں ہوا - بلوچی ایک قدیم زبان ہے اور پندرھویں صدی کے منظوم شدہ پاروں کو دیکھ کر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بلوچی زبان میں شعر و سخن کی گرم بازاری قدیم زمانہ میں بھی رہی ہوگی - لیکن امتداد زمانہ سے اس کے آثار باقی نہیں رہے - البتہ اس دور کے ان شاعروں اور عالموں کے نام ملتے ہیں، جو عربی اور فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے - تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں بلوچ شاعر بسام کرد کا نام ملتا ہے - جس نے خراسان کے حاکم یعقوب بن لیث صفر کے دربار میں فارسی میں قصیدہ پڑھا تھا ۱ - سامانیہ دور کی ایک شاعرہ "رابعہ" کا نام بھی ملتا ہے، جس کو مولانا شبلی نے رودکی سے بھی پہلے کی شاعرہ کہا ہے اور اس کو فرداری لکھا ہے۲ - دراصل فرداری نہیں قزداری ہے - یہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی اور رودکی کی ہمعصر تھی - اس کے باپ کا نام کعب تھا - یہ ان عربوں میں تھا، جنہوں نے قزدار۳ (خضدار) میں رہائش اختیار کر لی تھی ۳ - رابعہ فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شعر کہتی تھی - اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے - فارسی شاعر فرّخی سیستانی بھی ایرانی بلوچستان کا باشندہ تھا فرّخی (م - ۱۰۳۷ء) اپنے دور کا باکمال اور صاحبِ دیوان شاعر تھا - پہلے بلخ کے حکمران ابو المظفر چغتائی کے دربار سے متعلق تھا - پھر وہاں سے سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہنچا اور سلطان کے شعرائے خاص میں شامل ہو گیا - سلطان محمود کا محبوب سردار ایاز بھی فرّخی کا نہایت قدر دان تھا - "ترجمان البلاغہ" کے نام سے صنائع بدائع میں بھی اس نے ایک گرانقدر تصنیف یادگار کے طور پر چھوڑی ہے -

---

۱- Dr: U,M. Dawdpota: "The Influence of Arabic Poetry on the Development of Persian Poetry. p. 9.

۲- شبلی نعمانی : شعر العجم ص ۲۰

۳- بلوچستان کے شہر خضدار کو عربوں نے قضدار اور "قزدار" لکھا ہے - اس میں ایک صحابی بنام سیفان بن سلمہ الحذالی کا مزار ہے جو امیر معاویہ کے زمانہ میں سید قوم سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے - معجم البلدان (ج ۴، ص ۸۶) میں قزدار آیا ہے -

۲- عہد وسطیٰ (۱۱۰۰ء۔۱۴۷۰ء)

یہ زمانہ امیر جلال کے عہد سے شروع ہو کر امیر چاکر خان کے عہد تک ختم ہوتا ہے۔ روایتی بلوچی ادب امیر چاکر خان کے زمانے یعنی پندرھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کا ادب رزمیہ اور عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہے۔ پندرھویں صدی سے پہلے کا کوئی بھی شعر بلوچی میں نہیں ملتا۔ بلکہ میر مشھک تک بلوچی شعر کا سراغ نہیں ہے۔ لیکن پندرھویں صدی کا جو شعر ملا ہے، اس کے لسانی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں بھی بلوچی زبان میں شعر کہا جاتا ہوگا۔

۳- رند خاندان کا عہد (۱۴۸۸ء۔۱۵۵۵ء)

اس دور کا سیاسی و تاریخی پس منظر باب اول میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ دور اس لیے بھی اہم قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں کئی رومان ظہور پذیر ہوئے۔ حانی اور شہ مرید، بیبرگ و گراناز کی عشقیہ داستانیں اسی عہد میں وجود میں آئیں۔ شہداد اور ماہ ناز کی درد انگیز جدائی بھی اسی دوَر میں جنم لیتی ہے۔ ان رومانوی داستانوں کا ہی اثر ہے کہ بلوچی شاعری کے مزاج میں رزمیت کے ساتھ رومانیت کا عنصر بھی داخل ہوگیا، جو بعد میں اس شاعری کا حصہ بن گئی۔ یعنی اسی دور میں رزمیہ شاعری اور عشقیہ شاعری کی بنیاد پڑی۔ رزمیہ نظموں سے بلوچی فطرت اور مزاج، معاشی و معاشرتی حالات اور تہذیب و ثقافت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ جب اپنے دشمن سے انتقام لیتے ہیں، تو مبازرت طلب کرتے ہیں۔ لاشاریوں کا سردار گوہرام خان جب میر مان کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے تو اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھتا، بلکہ چاکر سے سر بازار کہتا ہے کہ:

ترجمہ: اے چاکر! میر مان کو،
(جسے تم سیلاب اور طوفان سے کم نہیں سمجھتے تھے)
میں نے قتل کیا ہے، اور
اس کا جسم ایسا ریزہ ریزہ ہوگیا ہے، کہ
زمین و آسمان میں کہیں بھی تم کو
اس کے جسم کا کوئی حصہ نہیں مل سکے گا!
اگر تم آسمان پر سیڑھیاں لگا سکتے ہو

ترجمہ : اگر تم ڈھاڈھر کے پہاڑوں کو ہلا سکتے ہو
تو میدانوں میں آؤ ، اور
میر ماں کا بدلہ مجھ سے لو !

اس نظم میں بلوچوں کی فطرت کی عکسی بھی ہے تو جنگ کے مناظر بھی - بہادروں کی بہادری کی تعریف اور گھوڑوں کی تعریف --- مل رند اپنے گھوڑے کی تعریف یوں کرتا ہے :

''میرا گھوڑا جب ہنہنانے لگتا ہے ، تو بزدل اسے نعرہ سمجھ کر اپنی ہمت ہار دیتے ہیں اور ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے -''

خوف اور دہشت کے لیے ایسے استعارے اور تشبیہیں بلوچی شاعری کی انفرادیت کو اجاگر کرتی ہیں - یہ رزمیہ نظمیں مکالموں کی صورت میں ہیں - یعنی واقعات کو کردار اپنی زبانی بیان کرتے ہیں - اس سے مغالطہ ہوا ہے کہ یہ اشعار ہی ان کے ہیں اور بعض محققین نے میر چاکر خان ، میر گوہرام خان وغیرہ کو شاعر قرار دے دیا ہے ، حالانکہ یہ دوسرے شاعروں کی نظمیں ہیں اور انہوں نے یہ مکالماتی انداز میں لکھی ہیں -

عشقیہ داستانوں میں سے مشہور داستانیں مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) شہ مرید کہری وحانی (۱۴۹۴ء) (۲) بیبرگ و گراناز (۱۴۹۵ء)
(۳) میر شہداد ماہ ناز (۱۵۰۰ء) - (۴) دوستین شیریں-

۱- شہداد ماہ ناز

یہ نظم بلوچی مزاج ، ثقافت و تہذیب کی آئینہ دار ہے - بر موقع تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے ایک عمدہ شعری تصنیف ہے - شہداد نے ماہ ناز کو غلط فہمی کا شکار ہو کر میکے بھیج دیا - ماہ ناز نے غلط فہمی دور کرنا چاہی - لیکن شہداد نے اس کی بات نہ سنی اور اسے طلاق دے دی - جب شہداد نے ماہ ناز کو طلاق دے دی ، تو اس نے انتقام کے طور پر عمر لنگڑہ سے شادی کر لی - کیونکہ اس پر عمر لنگڑہ سے ناجائز تعلقات کا الزام ہی لگایا گیا تھا - بعد میں شہداد نے کہنا شروع کیا کہ ماہ ناز پر جو الزام لگایا گیا تھا وہ صحیح ہے - ماہ ناز اس بات پر طنز کرتے ہوئے کہتی ہے :

ترجمہ : اگر تمہیں افلاس نے گھیر لیا ہے ،
تو رند اپنی روایات کے مطابق

تمہیں چندے کی صورت میں مال و زر دیں گے ۔
میں عمر کی اجازت سے ،
اپنا دبلا پتلا بیٹا ''نونک'' یا
گھمبیر زلفوں والی بیٹی بانڑی دوں گی ۔
تمہاری عقل اس مشکیزے کی مانند ہے ،
جو گدڑیوں کے کندے پر لٹکا رہتا ہے ،
اور ، جس کا ایک سرا
ہر وقت خشک رہتا ہے
اسی لیے تو مر گو تمہیں فریب دینے میں کامیاب ہو گئی !

یہ نظم طنز اور بلوچی بہادرانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہوئی تشبیہات سے بھری ہوئی ہے ۔

۲- بیبرگ و گراناز

چاکر خان اور گوہرام خان کی لڑائی کے دوران میں جب نالی کے مقام پر چاکر خان کو شکست ہوئی تو وہ انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا ، چنانچہ فوجی کمک لینے کے لیے وہ قندھار روانہ ہوا ۔ وہاں اس کا ساتھی بیبرگ حاکم قندھار کی بیٹی گراناز پر عاشق ہوگیا ۔ حاکم قندھار نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا ۔ وہ وہاں گراناز کے حسن و جمال کی تعریف میں اپنی بھدی آواز سے گاتا رہتا ۔ گراناز کو پریشانی ہوئی ۔ اس نے باپ سے کہہ کر اسے رہا کروا دیا ۔ رہا ہونے کے بعد وہ گراناز سے ملا اور اسے اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا اور گراناز کو لے بھاگا ۔ رند اور لاشاری آپس میں مل گئے اور بلوچوں کو پیغام بھیجا کہ کہ اگر بیبرگ اور گراناز کو ان کے حوالے نہ کیا تو خیر نہیں ۔ بیبرگ خود ہی موقع پا کر حاکم قندھار ۱ کے خیمے میں داخل ہوگیا اور اپنی خطا معاف کروا لی اور گراناز سے شادی کی اجازت حاصل کر لی ۔

بیبرگ کو جب گراناز کہتی ہے کہ ـــــ یہ خیال ترک کر دو چشم زدن میں ترک کر دو چشم زدن میں ترک سپاہی تمہارا سر تن سے جدا کر دیں گے ـــــ تو بے پرواہ بلوچ کی طبیعت پر ذرہ برابر خوف نہیں ہوتا ۔ وہ ماہ ناز سے کہتا ہے :

''اے حسن کی ملکہ ـــــ آج تک کسی ماں نے اس شہسوار کو جنم ہی نہیں دیا جو

۱- ڈیمز کے خیال میں حاکم قندھار شاہ بیگ ارغون ہوگا ، جس نے پہلے سبی فتح کیا اس کے بعد سندھ فتح کیا ۔

میرا سر کاٹ کر ہرات کے دروازے پر لٹکا دے!"

قدیم بلوچی شاعری میں اس نظم کو بلند ادبی مقام حاصل ہے۔ حسنِ بیان اور روانی کا یہ اعلیٰ نمونہ ہے۔

۳۔ شہ مرید حانی

شہ مرید رند سردار مبارک کا بیٹا تھا، شہ مرید بہادر اور نڈر سپاہی تھا۔ بچپن سے اپنے چچا کی بیٹی حانی سے منسوب تھا۔ حانی بے حد حسین تھی۔ میر چاکر خان اس پر فریفتہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے اس کی نسبت ٹوٹ جائے چنانچہ جب سب رند سرداروں سے اس نے قول لیے تو سہ مرید سے بھی لیا۔ شہ مرید نے کہا کہ صبح سویرے دستِ سوال دراز کرنے والے کو وہ خالی نہیں لوٹائے گا۔ کچھ ہی دنوں بعد چاکر خاں نے ایک شخص کو فقیر بنا کر شہ مرید کے ہاں بھیجا، اور اس طرح شہ مرید حانی کو ہار گیا۔ چاکر خاں نے حانی سے نکاح کر لیا۔ لیکن اس کا دل نہ جیت سکا۔ مرید نیم پاگل ہوگیا اور فقیر بن کر حرمین شریف چلا گیا۔ طویل عرصے کے بعد واپس آیا۔ خبر مشہور ہوگئی۔ حانی کی زندگی میں بہار آ گئی۔ بلوچ سرداروں نے میر چاکر خاں سے درخواست کی کہ وہ حانی کو طلاق دے دے چنانچہ وہ مان گیا، اور مرید ایک برق رفتار سانڈنی پر حانی کو لے کر کہیں اور چلا گیا۔

اس نظم کا مصنف بھی شہ مرید اور حانی کو سمجھ لیا گیا ہے ۱۔ اس داستان میں ڈرامائی رنگ ہے، ہیر کے قصے میں بھی اس طرح ہیر کی طرف سے جوابات موجود ہیں۔ جس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ہیر شاعرہ تھی۔ دوسری بلوچی عشقیہ داستانوں کی طرح اس داستان میں بھی بزم و رزم کے منظر، مکالمات کا سادہ اور پر لطف سلسلہ اور شاعرانہ خصوصیات کی حامل زبان و بیان موجود ہے اور اس کا ہیرو دوسری بلوچی داستانوں کی طرح بہادر اور نڈر ہونے کے علاوہ سچا عاشق بھی ہے۔ جو قول کا پکا مرد جوان ہے۔ بلوچی کی ہر داستان میں فنی خلوص نمایاں ہے۔

۴۔ دوستین اور شیریں

جب شاہ بیگ ارغون کے ترک لشکر نے رندوں پر حملہ کیا، تو دوستین لڑتا

۱۔ سید کامل القادری نے بھی لکھا ہے کہ "قطعیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکالمے واقعی ان کے (شہ مرید اور حانی) ہیں، یا سوبھا ڈوم کی داستان طرازی ہے"۔ حانی و شہ مرید کے اجزائے پریشان تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ (بلوچی دلیا ج نمبر ۵، ۶ جام ورک نمبر ص ۵۵)۔

ہوا قید ہوگیا ۔ اور ہرند یا اڑند کے قلعے میں قید کر دیا گیا ۔ اس کی منگنی لال خان رند کی لڑکی شیریں سے طے ہوئی تھی ، جس سے اس کو محبت تھی ۔ قید خانے میں اسے کئی برس بیت گئے ۔ جب شیریں کے والدین کو دوستین کے زندہ بچنے کی امید نہ رہی تو انہوں نے شیریں کی نسبت ایک اور جگہ ٹھہرا دی ۔ اتفاق سے اس کا نام بھی دوستین ہی تھا ۔ عین شادی والے دن دوستین بھاگ کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ تو دیکھا کہ شیریں کی شادی ہو رہی ہے ۔ وہ موقع پر پہنچا اور خود کو ڈوم ظاہر کر کے گانا شروع کیا ۔ شیریں نے دوستین کی آواز پہچان لی اور یہ بات جب رندوں کو معلوم ہوئی تو سب اس سے گلے ملے اور خود دولہا نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا : ''اب جب کہ تم واپس آ گئے ہو میں تمہاری امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں ۔''

یہ کہانی نثر میں ہے اور درمیان میں اشعار بھی ہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شاعر کا کیا نام ہے ۔ اس داستان میں بھی جو خاص عنصر ہے وہ یہ کہ اپنا ہی ماحول پیش کرتی ہے ۔ تشبیہیں اور استعارے بھی اپنے ہی ماحول سے لیے گئے ہیں ۔ جس کی وجہ سے فن میں بے پناہ خلوص نظر آتا ہے ۔ یہاں کے شاعر حقیقت پسندانہ طریقے سے اپنے معاشرے اور ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

اس دور کے بلوچی شعراء

کیونکہ بلوچ شاعر ، محفل میں شعر سنانا یا گانا عیب سمجھتا تھا ، اس لیے عام طور سے وہ کسی ڈوم کو شعر یاد کرایا کرتا تھا ۔ اور وہ ڈوم شاعر کے شعر محفل میں سناتا تھا ۔ بلوچوں کی خدمتگار قوموں میں لوڑی بھی ہیں ، جو کثیر التعداد ہیں ۔ ان کے دو طبقے ہیں ۔

(۱) سرمستاڑی ، جو زرگر ، آہن گر ، دار تراش اور بڑھئی کا کام کرتے ہیں ۔ ان کے جد اعلیٰ کا نام سرمست تھا ۔ (۲) دوسرا طبقہ ڈھول بجاتا ہے اور شعر سناتا ہے ۔ ایک روایت کے مطابق وہ بلوچی نسل سے نہیں ، بلکہ ہندی نسل ہے ۔ ڈوم گو خود شاعر نہیں ہوتے اور دوسروں کے شعر یاد کر کے سناتے ہیں ، لیکن لوڑی خود بھی شاعر ہوتے ہیں ۔ وہ بلوچوں کو بھڑکانے کے لیے محفل میں شعر سناتے ہیں اور غلو سے کام لیتے ہیں ۔ وہ تاریخی واقعات اور رومانی داستان منظوم کرتے ہیں ۔ مرکزی کرداروں کے مکالمے ان کی زبان سے ادا کراتے ہیں ۔ جن سے ان کا مزاج ، فطرت اور کردار واضح ہوتا ہے اور کہانی کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے ۔ رزمیہ نظمیں اور رومانوی داستانیں جو مہیا ہوئی ہیں

وہ اکثر لوڑیوں کی ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کچھ بلوچ شعراء کی بھی ہیں۔ لیکن اکثریت سے ان نظموں کے شعراء کے نام نہیں ملتے۔

چونکہ یہ نظمیں مکالماتی انداز میں ہیں۔ اس لیے ان داستانوں اور نظموں کے مرکزی کرداروں کو شاعر سمجھ لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں چاکر خان، گوہرام خان، شہ مرید، حانی، نور بندغ وغیرہ کو شاعر قرار دیا گیا ہے۔ ان میں نہ صرف مرکزی کرداروں کی کی طرف سے مکالمے ملتے ہیں بلکہ دوسرے کرداروں کے مکالمے بھی موجود ہیں۔ اگر مرکزی کرداروں کو شاعر سمجھا جاتا ہے تو دوسرے کرداروں کو بھی اپنے مکالمات کا شاعر کیوں نہیں سمجھا جاتا ہے —— دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہر نظم میں مختلف شاعروں کے اشعار ہیں، تو ان کو یکجا مرتب کرنے والے کون ہیں؟ رزمیہ نظمیں اور منظوم رومانی داستانوں کے شعراء کی نشان دہی اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ ان کے کلام کا کچھ اور حصہ بھی مل جائے۔ اس لیے یہ اپنی داستان کا شاعر خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے کچھ شعراء کے نام معلوم ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

(۱) ڈومبکی شاعر

بلوچی حسب نسب سے متعلق مشہور نظم جس کو ''دیتر شیٹر'' کہا جاتا ہے، ایک ڈومبکی شاعر کی ہے۔ لیکن اس کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔ ڈیمز کے خیال میں یہ نظم سولھویں صدی کے شروع کی ہے[۱]۔

(۲) رند شاعر

رند اور لاشار کی مشہور تیس سالہ جنگ کے متعلق دو نظمیں ہیں۔ یہ کسی رند قبیلے کے شاعر کی ہیں۔ لیکن شاعر کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس جنگ کے متعلق ایک اور طویل نظم ملتی ہے جو پانچ چھوٹی نظموں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور تیسری نظم گوہرام خان کی زبانی ہے۔ جن میں چاکر خان سے خطاب ہے۔ اسی بات سے یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ نظمیں چاکر خان اور گوہرام خان کی ہیں۔

(۳) قلاتی بن حبیب

ایک طویل نظم جس کے شروع میں بلوچی حسب نسب ہے اور اس کا اختتام رند اور

۱- Dames, Popular Poetry of the Baluchees. p. 1

لاشار کی جنگ پر ہونا ہے ۔ نظم سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ قلاتی بن حبیب کی ہے ۔

(۴) نودہ بن بہرام

ایک نظم جس میں ''گوہر جتنی'' کا ذکر ہے ، نودہ بن بہرام کی ہے ۔ گوہر جتنی پر رند اور لاشار کی جنگ چھڑی تھی ۔

(۵) بیبرگ

اس کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ چاکر خان کے ساتھیوں میں سے تھا اور اس کا بھانجا تھا ، جو کہ سولھویں صدی میں گزرا ہے۔ گراناز سے اس کے رومان کا ذکر آ چکا ہے ۔ اس رومانی داستان کے علاوہ بھی اس کے کچھ اشعار ملتے ہیں ۔ نمونے کے طور پر کچھ اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

ترجمہ : نوجوانو! میرا مشورہ قبول کر لو ، اور
افسردگی اور یاسیت کے تاریک سایوں
سے بچنے کی کوشش کرو ۔
میں خود غم اور نا امیدی کی سرحدوں
سے بہت دور رہتا ہوں ، اور
گھوڑوں کی زین پر بیٹھنا
حسین دوشیزاؤں کے نازک ہونٹوں
سے پیار کرنا !
شرفا کی مجلس میں شریک ہونا ، اور
پہاڑی بکرے کا گوشت کھانا پسند کرتا ہوں !

(۶) میر شہداد خان

شاہ بیگ ارغون ۱۵۱۱ء میں قندھار سے روانہ ہوئے اور سبی کو فتح کر کے واپس چلے گئے ۔ اس طرح سبی پر سے رندوں کا قبضہ ختم ہو گیا ۔ رندوں کی طاقت ختم ہونے کی وجہ سے میر چاکر خان رندوں کے ساتھ پنجاب کی طرف بڑھا ۔ بلوچ روایات کے مطابق رندوں نے ہمایوں کی مدد کی اور ہمایوں کو ۱۵۵۵ء میں فتح ہوئی ۔ پنج ند کے علاقے میں ہمایوں نے رندوں کو جاگیریں دیں اور وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں بس گئے ۔ لیکن ہمایوں کی فتح

سے پہلے میر چاکر خان فوت ہو چکا تھا ۔ میر چاکر خان کے بیٹے میر شہداد خان کی ایک نظم ملی ہے ۔ جس میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ رندوں کا لشکر ہی ہمایوں کی واپسی پر ہمایوں کی امداد میں سوریوں سے لڑا تھا اور انہیں کی وجہ سے ہمایوں کو فتح ہوئی تھی ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ نظم سولھویں صدی کے آخری نصف کی ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر شہداد خان شاعر تھا ۔ اس کے شاعر ہونے کا ایک اور ثبوت بھی ملتا ہے ۔ اس کی ایک اور نظم ملتان کی تاریخ کے متعلق بھی ہے ۔ اس میں ہندو دیومالا کے مطابق ملتان کی قدامت کا ذکر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ملتان میں رہائش کے دوران ملتان کی تاریخ کے متعلق کہانی سن کر اسے منظوم کیا ہے ۔

(۷) ریحان رند

ریحان ، چاکر خان کا چچا زاد بھائی تھا اور سالو اس کی محبوبہ تھی اس نے ایک نظم لکھی ہے ، جس میں وہ اپنی محبوبہ کی موت پر غم کا اظہار کرتا ہے ۔ اس کے آخر میں کہتا ہے :

ترجمہ : میں بھی رونے لگا ، جس طرح
برسات میں بادلوں سے مینہہ برستا ہے ۔
نوجوانو ، اس چیز کو سمجھو
کہ یہ جسم خالی ہے ۔
اس لیے مت روؤ !
یہ دنیا گزر جانے والی چیز ہے !

اس کے علاوہ ریحان کی ایک اور نظم ''رحان لاشاری اور ریحان رند کی گھوڑ دوڑ'' کے متعلق بھی ہے ۔ ڈیمز کے خیال میں یہ بلوچی کی قدیم ترین نظم ہے[۱] ۔ لیکن اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ جس واقعہ کا اس میں بیان ہے یہ اس وقت کا ہے جس وقت چاکر خان رند نے سبی کو فتح کیا تھا ۔ یعنی یہ نظم پندرھویں صدی کے آخر کی ہے ۔ ایک اور نظم بھی اسی گھوڑ دوڑ کے متعلق ہے جس میں ریحان اپنے جذبات اور احساسات بیان کرتا ہے ۔

(۸) میران رند

میران چاکر خان کا ساتھی تھا ۔ اس کی ایک نظم ملی ہے جس میں وہ کبوتر کو

۱- Dames, Popular Poetry of the Baluchees, p. 122.

محبوب کے لیے پیغام دیتا ہے۔ یہ نظم پہلے میٹر نے "بلوچی کلاسکس" میں دی ہے۔ اس کے بعد ڈیمز نے نقل کی ہے۔

اس دور کی ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کے شعراء کے نام باوجود تحقیق کے نہیں ملتے۔ ہوسکتا ہے یہ لوڑیوں کی بنائی ہوئی ہوں۔

(۱) چاکر خان اور ہیبت خان کے متعلق نظم

(۲) چاکر خان اور جاڑو کے متعلق نظم

ان نظموں میں ایفائے عہد کے متعلق کہانیاں ملتی ہیں۔

(۳) نور بندغ کے متعلق نظم

جس نے چاکر خان کی زندگی بچائی تھی۔ وہ لاشاری تھا اور سخی مرد تھا۔

(۴) دل ماسخ کے متعلق نظم

ایک رند شخص "دل ماسخ" کا ذکر ہے۔ جس نے اپنی تمام دولت جوئے میں ہار دی تھی۔ اندازاً یہ سولھویں صدی کی نظم ہے۔

(۵) رندوں اور دو دائیوں کی جنگ کے متعلق نظم

میر چاکر خان کے بعد رند، قلات و ڈیرہ جات اور سندھ و ملتان میں پھیل گئے اور ان کی آپس میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ ان میں میر بجار خان رند (جو نجاب نہیں گیا تھا) اور سہراب دودائی کے درمیان جنگ سب سے بڑی جنگ ہے۔ یہ اس قبائلی بلوچی شاعری سے ملتا ہے۔ اس لڑائی سے متعلق ایک نظم ڈرامائی انداز میں ہے۔ یہ نظم بھی سولھویں صدی کے نصف آخر کی ہے۔

(۶) شہداد کی ولادت کے متعلق نظم

شہداد میر چاکر خان کا بیٹا تھا۔ اس نظم میں دکھایا گیا ہے کہ شہداد کی ولادت اس وقت ہوئی جب میر چاکر خان دہلی گیا ہوا تھا۔ دہلی جانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس مبالغہ کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم کسی لوڑی کی بنائی ہوئی ہے۔

خوانینِ قلات کا عہد (۱۶۵۰ء — ۱۸۹۰ء)

اس عہد کا تاریخی پس منظر فصل اول میں دیا جا چکا ہے ۔ یہاں اس عہد کے ادب کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔ خوانینِ قلات کے عہد میں درباری زبان فارسی تھی ۔ اس وجہ سے فارسی میں شعر کہنے کا رواج ہوا ، فارسی کے ساتھ خوانینِ قلات نے بلوچی کی بھی سرپرستی کی ۔ اس دور کی بلوچی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا ۔ رزمیہ شاعری کے ساتھ ساتھ عشقیہ شاعری بھی کہی جانے لگی ۔ بلکہ عشقیہ شاعری زیادہ ترقی کرنے لگی اور اس شاعری میں نہ صرف عوام کی زندگی کی ترجمانی کی گئی بلکہ امیر طبقہ کی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے ۔ اس دور میں مذہبی شاعری کی بنیاد بھی پڑی ۔ آگے چل کر اس کا زیادہ رواج ہو گیا ۔ زبان کے لحاظ سے فارسی ، سندھی اور سرائیکی زبانوں کا اثر بلوچی زبان پر پڑا ۔ اس دور کی نظمیں تو ملتی ہیں لیکن سعراء کا اکثر پتہ نہیں چلتا ۔ سترھویں صدی کی نظمیں سولھویں صدی سے کم ملتی ہیں ۔ سترھویں صدی کے شعر کے محفوظ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں بلوچوں کی طاقت کمزور ہو گئی تھی اور ان میں کوئی مرکزیت نہ تھی ۔ بہر حال اس دور کے جتنے شعراء کے نام ملے ہیں ان کا تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے اور ان نظموں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جنکو منظوم کرنے والے سعراء کا علم نہیں ہو سکا ۔

(۱) کلمتوں اور برکتوں کی جنگ کے متعلق نظم

کلمتی۱ بلوچ تھے اور برقی سندھی تھے جو لس بیلہ میں رہتے تھے ۔ کلمتی جہاز ران تھے ۔ اکبر نے انہیں چاچکان کا علاقہ جاگیر میں دیا تھا ۔ ۱۶۵۲ء میں اورنگ زیب سندھ اور ملتان کا نائب تھا ۔ اسی کے زمانہ میں یہ جنگ ہوئی ۔

ایک اور زرمیہ نظم مرزائیوں اور جالیوں کی جنگ کے متعلق ہے ۔ یہ لڑائی اٹھارویں صدی میں ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مزرائی لوڑی کی لکھی ہوئی ہے ۔ یہ نظم پہلے لیچ نے قلات سے قلمبند کرکے اپنی کتاب میں دی ، بعد میں ڈیمز نے اسے نقل کیا۲ ۔

۳۔ بلوچ ہمسایہ کے حقوق کا بڑا خیال رکھتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات

۱۔ اصل لفظ "قرمطی" ہے جو ایک انتہا پسند شعیہ مذہبی فرقہ تھا اور اسماعیلوں کی ایک شاخ تھا ۔ جو بلوچ قرمطی ہو گئے تھے وہ قرمطی کہلانے لگے بعد میں یہ لفظ کلمتی بن گیا ۔ قرمطی مذہب والے دسویں صدی عیسوی میں مکران میں وارد ہوئے ۔ انہوں نے مکران کے علاوہ منصورہ اور ملتان پر بھی قبضہ کیا ۔ محمود غزنوی نے ان کا خاتمہ کیا ۔

۲۔ "Dames, Popular of Poetry of the Baluchees" p. 60.

ملتے ہیں۔ ''گوہر جتنی'' کی ہمسائیگی پر رند اور لاشار کی جنگ چھڑی جو تیس سال تک رہی۔
اسی قسم کا اور واقعہ بھی ملتا ہے جو ایک عورت سمی کے متعلق ہے۔ یہ واقعہ اٹھارویں صدی کا ہے۔ اس سلسلہ کی کچھ نظمیں دورہ خان کی والدہ اور دورہ خان کے بھائی کی زبانی آئی ہیں۔ لیکن وہ ان کا کلام نہیں ہے۔ شاعروں نے منظوم کرتے ہوئے البتہ مکالمے ان کی زبانی کہلوائے ہیں۔ سمی ایک مالدار عورت تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق وہ بلیدی قبیلہ کو چھوڑ کر گوز گیج قبیلہ کے سردار دورہ خان کی ہمسائیگی میں جا کر پناہ گزیں ہوگئی۔ ایک دن خبر آئی کہ راہزن سمی کی گائیں ہانک کر لے گئے ہیں۔ یہ خبر جب دورہ خان کی والدہ کو پہنچی وہ فوراً اپنے بیٹے کے پاس گئی۔ اسے نیند سے جگایا اور بولی :

ترجمہ : جو بہادر لوگوں کو پناہ میں لیتے ہیں ،
وہ دوپہر کو یوں غافل نہیں سوتے !
میں نے نو ماہ تجھے پیٹ میں رکھا ہے
اور تین سال تک تجھے دودھ پلایا ہے !
اس کے عوض میں تیرے ذمہ
یہ فرض عائد کرتی ہوں ، کہ
یا تو سمی کی گائیں صحیح سلامت لے آ ،
یا اپنی جان عزیز قربان کر دے !

دورہ خان گائیں تو واپس نہ لا سکا لیکن اس نے اس جستجو میں اپنی جان قربان کر دی۔ بالاچ گو ایک کم سن بچہ تھا ، لیکن اس نے عہد کیا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لے گا۔ اس جذبہ میں خلوص ، انتقام جوئی اور ہمسایہ کے حقوق کی حفاظت کے احساسات کارفرما ہیں۔ انتقام جوئی کے متعلق بلوچ قوم میں کوئی مدت یا میعاد مقرر نہیں۔ چنانچہ بالاچ کہتا ہے :

ترجمہ : بلوچ خون کا بدلہ
اس لیے نہیں چھوڑ سکتا ، کہ
واقعہ گزرے ہوئے مدت ہوگئی ہے !
یا ،
بدلہ لینے والا کمسن و کمزور ہے !

۴۔ ایک نظم میں اس حملے کی تفصیل ملتی ہے جو لغاریوں اور گورپانیوں نے مل کر

لڈوں پر کیا ۔ اس میں کثرت سے سندھی ترکیبیں ملتی ہیں ۔ یہ نظم اٹھارھویں صدی کے آخر کی ہے اور کسی لوڑی کی لکھی ہوئی ہے ۔

۵۔ ایک نظم میں جتوئیوں اور مزرائیوں کی جنگ کا ذکر ہے ۔ اس نظم میں پہلے حمد ہے اس کے بعد شاعر نے اپنے مرشدوں عالم ساہ اور والی حسین شاہ کا نام لیا ہے بعد میں واقع بیان کیا ہے ۔

۶۔ ایک نظم میں میر حمل خان کا ذکر ہے جو مزرائیوں کا سردار تھا ۔ اس کے زمانہ میں ایک خاص قسم کے جوئے میں پانچ آدمی مر گئے تھے ۔ چنانچہ حمل خان نے جوئے پر پابندی لگا دی تھی ، لیکن ایک دن اس کا اپنا بیٹا مٹھا جوا کھیلتے ہوئے پکڑا گیا ۔ میر حمل خان نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور اسے پکڑنے کا حکم دے دیا ۔ لیکن مٹھا دیوار پھلانگ کر بھاگنے لگا کہ باپ کے تیر سے ایک ٹانگ کھو بیٹھا ۔اس کے بعد مزرائیوں میں جوا بالکل بند ہوگیا ۔

۷۔ ایک نظم مریوں اور موسیٰ خیلی پٹھانوں کی لڑائی کے متعلق ہے ۔ یہ نظم انیسویں صدی کی ہے ۔ اس میں مریوں کی تعریف کی ہے ۔ شاعر کا نام معلوم نہیں ہوتا ۔

۸۔ ایک نظم میں کھوسوں اور لغاریوں کی لڑائی کا ذکر ہے ۔ اس کے چار حصے ہیں ۔ اس نظم میں انداز ڈرامائی ہے ۔ یہ نظم بھی انیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہے ۔

عشقیہ نظمیں

۱۔ بیبرگ و گراناز کے واقعہ پر ہر دور میں شعراء طبع آزمائی کرتے رہے ، چنانچہ اس دور میں بھی اس داستان پر نظمیں کہی گئیں ۔

۲۔ شیریں فرہاد کی نظم اس دور میں منظوم ہوئی ۔

۳۔ بلوچی رومانی داستان ''دوستیں شیریں'' کے متعلق کچھ نظمیں اس دور کی بھی ملتی ہیں ۔

۴۔ للہ و گراناز

یہ اس دور کی خاص کہانی ہے ۔ میر باران کلمت کا مشہور شخص تھا ۔ گراناز اس کی بیٹی تھی جس کی شادی للہ سے ہوئی ۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی میر باران کو دشمن سے لڑنے جانا پڑا ۔ للہ کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ گھر پر پڑا رہے ، چنانچہ وہ

بھی ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ میر باران اور اس کے دوسرے لڑکے جنگ میں کام آئے۔ للہ زخمی ہو گیا۔ گھوڑا اسے اس کے والدین کے گاؤں لے گیا۔ گراناز کو خبر ملی تو وہ غلط فہمی کا شکار ہوئی، وہ سمجھی کہ للہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ چنانچہ اس نے للہ کو پیغام بھیجا۔

ترجمہ:

جب جنگ شروع ہوئی، تو میں
اپنی سہیلیوں سے تمہاری بہادری کا تذکرہ کر کے
فخر محسوس کرتی رہی۔
مگر تمہیں لڑائی کے وقت حسیناؤں کی مجلسیں
اور آرام دہ گھر یاد آتے رہے۔
تم میرے لیے شوہر کی بجائے بیٹے کی مانند ہو،
جسے میں نے دودھ پلا کر پالا ہو!

للہ کو گراناز کا یہ توہین آمیز پیغام پہنچا تو اس نے جواب دیا۔

ترجمہ:

اگر اس کے زخم بھر گئے
تو وہ گراناز کے والد اور بھائیوں کے
قاتلوں کے لیے آبِ سرد بن کر نہیں رہے گا۔

صحتیاب ہونے کے بعد للہ نے دشمنوں سے بدلہ لیا۔ اس کے بعد گراناز کو احساس ہوا کہ للہ بہادر اور غیّور ہے۔ وہ للہ کے لیے بیتاب تھی، لیکن کیا کرتی؟ اس نے قسم کھا لی تھی۔ آخر اس نے مّلا سے رائے لی۔ مّلا نے رائے دی کہ اگر گراناز زندگی بھر زیور پہننا ترک کر دے اور للہ بھنگ پینے سے عمر بھر گریز کرے تو یہ دونوں پہلے کی طرح میاں بیوی کے طور پر رہ سکیں گے۔ چنانچہ پابندی سے دونوں نے یہ سرطیں قائم رکھیں اور مل کر رہنے لگے۔ اس داستان میں نو نظمیں ہیں، جن میں للہ اور گراناز ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں۔ یہ قصہ سترھویں صدی کا ہے[۱]۔ یعنی یہ نظمیں سترھویں صدی کی ہیں۔

شعراء

اس دور کے شعراء کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ بشیر احمد کا مضمون "للہ اور گراناز" ماہنامہ بلوچی دنیا، ص ۱۹۔ فروری ۱۹۶۳ء

۱۔ عثمان کلمتی

مکران کا بلند پایہ شاعر گزرا ہے۔ اس کا رزمیہ کلام کلمتی بلوچوں اور پرتگیزوں کی بحری جنگوں کے متعلق ہے۔ پرتگیزوں نے مکران کی بندرگاہوں پر حملہ کیا تھا۔ بلوچوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ان کی توپوں پر قبضہ کیا۔ اس لڑائی میں ''حمل جئیند کلمتی'' ان سے لڑتا ہوا شہید ہوا——عثمان کلمتی نے اس کے سرفروشانہ کارناموں کو منظوم کیا ہے۔ بعد میں یہ کلام حمل کلمتی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

۲۔ عسیف

یہ بھی اسی دور کا شاعر ہے[۱] لیکن اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ ان کی شاعری کا اسلوبِ بیان قدیم اور سادہ طریق بیان کے مقابلے میں دشوار اور مشکل ہے۔ فارسی ترکیبیں اور الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں۔ تشبیہیں بھی کثرت سے استعمال کرتے ''وہ زہرہ کی طرح اعلیٰ ترین ہے، جو حسینوں کی ملکہ اور حاصلِ زندگی ہے، جو لعل بدخشاں کی طرح گراں بہا ہے''۔[۲]

۳۔ حمل رند

حمل کلمتی کے علاوہ رند کو بھی شاعر سمجھا گیا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہادر تھا اور سمر سے بھی اس کا مقابلہ ہوا تھا۔ اس کو ماہ ناز نامی ایک خاتون سے محبت تھی۔ اس کے متعلق بھی اشعار ملے ہیں چنانچہ اس کو بھی شاعر سمجھا گیا ہے، حالانکہ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا اس سے منسوب جو نظم میر خدا بخش مری نے دی ہے[۳] اس کے متعلق خود لکھا ہے:

''مکالمے کی صورت میں ہے جس میں حمل، شیر، ماہ ناز اور اس کی چھوٹی بہن حصہ لیتی ہیں''۔

قیاس سے کہا جاتا ہے کہ یہ نظم خود حمل کی نہیں ہو سکتی۔ یہ نظم مناظرہ کی صنف میں ہے اور شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے اعلیٰ پایہ کی ہے۔

۱۔ میر مٹھا خان مری، (مقالہ) ثقافت اور ادب وادیٔ بولان میں، ص ۱۳۶ بزم ثقافت کوئٹہ، ۱۹۶۶ء

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔

۳۔ میر خدا بخش بجارانی مری، ''قدیم بلوچی شاعری'' بزم ثقافت کوئٹہ ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۹ تا ۱۴۵۔

۴۔ بانک سیمک

اس بلند پایہ بلوچی شاعرہ نے صرف موتک[1] کہے ہیں بلکہ اس نے اپنے بہادر شوہر کی یاد میں ایسے المیہ گیت بھی کہے ہیں جو غیرفانی حیثیت حاصل کر چکے ہیں ۔ وہ ہر چیز میں نتا سے متعلق کسی نہ کسی چیز کا رنگ دیکھ لیتی ہے ۔ اس کے سوز و گداز سے بھرپور گیتوں میں نغمگی بھی ہے تو تخیّل کی بلند پروازی بھی ، فنی پختگی بھی ہے نو موزوں تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں ۔ ان خصوصیات نے اس کو منفرد مقام دیا ہے ۔ چند اشعار کا ترجمہ دیا جاتا ہے :

ترجمہ :

بادلو ! برسو ، بزرگوں کے مزارات پر برسو !
برسو اور پھر تھم جاؤ!
کہ حسین نتا کے درشن ہو جائیں گے ۔

اس عظیم شاعرہ کے زمانہ کا تعیّن نہیں ہوتا ۔ لیکن اس شاعرہ کے اسلوبِ بیان اور مضمون کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سترھویں صدی کی آخر یا اٹھارھویں صدی کی شروع کی شاعرہ ہے ۔

۵۔ شہ عیسوا

بلوچی کا با کمال شاعر گزرا ہے ۔ اس کے شعر کی زبان صاف اور شستہ ہے اور اس نے اپنے جذبات اور احساسات مؤثر نوع میں بیان کیے ہیں ۔ احساسات کی اس گہری عکاسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کا ہے ۔

۶۔ شہ یار

یہ گوچانی قبیلہ سے تھا ۔ اس نے اس لڑائی کے واقعات منظوم کیے ہیں جو گورچانیوں اور مزاریوں کے درمیان ہوئی ۔ قیاس سے کہا جاتا ہے کہ یہ اٹھارھویں صدی میں گزرا ہے کیونکہ یہ جنگ ۱۷۰۰ء میں ہوئی ۔ اس لڑائی کے متعلق ایک اور نظم بھی ہے جس میں مزاری سردار حمل خان کو اپیل کی گئی ہے کہ جو کامیابیاں انہیں ہوئی تھیں ان پر مطمئن

۱۔ لوک گیت کی ایک صنف جس میں کسی کی موت پر نوحہ ہوتا ہے ۔

ہو جائیں اور لڑائی کو طول نہ دیں ۔ شاعر کا نام معلوم نہیں ہوتا ۔ لیکن ڈیمز کا خیال ہے کہ یہ اسعار بعد کے ہیں کیونکہ ان میں خیالات کو لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔

۷- جام درک

بلوچی زبان کے اس شاعر کو ملک الشعراء کہا جاتا ہے ۔ یہ ڈومبکی قبیلہ سے تھا اور خان کے قلعے کی کسی عورت سے اسے عشق تھا ۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہو سکیں ۔ ایک روایت کے مطابق اس کے والد کا نام کرمو تھا ۔ وہ نیر خان نوری کے دربار سے وابستہ ضرور تھا لیکن اس کا کوئی بھی شعر ایسا نہیں ملتا ، جس میں خان کی تعریف ہو ۔ جام درک کی شاعری تمام بلوچی شعراء سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے۔ اس کے کلام کی زبان صاف اور نستہ ہے ، تشبیہیں اور استعارے بکثرت استعمال کرتا ہے جو کہ وہ اپنے ماحول سے اخذ کرتا ہے ۔ اس سے پہلے بلوچی ساعری کا اندازِ بیان بالکل سادہ تھا ۔ لیکن جام نے بلوچی شاعری کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے جس میں ایمائیت بھی ہے اور اشاریت بھی ۔ وہ تغزل کا ساعر ہے ۔ اس نے حسن و جمال کی تصویر بڑے پیارے انداز میں پیش کی ہے ۔ آرائش و زیبائش اور گفتار اور رفتار کی عکاسی منفرد اور حقیقت پسندانہ نوعیت کی حامل ہے ۔ ہجرو فراق کی باتیں دل گداز انداز میں پیش کرتا ہے ۔ اس نے بلوچی شاعری کو ایک نیا رخ دیا ۔ مست توکلی نے بھی اس سے ہی اکتساب کیا ہے ۔ اس کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے امیر طبقہ کو خاص طور سے پیش کیا ہے ۔ اس کی نظم ''ڈھاڈھر کا بازار'' اس بات کی آئینہ دار ہے ۔

۸- حانی اور رانی

یہ دونوں شاعرہ تھیں ۔ ان کی نظمیں مٹھا خاں سوئم اور ولد حمل خان دوئم کی شادی کے متعلق ہیں ۔ مٹھا خاں اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہوئے ۔ حانی ، میر دوسا کی دختر اور رانی ، سالار کی دختر تھی اور دونوں بالاچانی قبیلہ سے تھیں ۔

۹- بجار

یہ مریوں کا شاعر تھا اور اٹھارھویں صدی کے آخر میں گزرا ہے ۔ اس نے مری بہادروں کی شجاعت اور دلیری کے گیت گائے ہیں ۔ اس کے کلام میں بڑا اثر اور رنگینی ہے ۔

۱۰- میر اشرف

مکران کا بلند پایہ پہلوان شاعر گزرا ہے۔ پہلوان شاعر ایسے شخص کو کہتے ہیں جو موسیقار بھی ہوتا ہے اور خود شاعر بھی ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کا کلام بھی یاد ہوتا ہے۔ بعض پہلوان خود شاعر نہیں ہوتے۔ میر اشرف بیک وقت بلند پایہ شاعر بھی تھا اور عظیم موسیقار بھی۔ ۱۷۶۶ء میں تمپ میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۴ء میں وفات پائی۔ اس کے والد کا نام سردار میر دراہ تھا، گچکی قبیلہ کی وزرئی شاخ سے تھا۔ وہ ہمیشہ سردار میر سہراب خان کے ہمراہ رہتا تھا۔

۱۱- سوہنا سور ہیانی

سوہنہ بن بشکلی (بخش علی) سورہیانی کی ایک نظم میں عربی فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کثرت سے ملتی ہیں۔ معنوی لحاظ سے اس میں صوفیانہ خیالات ہیں۔ بلوچی شاعری میں یہ رنگ انیسویں صدی کے شروع میں آیا۔

۱۲- کوبل جت

اس کے کلام کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی انیسویں صدی کے شروع کا شاعر ہے۔

۱۳- ملا ابراہیم

علاقہ پنجگور کے گاؤں تمپ کا رہنے والا تھا اور کاشانی قبیلہ سے تھا۔ عالم اور فاضل تھا اور پنجگور میں قاضی کے عہدے پر متمکّن تھا۔ بعد میں ذکری عقیدہ اختیار کر کے کبیج کے گاؤں نربت میں سکونت پذیر ہوا اور وہیں وفات پائی۔ نصیر خان نوری کا ہمعصر تھا اور اٹھارھویں صدی میں گزرا ہے۔ بلوچی کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتا تھا اس کے کلام میں ذکری عقائد کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ حمد، نعت اور قصیدوں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔

فارسی شعراء

خوانینِ قلات کی درباری زبان فارسی تھی۔ اس وجہ سے فارسی شاعری کا رواج بھی ہوا اور اس دور میں بہت سے فارسی شعراء ملتے ہیں۔ خصوصاً مکران کے ذکری فرقہ میں بہت سے فارسی شعراء ملتے ہیں۔ قلات کے اکثر شاعر غزل گو تھے اور چند کا رجحان تصوّف کی طرف تھا اور مکران کے ذکری شعراء کے کلام میں اکثر نعتیں اور قصیدے ملتے ہیں اور ذکری عقائد کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ان فارسی شعراء میں قاضی نور محمد ، گل محمد ناطق ، مرزا احمد علی ، سید محمد تقی شاہ گل محمد زیب ، ملّا محمد حسن بروہی ، مولا داد ، علیم اللہ علیم ، ابوبکر رسول بخش رہی ، عوب بخش خاکی ، فیض محمد قلاتی ، شے محمد درخشاں ، میر عبداللہ ، سے سلیمان ، شے جلال ، سے نصیر الدین ، میر علی شیر جنگی ، خوش قدم جنگی ، سے گل محمد ، نور محمد ، ملا ابوبکر ، ملا شہد دست ، شے امانی ، ملا مددی خان ، ملا نعمت اللہ ، عزیز لاری وغیرہ ہیں ۔ ان شعراء کے حالاتِ زندگی و کلام بر ببصرہ و تنقید فارسی کی جلد میں دیا جائے گا ۔

انگریزی عہد (۱۸۴۱ء ــ ۱۹۴۷ء)

۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا ۔ ۱۸۵۴ء میں انگلستان اور روس کی جنگ کی وجہ سے انگریزوں نے خان قلات سے نیا معاہدہ کیا ۔ اس بعد بلوچستان کی آزادی ختم کر دی گئی ۔ انگریزوں کی سازش کی وجہ سے سرداروں اور خان قلات کا آپس میں مقابلہ ہونے لگا ۔ جس کی وجہ سے بلوچ طاقت کمزور ہو گئی ۔ یہ دور ایک طرح سے جابریّت کا تھا ۔ انگریز بلوچوں کی طاقت کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچی شعراء کا میلان تصوّف اور اخلاقیات کی طرف بڑھ گیا ۔ وہ روحانیت اور تصوّف میں قلبی سکون حاصل کرنے لگے اور اخلاقیات کے سبق سکھانے لگے ۔ اسی وجہ سے اس دور کی شاعری زیادہ تر مذہبی ہے ۔ نعتوں ، معجزوں اور مداحوں کا منظوم ذخیرہ ملتا ہے ۔ اس سے پہلے مکالموں کے انداز میں رزمیہ داستانیں لکھتے تھے ، اب اخلاقی اقدار پیش کرنے کے لیے فرضی مناظرے پیش کرنے لگے ۔ ایسی نظموں کا بھی ذخیرہ ملتا ہے ۱ ۔ اس دور میں بلوچی شاعری پر سندھی اور سرائیکی شاعری کا اثر پڑا ، جس کی وجہ سے دلکشی میں اضافہ ہوا ۔ مکرانی بلوچی پر فارسی کا اثر پڑا ، یعنی اس دور میں نئے مضامین ، نئے خیالات اور نئے اسلوبِ بیان نے جنم لیا ۔ شاعری کے لیے نئی راہیں ہراسی گئیں ۔ شعری نظریات کے پیشِ نظر بلوچی شاعری کے دو مکاتبِ فکر عمل میں آئے ''مشرقی مکتبِ فکر'' اور ''مغربی مکتبِ فکر'' ۔

۱ ۔ مشرقی مکتبِ فکر

اس مکتبۂ فکر پر سندھی اور سرائیکی شاعری کا اثر ہے ، جس کی وجہ سے مشرقی بلوچستان کی شاعری میں رنگینی اور روانی آ گئی اور اعلیٰ فکر بھی نظر آنے لگا ۔ اس شاعری میں فطری جذبات اور احساسات کی عکاسی کے نمونے ملتے ہیں ۔ یعنی داخلیت کا عنصر زیادہ ہے ۔ اس

---

۱ ۔ مجھے بھی بہت بڑا ذخیرہ ملا ہے ۔ عبد المجید میمن (مقالہ نگار) ۔

کے علاوہ نئی نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال بکثرت ہوا ۔ اس دور کے بہت سے شعراء کے حالات نہیں ملتے ۔ مشہور شعراء پر تبصرہ ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

۱- ابراہیم شعبانی

وہ آسنی میں رہتا تھا ۔ ۱۸۷۶ء میں اس نے ایک نظم ڈیمز کو سنائی جس کو ڈیمز نے قلمبند کیا[۲] ۔ اس نظم میں وہ مذہبی رہنماؤں کی تعریف اور توصیف کرتا ہے اور دعا مانگتا ہے کہ خدا تعالیٰ اسے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

۲- لشکر خان جسکانی

اس کے والد کا نام سلیمان تھا ۔ ڈیمز نے اس کی دو نظمیں اپنی کتاب[۱] میں دی ہیں جو اس نے ۱۸۷۶ء میں اس کی زبان سے سن کر قلمبند کیں ۔ وہ حمد اور نعت کے بعد حضرت علیؓ کی تعریف و توصیف اور خلفائے راشدین کی تعریف کرتا ہے ۔ اس کے بعد اسلامی عقائد بیان کرتا ہے ۔

۳- مست توکلی

بلوچی کا بلند پایہ شاعر ہے ۔ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان ایک غریب گھرانے میں کوہلو کے مقام پر اس کی ولادت ہوئی ۔ مری قبیلہ کی سیرانی شاخ سے اس کا تعلق تھا ۔ عین عالمِ شباب میں اسے ایک شادی شدہ مری عورت ''سمو'' سے محبت ہو گئی جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ۔ وطن چھوڑ کر چل پڑا اور ڈیرہ غازی خان جا نکلا۔ راستہ میں لوگ اسے پاگل سمجھنے لگے ۔ مستی کے عالم میں گھومتا پھرتا واپس مری میں آ گیا ۔ اس کی وفات قریباً ۱۸۸۵ء میں ہوئی ۔ شاہ بیگ رند نے اپنے مضمون میں تاریخ وفات ۱۸۹۶ء لکھی ہے[۲] ۔

مست حسن و عشق کا شاعر ہے لیکن پھر بھی ان کے اشعار میں اس دور کے حالات کا عکس ملتا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

ترجمہ :

میں اپنی محبوبہ سمو کے قریب آیا ،
لیکن وہ گلابی سرزمین اجاڑ اور اداس تھی ۔
میرے ذہن میں شکوک پیدا ہوئے ،اور
غم کی زنجیروں نے مجھے جکڑ لیا ۔

۱- Dames, Popular Poetry of the Baluches.

۲- اولس ، سالنامہ ۱۹۶۳ء ، ص ۲۴ ۔

میری محبوبہ سمو — کہاں ؟
میرے خیال میں وہ نہ تو کسی زندان میں محبوس ہے ،
اور نہ انگریزوں کی قید میں ہے -

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں انگریز بلوچوں کو قید کیا کرتے تھے - مست توکلی کے ہاں سندھ کے عظیم شاعر شاہ لطیف کا رنگ ملتا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شاہ لطیف کا کلام سنا تھا اور اس سے متاثر ہوا تھا - سندھ کی طرف آنے کا ثبوت تو خود اس کے کلام سے ملتا ہے - وہ کہتا ہے :

ترجمہ :

عہد شباب ہے اور
میرے سبزۂ خط کا آغاز ہے !
میرے دل میں سیر و شکار کی ہوس ہے ،
سبزہ زاروں کی سیر کرتا ہوا میں سندھ کے ریگزاروں تک جا پہنچا -
پھرتے پھراتے میں سخی سرور کے محلات تک گیا -
اونٹ قطار اندر قطار جا رہے ہیں -
ان پر کجاوے لدے ہیں -
کجاووں میں ناز پروردہ عورتیں جھول رہی ہیں -
کیا ان میں سے کسی کی صورت سمو سے ملتی ہے -
سمو کا بدل تو کہیں بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتا [1] !

توکلی کا اندازِ بیان شگفتہ اور دل آویز ہے -

جیسوا کرد

اس کی ایک نظم ۱۸۸۵ء میں ڈیمز نے قلمبند کی - وہ مزاری نوجوان تھا اور ان دنوں پولیس تھانہ کا انچارج تھا - شاعر کی حیثیت سے اس علاقہ میں اس کی شہرت تھی - اس نظم میں حمد کے بعد جوانی میں انسان کے مزاج کا بیان ہے -

حیدر بالا چانی

یہ بھی مزاری تھا اور انیسویں صدی میں گزرا ہے - میئر نے ''بلوچ کلاسک'' میں اس کی ایک نظم دی ہے - اس میں جوانی اور بڑھاپے کا ذکر ہے -

---

۱- بلوچ کلاسک ص ۶ -

رحم علی مری

مری قبیلہ کے شاعر بجار مری کا فرزند تھا۔ باپ کے بعد مری قبیلہ کا ''ریزوار'' شاعر بنا۔ ''ریزوار'' کو قبائلی زندگی میں بلند مقام حاصل ہے۔ لوگ اس کے طریقۂ اشعار کی وجہ سے اس سے ڈرتے تھے۔ رحم علی عوامی اور قومی شاعر تھا۔ جب اس نے بلوچ سرداروں کو انگریزوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے دیکھا تو طنزیہ انداز میں کہنے لگا:

ترجمہ:

غیرت بھاگ کھڑی ہوئی، اور
پلٹ کر حیا سے کہنے لگی،
میں تو جا رہی ہوں،
تو بھی میرے نقشِ قدم پر خاموشی سے چلی آ!

ان کی نظموں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہے، وہ مری بہادروں کو اپنے وطن کی حفاظت کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے پر ابھارتا ہے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۱۷ء کو حکومتِ ہند نے میجر جنرل ہارڈی کو مری قبیلہ کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے مری بھیجا۔ مریوں نے اس کا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اگرچہ مریوں کو جانی اور مالی نقصان کا مقابلہ کرنا پڑا مگر انہوں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لڑائی کے دوران رحم علی، مریوں کو اپنے اشعار کے ذریعہ ابھارتا ہے۔ اس کے بعد وہ جنگ میں حصہ لینے والوں کی تعریف کرتا ہے۔ روانی، زورِ بیان اور واقع نگاری کے لحاظ سے اس کو بلوچی رزمیہ شاعری کا فردوسی کہا گیا ہے۔ افسوس اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں نہیں ملتیں۔

ملا عمر مری

اس کا کلام بلوچی کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی موجود ہے۔ اس کے کلام میں بھی قومی جذبات ہیں، حب الوطنی ہے اور انگریزوں کے خلاف نفرت ہے۔ اس نے حمد، مدح اور مولود بھی کہے ہیں۔ سندھی شاعری میں مولود ایک صنف ہے جس میں حضور صلعم کی ثنا اور صفت ہوتی ہے۔ یہ صنف سندھی سے بلوچی میں آئی ہے۔

پنجو بنگلانی

اس نے نواب جیال خان پر بہترین مرثیہ کہا تھا اور سرداروں کے اعلان کے

مطابق ۱ اونٹ انعام میں حاصل کیا تھا - یعنی اس کا مرثیہ مقابلے میں سب سے بہتر قرار پایا تھا -

پہلوان فقیر

جیکمب آباد ضلع کے ایک گاؤں میں اس کی رہائش تھی - بلند پایہ صوفی شاعر تھا - اس کے کلام پر سندھی صوفی شعراء شاہ لطیف ، سچل سرمست اور بیدل روہڑائی کا اثر تھا - ماضی قریب میں فوت ہوا ہے -

احمد

احمد ولد شوران کی ایک نظم ملتی ہے جس میں حضرت صلعم کا ایک معجزہ بیان کیا ہوا ہے - قیاس سے کہا جاتا ہے کہ یہ انیسویں صدی کا شاعر تھا -

غلام محمد بالاچانی

یہ خود بھی شاعر تھا اور اس کو دوسروں کا بھی بہت سا کلام یاد تھا - اس کی کچھ نظموں کے علاوہ کچھ پہیلیاں بھی ملتی ہیں -

چکھا بزدار

علی محمد ولد لعل بزدار موضع درگ ہٹر (ڈیرہ غازی خان) میں پیدا ہوا - روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوا اور بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں فوت ہوا - صوفی منش تھا ، غریب تھا ، لیکن سرداروں سے سچی بات کہہ کر اسے دلی راحت ملتی تھی - چنانچہ اس وجہ سے سردار اس سے ناخوش رہتے تھے - وہ بلا خوف کہتا تھا :

ترجمہ :

اے قوم کے سردارو !
خدا کے قہر و غضب سے ڈرو !
اور اپنی شان و شوکت پر تکبر مت کرو !

۱- نواب جال بڑا ذہین اور معاملہ فہم شخص تھا - وہ کئی مہموں میں سنڈیمن کے ساتھ رہا تھا - اسی وجہ سے اس کو نواب کا خطاب ملا تھا - ۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا -

کیونکہ تمہارا یہ زعم دائمی نہیں
بلکہ تم سے پہلے لاکھوں حکمران ہو گزرے ہیں !

اس سے اس کی حق گوئی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس کا ایک ہم عصر محمود لعل خان نامی شاعر ہمیشہ سرداروں کی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس سے چکھا بزدار کا ہمیشہ مقابلہ رہتا تھا ۔ وہ کہتا ہے :

ترجمہ :

محمود ولد لعل خان میں اب پھر گفتار (شعر) کہہ رہا ہوں ،
تو تو ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ
فضول دفتر نہ بنا اور
تیرے شعر فضول ہیں ، کیونکہ
تو تو سرداروں کو ہمیشہ سچی بات کہتا ہے
جس سے میں اور سردار ناراض ہیں ۔

چکھا ڈیرہ جات میں بڑا مشہور شاعر ہے ۔ اس کی زبان شستہ اور شعروں میں روانی و برجستگی ہے ۔ تشبیہیں اور استعارے بکثرت استعمال کرتا ہے ۔ فنّی لحاظ سے اس کے اشعار کی ساخت ''دوہوں'' جیسی ہے ۔ جس کو وہ ''گال'' کہتے ہیں ۔

سنگت

ایک بلوچی لوڑی تھا ۔ خانپور تعلقہ شکار پور کا رہنے والا تھا ۔ ۱۹۵۲ء میں ۸۰ سال کی عمر میں فوت ہوا ۔ اس نے نعتیں اور مناقب بھی لکھے ہیں اور بہادروں اور دلیر ڈاکوؤں پر بھی نظمیں کہیں ہیں ۔ اس سلسلہ میں اس کی ڈاکو ''عبدالرحمان بروہی'' پر لکھی ہوئی نظم قابل ذکر ہے ۔

منلو کہیری

باٹھاری ، علاقہ بھاگ ناڑی کا رہنے والا تھا ۔ قریباً ۱۹۵۸ء میں ۹۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا ۔ اس نے حمد ، نعت ، مدح ، مناقب اور قصیدے کہے ہیں ۔ اس کے کلام کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے ۔

جوانال

بلوچی کا بلند شاعر ہے۔ حس کے کلام میں مضمون کی بلندی بھی ہے اور زبان کی رنگینی بھی۔ ۱۹۶۷ء میں ایک سو پانچ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ضلع جیکب آباد کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ بگٹی قبیلہ کے پاڑہ (شاخ) ہیوانی سے تھا۔ غریب اور ان پڑھ تھا، لیکن دل و دماغ روشن تھا۔ وہ ایک عوامی شاعر تھا۔ دکھی عوام کے بارے میں اس کے اشعار سے نمونہ دیا جاتا ہے:

ترجمہ:

وہ دکھی لوگ
دکھ کی پر درد کھنکتی ہوئی
زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

مغربی مکتبِ فکر

اس مکتبِ فکر کے شعراء میں مکران کے شاعر آتے ہیں۔ انیسویں صدی کے ان شعراء میں زیادہ تر عالم تھے اور ان کو مُلّا کہا جاتا تھا۔ اس لیے اس کو مُلّاؤں کا مکتبِ فکر بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے روایتی اندازِ بیان کو ترک کر دیا اور فارسی شاعری کی تقلید کی۔ فارسی عربی الفاظ بکثرت استعمال کیے۔ وہ نظم کے شروع میں حمد اور نعت لاتے ہیں اور اس کے بعد اصل مقصد بیان کرتے ہیں۔ کبھی وہ عقاب یا کبوتر سے خطاب کر کے سبھی نظم کا آغاز کرتے ہیں۔ اس مکتبِ فکر کے قابلِ ذکر شاعروں کا ذیل میں جائزہ لیا جاتا ہے۔

مُلّا فاضل

اس کا نسبی تعلق رندوں کی شیخوزئی شاخ سے تھا۔ اس کے والد کا نام ''چاؤش'' تھا اور وہ مکران کی وادی مند کے ''شاہ بیگ قلات'' نامی گاؤں کا رہنے والا تھا، اس کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ بڑا ذہین اور خوش خلق تھا۔ اس کی شاعری نے اپنے عہد میں بڑا نام پایا۔ فاضل اس مکتبۂ فکر کا بڑا شاعر ہے اور اس کے اشعار میں رنگینی اور دلکشی ہے۔

ملا قاسم

مّلا فاضل کا بھائی تھا ۔ وہ بھی اچھا شاعر تھا ۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں دونوں قدرت رکھتے تھے ۔

ملا نور محمد چشتی

مکرانی شاعر تھا طویل نظمیں کہی ہیں ۔ ہر مصرع کے آخر میں قافیہ دیتا ہے ۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کی وفات ہوئی ۔

عزت بیگ پنجگوری

پنجگور کا رہنے والا تھا ۔ ملا فاضل کا ہم عصر اور دوست تھا ۔ اسلامی علوم اور عربی و فارسی میں دسترس رکھتا تھا ۔ قدیم بلوچی شاعری میں غزل کا رواج نہیں تھا ، لیکن عزت نے بلوچی میں غزلیں کہیں ، جن میں جدّت اور انفرادیت ہے ، پھر بھی غزل میں ایرانی رنگ قائم ہے ۔ ایک شعر ملاحظہ ہو :

ترجمہ :

بلبلوں کی طرح فغاں نہ کر عزت !
اس سے پھولوں کو رحم آتا ہے ۔

ملا اسماعیل

تمپ کے قریب پھل آباد نامی گاؤں میں پیدا ہوا ۔ ملا فاضل کا ہمعصر تھا ۔ ۱۸۷۸ء میں وفات پائی ۔ اس کا کلام صوفیانہ اور نہایت پاکیزہ ہے ۔ طنز و مزاح میں بھی مشہور تھا ، بلوچی کے علاوہ فارسی کا بھی اچھا شاعر تھا ۔

سید نور شاہ

بلوچی اور فارسی کا صوفی شاعر گزرا ہے ۔ تونسہ کے مشہور صوفی خواجہ اللہ بخش اور خواجہ شاہ سلیمان کے خاندان سے تھا ۔ ۱۹۳۴ء میں وفات پائی ۔ نگور میں مدفون ہے ۔ صوفی منش اور قادری نقش بندی سلسلہ سے تھا ۔ اس کے کلام میں تصوّف کے رموز اور نکات ملتے ہیں ۔ ہر جگہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی ، حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندی اور اولیاء اللہ کی توصیف کرتا ہے ۔

دورِ جدید (۱۹۴۷ء — ۱۹۷۰ء)

آزادی کے بعد بلوچی شعراء میں ایک نیا شعور اور ایک جذبہ پیدا ہوا ۔ تعلیمی ترقی کے ساتھ ان میں ذہنی پختگی پیدا ہونی شروع ہوئی ۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار بلوچی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی ۔ رسائل نکلنے لگے اور ریڈیو سے بھی پروگرام نشر ہونے لگے ۔ ۱۹۴۷ء میں ریڈیو پاکستان کراچی نے بلوچی نشریات کا مخصوص پروگرام نشر کرنا شروع کیا ۔ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ بلوچی ادب تحریر کی شکل میں ظاہر ہونے لگا ۔

جدید بلوچی شاعری تمام فرسودہ روایات سے آہستہ آہستہ قطع تعلق کرتی جا رہی ہے اور ادب برائے زندگی کے نظریے سے قریب ہوتی جا رہی ہے ۔ بلوچی شاعری میں مقصدیت پر زور دیا جاتا ہے ۔ اگر رجائیت کے ساتھ ساتھ قنوطیت اور یاسیت بھی داخل ہوگئی ہے لیکن بلوچی شاعر دیر تک خود کو قنوطیت کا شکار نہیں ہونے دیتا ۔ موجودہ دور کا بلوچی شاعر اردو ، سندھی ، سرائیکی ، پنجابی اور پشتو کے علاوہ مغربی ادب سے بھی متاثر ہے ۔ بلوچی شاعروں نے اردو غزل اور سندھی کافی کے انداز کو اپنا لیا ہے اور اسے بلوچی رنگ دے دیا ہے ۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے قدیم فنی انداز ''الحان'' میں ''نسیٹر'' ، ''گال'' ''داستاہ'' وغیرہ لکھنے شروع کیے ۔ آزاد نظم بھی ایک حد تک کامیابی سے لکھی جا رہی ہے ۔ موجودہ دور کے مشہور شعراء مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ گل خان نصیر

اس دور کے شاعروں میں گل خان نصیر کا نام سرِ فہرست ہے ۔ وہ بلوچی میں بھی لکھتا ہے اور اردو میں بھی ۔ یہ پہلا بلوچی شاعر ہے جس نے ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے ہیں ۔ اس کا مشاہدہ گہرا اور وسیع معلوم ہوتا ہے ۔ اس کی شاعری قومی شاعری سے شروع ہوکر بین الاقوامی شاعری بن جاتی ہے ۔ اس کی نظموں میں ''خواب میں جام درک سے ایک ملاقات'' ''کوہ چہلتن سے خطاب'' ، ''شیطان'' اور ''ہمارا تمہارا سمجھوتا کیسے ہوسکتا ہے'' اچھی نظمیں ہیں ۔ اس کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

۲۔ آزاد جمالی

اس کا کلام سادہ ہے ۔ ادب میں ترقی پسند نظریہ کا قائل ہے ۔ سرمایہ داری

کے خلاف لکھتا ہے۔ بلوچوں کی پسماندگی، جہالت، اقتصادی بدحالی اور اخلاق انحطاط پر آنسو بہاتا ہے۔ اس نے پابند شاعری بھی کی ہے اور آزاد بھی۔ اس کی بیشتر نظمیں کلاسیکل آہنگ و الحان کی ہیں۔ اس کے کلام کا ایک مجموعہ ''مست، توار'' کے نام سے اردو ترجمہ کے ساتھ انجم قزلباش نے شائع کیا ہے۔ آزادی کے بعد اس نے کراچی سے رسالہ ''بلوچی'' بھی نکالا جو چار سال تک جاری رہا۔

۳۔ عطا شاد

بلوچی کا بلند پایہ شاعر ہے۔ اس کی شاعری نئے رجحانات کی حامل ہے۔ پابند نظم سے زیادہ آزاد نظمیں لکھتا ہے۔ لیکن وزن کا خیال رکھتا ہے اور غزل کے لیے تغزل ضروری سمجھتا ہے۔ اس کی نظموں میں ''روح کجا در فشکالنت'' ''ز ہرانی رازہ'' اور ''تو میں چھانی وانگیں شاعری'' اچھی نظ یں ہیں۔

۴۔ میر عیسیٰ قومی

مکران کا پرانا شاعر ہے۔ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوا۔ اس نے قومی تحریک میں بھی کام کیا۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کا سیکرٹری بھی رہا۔ اس کے کلام میں ہر جگہ وطن سے والہانہ محبت کا جذبہ ملتا ہے۔

۵۔ مراد ساحر

مکران کے اچھے شاعروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قومیت کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس کی شاعری میں خارجیت زیادہ ہے۔ کچھ عرصہ تو اس پر قنوطیت و یاس کی کیفیت طاری رہی، لیکن اس نے جلد ہی ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور وہ درخشاں مستقبل کے نغمے لکھنے لگا۔ ''میانئی جنگ'' اس کی اچھی نظم ہے۔

۶۔ صدیق آزاد

شاعر اور نثر نویس ہے۔ آزاد و پابند دونوں قسم کی شاعری کرتا ہے۔ ''مژدہ'' اور ''مرگ جاوداں'' اس کی اچھی نظمیں ہیں۔

۷۔ اسحاق شمیم

نظم کا شاعر ہے۔ فارسی الفاظ اور ترکیبیں زیادہ استعمال کرتا ہے۔ عروض کی پابندی ضروری خیال کرتا ہے۔ ''بزرگان'' اور ''دلہن'' اس کی اچھی نظمیں ہیں۔

۸۔ ملک محمد رمضان

شاعر اور نثر نگار ہے۔ اس کے علاوہ صحافی بھی ہے۔ بلوچی میں ''مستونگ'' سے ہفت روزہ ''ساربان'' نکالتا ہے۔ علمِ عروض پر بھی شعر کہے ہیں اور قدیم رنگ میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ''تہرا شاعر پبارا'' اس کی اچھی نظم ہے۔

۹۔ قاضی عبدالرحیم صابر

مکرانی ہے لیکن آج کل کراچی میں سکونت پذیر ہے۔ نظم اور نثر دونوں لکھتا ہے۔ زیادہ تر غزل لکھتا ہے اور عروض کی پابندی کرتا ہے۔ اس کے کلام کا ڈھنگ پرانا ہے، لیکن انفرادیت پھر بھی قائم رہتی ہے۔

۱۰۔ ظہور ہاشمی

۱۹۳۶ء میں پیدا ہوا۔ مکران کا رہنے والا ہے۔ ریڈیو پاکستان میں ملازم ہے۔ اس کی غزلوں میں جمالیاتی عنصر زیادہ ہے۔ غزلوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، نظموں میں ''جادو'' اور ''وڑدلیانی بات'' اس کی اچھی نظمیں ہیں۔

۱۱۔ احمد جگر

اصل میں مکران سے تعلق رکھتا ہے۔ اب کراچی میں رہتا ہے۔ اچھا غزل گو ہے۔ اس کی غزل میں قدیم رنگ زیادہ ہے۔ محبوب کے ظلم و ستم کا ذکر درد انگیز انداز میں بیان کرتا ہے۔

۱۲۔ احمد زہیر

گوادر میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں کراچی آیا۔ غزل کا شاعر ہے۔ اس کی غزلوں میں ہجر و فراق کا زیادہ ذکر ہے۔

۱۳۔ شیر احمد بیدار

پابند اور آزاد دونوں قسم کی شاعری کرتا ہے۔ ''عیالے'' اس کی اچھی نظم ہے۔

۱۴۔ آدم حقانی

مکران کا باشندہ ہے لیکن اب کراچی میں رہتا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو پر دسترس رکھتا ہے۔ کلام کا انداز پرانا ہے اور قومی رنگ زیادہ ہے۔

۱۵۔ دوست محمد بیکس

بلوچی اور اردو میں شعر کہتا ہے ۔ اس کی اکثر نظموں میں اقبال کا رنگ ملتا ہے ۔

بلوچی زبان کا نثری ادب

(۱) آزادی سے پہلے بلوچی نثر کی ابتدا ہو چکی تھی ۔ درخوانی علماء نے اشاعت دین کے جذبے کے تحت بہت سی کتب لکھیں ۔ مثلاً حضور بخش نے قرآن شریف کا بلوچی میں ترجمہ شائع کیا ۔ عیسائیوں نے انجیل مقدس کے ایک حصہ کا بلوچی میں ترجمہ کیا ۔ قیام پاکستان کے بعد سے بلوچی نثر تیزی سے ترقی کر رہی ہے ۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ افسانوی ادب میں بھی اضافہ ہو رہا ہے ۔ میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، قاضی عبدالرحیم صابر، مولانا خیر محمد ندوی اور ظہور شاہ سید نے بلوچی نثر کی داغ بیل ڈالی ۔ موجودہ دور میں بلوچی نثر نگار خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں ۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کا نام قابل ذکر ہے :

عبدالرحمان غور، میر مٹھا خان، ملک محمد رمضان، عبدالغفار ندیم کچکی، عبداللہ جمالدینی، میر شیر محمد مری، غلام محمد شہسوانی (مرحوم) امان اللہ، م ۔ طاہر، ایم بیگ بلوچ، ایم ۔ کے بلوچ، عبدالحکیم، شاہ بیگ رند، مہر علی، میر عبدالمالک، احمد علی، غوث بخش صابر، محمد بخش لہڑی ۔

ذیل میں افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کے نام بھی دیے جاتے ہیں :

نعمت اللہ گچکی، قرۃ العین طاہر، صورت خان مری، نسیم دشتی، مومن بزدار، رحیم صادق، عطا شاد، غوث بخش صابر اور عصمت جمالدینی ۔

کچھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں ۔ کاردار بلوچی اکیڈیمی کراچی کی طرف سے ذیل کی چار علمی ادبی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں ۔

(۱) بلوچی زھگ بلا ۔ (۲) مستاگ ۔ (۳) بلوچی زبان و ادب کی تاریخ ۔ (۴) بلوچی گرامر از کرنیل ماکیور، مترجم ایم بیگ بلوچ ۔

بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ کی طرف سے ۱۹۶۶ء میں بشیر احمد کی مرتب کی ہوئی کتاب ''جام درک'' شائع ہوئی ہے ۔ یہ بلوچی زبان کے عظیم شاعر جام درک کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں بلوچی اور انگریزی میں مفصل مقدمہ بھی ہے ۔ ''مست توکلی'' پر بھی بلوچی اکیڈیمی کی طرف سے ایک تحقیقی کتاب شائع ہوئی ہے ۔

بلوچ طلبہ کی جماعت ''ورنا واندہ گل'' نے ۱۹۶۶ء میں ''بوا انا نامہ'' شائع کیا جس میں معیاری مقالے ہیں ۔ بلوچ طلبائے کراچی کی طرف سے ہر سال ''پنجار'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع ہوتا ہے ، جس میں بلوچی اور اردو میں مضامین ہوتے ہیں ۔ ان کے علاوہ کراچی سے ایک خالصتاً ادبی کتاب ''سبتگین دستونک'' بھی شائع ہوئی ہے ۔ ''بلوچی سیاہگ'' اور ''بلوچی بنگیجی'' نامی کتابیں بھی کراچی سے شائع ہوئی ہیں ۔ ''نوکین دور'' کے خاص نمبر اور ''اولس'' کے خاص نمبر اور سالنامے بھی معیاری بلوچی مضامین پر مشتمل ہیں ۔

دوسری کتب

انگریز حکمرانوں نے یہ ضروری سمجھا تھا کہ جو سرکاری افسر بلوچی علاقوں میں ہوں ۔ وہ بلوچی جانتے ہوں ۔ اس وجہ سے بلوچی سیکھنے کے لیے انگریزی میں کتابیں لکھی گئیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

۱- ارنبسٹ ٹرمپ نے بلوچی گرائمر شائع کی ۔

۲- میجر ما کلر نے ۱۸۷۷ء میں مکرانی بلوچی گرائمر[۱] مرتب کر کے شائع کی اب اس کا بلوچی ترجمہ بلوچی اکیڈیمی کراچی سے شائع ہوا جو ایم بیگ بلوچ نے کیا ہے ۔

۳- مشرقی بلوچی کی گرامر ایچ نکل (H. Nicol) نے ۱۹۱۲ء میں لاہور سے شائع کی ۔

۴- بلوچی ٹیکسٹ بک ، ایل ۔ ڈیمز نے لکھی اور ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی ۔ قیام پاکستان کے بعد اردو میں بلوچی سکھانے کے لیے جو کتابیں شائع ہوئیں وہ یہ ہیں:

(۱) گال گپ ۔ مولانا محمد قاسم غنی ۔

(۲) بلوچی بومیا ۔ عبدالقیوم بلوچ ، بولانا اکیڈیمی کوئٹہ ۔

(۳) ماہنامہ ''بلوچی دنیا'' جگد والہ ضلع ملتان میں ''بلوچی دنیا'' کے عنوان سے اسباق شائع ہوئے تھے جن میں بلوچی سکھائی جاتی تھی ۔

(۴) بلوچی اکیڈمی کراچی کی طرف سے بلوچی بچوں کے لیے ابتدائی درسی کتاب ''بلوچی زہگ بلد'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی ۔

۱- کتاب کا نام یہ ہے Introduction to a Grammer of the Baluchi Language. ۔

فصل اول

براہوئی زبان

علاقائی تعارف

براہوئی زبان مغربی پاکستان کے قلات ڈویژن میں بولی جاتی ہے۔ یہ ایک بے قاعدہ مستطیل ہے جو شمال میں قدرے لمبی اور جنوب میں قدرے چھوٹی ہے اور شرقاً غرباً برابر ہے۔ اصل میں یہ ڈویژن سطح مرتفع بلوچستان کا ایک حصہ ہے جو ۵۰۰ فٹ سے لے کر ۸۰۰۰ فٹ سے بھی زیادہ تک بلند ہے۔ یہ سطح مرتفع کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر کے مغرب میں واقع ہے۔ توبہ کاکڑ اور چاغی کے سلسلے اسے افغانستان سے علیحدہ کرتے ہیں۔ کوہ براہوئی وسطی اور کوہ وسطی مکران اس کے وسط میں افتاں و خیزاں ہیں اور کوہ ساحلی مکران اس کی جنوبی حد بندی کرتا ہے[1]۔

ازمنہ قدیم سے اس ڈویژن کے تعلقات مغربی اور وسطی ایشیا سے استوار رہے ہیں۔ ان تعلقات کا ذریعہ مندرجہ ذیل چار راستے تھے:

۱۔ اہم ترین راستہ درہ بولان ہے جو کولبور سے رندلی تک جاتا ہے اور ۶۰ میل لمبا ہے[2]۔

۲۔ دوسرا راستہ درہ مولا تھا جو دریائے مولا کے دہانے سے انجیرا کے قریب شروع ہوتا ہے[3]۔

۳۔ تیسرا راستہ لس بیلہ اور مکران کا برّی، ایکن ساحلی سمندر کے ساتھ ساتھ کا ہے[4]۔

۴۔ چوتھا راستہ بحری راستہ ہےجو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلتا تھا[5]۔

یہ ڈویژن بعض خصوصیات کی بنا پر مغربی پاکستان کا منفرد ڈویژن ہے۔ مثلاً اس کے

۱۔ ایس، احمد قاضی، ڈاکٹر، اے جیاگرافی آف پاکستان، ص ۲۵۔

۲۔ لہڑی، ملک صالح محمد خان، بلوچستان ص ۳ تا ۴ اور رشید اختر ندوی، مغربی پاکستان کی تاریخ، جلد اول ص ۳۲ باورق۔

۳۔ لہڑی، ملک صالح محمد خان، بلوچستان، ص ۵۔

۴۔ انشینٹ انڈیا، اٹس انز دویژن بائی الیگزنڈر دی گریٹ از جے۔ ڈبلیو میکرنڈل ص ۱۶۶ تا ۱۸۰۔

۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً

جنوب میں بحیرہ عرب ، مغرب میں ایران اور شمال میں افغانستان واقع ہیں - اس وجہ سے یہ دفاعی تجارتی سیاسی اور تمدنی اہمیت کا مالک ہے -

رقبے کے اعتبار سے بھی یہ ڈویزن مغربی پاکستان کا عظیم ترین ڈویژن ہے - اس کا رقبہ ۱۸۰۸ ۷ مربع میل ہے ، جو مغربی پاکستان کے کل رقبے (۳۰۶۹۷۷ مربع میل) کا قریباً ۲۳.۴ فیصدی ہے - اس کا اکثر و بیشتر حصہ پہاڑوں اور صحراؤں ، جنہیں براہوئی زبان میں دشت یا بنجر چٹیل میدان اور ضلع کچھی کی زبان جٹکی میں بٹ یا پمر ٹمو کہتے ہیں ، پر مشتمل ہے -

مندرجہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ قلات ڈویزن مغربی پاکستان کی متعدد نسلوں کا گہوارہ رہا ہے - براہوئیوں اور بلوچوں کے موجودہ سیاسی تسلّط سے قبل قلات کے جنوبی حصوں میں جاٹ یا جدگال بہت طاقتور تھے ۱ ، جب یہ لوگ براہوئیوں کی یلغار کا سامنا نہ کر سکے ، تو اکثریتی طور پر سندھ اور پنجاب میں منتقل ہو گئے ، لیکن ضلع کچھی میں ایک اچھی خاصی تعداد برقرار رہی اور ان کی زبان جٹکی یا جدگالی آج بھی موجود ہے -

براہوئی ضلع قلات کے قدیم ترین باشندے ہیں - ضلع مکران بلوچوں کا مسکن ہے - ایران سے ہجرت کے بعد یہ لوگ یہیں آ کر بسے ، پھر رند اور لاشار کے تحت منظّم ہو کر مزید توسیع پذیر ہوئے - انہوں نے قدیم اوستائی زبان کو برقرار رکھا اور ثقافت و سیاست پر دائمی نقوش ثبت کیے - براہوئیوں نے بھی مختلف اقوام اور نسلوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کے باوجود اپنی اس زبان کو جسے دراوڑ ، جو وادیٔ سندھ کی تہذیب کے آفرید کار تھے بولتے تھے ، برقرار رکھا - ضلع قلات میں انہوں نے اپنی قبائلی زندگی کو منظّم کیا اور یہی ضلع بعد میں ریاست قلات کا مرکز بن گیا - اس ضلع کو انتظامی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا : ۱- سرداراں (جس کے معنی ہیں سرا یا شمالی) ۲- جھلاواں (بلوچی لفظ جھل بمعنی نیچے یا عقب یا جنوبی) - مرکزی علاقے خانی شہر قلات کے علاقے سرداراں میں شامل تھے اور قلات کے جنوب کے علاقے جھلاواں میں - جوں جوں ریاست قلات وسعت پذیر ہوتی گئی ، توں توں قلات کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے تمام علاقے سرداراں میں شامل ہوتے گئے ، لیکن انیسویں بیسویں صدی میں جب انگریزوں کے حملوں کی صورت میں بہت سے علاقے ریاست قلات کی گرفت سے نکل گئے تو یہ ریاست اپنے قدرتی اور جغرافیائی خول میں واپس لوٹ آئی - اس طرح سرداراں اور جھلاواں اپنی اصل اور بنیادی حد بندیوں میں محصور ہو گئے - سرداراں کا رقبہ ۸۶۷۴ مربع میل اور جھلاواں کا رقبہ

۱- پگٹ ، سٹوارٹ ہری ہسٹارک انڈیا ، ص ۱۳۵ تا ۱۳۷ -

۲۱۱۲۸ مربع میل ہے [۱] براہوئیوں کا اصل مسکن جھلاوان کا علاقہ ہے۔ یہیں سے یہ لوگ سرداراں میں پھیلے۔ یہ علاقہ رقبے کے اعتبار سے قلات ڈویژن کا قریباً ایک تہائی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں ضلع قلات کی آبادی میں براہوئی ۸۹ فیصدی تھے اور ان کی غالب آبادی جھلاوان میں ہی تھی۔

سرداراں

یہ علاقہ شمالی عرض بلد میں ۲۸°۵۷ اور ۳۰°۰۸ اور مشرقی عرض بلد کے ۶۶°۱۰ اور ۶۷°۳۱ درجات کے درمیان واقع ہے۔ شمالاً جنوباً اس کی لمبائی ۶۰ میل ہے۔ شرقاً غرباً اس کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ ۸۰ میل ہے۔ سرداراں کا علاقہ بالعموم پہاڑی ہے جو شرقاً غرباً متوازی سلسلہ ہائے کوہ پر مشتمل ہے۔ ان سلسلہ ہائے کوہ میں سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ سے لے کر ساڑھے چھ ہزار فٹ تک بلند وادیاں پائی جاتی ہیں۔ وسطی کاریزیں زیادہ چوڑی ہیں اور مشرقی پہاڑیوں میں محصور ہیں، جن کی بدولت ان وادیوں میں ہرے بھرے کھیت نظر آتے ہیں۔ مشرقی وادیوں میں بہت گہرے نشیب ہیں جس کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کا تعلق باہر کے لوگوں کے منقطع ہوگیا ہے، مثلاً کوآک اور مروکی وادیاں۔

جھلاوان

یہ علاقہ عرض بلد پر ۲۵°۲۸ اور ۲۹°۲۱ اور طول بلد کے ۶۵°۱۱ اور ۶۷°۲۷ درجات کے درمیان واقع ہے۔ شمالاً جنوباً اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۲۰۰ میل اور شرقاً غرباً چوڑائی زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ میل ہے۔ جھلاوان کا طویل و عریض علاقہ شمال کی طرف بلند ہے اور جنوب کی طرف بتدریج ڈھلوان ہوتا چلا جاتا ہے، جو زیادہ تر خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ ان خشک پہاڑی سلسلوں سے نکلنے والے دریا بھی برائے نام ہیں اور سارا سال خشک رہتے ہیں۔ صرف موسم برسات میں ان میں پانی آتا ہے۔ لیکن جتنا تیزی سے آتا ہے اسی تیزی سے بہہ بھی جاتا ہے۔

دونوں حصوں کی آب و ہوا خضدار (جھلاوان ۳۸۰۰) تک ایک ہی جیسی سرد خشک ہے۔ لیکن خضدار کے جنوب میں زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ جھلاوان کے لوگوں کی اکثریت کاشتکار اور گلّہ بان ہے۔ اس میں سے ۷۵ فیصد آبادی خانہ بدوش اور ''مالدار'' ہے جو سال بھر اس وسیع و عریض علاقے میں پانی اور چراگاہ کی تلاش میں ادھر ادھر

۱۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر سیریز، جلد ششم (سرداراں) ص ۱ جلد ششم ب (جھلاوان) ص ۱۔

گھومتی پھرتی رہتی ہے - ڈبلیو - ایس - پاس کے الفاظ میں جھلاواں کی آبادی کلاسیکی طرز زندگی افقی یا خالص خانہ بدوش کا نمونہ پیش کرتی ہے[۱] - یہ لوگ خانہ بدوشانہ زندگی سے تنگ آ کر سازگار اور مساعد حالات پاتے ہی سندھ میں مستقل آباد ہونے کے موقع کو بمشکل ہی چھوڑ سکتے ہیں - جھلاواں کے مقابلے میں سرداراں کے لوگ عام طور پر اپریل سے ستمبر تک اپنے پہاڑی علاقوں میں ہی کھیتی باڑی یا مویشی چرانے میں مصروف رہتے ہیں ، لیکن کرو اور کوریج کی تباہ خیزیوں اور سرمائی شدت کی وجہ سے اکتوبر سے مارچ تک بہت بڑی تعداد میں خاندان سمت گلّوں اور سازو سامان لیے کچھی چلے جاتے ہیں - بعض کی یہاں زمینیں ہیں ، جن میں وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور دوسرے لوگ ریوڑ چراتے ہیں - گویا ڈبلیو - ایس پاس کے الفاظ میں سراوانی آبادی پہاڑی یا عمودی یا سقوطی خانہ بدوشی کا نمونہ پیش کرتی ہے اور اس پر نقل وطن کی کشش کا غلبہ نسبتاً بہت کم ہوتا ہے - بہر حال پہاڑوں کی خشکی ، دریاؤں کی پایابی ، کرو اور کوریج ہواؤں کی تباہ کاری ، سردی کی شدت اور ناگزیر خانہ بدوشی کی وجہ سے ان کے لیے آسان انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا -

اس مخصوص جغرافیائی ماحول میں بسنے والے لوگوں کے عادات و خصائل ، گفتار و کردار اور رسم و رواج بھی قدرتی طور پر مختلف ہیں -

اولاً یہاں مرکزی نظام کا قیام ناممکن نہیں تو محال ضرور تھا - مواصلات کی دشواری اور عدم موجودگی کی بنا پر جو آبادی باہم مربوط اور مرکوز نہ ہو ، اسے ایک ہی نظام میں منسلک کرنا بہت مشکل ہے - لہذا یہاں قبائلی نظام رائج ہو گیا -

ثانیاً یہ لوگ لازماً جفاکش اور محنتی تھے - روزی کمانے کے لیے جس مسلسل اور کٹھن جد و جہد کی یہاں ضرورت تھی وہ صرف بھاری قوی کی ہی طلبگار اور ضامن تھی -

ثالثاً یہ لوگ جنگجو تھے اس لیے کہ کاریز ، چشمے ، چراگاہیں ، جنگل کے استعمال مذہبی عقیدے ، روایتی دستور کی کسی شق کی خلاف ورزی ، یا پھر کسی منچلے خطر پسند سردار کے ذوق بیکار کی وجہ سے کسی وقت بھی جھگڑا ہو سکتا تھا اس لیے ان لوگوں کو آمادۂ پیکار رہنا پڑتا تھا -

رابعاً یہ لوگ آزاد اور آزادی پسند تھے - کیونکہ جغرافیائی حالات کی بنا پر نہ تو ان کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی لگائی جا سکتی تھی اور نہ ہی انتشار آبادی کی وجہ سے ان کی گفتار و کردار پر کوئی قدغن عائد ہو سکتی تھی -

---

۱- پاس ولیم ، ایس ، ایران ، ص ۵۰ تا ۵۲ -

خامساً — انہیں آبائی اعتقادات سے عشق تھا اور ان میں جہالت و توہمات کا دور دورہ تھا ۔

سادساً — ایک محدود تعداد چشموں یا کاریزوں سے فائدہ اٹھا کر عیش و تمول کی زندگی ضرور بسر کرتی تھی لیکن یہاں کی اکثریت خانہ بدوشی اور زمین کی ذاتی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی عسرت کی زندگی گزارتی تھی ۔ متوسط طبقے کا وجود نہ تھا ۔

سابعاً — فلاکت اور غربت کی وجہ سے لوٹ مار کا رجحان عام تھا اس لیے گرد و پیش میں قائم ہونے والی (ایران پاکستان و ہند اور افغانستان) سلطنتوں نے انہیں حتی الوسع ان کے علاقائی حصار سے نکلنے نہ دیا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی عداوت مول لی ، بلکہ ان کے سرداروں کو نوازا اور انہیں داخلی آزادی دے رکھی تھی ۔

ثامناً — بیرونی حملہ آوروں اور جنگ آزماؤں سے بچنے کے لیے انہوں نے آزادہ روی اور مرکز گریزی کے باوجود ایک مخصوص ہیئت اجتماعیہ قائم کی ، جس کی بنیاد خاندان ، برادری ، طائفہ اور قبیلہ پر رکھی گئی اور پھر آہستہ آہستہ ایک ایسے ماورائے قبیلہ نظام کی تشکیل عمل میں آئی جو بوقت امن انہیں اپنے اپنے حلقوں میں آزاد چھوڑ دیتا تھا ، لیکن بوقت جنگ ان کی متحدہ طاقت کو دشمن کے خلاف منظم کر سکتا تھا ۔

تاسعاً — مندرجہ بالا عوامل کے تحت تشکیل پانے والے معاشرہ پر قدامت پرستی اور روایت پرستی کا غلبہ تھا ۔ یہ ایک متحرّک معاشرہ نہ تھا بلکہ جامد معاشرہ تھا جس میں مخصوص صفات و عادات کو خواہ وہ منفی ہوں یا مثبت ، یہاں دوام حاصل تھا ۔ دوسرے قبائل اور افراد کو جذب کرنے کے باوجود ہیئت اجتماعیہ اور ذہنی ساخت وہی رہی ۔ غرضیکہ قلّات کے جغرافیائی ماحول میں ایک قبائلی معاشرے کی تمام خصوصیات ما قبل تاریخی دور سے ہی جاری و ساری رہیں۱ ۔

براہویوں کا حسب و نسب

براہوئیوں کے حسب ونسب کے متعلق مندرجہ ذیل نظریات پیش کیے جاتے ہیں :

۱۔ براہوئیوں کا حکمران و مقتدر خاندان یا قبیلہ احمد زئی ہے جو امیر احمد خان اوّل (۱۶۶۶—۱۶۹۵ء) کو اپنا مورث اعلیٰ سمجھتا ہے ۔ اصل میں یہ براہوئی قبیلہ قمبراڈی کی شاخ ہے جس کے ہاتھ میں پندرھویں صدی عیسوی سے براہوئی زمام اقتدار رہی اور جس کا قانون ہی براہوئی قبائل کا قانون سمجھا جاتا تھا ۔ یہ اپنی روایات میں اپنے آپ کو عربی کہتا ہے ۔

۱۔ کاجی، پروفیسر ایچ ۔ ایل ، پرنسپلز آف جنرل جیاگرافی ، ص ۱۹۹ تا ۲۰۲ ۔

احمد زئی قبیلے کے اس دعوے کے علاوہ براہوئی قبائلی تنظیم ان کے عادات و خصائل از قسم مہمان نوازی ، بہادری و جانبازی ، جذبۂ انتقام وغیرہ اور ان کی زبان میں خالص عربی حروف مثلاً خ اور غ وغیرہ کا وجود ان کے دعوے کو تقویت دیتا ہے[۱] -

۲- براہوئی ٹرکو منگول تھے جو کوہ کیر قمر میں آباد تھے - انہوں نے دراوڑوں کو مغلوب کیا لیکن مفتوح کی تہذیب و زبان اپنا لی[۲] -

اس نظریے کی تائید ایک بلوچ میر محمد حسین عنقا نے کی ہے جو 'شاہنامہ فردوسی' کی ترکیب ''کوچ و بلوچ'' کے سہارے پر براہویوں کو کشان (کوشانی) ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں [۳] -

۳- پروفیسر رابسن کے خیال میں براہوئی ایرانی النسل ہیں ، جنہوں نے دراوڑوں کی زبان ضرور اپنا لی ہے لیکن ان میں سے کوئی دراوڑ نہیں[۴] -

۴- براہوئی کردوں کے قبیلہ براہوئی سے ماخوذ ہیں اور ان کی آبادی میں کردوں کا عنصر اس پر دال ہے - بہت سے بلوچ اب بھی انہیں کرد کالی کہتے اور لس بیلہ میں براہوئی کو کردی کہا جاتا ہے[۵] -

۵- بعض علماء کے نزدیک براہوئی گورجر (گوجر) قبیلہ بروہ یا براہ سے تعلق رکھتے ہیں[۶]-

۶- میر گل خان نصیر اور ملک صالح محمد کے نظریہ کے مطابق براہوئی بلوچوں کا طائفہ اوّل ہیں اور چونکہ وہ کوہ البرز سے یہاں وارد ہوئے تھے ، اس لیے پہلے برز کوہی کہلائے اور پھر براہوئی بن گئے[۷] -

اصل میں براہوئی ایک نسلی ملغوبہ ہیں - ان میں جٹّی ، کرد ، ایرانی ، منگول ، پٹھان ، بلوچ اور جاٹ وغیرہ شامل ہیں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں وارد ہوئے اور مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اصل براہوئی کے ساتھ جذب ہو کر انھی کی زبان و معاشرت اختیار کر گئے - براہیوں کا ایک قبیلہ بھی ایسا نہیں، جو براہوئی کے ذاتی نام سے پکارا جاتا ہو - جن ناموں سے

۱- برے ، سرڈینس ، دی براہوئی لینگویج ، ج ۲ ب ۲ ، ص ۴۰

۲- ہولڈ سرٹلس بحوالہ رشید اختر ندوی ، مغربی پاکستان کی تاریخ ج ۱ ، ص ۸۸ تا ۹۸ ۹۹

۳- ہفت روزہ اقلیم ، مستونگ - کیا براہوئی کوشانی مستونگ ہیں اگست ۱۹۶۵ء

۴- ندوی ، رشید اختر ، مغربی پاکستان کی تاریخ ج ۱ ، ص ۵۹

۵- بلوچ ، ایم ایس خان ، ہسٹری آف ریس اینڈ بلوچستان ، ص ۲۶۶

۶- حسن ، رانا علی ، تاریخ گوجر خان ، ج ۵ ، ص ۴۰۳ ، ۱۴۴ تا ۲۴۴ اینڈ کے ایم متشن دی کلوری دیٹ واز گوجر دیشیا ص ۹۰ ، ۳۶۹

۷- برے ، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگویج جلد دوم ، پارٹ دوم ، ص ۴۳ تا ۵۵

یہ قبائل پکارے جاتے ہیں وہ زیادہ تر قرونِ وسطیٰ کے فاتحین جیسے عرب ، ایرانی ، کرد منگول پٹھان اور بلوچ ہیں اور جو قبائل مقامی کہلاتے ہیں ان کے نام بھی انہیں فاتحین جیسے ہوگئے ہیں ، جیسے سہالاڑی ، قلندر لاڑی ، (غالباً ترک عنصر کا مظہر ہے کرگیذ ندی اور کڑگناڑی شاید گورکان سے مربوط ہوں ، مزید برآں وادئی مرو بھی صریحاً ترک اثر کی حامل ہے) ہارونی ، ساتکزئی اور رستم زئی وغیرہ حتیٰ کہ محمد شاہی بھی ۔ البتہ قلات کے جنوب میں نیچارہ ، جس سے نیچاری قبیلہ منسوب ہے ، ضرور کسی گہری قدامت کا حامل معلوم ہوتا ہے ۔ قرونِ وسطیٰ کے تمام اہم فاتحین کا انتہائی خود نگر ہونے اور اپنے اپنے مخصوص تہذیب و تمدن کے حامل ہونے کے باوجود ، براہوئی زبان و تمدن کو اپنا لینے کا مطلب تو یہی ہے کہ اس میں متاثر کرنے کی قوت موجود ہے ۔ گو آج اگر اصل بروہی تمدن وقت کی تہوں میں چھپ گیا ہے تاہم اس کا ہیولا آج بھی موجود ہے ۔

فصل دوم

براہوئی قبائلی و سیاسی تنظیم

وادئی سندھ کی تہذیب کے حاملین کا کافی حصہ تو آریوں کے قتل و غارت اور داروگیر کی نذر ہوگیا ۔ باقی ماندہ افراد تین حصوں میں بٹ گئے ۔ ایک وہ حصہ جو مزید مدافعت کا یارا نہ پا کر جنوبی بھارت میں منتقل ہو گیا اور آج تک وہاں اپنی مخصوص زبانوں ، تمدن اور اندازِ فکر و نظر کا مالک ہے اور سہ ہزار سالہ ہندو ابتلا و استعمار کے باوجود شمالی بھارت کی اکثر و بیشتر آریا ہندو آبادی سے بنیادی طور پر مختلف ہے ۔ دوسرا وہ حصہ جس نے آریہ ظلم و ستم کو نقلِ وطن پر ترجیح دی اور وادئی سندھ میں ہی رہنا گوارا کر لیا اور آہستہ آہستہ اپنی افضل تہذیب سے آریوں کو متاثر کرتا رہا ۔ تیسرا وہ حصہ جو قلات کے خشک ، اور غیر دلکش اور دور افتادہ پہاڑوں اور صحراؤں میں مقیم رہا ۔ چونکہ ان کے مغرب ، شمال اور مشرق میں آریوں کا قبضہ ہو چکا تھا لہذا یہ لوگ نہ تو اپنے مخزن ، یعنی ہلالِ زرخیز سے مربوط رہ سکے اور نہ ہی جنوبی بھارت میں منتقل ہونے والے قبائل سے اور نہ ہی وادئی سندھ میں اپنے پسماندگان سے !

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آریوں کی یلغار ہی واحد یلغار نہ تھی جس کا سامنا ان لوگوں کو کرنا پڑا ، بلکہ مغربی اور وسطی ایشیا کے قسمت آزما اور جنگ جو قبائل اپنی

اقتصادی اور سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے یکے بعد دیگرے اس علاقے اور اس کے لوگوں کو تختۂ مشق بناتے رہے - ان نوواردوں کا بیشتر حصہ تو آگے گزرتا گیا ، لیکن ان کے کچھ حصے یہاں بھی اقامت پذیر ہوتے گئے - خصوصاً ایرانی ، کرد ، عرب اور بلوچ تو ما بعد اسلام زمانے میں اچھی خاصی تعداد میں براہوئی علاقے میں سکونت پذیر ہوئے - انتشار و خلفشار کا یہ عالم پندرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا حتیٰ کہ اس مسلسل تذبذب سے بچنے کے لیے ذخائر آب اور کاریزوں اور چراگاہوں کی اشد ضرورت تھی اور ان کی اٹل حفاظت ، باہمی لوٹ کھسوٹ اور کشت و خون سے بچاؤ ، بیرونی حملہ آوروں کی روک تھام اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی ضرورت نے ان بکھرے ہوئے پراگندہ قبائل میں مرکزیت کی ایک زبردست خواہش پیدا کر دی اور انہوں نے قبراڑی قبیلے سے قیادت کی درخواست کی - قبراڑیوں نے اس بار قیادت کو سنبھال لیا اور اس طرح خانیٔ قلات وجود میں آئی اور یہ اسی قبیلہ کی شاخ احمد زئی میں جاری و ساری ہے[۱] -

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ براہوئیوں میں ظہورِ خانی سے پیشتر کوئی معاشرتی یا قبائلی تنظیم نہ تھی ، بلکہ دقیق مطالعہ سے یہ بات وانشگاف ہوتی ہے کہ یہ معاشری یا قبائلی تنظیم نہ صرف قائم و دائم رہی ، بلکہ مزید طور پر راسخ ہوگئی اور اسی کے بنیادی اصول خانی کی تشکیل و تعمیر میں استعمال ہوتے رہے اور اسی کے قوانین و ضوابط کا بیشتر حصہ خانی کا وظیفۂ حیات اور اساس نظم و نسق بنا - بہر حال براہوئیوں کی معاشری یا قبائلی تنظیم کا مطالعہ ہم دو حصوں میں کر سکتے ہیں ، یعنی ظہورِ خانی سے پہلے کی قبائلی تنظیم اور ظہورِ خانی کے بعد کی تنظیم -

ما قبل خانی دور کی قبائلی تنظیم

اس تنظیم کی بنیادی اکائی خاندان ہے ، جسے براہوئی اصطلاح میں ''پرا'' کہا جاتا ہے - خاندان کا رکنِ اعلیٰ جو دراصل خاندان کا سردار ہوتا ہے ، ''پیرنگا'' کہلاتا ہے - کئی خاندان مل کر برادری یعنی شلوار بناتے ہیں - اسی سے شلواری تنظیم وجود میں آئی - شلوار کے سربراہ کو ''کماشا'' کہتے ہیں - مختلف شلواروں کے اشتراک سے ٹھکر بنتا ہے جس کا قائد ٹھکری کہلاتا ہے - چند ٹھکریوں سے مل کر خوم یعنی قبیلہ بنتا ہے - اس کے منظم اعلیٰ کو سردار کہا جاتا ہے - ''پیرنگا'' کے علاوہ باقی تمام عہدے موروثی ہوتے ہیں -

یہ چند بندھے ٹکے ، سینہ بہ سینہ چلنے والے اصول تھے جو میر و فقیر اور سردار و قبائلی

۱- برے ، سرڈینس ، دی براہوئی لینگویج ج ۲ ، پارٹ دوم دوم ص ۶ تا ۷ -

کے لیے یکساں طور پر لازمی تھے اور ہر کہہ و مہہ کا وظیفۂ حیات سمجھے جاتے تھے - یہی اصول جو براہوئیوں کے ہمراز تھے ان کے دستور تھے اور اس کی کسی شق کی خلاف ورزی جہاں ایک عام قبائلی کو سزا کا مستوجب ٹھہراتی تھی وہاں خود کہاش یا ٹھکری یا سردار کو بھی معزولی کا سزاوار بنا دیتی تھی۔ انہیں ہم معیار کہیں یا ضابطۂ ناموس یا نظامِ اخلاق و اقدار، بہر حال یہ اصول براہوئی قبیلے اور اس کے ہر فرد کے لیے نصِ قرآنی کا حکم رکھتے تھے - یہ اصول مندرجہ ذیل تھے[۱] :

۱- خون کا بدلہ لینا ، خواہ اس کے لیے عمر بھر تاک میں رہنا پڑے - اسے براہوئی اصطلاح میں ''بیتر'' اور قدیم عربی اصطلاح میں ثار کہتے ہیں -

۲- پناہ گزیں کی مرتے دم تک حفاظت کرنا - اسے براہوئی اصطلاح میں باہوٹ کہتے ہیں ، جو غالباً قدیم فنیقی لفظ بیت بمعنی گھر سے بگڑا ہوا ہے -

۳- سپرد شدہ یا اماتنی جائداد و مویشی کے لیے دمِ آخر تک لڑنا - اسے اصطلاحاً انامت کہتے ہیں جو عربی لفظ امانت کا براہوئی مترادف ہے -

۴- مہمان کی تواضع میں پوری تگ و دو سے کام لینا ، خواہ اس کے لیے بارِ قرض ہی اٹھانا پڑے - اس لیے ہر بستی میں ہر وقت مہمانوں کے لیے ایک گدان (خیمہ) مستقل لگا رہتا تھا اور مہمان کی خدمت امیر و غریب پر فرض تھی -

۵- عورت ، کمسن بچے ، کمین اور ہندو کو مارنے سے اجتناب کرنا -

۶- مجرم یا قاتل قبیلے کی کسی خاتون کی مداخلت پر جرم معاف کر دینا یا کم از کم صلح جو عورت کو پوشاک بطور عزت دے کر لوٹا دینا اور جرم معاف نہ کرنا، لیکن سیاہ کاروں کے قتل اس سے ہمیشہ مستثنیٰ تھے -

۷- زیارت یعنی کسی بزرگ کے مزار کے اندر کسی آدمی کو نہ مارنا ، خواہ وہ سخت جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

۸- جنگ کے دوران اگر کوئی سید یا عالم یا عورت قرآن حکیم سر پر رکھ کر آ جائے یا ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ہوئے بیچ بچاؤ کے لیے آ جائے تو لڑائی فوراً بند کر دینا -

۹- سیاہ کار (زناکار) اور سیاہ کارہ کو قتل کر دینا -

ان کے علاوہ بھی کچھ اصول ہیں جن کو براہوئی صدیوں سے عزیز از جان سمجھتے آئے ہیں۔ مثلاً بصورت جنگ پامردی و جانبازی ، اپنے سرداروں کی اندھا دھند تقلید، بشرطیکہ وہ نہ تو دستور قدیم کی خلاف ورزی کریں اور نہ ہی قبائل کی روزمرہ آزادانہ روشِ حیات

۱- بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹئر ، جلد ششم ب ، ص ۱۲۲

میں مداخلت کریں ، کیونکہ ایسی صورت میں قبائلیوں کو بغاوت کا حق مل جاتا تھا ۔ وہ وہ ہمسایہ شخص جو کسی دوسرے قبیلے کا ہو اور عارضی طور پر کسی اور قبیلے کے پاس مقیم ہو) کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کرنا اور بصورت جنگ اسے اپنے اصلی قبیلے میں واپس جانے اور اس کی طرف سے لڑنے کا حق دینا اور اپنے طرزِ حیات کے ساتھ بے پناہ دل بستگی اور پیوستگی ۔ بارش نہیں تو نہ سہی ، پہاڑ خشک ہیں تو خشک ہی سہی ، بدویت پر مجبور ہیں تو کوئی پرواہ نہیں ۔ ان تمام محرومیوں اور مشکلات کے مقابلے پر اپنا مخصوص صدیوں پرانا نظامِ حیات گویا کہ ان کی زندگی کا لب لباب اور منتہائے مقصود ہے ۔ اگر ان اصولوں کا مقابلہ قدیم عربوں کے ضابطۂ مروت سے کیا جائے تو ان میں ایک حیرت انگیز مشابہت بلکہ یگانگت ملتی ہے ۔ بہر حال یہ ضابطہ براہوئی سرداروں کے بظاہر غیر محدود اختیارات کی تجدید کر دیتا تھا ۔

ظہور خانی کے بعد

مرکزیت کی تلاش براہوئیوں کو پلّو شریک کے درجے تک تو پہنچا ہی چکی تھی کہ پندرھویں صدی کے نصف آخر میں مکران میں بلوچ میر چاکر خان رند اور میر گوہرام خان لاشاری کے تحت مکران کے شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کے لیے پر تولنے لگے ۔ عین اسی وقت براہوئیوں کی جستجوئے مرکزیت بھی غیر معمولی رفتار اختیار کر گئی اور انہوں نے قبائل کے سردار خیل سے متفقہ درخواست کی کہ وہ بین القبائلی قیادت کی باگ ڈور سنبھال لے ۔ چنانچہ میر قمبزاڑی براہوئیوں کا پہلا خان بنا ۱ ۔ خانی کا انتخاب بھی کماشا ، ٹھکری اور سردار کی طرح بالواسطہ اصولِ انتخاب پر کیا گیا تھا ۔ اس کا صدر مقام قلات قرار پایا جو خطۂ قلات کے سلسلہ ہائے کوہ کے تقریباً وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے محفوظ ترین مقام سمجھا گیا اور جہاں سے خان کے لیے اپنی ریاست کے چاروں طرف نگرانی بھی آسان تھی ۔ خانی بھی دیگر درجہ وار قیادتوں کی طرح موروثی تھی اور آج تک قمبراڑی قبیلے میں ہی مرکوز ہے ۔

خانیٔ قلات اپنے قیام سے لے کر قیامِ پاکستان تک تین ادوار سے گزری ۔ یعنی ابتدا سے ۱۶۶۶ء تک کا دور جسے تشکیلی دور کہا جا سکتا ہے ۔ ۱۶۶۶ء سے ۱۸۳۹ء تک جسے خانی کے عروج ، داخلی استحکام اور خارجی توسیع کا دور کہا جا سکتا ہے اور ۱۸۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک جسے انگریزی اقتدار کا نام دینا مناسب ہے مگر یہ اس کے خلاف ردِّ عمل ، باہمی خلفشار اور تحریکات آزادی کا دور بھی کہا جا سکتا ہے ۔

۱۔ نصیر ، میر گل خان ، تاریخ بلوچستان جلد اول ، ص ۱۶

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ریاستِ قلات اصل میں آزاد قبائل کی ایک وفاقیہ تھی۔ قبائلی زندگی کا محور قبیلہ اور اس کا سردار تھے لیکن ماورائے قبیلہ مسائل خان کے سپرد تھے۔ خوانینِ قلات نے اکثر و بیشتر اختیار نمائی سے گریز کیا اور سرداروں کے اختیارات کو بخوشی تسلیم کر لیا۔ اسی طرح سرداروں نے ٹھکریوں پر اور ٹھکریوں نے کاشائیوں پر اور کاشائیوں نے پیرنگوں پر تسلّط اور دباؤ نہیں جمایا اور پوری تنظیم ایک وحدت کی طرح کام کرتی رہی۔ ثانیاً ریاست قلات کو عموماً اپنی ہمسایہ اور زیادہ طاقت ور سلطنتوں کے ساتھ وفادارانہ تعلقات قائم رکھنے پڑے اور اکثر خوانین نے ان تعلقات کو اپنے قبائلیوں کی اقتصادی بہبودی کے لیے ہی استعمال کیا۔ براہوئی روایتی دستور کا یہ کمال تھا کہ قبائلی ان کے مقامی قائد، سردارانِ قبائل اور خوانین خانی، قلات کے زیادہ حصہ میں یک جہت و یک سو ہو کر چلے اور گو میر نصیر خان نے مقامی قائدین کو عسکری اختیارات دے کر اور انگریزوں نے سرداروں کے ساتھ براہِ راست تعلقات قائم کر کے اور انہیں وظائف دے کر زیادہ با اختیار بنا دیا، پھر بھی وہ مجموعی طور پر اسی روایتی دستور کے پابند رہے، جو براہوئیوں کا ہمزاد معلوم ہوتا ہے۔

فصل سوم

(الف) مذہب

براہوئی معاشرے میں پتھر کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ براہوئی اپنے تمام جذبات کا اظہار پتھروں کی ڈھیریاں بنا کر کرتے ہیں۔

سر ڈینس برے کے خیال میں ان کے عقب میں کوئی عقیدہ ہے۔ براہوئی زبان میں پتھر کو ''خل'' کہتے ہیں جس کے دراوڑی مرادفات مندرجہ ذیل ہیں۔ کل (تامل۔ ملیالم۔ کناری) کلو (تلیگو۔ تولو)[۱] عربی میں ایک لفظ خوالد ہے جس کا معنی پہاڑ یا پتھر ہے[۲] ایک اور عربی لفظ کل بمعنی ایسا شخص جس کا والد اور اور اولاد نہ ہو ''یتیم'' بے خبر، کمزور'' چھری تا تلوار کا پہلا حصہ، وکیل، محتاج، عیال، بھاری، بوجھ اور بت مستعمل ہے[۳] براہوئی لفظ خل دراوڑی کل اور کلو اور عربی الفاظ خوالد اور کل سب

۱- برے، سر ڈینس دی براہوئی لینگوئج جلد دوئم، پارٹ سوم، ص ۱۲۸۔
۲- منجد، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی، ص ۳۴۲۔
۳- ایضاً ص ۱۱۰۹۔

ہم معنی و ہم اصل معلوم ہوتے ہیں۔ دراوڑی اور براہوئی لوگ ما قبل تاریخ دور میں یقیناً بت پرست تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ کوہ پرست بھی تھے۔

سر جان مارشل کے خیال میں وادیٔ سندھ کے لوگ غالباً پانی کی بھی پرستش کرتے تھے[۱] اور انہی سے آریوں یا ہندوؤں نے گنگا دیوی اور جمنا دیوی اور گنگا اشنان کے اعتقادات اپنائے[۲]۔ اپنے منبع اور ہم مخرج قبائل سے کٹ جانے اور پہاڑی چاردیواری میں محصور ہونے اور اس کے نتیجہ کے طور پر خانہ بدوشی اختیار کرنے کی وجہ سے براہوئیوں پر توہمات کی ایک طویل رات مسلط ہوتی گئی۔ ان توہمات میں سے بعض اب بھی ان کے رگ و پے میں پیوست ہیں۔ اور ان کے مافوق الفطری عقائد کا حصہ ہیں۔

توہمات کا یہ طلسم نہ جانے کتنا گہرا اور غیر مختتم ہوتا اگر اسلام کی روشنی ان براہوئیوں کو نصیب نہ ہوتی۔ ۶۶۴ء میں اگرچہ خضدار پر عربوں کے قبضہ سے[۳] اسلام کے اثرات پھیلنے لگے لیکن جب آخر اٹھارھویں صدی کے وسط میں اسلام کو یہاں کے ایک حاکم میر نصیر خاں کا تحفظ حاصل ہوا تو اسلام کے احکام سرکاری طور پر نافذ کیے گیے۔ اس کی اپنی زندگی شریعت کے مطابق تھی اور اس کے اندر بے پناہ مذہبی ولولہ موجود تھا۔ اس کے عہد میں افغانی عالم ملّا ملک داد ابن آدین غرشین قندھاری ثم قلاتی نے جو عربی، فارسی، پشتو اور براہوئی کا بہت جید عالم تھا، پہلی دفعہ نور اسلام کو براہوئی قبائلیوں تک پہنچانے کا عزم کیا۔ قدرتی طور پر اس مقصد کے لیے بہترین ذریعۂ اظہار و تبلیغ براہوئی زبان ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۷۵۹ء میں انہوں نے 'تحفۃ العجائب' لکھی جس میں شریعت اسلامیہ کے روزمرہ کے اصول شعری پیرائے میں بیان کیے اور یہی موجودہ براہوئی زبان کی اولین و قدیم ترین کتاب ہے۔ یہ ملّا ملک داد کی شخصیت ہے، براہوئی علماء فضلاء کی قائد ہے اور ان کی اسلام گستری اب بھی جاری و ساری ہے۔ اس کے علاوہ میر نصیر خان اعظم نے خود بھی تبلیغ حق کے لیے بہت جد و جہد کی۔ چونکہ براہوئیوں کے منبع جھلاواں میں توہمات کا دور دورہ تھا اور شریعت پر عمل نہ ہوتا تھا لہذا اس نے ۱۷۶۶ء میں ایک خاص وفد وہاں بھیجا جس نے میر موصوف کے فرمودہ مندرجہ ذیل احکامات وہاں نافذ کیے :[۴]

۱۔ شریعت کے اوامر و نواہی پر سختی سے عمل کیا جائے۔

۱۔ ندوی، رشید اختر، مغربی پاکستان کی تاریخ، جلد اول، ص ۱۷۲ تا ۱۷۳۔
۲۔ ایضاً۔
۳۔ مولوی دین محمد، یادگار تاجپوشی قلات، ص ۱۲۔
۴۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر سیریز جلد ششم ب، ص ۹۳ تا ۹۴۔

۲- شادی ، ختنہ اور دیگر تقریبات پر سرود ، تمبور ، نے ، چنگ ، دف وغیرہ مطلقاً استعمال نہ کیے جائیں -

۳- شادیوں اور دیگر طربیہ مواقع پر مرد اور عورتیں اکٹھے چاپ (رقص) میں ہرگز حصہ نہ لیں -

۴- بھنگ ، چرس اور شراب ممنوع ہیں اور کوئی عورت بے پردہ بازار نہ جائے -

۵- غلاموں کی تجارت ممنوع ہے -

۶- اموات پر مرد اور عورتیں زیادہ ماتم نہ کریں ، یعنی سر ننگے نہ کریں ، بال نہ بکھرائیں ، چہرے مسخ نہ کریں اور اپنے آپ کو زخمی نہ کریں -

۷- مسلمان فقیروں کے پاس ارادت مندی سے نہ بیٹھیں اور وہ لمبے بال نہ رکھیں -

۸- قصبات میں جمعہ کی نماز لازمی قرار دی گئی اور محلے کے لوگ محلے کی مسجد کے امام کے نان و نفقہ کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے -

۹- سیاہ کاری کے غلط الزام پر بہتان تراش کو اسی درے کی سزا ملے گی اور بعد میں وہ ساقط الاعتبار سمجھا جائے گا - بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ بلا جرم سختی اور بد سلوکی بھی ممنوع قرار دی گئی -

۱۰- ہندو اپنے مندروں میں مسلمان نوکر نہ رکھیں - مسلمان ان کی پوجا میں شریک نہ ہوں - ہندوؤں کے مکان مسلمان باسندوں کے مکانوں سے اونچے نہ ہوں اور وہ شناخت کے لیے ماتھوں پر تلک یا ٹیکہ لگائیں - مندروں میں عبادات پر موسیقی ممنوع قرار دی گئی اور ماتموں پر بھی - سیر و تفریح میں ہندو مسلمانوں سے آگے نہ نکلیں اور ایسے ہی بازار گلی وغیرہ میں بھی ہندو زین والے گھوڑے پر نہ بیٹھیں -

۱۱- مزاروں کے آس پاس بھیڑیں قربان نہ کی جائیں اور ان کا خون بیٹوں ، دلہنوں ، دولھوں یا گھوڑوں کو نہ لگایا جائے - لمبے لمبے بال رکھنے والے شجنوں کے سر تراش اور بال کاٹ دیے جائیں اور انہیں مریضوں کے پاس نہ آنے دیا جائے اور ان پر مطلق اعتبار نہ کیا جائے -

۱۲- زکواۃ اور عشر واجب قرار دئیے گئے -

۱۳- سود ممنوع کر دیا گیا -

(ب) ثقافت

۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق براہوئیوں کی ۳۸ فیصدی آبادی مستقلاً خانہ

بدوش تھی؛ اور جیسا کہ پہلے جغرافیائی پس منظر میں اشارہ کیا جا چکا ہے براہوئی خانہ بدوشی صرف عمودی ہی نہیں جس کا منظر سراداں پیش کرتا ہے بلکہ کلاسیکی یا خالص یا افقی خانہ بدوشی بھی ہے جو جھلاوان پر محیط ہے اور جو اپنے حاملین کو مسلسل مصروف سفر رکھتی ہے ظاہر ہے کہ ان حالات میں براہوئی ثقافت زیادہ تر خانہ بدوشوں کی ثقافت ہے ۔ اس نہج حیات میں چونکہ انہیں مختلف النوع خطرات در پیش رہتے ہیں لہذا انہیں ہر وقت تیار، چوکس اور کمر بستہ رہنا پڑتا ہے ۔ اس لیے شمشیر آزمائی، نیزہ بازی، تیر اندازی، شہسواری، بندوق بازی اور اسی قبیل کے دیگر مشاغل ان میں بہت مقبول ہیں ۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مشاغل ان کے جذباتی نکاس اور بحالی کے لیے کافی نہیں ہیں ۔ اس کے لیے گیت اور لوک ناچ نے وجود پایا ! ان کا مشہور ترین لوک ناچ چاپ کہلاتا ہے ۔ ڈھول بجانے والا کسی کھلے اور صاف میدان میں ڈھول لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ڈھول بجانا شروع کرتا ہے ۔ رقص و چاپ کے ماہرین اور شوقین اس گرد حلقہ بنا کر ڈھول کی تال پر برابر برابر قدم اٹھاتے ہوئے اور اسی مناسبت سے اپنے قدم آگے پیچھے کرتے ہوئے گھومتے رہتے ہیں ۔

براہوئی موسیقی عموماً ساز اور آواز کی ہم آہنگی کا نام ہے ۔ پہاڑی علاقوں میں ایک چھوٹا سا گول گیند نما لیکن قطر میں قدرے کم ساز ہوتا ہے جسے آگ میں پکا کر سرخ اور سخت کیا جاتا ہے اور ''شول'' کہلاتا ہے ۔ آواز میں قربت کی بنا پر اسے اگر بانسری کہا جائے تو شاید مناسب ہو ورنہ شول مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے اور بانسری لکڑی کی اور ساخت اور ہئیت میں جو فرق ہے وہی آواز میں بھی ہے ۔ اس کے علاوہ گرو یا نے، سرنہ یا سرو نزیا سروز، چنگ اور دف وغیرہ بھی استعمال ہوتے ہیں ۔

براہوئی معاشرے میں بچے کی پیدائش خوشی کا ایک بہت بڑا موقعہ فراہم کرتی ہے ۔ اس کی آمد قبیلے کی حربی قوت میں ایک اور جوان کی آمد متصوّر ہوتی ہے اور بسا اوقات بندوق چلا کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے[۲] ۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر براہوئی خواتین عموماً موزوں لوک گیت ''ہالو، ہلو'' گاتی ہیں جن کے لیے دف استعمال ہوتی ہے[۳] ۔

۱- برے، سر ڈینس، دی براہوئی لینگوئج، جلد دوم، ص ۱۰ ۔
۲- ایضاً ص ۲۷۰ ۔
۳- ایضاً ص ص ۲۷۱ تا ۲۷۲ ۔

موت کی رسموں میں تجہیز و تکفین تو اسلامی دستور کے مطابق انجام پاتی ہیں لیکن بعض رسمیں بہت قدیم ہیں اور میر نصیر خان اعظم کی ۱۷۷۶ء کی اصلاحات کے باوجود اب بھی جاری ہیں ۔ ماتم سرائی ، گریہ وزاری، چارپائی پر ایک مدت معینہ تک نہ سونا ، دودھ نہ پینا وغیرہ ایسی ہی رسمیں ہیں ۔ ان مواقع پر موزوں لوک گیت مودہ (نوحہ) بھی پڑھا اور گایا جاتا ہے ۔ قبائلیوں میں یہ تصور بھی پایا جاتا ہے کہ مردہ کی روح واپس لوٹتی ہے جو نقصان کا باعث ہوتی ہے ۔ چنانچہ اس کے دفعیہ کے لیے راستے میں رائی کے دانے پھینک دیئے جاتے ہیں اور اندھیرے میں مرحوم کا نام نہیں لیا جاتا، یا بہت ہی آہستہ لیا جاتا ہے ۔ مرحوم کے عزیز و اقارب دعائے مغفرت و خیر کے لیے آتے ہیں اور دعا کے بعد وارث کو ایک ، پانچ ، گیارہ ، یا اکیس روپے حسب توفیق یا حسب تعلق دیتے ہیں ۔ جفت روپے معیوب تصور ہوتے ہیں یہ مالی امداد ''پڑرس'' کہلاتی ہے۱ ۔

اجتماعی امداد کا یہ طریقہ براہوئی میں بہت قدیم معلوم ہوتا ہے ۔ شادی بیاہ کے اخراجات نمٹانے کے لیے بھی عزیز و اقارب سے مدد لے لی جاتی ہے جسے ''بجار'' کہتے ہیں۲ براہوئی مستورات اپنے اوقاتِ فرصت میں کشیدہ کاری کرتی ہیں ۔ ''کوٹڑوچکن'' (کاؤں کوٹرو کے نام کی مناسبت سے) اچھی خاصی مشہور ہے۳ یہ کشیدہ کاری کرتوں ، چادروں ، دوپٹوں وغیرہ پر کی جاتی ہے اور ان پر نہایت دیدہ زیب طریقے سے شیشے ٹکا دیئے جاتے ہیں ۔ واسکٹ ، زوڑ (نمدے کا بنا ہوا کوٹ) اور چھلیوں پر بھی کشیدہ اور شیشہ کا کام کیا جاتا ہے۴ ۔

براہوئی بچوں کے مخصوص کھیل جن سے بڑی عمر کے افراد محظوظ ہی نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اپنی عملی شرکت بھی احیائے طفلی سمجھتے ہیں ، گو ، ہو ، کھڈک اور میلش بھنکو کہلاتے ہیں۵ ۔ گو تو عام دوڑ کے مترادف ہے ۔ ہوکو جویا یا جھو یا واری واری بھی کہتے ہیں اور اس کے کھیلنے والے عموماً دو گروہوں میں بٹ کر کھیلتے ہیں اور اس میں بچوں کے علاوہ نوجوان بلکہ ادھیڑ عمر کے لوگ بھی حصہ لے لیتے ہیں اور سردار ، ٹھکری یا مقدم بھی بطور تماشبین اور منصف حصہ گیر ہوتے ہیں ۔

۱- پروانہ ، نور محمد ، ثقافت و ادب وادیٔ بولان میں - ''مضمون براہوئی ثقافت'' ص ۲۸۵ -
۲- ایضاً ص ۱۷۱ -
۳- برے، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگوئج جلد دوم ، پارٹ سوم ، ص ۱۷۱ -
۴- پروانہ ، نور محمد ، ثقافت و ادب وادی بولان میں، مضمون ''براہوئی ثقافت'' ص ۲۸۷-
۵- ایضاً ص ص ۲۸۸ تا ۲۹۶ -

علاج معالجہ کے لیے دور افتادہ اور شاہراہوں سے ہٹے ہوئے دیہات اور خیموں میں عموماً جڑی بوٹیاں استعمال ہوتی ہیں ۔

لوڑی یا پیشہ ور گویے بلوچوں کی طرح براہوئی معاشرہ کا بھی ایک لازمی جزو ہیں لیکن یہاں وہ محض معاشرے کے خدمت گاروں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ وہ شجراتِ نسب ، لوک ادب اور لوک گیتوں کے محافظ ہونے اور تقریبات پر نغمہ گو و موسیقی نواز ہونے کے بلوچوں کی طرح شاعروں اور شاعر گروں کا درجہ حاصل نہیں کر سکے اور نہ ہی انہیں براہوئی ثقافت کا نشان یا علامت سمجھا گیا ہے ۔

فصل چہارم

براہوئی زبان

براہوئی زبان آریائی یا ہندو اروپائی قدیم و جدید السنہ از قسم سنسکرت ، قدیم فارسی ، یونانی ، لاطینی ، انگریزی ، فرانسیسی ، جرمن ، اطالوی ، روسی ، فارسی اور ہندی کی طرح تعریفی زبان نہیں ، جو اپنے قواعدی رشتوں کو ممیّز کرنے کے لیے لاحقوں ، سابقوں یا میانوں کے ذریعے الفاظ کی انتہا یا ان کی صورت تک کو بدل ڈالتی ہیں اور یہ لاحقے ، سابقے اور میانے اسماء کے ساتھ مل کر اپنے معنی اور اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھتے ہیں ، تاکہ ایک نیا معنی یا ایک نیا لفظ پیدا ہوسکے۱ ، اور نہ ہی براہوئی زبان چینی یا تبتی کی طرح یک لفظی یا یک رکنی زبان ہے کہ ہر لفظ بغیر کسی اضافہ کے ایک بنیادی خیال کا مظہر ہو۲ ، بلکہ یہ التعاقی یا امتزاجی یا غیر تعریفی زمرہ کی زبان ہے ۔ اس زمرے میں قدیم و جدید سامی زبانیں از قسم بابلی ، فنیقی یا کنعانی یا آرامی ، عبرانی ، آشوری ، کلدانی ، مصری ، قبطی اور عربی اور یورال الطائی زبانیں از قسم سمیری ، ترکی ، منگولی ، ہنگروی وغیرہ شامل ہیں۳ ۔ دراوڑی السنہ ، از قسم تامل ، تلیگو ، ملیالم ، تولو ، کداگو اور براہوئی وغیرہ کہ تراشیدہ و متمدن بولیاں ہیں اور گوند ، اکھونڈ ، کوٹا ، ٹوڈا ، اور اون اور راج محل کہ غیر متمدن و نا تراشیدہ ہیں ، بھی اسی زمرے میں شامل کی جاتی ہیں ۔ ان تمام السنہ کا اصول مشترک یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کو لاحقوں ، سابقوں اور میانوں کے ذریعے ایسے جوڑ دیتی ہیں کہ وہ تعریفی السنہ کے لاحقوں کی طرح اصل لفظ میں کاملاً جذب تو

---

۱ ، ۲ ، ۳ ۔ کیسلز چلڈرنز ، بک آف نالج ، مطبوعہ کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ لندن ، جلد پنجم ص ۱۸۴۲ تا ۱۸۴۳

نہیں ہوتے لیکن اپنے معانی قائم رکھنے کے باوجود امتزاج یا التعاق سے ایک نیا معنی ضرور پیدا کر دیتے ہیں اور اس طرح تعریفی السنہ کے مقصد کو پا لیتے ہیں۱ ۔ گویا براہوئی اور دیگر دراوڑ السنہ کا سامی و حامی السنہ سے رشتہ نہ صرف قریبی بلکہ قدیم ہے اور اغلب ہے کہ مزید تحقیقات کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے کہ دراوڑ نسل کا شرارہ بنو سام و بنو حام کے شعلہ سے ہی ٹوٹا تھا !

براہوئی زبان چونکہ قلات کے جغرافیائی ماحول میں گھٹی رہی، جہاں صرف خانہ بدوشانہ ، شبانی اور قبائلی طرزِ حیات ہی ممکن تھا اس لیے یہ جنوبی بھارت کے مختلف ماحول میں پروان چڑھنے والی دیگر دراوڑ السنہ سے مختلف ہوتی گئی اور اپنی وہ ماہیت من و عن برقرار نہ رکھ سکی جو وادیٔ سندھ کے تمدن میں اس کے لیے مخصوص تھی ۔ زبان لازماً ایک جغرافیائی اور سماجی پرتو ہے اور براہوئی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جا سکتی ۔ ثانیاً ہند و پاکستان اور ایران میں قائم ہونے والی طاقتور سلطنتوں کے زیر اثر ، خصوصاً ما بعد اسلام دور میں ، جب کہ ان باہم متخالف و متضاد سلطنتوں میں ایک ناگزیر لسانی و تمدنی یگانگت پائی جاتی تھی ، براہوئی میں عربی ، فارسی ، بلوچی ، پشتو اور سندھی وغیرہ کے بے شمار الفاظ داخل ہو گئے، لیکن جنوبی بھارت کی دراوڑ السنہ اس یورش سے بچی رہیں ۔ ثالثاً ریاست قلات کی سرکاری ، درباری اور دفتری زبان فارسی تھی ، لہذا براہوئی صرف بول چال کی زبان رہ گئی اور تامل وغیرہ کی طرح کوئی ادب پیدا نہ کر سکی !

لیکن ان دخیل الفاظ کی ان دبیز تہہ کے باوجود براہوئی کی اساسی لغت بھی دراوڑی ہے ۔ گرامر زیادہ تر وہی ہے جو دراوڑ السنہ کی ہے ۔ پہلے تین اعداد است (ایک)، ارٹ (دو) مسٹ (تین) دراوڑی ہیں ۔ ضمائر جیسے در (کون ؟) دنا (کس کا) دڑے (کس کو) ، انت (کیا) ، ارا (کس کا) وغیرہ بھی دراوڑی ہیں ۔ دراوڑ الفاظ کم ہونے کے باوجود بہت مضبوط اور زندگی کے اساسی ترین اور ابتدائی ترین تصورات کے مظہر ہیں ۔ مثلاً منہ ، کان ، آنکھ ، دماغ ، خون ، نیند ، چوٹی ، تہ وغیرہ جیسے اسمائے ذات ، بڑا ، چھوٹا ، نیا ، پرانا ، میٹھا ، تلخ ، گرم ، سرخ وغیرہ ، صفات ، افعال جیسے ہونا ، ہو جانا ، آنا ، دینا ، کھانا ، بولنا ، سننا ، دیکھنا ، سمجھنا ، لینا ، مارنا ، ڈونا ، مرنا وغیرہ ۔ متعلق افعال جیسے پہلے یا پیشتر ، بعد ، سابقہ ، ابھی تک یا ہنوز ، اور آج وغیرہ میں براہوئی لازماً ایک دراوڑی زبان ہے۲ ۔ نہ صرف یہ بلکہ روزمرہ کی لغت میں بھی براہوئی اور دراوڑی السنہ بیّن طور پر

۱- دی امریکن پیپلز انسائیکلوپیڈیا ، جلد ہفتم ، مطبوعہ سپنسر پریس شکاگو ، کالم نمبر ۳۰۸
۲- برے ، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگوئج ، جلد دوم ، پارٹ دوم ، ص ۱۵ تا ۱۶

مشابہ ہیں ۔ یہ بات مندرجہ ذیل نقشے سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے[۱] :

اردو	براہوئی	دراوڑی السنہ
پانی	دیر	نیر
پتھر	خل	کل
آئینہ	آدینک	کناھدی

یہ تقابلی مطالعہ اچھا خاصا طویل و بسیط ہو سکتا ہے اور سر ڈینس برے نے اپنی ڈکشنری میں قریباً ساڑھے تین سو الفاظ دیے ہیں جو براہوئی زبان اور دیگر دراوڑ السنہ میں مشترک ہیں ۔

لیکن اس موازنے کو ذرا آگے بڑھایا جائے اور التعاق زمرہ کی ہی قدیم و جدید سامی السنہ سے اس کا تقابل کیا جائے تو نہایت معنی خیز اور ہر امکان مشابہت بلکہ یگانگت ملتی ہے ۔ مثلاً نقشہ ذیل میں براہوئی اور قدیم سامی السنہ کا ایک مختصر سا تقابلی منظر دیکھیے[۲] :

اردو	براہوئی	فنیقی ، عبرانی وغیرہ
ابا	باوا ، ابا	اب ، ابو ، ابا ، ابون
ماں	لماں	ایم ، امو ، ایما ، ام
کان	خف	قاف (براہوئی میں ق نہیں ہے)
آنکھ	خن	عین (براہوئی میں ع نہیں ہے)

یہ مشابہت و یگانگت براہوئی ، دیگر دراوڑی السنہ اور عربی کے تقابلی مطالعہ سے اور بھی واضح ہو سکتی ہے جیسا کہ نقشہ ذیل سے ظاہر ہو جائے گا[۳] :

اردو	براہوئی	دیگر دراوڑ السنہ	عربی
منہ	با	یابی ، بائی ، وائی ، وایی	فو ، فوہ
کان	خف	کیوی ، کوی ، کیپی ، گوی	قوف (کان کا بالائی حصہ)

۱- برے ، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگویج ، جلد دوم پارٹ سوم و ہفت روزہ ایلم مستونگ بابت ۱۷ نومبر ، ۲٦ نومبر و ۳ دسمبر ۱۹٦۴ء مضمون ، وادیٔ سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات ، از عین الحق فرید کوٹی ۔

۲- 'اے فرسٹ ہیبرو ریڈر' مصنفہ ڈاکٹر ڈنکن کیمیروں ص ص ۱۱ ، ۱۷ ، ۳٦ ، ۳۷ و کیسلز چلڈرنز بک آف نالج جلد پنجم ۔ کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ لندن ص ص ۲٦۵۷ ، ۲۷۵۱ ، ۲۹۹۹

۳- براہوئی الفاظ بمعہ معانی و دراوڑی مرادفات ، دی براہوئی لینگویج ، مصنفہ سر ڈینس برے جلد دوم پارٹ سوم سے ماخوذ ہیں اور عربی الفاظ منجد ، غیاث اللغات مطبوعہ رزاقی پریس کالپور اور فیروز اللغات فارسی مؤلفہ و مصنفہ مولوی فیروز الدین سے ۔

آنکھ	خن	کن ، کن، کنو، کنو ، خن ، قنو	
سے یا از	آن	ان ، آن ، آل	عن اورمن دونو مستعل ہیں
دل ، دماغ	است	ال، الن، الا، الامو، التا، التی است (مرکز ، بنیاد ، جڑ)	

مذکورہ تقابلی نقشے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ براہوئی کا قدیم سامی السنہ جن کی براہ راست جانشین اور حامل عربی ہے ، سے رشتہٗ یگانگت پایا جاتا ہے اور یہ بات ان کی نسل متعیّن کرنے میں بے حد اہمیت کی مالک ہے ۔

براہوئی کی لغت زیادہ سے زیادہ آٹھ دس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے ۔ سر ڈینس برے نے اپنی ڈکشنری میں ساڑھے پانچ ہزار الفاظ دے ہیں ، لیکن بہت سے الفاظ ان کی گرفت میں آنے سے بچ گئے ۔ بہر حال براہوئی اپنے اسی ذخیرۂ الفاظ سے قلات کے علاوہ مکران و خاران ، چاغی ، کوئٹہ ، کچھی ، کراچی ، سندھ اور جنوبی افغانستان اور مشرق ایران کے براہوئیوں کی ضرورتِ اظہار و ابلاغ کو پورا کر دیتی ہے ۔ پھر بھی ہمارے روز افزوں ترقی کے ماحول میں یہ ذخیرہ بہت کم ہے اسی لیے اب اس میں دھڑا دھڑ انگریزی اور اردو الفاظ داخل ہو رہے ہیں ۔ ویسے بھی براہوئی لغت کا قریباً پچاس فیصدی حصہ اردو دان طبقے کے لیے قابل فہم ہے کیونکہ براہوئی کے قریباً بیس فیصدی الفاظ ، دس فیصدی عربی اور قریباً ایک تہائی جٹکی ، سندھی ، بلوچی اور پنجابی سے مشترک ہیں ۔

براہوئی زبان و گرامر پر تصانیف

انیسویں صدی کے وسط میں اس علاقے میں انگریزوں کا دخل ہوا تو ایک انگریز لیفٹننٹ کہ ہنوز جوان تھے اور عسکریات و مسافیات سے کہیں زیادہ علم و ادب کا شغف رکھتے تھے (آر۔ لیچ) کوبراہوئی زبان و ادب کے مطالعے پر مامور کیا گیا ۔ انہوں نے اپنے مطالعات کو ایک مقالے کی صورت میں جنرل آف دی رائل ایشیالک سوسائٹی کو پیش کیا ۔ یہ مقالہ جون ۱۸۳۸ء میں جرنل کے شمارہ نمبر ۷۸ میں چھپا اور اسی کو رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۰۰ء میں ایک کتابچے کی صورت میں چھاپا ۔ یہی کتابچہ ہمارے پیش نظر ہے ۔

لیچ نے جس وقت براہوئی زبان و ادب کا مطالعہ کیا، اس وقتؒ براہوئی زبان کی کوئی مطبوعہ کتاب تو ایک طرف ، اس کے کسی قلمی نسخے یا دستاویز یا مسودے کا بھی کوئی پتہ نہ تھا۔

صاحب مقالہ نے ابتدائی پیرے میں لکھا ہے یہ زبان پوری خانیٔ قلات میں بولی جاتی ہے جس کی حد بندی کا خط ہڑند، شال، کوکک، کیچ اور ضلعے یا علاقہ موسومہ بہ گرم سیل کے بیچ میں کھینچا جا سکتا ہے۔ رسم الخط فارسی ہے اور حروف تہجی بھی ماسوائے ایک مخصوص ''ث'' جو دیوناگری .... کے قریب ہے اور ایک ''ٹ'' کے جو تالو سے ایک زور دار سانس نکال کر بولی جاتی ہے! براہوئی لوگ کہتے ہیں کہ ان کا زاد بوم حلب ہے اور یہ کہ ان کی کافی نعداد کوئی بیس قرون پیشتر وہاں سے ایک سردار موسومہ بہ قمبر کی سرکردگی میں بلوچستان میں ہجرت کر آئی، جس سے قمبرانی قبیلہ وجود میں آیا، جو اب اہمیت میں مقدم سمجھا جاتا ہے اور جس میں خانی موروثی طور پر چلتی ہے۱۔

اس کے بعد مصنف براہوئی گرامر کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو براہوئی گرامر کو سمجھنے اور متعین کرنے کی اولین کوشش ہے۔ وہ مختلف عنوانوں کے تحت اس کا ترتیب وار مطالعہ کرتا ہے۔ جیسے تذکیر و تانیث، اسماء کی مختلف حالتوں کو ظاہر کرنے کے لیے سابقوں، لاحقوں اور میانوں کا استعمال واحد جمع، صفات مقابلہ، ضمائر ذات، ضمائر تفاعلی، ضمائر استفہامیہ، ضمائر موصولہ، ضمائر متلازم، ایام ہفتہ، اعداد، توصیفی و ترتیبی اعداد، کسور، فعل اثباتی اور مصدر ''ہر فنگ'' (پوچھنا) کی گردانیں، متعلق افعال، حروف عطف اور حروف ندایا فجائیہ! اس کے بعد مصنف نے ۲۰۴ الفاظ کی فرہنگ دی ہے جو اعضائے جسمانی، رنگوں، ذائقوں، پھلوں، رشتہ داروں، اشیائے خوردنی، گھریلو ساز و سامان زیورات، آلات و معدنیات، اشجار اور متفرق موضوعات پر محیط ہے۔ اس کے بعد صاحب مقالہ نے ۶ لازم مصادر اور ۱۰۵ متعدی مصادر دیے ہیں اور پھر ۱۱۰ فقرات و تراکیب درج کیے ہیں جو حال احوال اور روز مرہ کے کاروبار اور گفتگو سے متعلق ہیں۲۔

لیچ کے بعد چارلس میسن نے اپنے سیاحت نامے لکھے۔ ۱۸۴۲ء میں 'بلوچستان، افغانستان اور پنجاب کی سیاحتیں' کتاب شائع ہوئی اور اس سے اگلے ہی سال ۱۸۴۳ء میں 'قلات کے ایک سفر کی روداد' منظر عام پر آئی۔ مؤخرالذکر میں فاضل سیاح نے براہوئی زبان کی مختصر سی فرہنگ بھی دی۳۔

میسن کے بعد ایک جرمن عالم لیسن نے براہوئی زبان کی طرف توجہ دی۔ ان کی کتاب مطبوعہ ۱۸۴۴ء کی پانچویں جلد میں اس نے 'براہوئی اور اس کی بول چال'

۱- لیفٹننٹ آر لیچ، ایپھی ٹوم آف دی گرامرز آف براہوئیکی، بلوچکی اینڈ پنجابی، ص ۱
۲- ایضاً ص ۱ تا ۱۲
۳- سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء ''براہوئی زبان و ادب'' مضمون از عبدالرحمان براہوئی

پر تفصیلی نظر ڈالی ہے ۔ لیسن پہلا یورپی عالم ہے جس نے براہوئی زبان کا تقابلی مطالعہ کیا اور لکھا : ''مجموعی طور پر براہوئی زبان اسی قبیلے سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس سے پنجابی اور سندھی نکلی ہیں ، لیکن اس میں صریحاً دراوڑی عنصر شامل ہے۱ ''۔ گو بعد کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ براہوئی اور دراوڑی کا منبع ایک ہی ہے اور اس میں پنجابی سندھی وغیرہ الفاظ بعد میں شامل ہوگئے ہیں ۔ تاہم لیسن کے فرمودہ پر ہی براہوئی کے لسانیاتی مطالعہ کی عمارت کھڑی ہوئی ۔

لیسن کے بعد ریورینڈ رابرٹ کالڈ ویل کی کتاب 'دراوڑی یا جنوبی ہند کی السنہ کی تقابلی گرامر' ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی ، جس نے براہوئی اور دیگر دراوڑ السنہ کے تعلقات کو لیسن کی نسبت نہ صرف زیادہ واضح کر دیا بلکہ انہیں زیادہ قریبی بتا دیا۲ ۔

کالڈ ویل کے بعد ایک اطالوی عالم فنزی فیلس نے براہوئی زبان کی طرف توجہ دی لیکن ان کے کام کی بنیاد لیبیج کی تحریرات ہی تھیں ۔ لہذا ان کی کتاب کو لیبیج کا ہی دوسرا ایڈیشن قرار دیا جا سکتا ہے ۳ ۔

۱۸۷۴ء میں ڈاکٹر بیلو کی کتاب 'دریائے سندھ سے دجلہ تک' لندن سے شائع ہوئی جس کے ایک ضمیمے میں براہوئی گرامر اور فرہنگ بھی درج تھی ۴ ۔ اسی سال ایک اور کتاب 'ہندوستان کی زبانوں کے نمونے' مؤلفہ سرجارج کیمبل کلکتہ سے شائع ہوئی جس میں براہوئی زبان کا بھی ذکر تھا ۵ ۔

۱۸۷۵ء میں کالڈ ویل کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ، جس میں دیگر السنہ کے علاوہ براہوئی زبان کے متعلق بھی معلومات درج تھیں ۔

اب تک جتنا کام براہوئی زبان و ادب خصوصاً اوّل الذّکر پر ہوا تھا ، وہ ضخامت یا مقدار میں زیادہ تو نہ تھا لیکن قابل قدر ضرور تھا ۔ اس کا عظیم ترین فائدہ یہ ہوا کہ براہوئی کے لسانی مقام کا تعیّن ہو سکا ۔ بیرونی علماء فضلاء کی مساعیٔ جمیلہ کو دیکھ کر بالآخر ایک براہوئی عالم بھی میدان میں اترے ۔ یہ مولوی اللہ بخش زہری تھے جو ہائی سکول کراچی میں فارسی کے معلّم تھے ۔ گو ان کا بنیادی مقصد اہل یورپ کو براہوئی سے آشنا کرنا تھا تاہم ان کی کتاب 'ہینڈ بک آف دی براہوئی لینگوئج' مطبوعہ کراچی

۱۔ برے ، سرڈینس ، دی براہوئی لینگوئج جلد دوم ، پارٹ دوم ، ص ۱۵
۲۔ سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء مضمون ''براہوئی زبان اور ادب'' از عبدالرحمان براہوئی
۳ ، ۴ ، ۵۔ سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء مضمون ''براہوئی زبان اور ادب'' از عبدالرحمان براہوئی ۔

۱۸۷۷ء براہوئی زبان قواعد اور ادب میں ایک گراں بہا اضافہ تھا - مولوی صاحب نے شروع میں براہوئی حروف تہجی دئیے ہیں جو سراسر اردو حروف ہیں - ان کے علاوہ دوہرے حروف (اوار حروف) بھ ، پھ ، تھ ، ٹھ ، چھ ، کھ اور گھ بھی دیے ہیں جو اردو میں ہو بہو مستعمل ہیں - اس کے بعد براہوئی فرہنگ بمعہ انگریزی معانی دی ہے - ان کے بعد تذکیر و تانیث واحد جمع ، اسمائے صفات ، اعداد ، توصیفی و ترتیبی اعداد ، اسم کی مختلف حالتوں ، گردان غیر معین اعداد ، ضمائر ، متعلق افعال ، حروف عطف اور حروف ربط پر بحث کرنے کے بعد ۱۳۷ براہوئی مصادر دیے ہیں - یہاں تک کتاب مذکور نے ۴۹ صفحات گھیرے ہیں - صفحہ پچاس سے لے کر صفحہ ایک سو چونتیس تک مولوی صاحب نے براہوئی نثر لکھی ہے جو صفحہ ۱۱۳ تک صفاتی ، استفہامیہ ، امر و نہی ، ہدایاتی ، تعارفی ، عدالت و قانونی فقرات پر مشتمل ہے اور صفحہ ۱۱۴ سے فاربس مینوئل کے ۱۹ پیروں کا براہوئی ترجمہ تحریر کیا ہے - ان پیروں میں پوری پوری لیکن چھوٹی کہانیاں بھی شامل ہیں -

۱۸۸۰ء میں جرمن یونیورسٹی میونخ کے ایک مشہور مستشرق ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے 'براہوئی گرامر' تالیف کی اور اسے سائنس اکاڈمی کو پیش کیا - ڈاکٹر ٹرمپ براہوئی زبان سے ذاتی طور پر واقف نہ تھے لیکن لیچ ، ڈاکٹر بیلو اور کپتان نکلسن وغیرہ کی تحریرات سے ہی مستفید ہو کر انہوں نے اپنی گرامر لکھی تھی ، جس کا ترجمہ ڈاکٹر تھیوڈور ڈوکا نے ۱۸۸۷ء میں کیا - ڈاکٹر ٹرمپ نے براہوئی کی دراوڑی اصلیت پر مزید استدلال سے کام کیا۱ -

براہوئی علم و ادب

براہوئی ادب کو غیر تحریری اور تحریری کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - غیر تحریری ادب میں لوک ادب کا حصہ ہے - جس کی ابتدا اتنی ہی قدیم ہو سکتی ہے جتنی کہ براہوئی زبان کی ابتدا - لیکن افسوس ہے کہ براہوئی زبان و ادب کو ابو تمام (م- ۸۵۰ء) یا فردوسی جیسا کوئی نغمہ پرداز نہ مل سکا - جو زمانۂ قدیم کے گیتوں اور نغموں کو اکٹھا کر لیتا یا قدیم قصوں اور کہانیوں کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ''فن یا علمِ شاعری کے متعلق براہوئی قبائل میں ایک واہمہ یہ بھی ہے کہ جو آدمی شاعر ہوگا وہ مفلس ہوگا ، بے اولاد

۱- سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء مضمون ''براہوئی زبان اور ادب'' از عبدالرحمان براہوئی اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ء مضمون ''براہوئی اور اردو'' از سید کامل القادری -

ہوگا ، کنگال ہوگا اور بسا اوقات نعمتِ بصارت سے بھی بے بہرہ ہوگا۔ البتہ اس کی شاعری کی آواز میں تیر کا سا اثر ضرور ہوگا۔ جس کو شاعر نے بد دعا دی اس کا خاتمہ اور جس کی تعریف کی اس کے لیے عزت و آرام لازمی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی باعث بسا اوقات آج بھی دیکھنے میں آئے گا کہ اگر کسی براہوئی کو اپنے مد مقابل کی باتیں بے اثر و بے وقعت ظاہر کرنی مقصود ہوں تو وہ یہی کہے گا کہ اجی صاحب! یہ یونہی غزل کہتا ہے۔ 'شعر خلیک'۱ بہر حال انفرادی طور پر چند اصحاب نے نغمہ اندوزی کے سلسلے میں کام کیا ہے اور وہ اتنا گراں قدر اور پر امکان ہے کہ اس کی بنیاد پر براہوئی غیر تحریری ادب کی وسعت و گیرائی کا ہلکا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ باقاعدہ اجتماعی کوشش کے بغیر اس خزانۂ عامرہ کی دریافت اور رطب و یابس سے اس کی صفائی ناممکن ہے۔

لوک گیت

ذیل میں کچھ لوک گیت اور کہانیاں مع اردو ترجمے کے دی جاتی ہیں جن سے ان کے مزاج اور معاشرت کی جھلکیاں مل سکیں گی۔ ایک دو مثالیں بلاحظہ ہوں :

(۱) ترجمہ :

(مرد) میرے چھوٹے سے قیمتی نگینے! میں تیرے گرد عود ران کی طرح پھروں گا۔
(عورت) میں تیرے ساتھ آؤں گی اے میرے اچھے محبوب۔
(مرد) میرے قیمتی نگینے! تم ہاں کہتی ہو لیکن شاید تم آؤگی نہیں۔
اب تم (خیرات حسن) دوگی ، اب نہیں دوگی اے خوبصورت جوان دوشیزہ!
اے گل لالہ! چھت پر کھڑی نہ ہو۔
رنڈی تمھیں دیکھ لے گی اے خوبصورت دوشیزہ!
اے گل سوسن! وہ تمھیں اپنا بنا لے گی۔

دوسری مثال :

(۲) ترجمہ :

اے حسینہ! ہمیں پانی دے دو۔
تیرے ہاتھوں کا پانی شیریں ہے ، ہمیں پانی دے دو۔
اے خیمے کی ملکہ! ہمیں پانی دے دو۔
تیرے ہاتھوں کا پانی خنک ہے ، ہمیں پانی دے دو۔

۱- خاکہ براہوئی زبان و ادب برائے پنجاب یونیورسٹی تیار کردہ نور محمد پروانہ۔

پہلا گیت شہری زندگی کا عکس ہے تو دوسرا خانہ بدوشانی زندگی کا نقش۔ پہلے گیت میں تشبیہات سب فارسی کی ہیں گو نفسِ مضمون براہوئی میں ہے۔ دوسرا گیت مختصر لیکن خالص براہوئی گیت ہے اور یہ جہاں براہوئیوں کی خانہ بدوشی کا مظہر ہے وہاں ان کے عشقیہ جذبات کا با سلیقہ اور مہذبانہ اظہار بھی ہے، جو یقیناً کئی ابتدائی و ارتقائی مراحل پر دال ہے[۱]۔ اس گیت کی معنویت اس میں پوشیدہ ہے کہ براہوئی زبان الھڑ اور آوارہ زبان نہیں بلکہ قلبِ انسان کے لطیف ترین احساسات کی عکاسی پر قادر ہے۔ براہویوں کو اگر پانی با افراط اور بر وقت میسر آ جائے تو ان کی سرزمین گل و گلزار اور باغ و بہار بن جائے اور ان کے صدیوں پرانے آلام و مصائب ختم ہو جائیں۔ پانی کی کمیابی بلکہ نایابی کا دکھ ان کے یہاں اتنا گہرا اور گھمبیر ہے کہ یہ اتنے مختصر، لطیف اور دلنواز گیت میں بھی ''ننے دیر ایتے'' کی التجائیہ لیکن تاریخی ترکیب میں ابھر آیا ہے[۲]۔

لوک کہانیاں

ان دو گیتوں کے علاوہ آر۔ لیچ نے اپنے مقالہ کے آخر میں دو کہانیاں بھی قلم بند کی ہیں۔ جو اب تک کی تحقیقات کے مطابق ہمارے پاس بلا شبہ براہوئی نثر کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ پہلی کہانی میں چار مسافر یعنی زرگر، ترکھان، درزی اور فقیر سفر کے دوران رات کے وقت ایک خوفناک جگہ پر پڑاؤ ڈالتے ہیں اور باری باری پہرہ دیتے ہیں۔ ترکھان ایک لکڑی سے ایک عورت کا جسم تراشتا ہے، زرگر اسے زیورات پہناتا ہے، درزی اسے ملبوس کرتا ہے اور فقیر اپنی باری میں دعا مانگ کر اسے ایک زندہ و تابندہ عورت بنا دیتا ہے۔ پھر وہ چاروں اس کے لیے جھگڑتے ہیں۔ بالآخر وہ ایک مسلمان راہگیر سے انصاف کی التجا کرتے ہیں لیکن وہ اس عورت کو دیکھ کر منصف بننے کی بجائے پانچواں شریک بن جاتا ہے۔ وہ کوتوال کے پاس انصاف کے لیے آتے ہیں لیکن وہ اسے خود قبضانا چاہتا ہے۔ بالآخر وہ بادشاہ کے رو برو حاضر ہوتے ہیں لیکن وہ عورت کو ہتھیا لیتا ہے اور ان سب کے پیٹ چاک کروا دیتا ہے[۳]۔ دوسری کہانی مُلّا منصور کے متعلق ہے جسے یتیمی کی وجہ سے قاضیٔ شہر کی ملازمت کرنا پڑی لیکن قاضی جی کی سختی سے تنگ آ کر اس نے صحرا کا راستہ لیا اور ایک بوڑھے

۱۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۶۲ء مضمون ''براہوئی زبان و ادب'' از سید کامل القادری۔

۲۔ رومان، ایم انور، دی براہوئیز آف کوئٹہ قلات ریجن، ص ۲۵ تا ۲۶ و ۵۱

۳۔ لیفٹننٹ آر۔ لیچ ایبی ٹوم آف دی گرامرز آف براہوئیکی، بلوچکی اینڈ پنجابی ص ۱۳ تا ۱۵۔

چرواہے کے پاس قیام کیا۔ بعد میں اسی چرواہے کی لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر شہر واپس آیا تو اس صحرا زادی کے حسن کا شہرہ سن کر بادشاہ، وزیر، وکیل اور قاضی نے اپنی اپنی خادماؤں کے ذریعے اسے دعوتِ معاشقہ دی صحرا زادی نے ان سب کو شام گھر پر بلا لیا۔ اس نے اپنے شوہر کو چھت پر لٹا دیا اور خود منتظر رہی۔ سب سے پہلے قاضی جی آئے اور سو روپیہ اس کی نذر کیا لیکن وہ ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ بادشاہ سلامت آ پہنچے۔ اس نے قاضی جی کو نوکرانی کا لباس پہنا کر چکی پیسنے پر بٹھا دیا اور بادشاہ کو اندر لے آئی۔ بادشاہ نے دو ہزار روپیہ نذر کیا ہی تھا کہ وزیر آ گیا۔ اس نے باہر آ کر بادشاہ کی آمد کی اطلاع دی اور پھر اس کی رضا و رغبت سے اسے ایک بوری میں بند کر کے اندر لے گئی۔ اتنے میں وکیل پہنچا تو اس نے اسے بھی مایوس نہیں ہونے دیا بلکہ ایک ڈوئی کی دم بنا کر جانوروں کے باڑے میں چوپایوں کی طرح چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ دروازے کو مقفل کر کے چھت پر اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ بادشاہ سلامت انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو پنسہاری سے پانی مانگا لیکن وہ قاضی صاحب نکلے۔ دونو ابھی شرمسار ہی ہو رہے تھے کہ صحرا زادی اور مّلا منصور نیچے اترے اور بوری کا منہ کھول کر وزیر کو باہر نکالا۔ اس کے بعد دروازہ کھول کر وکیل کی ہئیت دکھائی۔ وہ چاروں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے اور بادشاہ کی معیت میں اسے ''ماں بہن'' کہہ کر رخصت ہوئے۔ دونو میاں بیوی بہت عزت و مسرت سے رہتے رہے اور ان کے ہاں لڑکا تولد ہوا جب لڑکا سات سال کا ہوا تو قاضی جی کے سکول میں بھیج دیا۔ ایک دن صحرا زادی نے قاضی جی کو بلایا اور اپنے شوہر سے کہا کہ وہ گھنٹیاں لے کر چھت پر بیٹھ جائے اور جب قاضی جی براجمان ہو جائیں تو انہیں بجانا شروع کر دے۔ قاضی جی شام کو پہنچ گئے۔ سو روپیہ اس کی نذر کیا لیکن گھنٹیاں بجنے لگیں۔ صحرا زادی نے کہا ''میرا شوہر آ گیا ہے اور میرا منہ کالا ہو گیا ہے'' قاضی جی بہت گھبرائے تو اس نے انہیں صندوق میں بند کر کے قفل لگا دیا اور صبح سویرے رونا شروع کر دیا کہ میرا شوہر میری ماں کی لاش کو لایا ہے۔ لوگ باگ اکٹھے ہو گئے۔ بادشاہ بھی موقعہ پر پہنچ گیا۔ قفل کھولا تو اس میں سے قاضی جی نکلے۔ اس پر سب نے انہیں لعنت ملامت کی۔ زد و کوب کیا اور بادشاہ نے اسے ملک بدر کر دیا ۱۔ پہلی کہانی جہاں نہ صرف عورت بلکہ پوری کی پوری مجبور و مقہور

۱۔ لیفٹننٹ آر۔ لیچ، ایبی ٹوم آف دی گرامرز آف براہوئیکی، بلوچکی اینڈ پنجابی، ص ۱۰۵ تا ۱۰۹۔

انسانیت کے لیے ایک ہمدردی پیدا کرتی ہے اور آمریت کے خلاف نفرت ابھارتی ہے وہاں دوسری کہانی بے کردار اہلِ دولت و اقتدار کے مقابلے پر با کردار اور خود دار غریبوں اور بدویوں کو ابھارتی ہے۔

لییچ کے بعد براہوئی غیر تحریری ادب کے نمونے ہمیں میئر کی کتاب 'اے براہوئی ریڈنگ بک' مطبوعہ لدھیانہ ۱۹۰۷-۶ء میں بھی ملتے ہیں اور ان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ براہوئی غیر تحریری ادب مندرجہ ذیل اجزاء و اصناف پر مشتمل ہے۔

ضرب الامثال

یہ عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو عام، سادہ مثل جس کے ساتھ کسی واقعہ کا التزام یا رابطہ ضروری نہیں بلکہ وہ براہ راست کسی مخصوص صورت حال پر جچے تلے اور برجستہ فقرے کی صورت میں چسپاں ہو جاتی ہے اور دوسری وسائت، جس کا عربی لفظ بسط کے ساتھ گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے اور جس کے ساتھ کسی آپ بیتی یا جگ بیتی کا تذکرہ بطور شرح و بسط ضروری ہوتا ہے۔[۱] ذیل میں کچھ ضرب الامثال کو ملاحظہ کیجیے:

(۱) ''کونٹے ہمیڑے ایتہ — ہراڑے کہ پران ام تولنگ کیس ئی ات''[۲] یعنی اونی دری اس جگہ دو جہاں بعد میں تم خود بھی اس پر بیٹھ سکو۔ یاد رہے کہ اونی دری یعنی کونٹ کو براہوئی خواتین خود بنتی ہیں اس لیے یہ لفظ خواتین کا مظہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی بیٹی کا رشتہ ایسی جگہ دو جو تم سے نچلے درجہ یا برابر کی ہو جہاں تم آسانی سے آ جا سکو اور دکھ سکھ میں شریک ہو سکو۔ یہ مثل افریشیائی مزاج اور رواج کے عین مطابق ہے۔ لیکن یورپی ذہن ان باریکیوں کو کہاں پا سکتا ہے۔ افسوس کہ سر ڈینس برے نے اس مثل کا معنی یہ لیا کہ براہوئی لڑکی اگر کسی سندھی کے یہاں بھاری قیمت پر بیاہ دی جائے تو اس کے عزیز و اقارب اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے قریبی تو قریبی، دور کے رشتہ دار بھی اپنی آمد و رفت اور آئے دن کی مہمانی اور آؤ بھگت سے اس سندھی دولہا کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔[۳]

(۲) ''ہیٹے کہ کھٹی ہلیک، شعران نا ارغے کسیک''[۴] یعنی جب بکری کی شامت

۱- ہفت روزہ ''ایلم مستونگ'' ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء مضمون ''براہوئی متل'' از جورک جھلاوانی۔

۲- ایضاً ایضاً

۳- برے، سر ڈینس، دی براہوئی لینگوئج، جلد دوم، پارٹ دوم، ص ۱۲ تا ۱۳۔

۴- ایضاً جلد دوم، پارٹ سوم، ص ۱۷۶۔

آتی ہے تو چرواہے کی روٹی کھا جاتی ہے ۔ مفہوم یہ ہے کہ اپنے محافظ کا احترام نہ کرنا یقیناً کسی شامت اور بدبختی کا پیش خیمہ ہے ۔

(۳) ''زمانہ آخرے شفکو ، خل بڑزا مسوئے ، بھلا شف مسوئے''۱ یعنی زمانہ ختم ہونے کو آ گیا ۔ چھوٹے پتھر اوپر ہو گئے اور بڑے پتھر پست ہو گئے ۔ مفہوم یہ ہے کہ ایک زبردست انقلاب کی نشانیاں ہیں یا قیامت کے آثار ہیں ۔

(۴) ''بادشاہ نہ خن آف ، خف ارے''۲ یعنی بادشاہ کی آنکھیں تو نہیں ہیں البتہ کان ہیں ۔ مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی نگہبانی تو نہیں کر سکتا لیکن اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے ۔ یہ مفہوم بھی ہے کہ بادشاہ کا ذاتی مشاہدہ تو ہے نہیں صرف سنی سنائی در چلتا ہے ۔

(۵) ''خشکا رہ گورنا شکار''۳ یعنی بارانی زمین میں کاشتکاری اتنی ہی مشکل ہے جتنا گورخر کا شکار ۔

(۶) ''نی انت گناہ ۔ دیر چشمہ غان لڑد''۴ یعنی تیرا کیا گناہ ہے ؟ پانی تو اپنے منبع سے ہی گدلا ہے ۔ مفہوم یعنی کہ ابتدا ہی غلط ہے تو انتہا معلوم !

(۷) ''لشکر ناخلوک آباد مریک ۔ پڑنا خلوک آباد مفک''۵ یعنی فوج کے مارے پیٹے ہوئے تو آباد ہو جاتے ہیں لیکن پیٹ کے مارے پیٹے آباد نہیں ہو سکتے گویا دلدادگان اکل و شرب اور عیش و عشرت کا سنبھلنا بہت مشکل ہے ۔

(۸) ''خدا نبتی اے بوح و خلا ہم تپ''۶ یعنی خدا غریبی اور ناداری تو جڑی بوٹیوں اور پتھروں کو بھی نہ دے ۔

(۹) ''ککڑ خایہ اس ایتک جہانے خبر کیک او صدف مرواری خنیک توار کپک''۷ یعنی مرغی انڈا دیتی ہے تو دنیا کو سناتی ہے لیکن صدف موتی پیدا کرتی ہے تو بھی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی گویا ''خور کنگا رزان توار بھاز کیک'' ۸ یعنی خالی برتن شور

۱- برے ، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگوئج ، جلد دوم پارٹ دوم ، ص ۱۷۸ ۔
۲- لیفٹننٹ آر لیچ ، ایپی ٹوم آف دی گرامرز آف براہوئیکی ، بلوچکی اینڈ پنجابی ، ص ۱۸
۳- برے ، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگوئج ، جلد دوم ، پارٹ سوم ، ص ۱۸۷ ۔
۴- ایضاً ص ۱۹۶ ۔
۵- سالنامہ ماہ نو کراچی ، مارچ ۱۹۶۶ء ، مضمون '' براہوئی زبان اور ادب'' از عبدالرحمان براہوئی ، ص ۱۲۶ ۔
۶- ایضاً
۷- برے ، سر ڈینس ، دی براہوئی لینگوئج ، جلد دوم ، پارٹ سوم ، ص ۱۸۰ ۔
۸- ایضاً ص ۱۸۵

زیادہ کرتا ہے :

(۱۰) ''ٹھکریء سردارئے کسیس بخنس کنے ۔ او کھل نائےء کھل کنء''۱ یعنی ٹھکری اور سردار کو کسی نے تقسیم نہیں کیا یعنی اپنے لیے مخصوص نہیں کیا بلکہ وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے -

(۱۱) ''ہچ نادزی گھو کلانی اٹ مفک''۲ یعنی اونٹ کی چوری گھٹنوں کے بل چلنے سے نہیں ہوتی گویا عظیم مقاصد رینگ کر چلنے سے حاصل نہیں ہوتے -

وسائت کی ایک مثال بھی درج ذیل ہے - ایک غریب براہوئی خان سے ہم کلام ہوا تو شام کو گھر میں کسی سے بھی نہ بولا - گھر والوں نے اسے بلانے کی بہت جد و جہد کی تو کہنے لگا

اے با کہ ہیت کر پنے خان نو　　　داسا امر ہبت کے سعران تو ؟

یعنی جس منہ نے خان جیسے عظم المرتبت انسان سے گفتگو کی ہو وہ اب چرواہے سے گفتگو کے لیے کیسے تیار ہو؟ ۳

غرضیکہ براہوئی ضرب الامثال ان کے معاشرے ، ان کی روزمرہ کی زندگی اور حیات کے بہت قیمتی تجربات کی آئینہ دار ہیں اور گو سر ڈینس برے نے اپنی ڈکشنری میں سینکڑوں ضرب الامثال دی ہیں لیکن معمر براہوئیوں سے رابطہ اس خزانۂ عقل و دانش میں مزید اضافے کا موجب ہو سکتا ہے -

لوک گیت (الف)

(۱) مودہ یعنی نوحہ یا بین یا مرثیہ - یہ بھی خالص عورتوں کا گیت ہے جو وہ اپنے کسی عزیز کی موت پر گاتی ہیں - مثلاً ایک بہن بھائی کی وفات پر کہتی ہے :

کنا ایلم کنے اتدس آرانگی آنہاس نی　　　ھمیڑے دیر کنے آن دوست خناس نی

یعنی اے میرے بھائی ! مجھے یوں چھوڑ کر تم کہاں چلے گئے ہو اور وہاں وہ کون ہے جسے تم نے مجھ سے بھی زیادہ عزیز سمجھ لیا ہے ؟۴

۱- ثقافت اور ادب وادئی بولان میں مضمون ''براہوئی ادب'' از عبدالرحمان کرد ، ص ۲۰۷ تا ۲۰۸ -

۲- ہفت روزہ ایلم ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۶ء ، ''براہوئی متل'' از جورک جھلاوانی -

۳- ایضاً ۱۰ نومبر ۱۹۶۶ء ایضاً

۴- ہفت روزہ ایلم مستونگ ، ۱۷ نومبر ۱۹۶۶ء ''براہوئی متل'' از جورک جھلاوانی -

(۲) شند ہینگ ۔ لفظی معنی پھلاوہ اور بہلانا ہے ۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے اسے لولی (لوری) بھی کہتے ہیں ۔ مثلاً ماں بچے سے کہتی ہے :

نی اس پھل استنا ، پھلان گجینا کنے دوست اس کنا جید اس ہنینا ۱

یعنی تم میرے دل کے پھول ہو ۔ تمام پھولوں سے منتخب ۔ تم مجھے پیارے ہو ۔ اے میرے شیریں لخت جگر !

نا پیری ام کنے دوست بنک نی ولے دشمن نا موناں ام سلک نی ۲

یعنی تمہارا بڑھاپا بھی میں چاہتی ہوں (عمر دراز بھی چاہتی ہوں) لیکن کان کھول کر سن لے ، تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ تم دشمنوں کے مقابلے پر کھڑے ہو جاؤ ۔

بجانی تھوفکس زیبت نفوک مئے ناد و آن زغمے ناژ انبا رہ دومئے ۳

یعنی تمہاری کمر پر بندوق خوبصورتی سے بندھی ہوئی ہو اور تلوار کو تمہارے ہاتھ سے طوفانی جھنکار ہو !

اس کی ایک قسم جلونٹ کہلاتی ہے یعنی جھولے کا گیت ۔ ننھے بچے کو جھولے میں لٹا کر براہوئی مائیں یہ گیت گاتی اور بچے کو سلاتی ہیں ۔

لوک گیت (ب)

(۳) متفرق لوک گیتوں کی کئی قسمیں اور سریں مشہور ہیں ۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(الف) لیلی مور

ترجمہ : جو استدعا کرتا ہوں
اسے آپ برا مناتی ہیں
بتائیے اس (بھیانک) سردی میں
آپ مجھے کس کے پاس بھگانا چاہتی ہیں ؟ ۴
یہ ایک پرزور استدعائے محبت تصور کی جا سکتی ہے !

۱۔ ہفت روزہ ایلم مستونگ ، ۱۷ نومبر ۱۹۶۶ء "براہوئی متل" از جورک جھلاوانی ۔
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء ایضاً
۴۔ ہفت روزۂ ایلم مستونگ ۲۶ نومبر ۱۹۶۶ء "براہوئی متل" از جورک جھلاوانی ۔

(ب) برنازنا کی ایک مثال ملاحظہ ہو :

ترجمہ : (اے میری محبوب !) تو اب ناز و ادا کے ساتھ آ جا ، تو
اب ناز و ادا کے ساتھ آ جا
تو نے بہت سوں کا دل موہ لیا ہے ،
لے اب میرے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر ،
تو اب ناز و ادا کے ساتھ آ جا ، تو اب ناز و ادا کے ساتھ آ جا !
میں جانتا ہوں کہ تو حسین و جمیل بلکہ لاثانی ہے ،
اور تیرا حلق ایک ساز کی مانند ہے
اب اپنے ناز و ادا کے ساتھ آ جا ، آ جا اے میری محبوب آ جا !۱

ایک اور برنازنا کا بول ہے :

"شوخ ، شرابی ، مستس ، دلبر ، ہیہ ، سکر بار ، دانگی"۔ یعنی اے میرے شوخ ، شرابی مخمور دلبر ! نہ جاؤ ! اے شکر بار ! یہاں آؤ ! ۲ ایک اور مثال ملاحظہ ہو !

ترجمہ : اے میرے کھیلو جان ؟
آؤ کہ تمھارے انداز ہی مجھے کچھ کہہ سکے ہیں اور
تمھاری بر محل باتیں ہی مجھے گرفتار دام کر سکتی ہیں
گویا محبوب کو اپنے پاس بلانے کی ترکیب
اسی کے انداز و گفتار کی محبوبیت کی بنا پر کی جا رہی ہے ؟ ۳

آخر میں برا ہوئی کی ایک پرانی غزل ریورنیڈ میئر کی کتاب 'اے براہوئی ریڈنگ بک' کی جلد اول سے درج کی جاتی ہے ۴

ترجمہ : اپنے خالق خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم اپنے محبوب کے روبرو ہوئے
ہماری آنکھیں روشن ہوگئیں ، چاند کو شرمانے والی کے دیدار سے
او سومری ! باغ میں ایک دفعہ سیر کے لیے تو آؤ۔
تو اپنے رخساروں سے باغ کے پھولوں کو شرمندہ کر دے گی ۔

۱- ثقافت و ادب وادئی بولان میں ، مضمون "براہوئی ادب" از عبدالرحمان کرد ص ۲۱۶ ۔
۲- ریورنیڈ ٹی جے ایل میئر ، اے براہوئی ریڈنگ بک ، جلد اول ، ص ۱۱ ۔
۳- ہفت روزہ ایلم مستونگ ۲۶ نومبر ۱۹۶۶ء "براہوئی ادب" از جورک جھلاوانی ۔
۴- ریورنیڈ ٹی جے ایل میئر ، اے براہوئی ریڈنگ بک ، جلد اول ، ص ۱۲ ۔

ماہ جبیں سومری کو سنگار کی کیا ضرورت ہے ؟
تو ہمیں عزیز ہے - اپنی دنیا سے ایک دفعہ آ جاؤ۔
تو نے ہمارا دل لے لیا ہے اور خود مہتاب کو پسند کر لیا ہے !

غرضیکہ براہوئیوں کا غیر تحریری ادب ان کی جذباتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو مختلف اصنافِ سخن کے ذریعے بیان کرتا ہے اور اس کی یہ روایت جاری و ساری ہے۔ چنانچہ ایکی نوشکوی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں نغمہ پرداز رہا ۔ اس کے کلام کا بہت تھوڑا حصہ ہی ابھی تک تحریر میں لایا جا سکا ہے اور بقیہ لوڑیوں کے ذہنوں میں ہی محفوظ ہے ۔ اس نے غیر تحریری ادب کی قدیم روایت کو بھی برقرار رکھا لیکن اس میں بلوچستان پر انگریزوں کی آہنی گرفت اور اس کے نتیجہ کے طور پر براہوئیوں اور بلوچوں پر مسلط عذاب کا احساس بھی پایا جاتا ہے اور وہ مایوسی کی برف میں بھی بہارِ فتح کا گیت گاتا ہے ۔ اس کے یہ شعر تو بلوچستان کے کونے کونے میں زبان زد خاص و عام ہیں[1] :

ترجمہ : اے نصیر خان ولی!
گھوڑا بے قابو ہو گیا ہے
آج ہمارے لیے شام ہے
کل ہماری بھی باری آئے گی !

ضرورت اس بات کی ہے کہ لوڑیوں اور معمر براہوئیوں سے براہ راست رابطہ قائم کر کے ان کے قلوب و صدور کے اندوختہ کو جلد از جلد سلکِ تحریر میں پرو لیا جائے ورنہ مرورِ زمان کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان غیر تحریری لوک ادب کے ضیاع کا احتمال اور اندیشہ ہے اور ہم براہوئی ادب کے نادر نمونوں ، ان کے عظیم خیالات اور شاہکاروں سے محروم ہو سکتے ہیں !

تحریری ادب

براہوئی تحریری ادب کی عمر تقریباً سوا دو سو سال ہے اور اس کا نقطہ آغاز میر نصیر خان کی تخت نشینی (۱۷۴۹ — ۱۷۵۰ء) قرار دیا جا سکتا ہے ۔ میر موصوف کا دور ریاست قلات کا زریں دور تھا ۔ اس نے نہ صرف ریاست کی داخلی تنظیم میں انقلابی اصلاحات کیں اور براہیوں

۱- اوریئنٹل کالج میگزین لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ء - "براہوئی زبان و ادب" از سید کامل القادری ص ۲۰ تا ۲۱ -

اور بلوچوں کے قوام سے اسے وسعتِ نظر بخشی بلکہ قبائلی نظام کو ایسے منظم کیا کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مؤثر ہوسکے اور براہوئی معاشرت و ثقافت کو شریعت اسلامیہ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ میر موصوف علمی و ادبی ذوق کا مالک تھا اور علم و ادب کا مربّی بھی تھا ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں بلوچی زبان کا عظیم ترین شاعر جام درک اس کا ملک الشعراء تھا وہاں براہوئی زبان کا اولّین عالم و مصنف مّلا ملک داد بھی اس کے دربار کی زینت تھا!

براہوئی تحریری ادب کا جائزہ لینے کے لیے اسے مندرجہ ذیل چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

۱۔ پہلا دور جو میر نصیر خان اعظم (۹۴۔۔۰ ۱۷۵۰ء — ۱۷۸۴) کے ساتھ شروع ہوا اور اس کے ساتھ ختم ہوگیا ۔

۲۔ دوسرا دور ۱۸۱۶ سے ۱۸۸۰ء تک ۔

۳۔ تیسرا دور ۱۸۸۰ سے ۱۹۶۰ء تک ۔

۴۔ جدید دور ۱۹۶۰ء سے . . .

پہلا دور

اس دور کی صرف ایک ہی تصنیف ابھی تک منظر عام پر آسکی ہے اور وہ بھی مولانا نبو جان[1] کی مساعئی جمیلہ کا نتیجہ ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ اس دور میں اور براہوئی کتب بھی لکھی گئی ہوں جو مسودات کی صورت میں موجود ہوں ۱ ۔ بہر حال 'تحفتہ العجائب' مّلا ملک داد کی ایک چھوٹی سی کتاب ہونے کے باوجود براہوئی کی اوّلین کتاب ہونے کی وجہ سے ایک بے نظیر اہمیت کی مالک ہے !

مّلا ملک داد کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں ۔ ان کی کتاب زیر بحث سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد کا نام آدین تھا اور وہ غرشین قبیلہ کے پٹھان تھے ۔ وہ اصل میں قندھار کے باشندے تھے لیکن قلات میں سکونت پذیر ہوگئے تھے ۔ وہ عربی ، فارسی ، پشتو ، بلوچی اور براہوئی کے عالم اور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میر نصیر خان اعظم کے دور میں لکھی جب مؤخرالذکر کو سریر آرائے سلطنت ہوئے قریباً دس سال ہوگئے تھے۔ سال تصنیف ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ ہے ۔ یہ تصنیف ایک قلمی نسخے کی صورت میں مّلا موصوف کے پسماندگان کے پاس محفوظ رہی حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی عیسوی

۱۔ ماہنامہ الس ، کوئٹہ اپریل ۱۹۶۶ء "براہوئی زبان نا اولیکو کتاب" ۔ از عبدالرحمان محمد شہی ۔

کے اوائل کے ایک براہوئی عالم مولانا نبّو جان کو ان کے وارثوں سے دستیاب ہو گئی ۔ مولانا موصوف نے اصل نسخے میں اصلاح کی اور ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں لاہور سے چھپوا دی۱ ۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل نسخہ کون سے رسم الخط میں تھا ۔ خود مولانا نبو جان کا صحیح شدہ نسخہ بھی اصل نسخے کی طرح ناپید ہے ۔ اغلب خیال یہی ہے کہ اصل و صحیح شدہ مسودات دونوں کا رسم الخط فارسی تھا اور املا کی طرز پشتو تھی ۔ براہوئی رسم الخط کی اب تک قدیم ترین شہادت ہمیں لیفٹیننٹ آر۔ لیبچ کے مقالہ مطبوعہ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے شمارہ جون ۱۸۳۸ء میں ملتی ہے ، جس کا تفصیلی حوالہ غیر تحریری ادب میں دیا جا چکا ہے اور جس کے مطابق اس کا رسم الخط فارسی تھا ۔ ۱۷۵۹ء اور ۱۸۳۸ء میں کچھ اتنا زیادہ بعد زمانی نہیں ۔ اس عرصے میں ریاست قلات پر ایک ہی خاندان کی حکومت رہی اور کوئی ایسی بنیادی ، ہمہ گیر تبدیلی نہیں آئی جو براہوئی تمدن کو یکسر ہی بدل ڈالتی اور نصیر خاں اعظم کی روایات آج کی طرح بلکہ آج سے بھی زیادہ ۱۸۳۸ء میں براہوئی رگ و پے میں پیوست تھی لہذا یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ 'تحفۃ العجائب' کا اصل نسخہ اور قریباً ڈیڑھ سو سال بعد کا مولانا نبّو جان کا نسخہ دونوں فارسی رسم الخط میں تھے ۔ ۱۹۰۵ء میں چھپنے والے نسخے بھی اب قریب قریب ناپید ہیں ۔ گو انڈیا آفس لائبریری لندن میں ضرور موجود ہیں لیکن ان نسخوں کی بنا پر بعد میں چھپنے والے نسخے دستیاب ہوئے ہیں ۔ ہمارے زیر مطالعہ نسخہ مولانا عبدالباقی درخانی صاحب کا مکتوبہ ہے جو ۱۴ اگست ۱۹۵۸ء کو یوم آزادی پر تکمیل پذیر ہوا ۔ یہ نسخہ اسلامیہ پریس کوئٹہ کا مطبوعہ ہے اور اس میں ۲۷۰ اشعار ہیں!

افسوس ہے کہ ملّا ملک داد صاحب کا فارسی ، پشتو ، بلوچی اور دیگر براہوئی کلام ضائع ہوگیا اور ان کی واحد یادگار یہی براہوئی منظوم کتاب 'تحفۃ العجائب' رہ گئی ۔ لیکن اس سے ہم ملّا موصوف کے ذہن و قلب اور ایمان و اعتقاد اور میلانات و رجحانات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ملّا مذکور ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھے اور انھوں نے اپنی علمیت اور جولانئے طبع کو زیادہ تر دینی افہام و تفہیم اور درس و تدریس کے لیے وقف کیا ہوا تھا ۔ یہ اندازہ لگانا بھی چنداں مشکل نہیں کہ مولانا ملک داد کے ابنا و اخلاف میں سے کوئی بھی علمی مذاق کا مالک نہ تھا ۔

کتاب بیالیس ابواب پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں ۔

حمد ، نعت ، صفت چہار یار کبار ، صفت بہشت ، بیان دوزخ ، بیان تصنیف کتاب ، بیان خواندن علم شرعی ، مذمت تارک نماز ، نماز با جماعت ، صفت ایمان ، صفت ایمان مفصل ،

صفحت ایمان مجمل ، فرضہائے طہارت ، سنتہائے وضو ، مستحبات وضو ، مکروہات وضو ، شکنندہ ہائے وضو ، غسل جنابت ، فرضہائے غسل ، سنتہائے غسل ، وزن آب وضو ، فرضہائے تیمم ، مقدار میل ، فرضہائے نماز ، واجب ہائے نماز ، سجدہ سہو نماز ، سنت ہائے نماز ، سنت ہائے نفلی نماز ، مستحب ہائے نماز ، رکعات فرض پنج وقت ، سنت موکدہ و نفل روزہ ہائے رمضان المبارک ، چیز ہائے منع وغیر منع در روزہ ، سنت ہائے تراویح ، صدقہ عید الفطر ، روزہ ہائے نفلی ، زکواۃ مال دادن ، عشر زراعت ، مانع زکواۃ و عشر ، فضیلت زکواۃ ، گزاردن حج بیت اللہ اور باب در بیان خاتمہ کتاب و التجا ۱ -

حمد میں کہتے ہیں :

ترجمہ : ساری حمدوثنا خدا کے لیے ہے کہ وہی ساہ و گدا کا روزی رساں -

وہ عجیب رحمان و رحیم پالنہار ہے کہ بنجر ، بارانی زمینوں کو سرسبز کر دیتا ہے -

اس نے پہاڑ سے چشمے اور کاریز پیدا کیے تا کہ بوستان و کشت آزار آباد ہوں -

اس نے بہت سے رنگا رنگ عجائب پیدا کیے اور درودیو پری پیدا کیے -

اس نے فرشتے اور جن و انس پیدا کیے لیکن ہر جنس کو اپنا اپنا رنگ دیا -

آدم کی سرشت کے چار عناصر ہیں اور خاک و آتس اور باد و آب ان کی تعداد ہے -

عجیب رنگ ، عجیب صورت اور عجیب چہرہ بنی آدم پر اس نے بہت سی مہربانی کی ہے -

عاجز ، مسکین اور فقیر ملک داد کے لیے کہو (دعا مانگو) کہ خدا اسے بخشے !

حمد براہ راست دل سے نکلنے کی وجہ سے انتہائی اثر انگیز ہے اور ملا موصوف کی شاعرانہ قدرت کی دلیل ! ۱

نعت کے شعر بھی اثر و خلوص میں ڈوبے ہوئے ہیں - مثلاً :

محمدؐ افضل کل انبیاتا محمدؐ خاتم پیغمبراتا ۲

اردو معنی : محمدؐ افضل الدنیا ہیں اور محمدؐ خاتم النبییّن ہیں

منقبت بھی اسی خلوصِ قلبی کی مظہر ہے - اس کے بعد بہشت ، دوزخ ، تصنیف کتاب اور

۱- ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان ، اپریل ۱۹۶۶ ، "تحفہ" العجائب" مضمون از عبدالرحمان براہوئی

۲- "تحفۃ العجائب" مکتوبہ مولانا عبدالباقی درخانی مصنفہ ملا ملک داد قلاتی ، ص ۹۴ -

فوائد حصول علم دین کا بیان ہے۔ پھر پانچ ابواب میں تارک نماز، نماز باجماعت، صفت ایمان، ایمان مفصل اور ایمان مجمل کو بیان کیا گیا ہے۔ بارھویں باب سے لیکر اکتالیسویں باب تک یعنی تیس ابواب میں فقہ حنفی کے مسائل بیان کیے گئے ہیں جو قدوری کی منیۃ المصلی، اور ہدایا سے ماخوذ ہیں اور متفق علیہ ہیں۔ آخری باب میں دعا ہے۔

ترجمہ: اسلام کے ارکان پانچ ہیں۔ اے خدا! ان پانچوں کو ہمارے نصیب فرما!

اے خدا وند! مجھے توفیق کا رفیق ایمان بنا!

اے غفار و رحمان! مسلمانوں کو ایمان عطا فرما!

زبان قدیم براہوئی زبان ہے جس کے بعض الفاظ آج کل متروک ہیں لیکن سوا دو سو برس پرانی براہوئی زبان کا نمونہ ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم براہوئی زبان میں اظہار خیالات کے لیے الفاظ کا فراواں ذخیرہ موجود تھا۔ کتاب کی زبان پر عربی فارسی الفاظ کا بھی اچھا خاصا اثر ہے اور یہ موضوع کی مناسبت اور مصنف کے رجحان طبع کی بنا پر قدرتی اور لازمی امر تھا۔ بہر حال مّلا موصوف نے حتیٰ الوسع مانوس عربی فارسی الفاظ ہی استعمال کیے ہیں۔ آج سے دو سو سال پہلے کے براہوئی ذہنی و علمی طور پر کیسے تھے اور مصنف کا ان کے متعلق کیا نظریہ تھا؟ یہ ہمیں چھٹے باب دربیان تصنیف کتاب'' کے تین اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

ترجمہ: تحفہ عجائب نامی کتاب میں نے محض ثواب کے لیے براہوئی زبان میں لکھی۔

براہوئی بہت جاہل ہیں اور دین کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔

میں نے اللہ تعالی کی رضا سے یہ تصنیف کی ہے کہ شاید حق تعالیٰ انہیں ہدایت بخشے!

اپنے اور تصنیف کتاب کے سن کے متعلق لکھا ہے:

ارے دابندہ ساکن فی القلاتے	کہ این آدین نا غرشین ذاتے
ہزار و یک صد و ہفتاد و سہ سال	رسول تا ہجر تان اے نیکو اعمال[۱]

غرضیکہ یہ کتاب اور اس کا مصنف دونوں براہوئی تحریری ادب میں ایک منفرد اور غیر فانی اہمیت کے مالک ہیں۔ مّلا ملک داد نے پہلی دفعہ براہوئی زبان کو علم و ادب اور شریعت اسلام کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس طرح نہ صرف اس کی قوت اظہار کو وسعت دی بلکہ اس کی امکانی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کیا۔ ان سے پہلے براہوئی صرف خانہ بدوشوں کی بول چال کی عامی زبان تھی لیکن انہوں نے اسے مسلمانوں کی دیگر علمی و ادبی زبانوں

۱۔ ''تحفۃ العجائب''مکتوبہ مولانا عبدالباقی درخانی مصنفہ ملاّ ملک داد قلاتی ص۔ ۳۶۔

کی صف میں لا کھڑا کیا - ثانیاً علم و ادب جہاں انسانی معاشرت و سیاست کی پیداوار ہوتے ہیں - وہاں اس معاشرت و سیاست کے رہنما اور مشعل بردار بھی ہیں - مٌلا ملک داد نے براہوئی معاشرے کو اپنے تخیلات و اعتقادات کی روشنی میں دیکھا اور نتیجہ نکالا کہ اس معاشرے پر جاہلیت کے غیر اسلامی اثرات نقوش کے سائے بہت گہرے ہیں اور انہوں نے ان ظلمتوں کو دور کرنے کے لیے براہوئی زبان کے ذریعے نور اسلام پھیلانے کی جد و جہد کی - ان کا یہ تجزیہ اتنا صحیح تھا کہ ان کی کتاب کی تصنیف کے سترہ سال کے اندر ۱۷۷۶ء میں میر نصیر خان اعظم نے براہوئیوں کی جہالت اور غیر اسلامی طرزِ حیات کو دور کرنے کے لیے جھلاوان میں ایک وفد بھیجا جس نے وہاں ایسے قوانین نافذ کیے جو شریعت اسلامیہ اور وقار انسانیہ کے لیے مفید تھے ۱ - گویا مٌلا ملک داد میر نصیر خان کو اصلاحات کے ذہنی محرک تھے - ثالثاً مٌلا ملک داد کا اثر اتنا جاودان اور ہمہ گیر تھا کہ وہ انہی کے دور تک محدود نہ رہا - انیسویں صدی کے ربع آخر میں درخان (ڈھاڈر) سے جو تحریک نشاۃ الاسلامیہ جناب شیخ البلوچستان مولانا محمد فاضل کے زیر قیادت چلی نہ صرف لسانی بلکہ موضوعاتی اور ذہنی لحاظ سے بھی مٌلا ملک داد کی روایت کی حامل تھی اور چونکہ درخانی مدرسۂ فکر اور اس کی نگارشاتِ عالیہ اب بھی مصروف تخلیق و تطہیر ہیں اس لیے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مٌلا ملک داد کی روایت اب بھی براہوئی علم و ادب اور ذہن و قلب میں جاری و ساری ہے - رابعاً براہوئی زبان کا موجودہ فارسی رسم الخط بھی غالباً مٌلا ملک داد کا اختیار کردہ ہی ہے -

براہوئی ادب کے دوسرے دور کو بجا طور پر زبان و گرامر اور غیر ملکی مستشرقین کا دور کہا جاتا ہے - اس لیے کہ اس دور میں آر - لیچ سے لے کر ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ تک مولوی اللہ بخش زہری کے سوا سب ہی غیر ملکی تھے اور سب نے ماسوائے سر چارلس نیپئر کی کتاب 'فتح سندھ' اور گرانٹ ڈف کی 'مرہٹہ تاریخ' کے براہوئی زبان میں تراجم کیے، براہوئی زبان و گرامر پر کتابیں لکھیں - ان کتابوں کا ذکر چونکہ براہوئی و زبان و گرامر کی کتب کے ضمن میں ہو چکا ہے - یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں - میں نے اس دور کو ۱۸۸۰ء پر صرف اس لیے ختم کیا ہے کہ اس کے فوراً ہی بعد براہوئی تحریری ادب میں تحریکِ درخان اٹھی جس نے نہ صرف تحریری ادب کو مالا مال کر دیا بلکہ مقامِ مسرت ہے کہ یہ تمام مصنفین براہوئی تھے اور ان کی نگارشات مذہبی و اخلاقی ہونے کے باوجود علمی و تخلیقی بھی تھیں!

۱- بلوچستان ڈسٹرکٹ گزٹیر سیریز ج - ششم ب - مؤلفہ میجر سی - ایف - منچن ص ۳۹ تا ۴۱ -

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دور میں براہوئی زبان و ادب تخلیقی کام سے عاری رہے۔ براہوئی زبان کا مشہور شاعر تاج محمد بنگل زئی المعروف بہ تاجل اسی دور میں ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۰ھ مستونگ میں پیدا ہوا اور غیر معمولی طویل عمر پا کر ۱۹۴۵ء فوت میں ہوا۔ گویا وہ ہمارے دوسرے اور تیسرے ادوار کا شاعر تھا ۱۔ تاجل کی تعلیم صرف کلام پاک کی کچھ آیات حفظ کرنے تک محدود تھی لیکن شاعری کا ملکہ خدا داد تھا۔ لہذا ان میں آمد فراواں تھی۔ فکر و تخیّل اور شعر و سخن میں وہ ہر قسم کی قید سے آزاد تھے۔ گرد و پیش کی زندگی سے پیدا ہونے والے تاثّرات اور اپنے داخلی واردات کو نہایت بے تکلفی سے بیان کر دیتے تھے۔ زمیندار ہونے کی وجہ سے انہوں نے کاشتکاروں کی حالت زار کو دیکھا تھا اور وہ ان کی تحریروں میں منعکس ہوئے ہیں۔ ابتدا میں طبیعت مزاح کی طرف زیادہ مائل تھی لیکن تصوّف کا رنگ بھی ظہور پذیر تھا ۲۔ انگریزوں کے تسلّط کے بعد براہوئی شیرازے کے انتشار نے مایوسی و قنوطیت کی ایک زبردست فضا پیدا کر دی تھی۔ تاجل اور درخانی تحریک اسی فضا میں پروان چڑھے لیکن درخانی تحریک کے علمبردار اور حاملین تسبیح کے دانوں کی مانند تھے جو اکیلے ہونے کے باوجود یک رخ اور یک مقصد ہوتے ہیں۔ وہ ان تغیّرات اور ظلمتوں کے سامنے سینہ سپر ہوئے، لہذا انگریزی تسلّط ان کے جوہر تخلیق و تحقیق، توانائی اور رجائیت پر ہلکا سا اثر بھی نہ کر سکا، لیکن تاجل ایک فردِ واحد کی حیثیت سے مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تصوّف کے سوا اور کوئی پناہ نہ پا سکے۔ آخری عمر میں ان کی بینائی بھی جاتی رہی جس سے یہ دنیائے رنگ و نور ان کے لیے واہمہ ہی بن گئی۔ چنانچہ ان پر بتدریج تصوف کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ ان کی بیوی کا نام لعلمین تھا جس کو وہ اپنی شاعری میں صرف لعل کہتے تھے ۳۔ مشہور ہے کہ جب ان کا بیٹا صادق آٹھ سال کی عمر میں سخت بیمار ہوا تو اس کی صحت اپنی کور چشمی کے بدلے خدائے قدوس سے مانگی اور یہی ہوا۔ قدرت نے انہیں شاعری کا ملکہ اور لحن داودیؑ عطا فرمائے تھے۔ ایک دفعہ لعلمین نے ان سے کہا کہ میں نماز پڑھتی ہوں، ذرا ہانڈی کا خیال رکھنا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ تاجل نے اس موقعہ پر یہ اشعار کہے :۴

۱۔ ماہنامہ الس کوئٹہ، ستمبر ۱۹۶۵ء، مضمون ''تاجل'' از عزیز احمد و ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء مضمون ''تاج محمد تاجل'' از عبدالرحمان براہوئی۔
۲۔ ماہنامہ بلوچی دنیا، ملتان نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء مضمون ''تاج محمد تاجل'' عبدالرحمان براہوئی۔
۳۔ ماہنامہ الس کوئٹہ، ستمبر ۱۹۶۵ء مضمون ''تاجل'' از عزیز احمد۔
۴۔ ماہنامہ بلوچی دنیا، ملتان۔ نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء ''تاج محمد تاجل'' از عبدالرحمان براہوئی۔

ترجمہ : اے کتے! دور ہو جاؤ ! اے بلی ! تو بھی دور ہو جا
(تمہیں معلوم نہیں کہ) لعل اپنی نماز پڑھتی ہے
اس کے بعد آ کر وہ (اپنی ہانڈی کا خیال کرے گی
اگرچہ میں نابینا ہوں ، کچھ دیکھ نہیں سکتا
(تاہم) لعل کے سامنے مجبور ہوں -

پیر و فقیر کی صحبت کی وہ اکثر تلقین کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں :

تاجل یارے توبہ و زاری　　　کرنی پیر بخیر نن یاری[1]

ترجمہ : یعنی اے تاجل ! گڑ گڑا کر توبہ کر لے اور پھر فقیر کی صحبت میں رہا کر
کہ دل کی کدورت دور ہو سکے !

افسوس ہے کہ ان کا بہت تھوڑا کلام بھی ابھی تک تحریر میں آ سکا ہے اور زیادہ تر
لوگوں کے سینوں میں ہی محفوظ ہے !

تاجل کے علاوہ اسی دور میں مثنوی 'ماہ گل' کا پتہ بھی چلا ہے اور اس کی نشان دہی ایک نوجوان براہوئی محقق عبدالرحمان نے کی ہے - انھوں نے لکھا ہے کہ قریباً تین سو ابیات کی یہ مثنوی براہوئی کے کسی قدیم شاعر ، نے منظوم کی ہے اور یہ ایک حقیقی براہوئی رومان پر مبنی ہے [۲] - انیسویں صدی عیسوی کے ربع ثالث کے آخری سالوں میں ، ضلع چاغی میں 'ماہ گل' پیدا ہوئی جو پیکر حسن و جمال تھی - اس کی شادی علاقے کے ایک متمول آدمی نبی بخش تراسی زئی سے کر دی گئی - میاں بیوی خوشی خوشی زندگی بسر کرتے رہے اور ان کے یہاں دو بچے اور ایک بچی پیدا ہوئی - سوء اتفاق سے شوہر کی معمولی سرزنش پر ماہ گل نے سادگی سے پڑوسن سے یہ بات کہہ دی - وہ بہت کائیاں عورت تھی - اس نے ماہ گل کو اس کے شوہر سے بد ظن کر دیا اور پھر دلالہ بن کر بہادر ، قوی اور جری شیر جان رخشانی سے ، کہ مردانہ حسن و شباب کا مرقع تھا ، اس کے خفیہ تعلقات قائم کروا دیے - نبی بخش کو چوہان کے ذریعے پتہ چل گیا اور اس نے پہلے شیر جان کو اپنی بندوق کا نشانہ بنایا جب وہ اسی کے گھر آیا ہوا تھا اور پھر ماہ گل کو بھی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا - گویا نفسِ مضمون کے اعتبار سے یہ کہانی بلوچی رومان ''شہدا دو منہاز'' سے کافی حد تک مشابہ ہے - یہ مثنوی ، جو غالباً ۱۸۸۰ء کے بعد ہی کہیں لکھی گئی ہو گی ، محفلوں ، ساربانوں اور کسانوں میں بہت مقبول ہوئی اور بہت سوں نے اسے حفظ کر لیا اور پھر

۱- ماہنامہ بلوچی دنیا ، ملتان ستمبر ۱۹۶۷ء مضمون ''مثنوی ماہ گل'' از عبدالرحمان براہوئی -
۲- ایضاً

آہستہ آہستہ یہ لوگوں کے حافظے سے اتر تو گئی ، حتی کہ ایک براہوئی ادب دوست سے یہ داستان صاحبِ مقالہ کو حاصل ہو گئی۔ بہتر ہوتا کہ عبدالرحمان صاحب مولانا نبو جان کے قائم کردہ معیار کے مطابق اس ادب دوست براہوئی کا نام نامی بھی دے دیتے ! بہر حال ان کے مطابق یہ مثنوی براہوئی زبان کی اولین مثنوی ہے اور پہلی دفعہ ایک حقیقی براہوئی رومان کو منظر عام پر لے آئی ہے !

مثنوی مفصل ہونے کی وجہ سے براہوئی معاشرے کے خد و خال کو واضح کرتی ہے کہ براہوئی خوانین کی کشیدہ کاری کی کئی اقسام ہیں جیسے گل کپ ، اسنال ، سورانی ، لاڑو ، جوٹی ، کون لوبو جو فضول سمجھی جاتی ہے اور ذرتو جو بہت عمدہ قسم ہے اور جس کے ٹانکے بالکل نہیں ہوتے ہیں ۱ - براہوئی جوانمرد کی یوں تصویر کھینچی ہے :

ترجمہ : اسلحہ رکھنا مرد کے لیے سنت ہے - بائیں طرف ناوار لٹکنی چاہئیے -

دائیں کندھے پہ بندوق ہونی چاہئیے- اور ایک مضبوط لاٹھی ہاتھ میں ہونی چاہئیے-

بہر حال مجموعی طور پر اگر پہلے اور دوسرے دور کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے دور کا تخلیقی کارنامہ 'تحفۃ العجائب' تک محدود تھا - دوسرے دور میں براہوئی بین الافوامی لسانی مطالعات میں شامل ہو گئی- تخلیقی میدان میں تاجل کی شاعری اور مثنوی 'ماہ گل' اس زبان کی قوتِ اظہار کا ثبوت بن گئیں ، لیکن ایک سو بیس سال کے طویل عرصے میں علم و ادب کا اتنا قلیل سرمایہ کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس دور میں کوئی ایسی تحریک نہ تھی جو اس کو آگے بڑھاتی -

تیسرا دور (۱۸۸۰ء سے ۱۹۶۰ء)

یوں تو ریاست قلات میں انگریزوں کا عمل دخل ۱۸۳۹ء میں میر محراب خان کی شہادت سے ہی شروع ہو گیا تھا لیکن ۱۸۷۶ء میں کوئٹہ پر ان کے تصرف کے بعد بلوچستان کے اطراف و اکناف میں کاملاً برطانوی حکومت قائم ہو گئی- بیرونی مسلمانوں کی سلطنت ہو یا براہوئی خوانین کی عملداری ، انہوں نے نہ صرف براہوییوں کی داخلی آزادی کو تسلیم کیا تھا بلکہ وہ ان کے مذاق و مزاج کے مطابق ہی ان پر حکومت کرتے رہے تھے - ان کے ادوار میں بغاوتیں ہوئیں اور فرو بھی کی گئیں- کبھی کبھی زیادتیاں بھی کی گئیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کی حکومتیں براہوییوں کے لیے قابل قبول

۱- ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان ، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء "مثنوی ماہ گل" از عبدالرحمان براہوئی -

ضرور تھیں لیکن اب زمام اقتدار ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جو نہ صرف تہذیب و تمدن بلکہ عقیدے کے اعتبار سے بالکل مختلف تھی اور ہر شعبہ حیات کو اپنے ہی مخصوص نظریات اور مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھی -

اس انگریزی تسلّط اور نفوذ کے خلاف براہوئیوں ، بلوچوں اور دیگر قبائلیوں کا اولیّن قدرتی ردِّ عمل مدافعت و مقاومت کا تھا - چنانچہ ان میں ایک طبقہ ایسا وجود میں آ گیا جو اس ہمہ جہتی سامراج کے خلاف مستقلاً صف آرا تھا - اسی میں ڈھاڈر کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں درخاں کے رہنے والے نوجوان محمد فاضل رئیسانی بھی شامل تھے - وہ اپنے ساتھیوں بینگل اور جودگل کے ساتھ انگریزی چوکیوں پر چھاپے مارتے رہے۱ - مگر محمد فاضل کی طبیعت بہت جلد اس طریقہ کار سے سیر ہوگئی اور ان کی فطری صلاحیتیں علم و فضل کے حصول کی طرف منعطف ہو گئیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت انہیں انگریزی فکری و اعتقادی یلغار کے خلاف مسلح کرنا چاہتی تھی ! ان کی صحیح تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں ہو سکی - البتہ ان کے نواسے مولانا عبدالباقی صاحب درخانی کے مطابق ان کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی - مولانا عبداللہ نے اپنے رسالہؒ 'قبلہ مجددی نقشبندی' میں ان کی تاریخ وفات ۹ ۱ شوال روزسہ شنبہ ۱۳۱۴ھ دی ہے جو سن عیسوی ۱۸۹۶ء نکلتی ۲ ہے گویا مولانا محمد فاضلؒ ۱۸۳۰ء کے قریب قریب پیدا ہوئے تھے -

مولانا محمد فاضلؒ درس و تدریس ، مناظرہ و مجادلہ ، تبلیغ و تلقین اور طریقت و روحانیت میں مصروف ہونے کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا کام نہ کر سکے ، لیکن ان کی ذات بابرکات اور اس کے ملکۂ آدم گری کا نتیجہ تلامذہ راسدہ کے ایک حلقہ کی صورت میں ظاہر ہوا - ان کے نامور تلامذہ میں مولانا محمد عبداللہ درخانیؒ ، مولانا نبو جانؒ ، مولانا عبدالحی درخانیؒ اور مولانا عبدالمجیدؒ تھے - مولانا محمد عبداللہؒ مولانا محمد فاضلؒ کی صحبت و تربیت سے کندن بن چکے تھے - شیخ البلوچستان کی چونکہ کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ، بلکہ صرف ایک ہی صاحبزادی تھی جس کی شادی مولانا محمد عبداللہ درخانیؒ سے کر دی گئی تھی ، اس لیے مولانا محمد فاضلؒ کی وفات پر وہی ان کے جانشین ہوئے اور اور ادارۂ مطبوعات ، مسجد اور لنگر وغیرہ کا انتظام سنبھالا - وہ ایک زبردست فقیہی اور خوشگوار شاعر تھے۳ - اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۷ء تک ریاست قلات

۱- ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان ، مارچ ۱۹۵۹ء ، مضمون علامہ محمد فاضل درخانی، عبدالرحمان غور -

۲- درخانی ، مولانا محمد عبد اللہ ، شمائل شریف ، ص ۱۲۰ -

۳- اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ء ''براہوئی زبان و ادب'' از سید کامل القادری

کے قاضی القضاۃ بھی رہے۔ وہ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ جن میں اکثر زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ مشہور اور اہم کتب مندرجہ ذیل ہیں۱ :

۱۔ افازہ المصلی۔ جو نماز حنفی کے جامع مسائل صحیحہ پر بحث کرتی ہے۔ یہ عربی میں لکھی گئی ہے اور ساتھ ساتھ فارسی ترجمہ بھی ہے۔

۲۔ شمائل شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے شمائل و خصائل کا بیان ہے۔

۳۔ معجزات شریفہ میں آنحضرتؐ کے معجزات کا ذکر ہے۔

۴۔ سفر حجاز درخانی فارسی میں ہے اور حج بیت اللہ کے متعلق ہے۔

۵۔ تحفہ' العوام۔

۶۔ راہ نامہ۔

۷۔ ایک قلمی نسخہ ، کنزالاخبار ، جو ہنوز ان کے صاحبزادہ مولانا عبدالباقی درخانی کے پاس محفوظ ہے۔ مولانا محمد عبداللہ ابن عالم متقی حاجی محمد عظیم رئسبانی درخانی ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی وفات ۴۴-۱۹۴۳ء میں ہوئی۲ ۔

مولانا نبو جان

یہ مسنونگ کے قریب ایک چوتو کے رہنے والے تھے اور قمبرنی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا عظیم ترین کارنامہ ملّا ملک داد کی تصنیف 'تحفہ' العجائب' کی طباعت تھی جس کا ذکر پہلے دور میں ہو چکا ہے۔ مولانا نبو جانؒ خود ایک جیّد عالم اور جلیل القدر مصنف تھے۔ ان کی مشہور ترین تصانیف 'ناصح البلوچ' اور 'تحفہ' الغرائب' ہیں۔ 'تحفہ' الغرائب' ملّا ملک دادؒ کے موضوعات پسندیدہ پر ہی لکھی گئی ہے۔ 'ناصح البلوچ' اس کی نسبت زیادہ مشہور و معروف ہے اور چھوٹی بحر کے استعمال ، بعض مصرعوں کے تکرار اور برمحل الفاظ کی وجہ سے براہوئی شاعری کا بہت اچھا نمونہ بھی ہے۔ جیسے :

اول صفت خدا نا ۔۔۔ بے چون و پادشاہ نا
خلاق و رہ نما نا ۔۔۔ کر بندگی خدا کن ۳

با منہ ہیت جوڑ کیوا ۔۔۔ براہوئی ایت پنت تیوا
اف زندگی کہیوا ۔۔۔ معاف کر کنے خدایا ۴

۱۔ سالنامہ ماہ نومبر کراچی مارچ ۱۹۶۶ء ''براہوئی زبان و ادب'' از عبدالرحمان براہوئی۔
۲۔ ہفت روزہ، ایلم استقلال نمبر ، ۱۹۶۶ء مضمون از ملک ممتاز علی براہوئی۔
۳۔ مولانا نبو جان، ناصح البلوچ۔ مکتوبہ مولانا عبدالباقی درخانی ص۔ ۲
۴۔ ایضاً ص۔ ۶

یعنی میں نے کچھ باتیں یا پند و نصائح کہی ہیں۔ براہوئی میں وعظ و نصیحت کی ہے۔ اف زندگی ختم ہے۔ اے خدا! مجھے معاف فرما!

ان کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں۔ البتہ تاریخ وفات ۱۹۰۷ بتائی جاتی ہے[۱]۔

مولانا عبدالمجید چوتوئی

مولانا نبو جان رح کے فرزند ارجمند تھے۔ وہ بیک وقت مولانا محمد فاضل درخانی رح اور مولانا نبو جان رح سے مستفید ہوئے۔ ان کی دو کتابیں بہت مشہور اور یادگار ہیں۔

۱۔ 'مفرّح القلوب' یہ کتاب براہوئی غزلیات کی اولین کتاب ہے اور فارسی طرز حروف تہجی کی رعایت سے مرتب کی گئی ہے۔ کل اشعار ۵۸۰ ہیں۔ کہیں کہیں مناجات اور مولود شریف بھی درج ہیں[۲]۔

۲۔ 'گلشن راغبین و غزلیات' جس کے آخر میں مولانا نبو جان رح کی فارسی زبان میں مناجات بھی مندرج ہے۔ مولانا نے دینی مسائل کو سلیس، عام فہم اور پر خلوص لب و لہجے میں تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کے کلام میں شرعی رنگ کے علاوہ خالص ادبی تخلیق کے جواہر بھی ملتے ہیں۔

مولانا عبدالحئی

مولانا محمد فاضل رح درخانی کے چوتھے شاگرد مایہ ناز مولانا عبدالحئی رح تھے۔ انہوں نے تبلیغ و تلقین کے علاوہ سلسلہ مطبوعات بھی جاری رکھا۔ یوں تو ان کی ذات سے بہت سوں کو فائدہ ہوا لیکن ان کے عظیم ترین شاگرد مولانا محمد عمر دین پوری رح تھے[۳]۔ وہ شہر مستونگ کے قبیلہ پندرانی میں پیدا ہوئے تھے اور مدرسہ درخان سے فیض یاب ہوئے۔ موصوف بیک وقت مصنف، مبلغ، مترجم، مفسر، مؤلف اور فنکار ہونے کے علاوہ ایک عملی سیاسی کارکن بھی تھے، اور نظم و نثر دونوں پر یکساں طور پر حاوی تھے۔ موصوف نے اڑتالیس کتب براہوئی زبان میں تصنیف و تالیف کیں اور اس لحاظ سے وہ براہوئی کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔ بہت سے مسودات و مخطوطات بھی محفوظ و موجود ہیں اور ہنوز منتظر طباعت ہیں۔ آپ کا عظیم ترین کارنامہ قرآن حکیم کا براہوئی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس

۱۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ ''براہوئی زبان و ادب'' از سید کامل القادری۔ ص ۱۳

۲۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ ''براہوئی زبان و ادب'' سید کامل القادری ص ۱۵ اور ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان اکتوبر ۱۹۶۶ ''حضرت علامہ محمد عمر دین پوری۔ عبدالرحمان براہوئی۔

۳۔ ثقافت اور ادب وادی بولان میں۔ ''براہوئی ادب'' عبدالرحمان کرد ص ۲۲۲ تا ۲۲۵

وقت تک یورپی مشنری بلوچستان میں بہت محنت شاقہ سے مصروف تبلیغ تھے اور انہوں نے ۱۹۰۷ء میں انجیل کا براہوئی ترجمہ شائع کر دیا تھا ۱ ۔ مولانا کا ترجمہ قرآن ۱۹۱۵ء (۱۳۳۴ھ) طبع ہوکر براہوییوں کے لیے ڈھال بن گیا ۔ ادبی لحاظ سے ان کی مقبول ترین کتاب 'سودائے خادم' ہے جو ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس میں وہ اپنی فنی ادبی عظمت کی انتہا پر ہیں ۔ نثر میں ان کی کتاب 'آئینہ قیامت' بہت اہمیت رکھتی ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء کے کوئٹہ کے قیامت خیز زلزلے کا تفصیلی حال بیان کرتی ہے ۔ انگریزوں کے خلاف ملک بھر میں جو جدو جہد جاری تھی مولانا اس سے بے تعلق نہیں رہے اور مولانا عبداللہ سندھی سے رابطہ قائم کیا اور تحریک ہجرت میں شریک ہوکر افغانستان گئے ۔ وہاں سے واپسی پر جیکب آباد کے قریب ایک بستی ''دین پور'' بسائی اور وہیں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مصروف رہے ۔ لیکن آخر عمر میں ''ٹربینٹ'' علاقہ جھلاوان آ گئے اور یہیں تادم واپسیں مصروف تبلیغ و تلقین رہے ۔ مولانا کے دو فرزند مولانا محمد شریف اور مولانا عبداللطیف بھی انہی کی معیت میں رہے ۲ ۔ ان کے ارادتمندوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ عین اس وقت جب مدرسہ درخان خاندانی تنازعات کی وجہ سے قریب المرگ تھا ، مولانا محمد عمر دین پوری رحمہ نے اپنی شخصیت اور اپنے نئے مرکز دین پور کی وجہ سے اس کے مفید اور مقدس کام کو جاری رکھا ، بلکہ اسے بے حد توسیع دی ۔ وہ ۱۹۳۸ء (۱۳۷۸ھ) میں فوت ہوئے ۳ ۔

مائی تاج بانو

یوں تو مولانا نے درجنوں تلامذہ راشدہ چھوڑے لیکن ان کا شاہکار ان کی صاحبزادی مائی تاج بانو ہیں ۔ جنھوں نے براہوئی خواتین کو مذہب سے آشنا کیا ۔ ان کی مشہور ترین تصنیف 'تسریع النسا' ہے جو ۱۹۳۴ء (۱۳۵۳ھ) شائع ہوئی ۔ اس میں نسوانی مسائل پر قادرانہ بحث کی گئی ہے ۔ اس نثری کارنامے کے علاوہ محترمہ حمد ، نعت ، منقبت ، مرثیہ ، اخلاق غزل اور دینی لوری سے بھی شغف رکھتی ہیں ۔ خصوصاً مرثیہ میں تو وہ اپنی نظیر آپ ہیں ۔ علامہ دین پوری رحمہ کا مرثیہ تو بہت ہی مشہور ہے ۔ لیکن اپنے بھائی ، بہن اور بچوں کی وفات پر بھی خوب مرثیے لکھے ہیں ۴ ۔ افسوس کہ ان کی علمی و

۱۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ ''براہوئی زبان و ادب'' ۔ سید کامل القادری ۔ ص ۱۲

۲۔ ثقافت و ادب وادی بولان میں ''براہوئی ادب'' از عبدالرحمان کرد ۔ ص ص ۲۲۲ تا ۲۲۵

۳۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان اکتوبر ۱۹۶۶ ''حضرت علامہ محمد عمر دین پوری ''عبدالرحمان براہوئی ۔

۴۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ ''براہوئی زبان و ادب'' از سید کامل القادری ص ص ۱۶ تا ۱۷

ادبی کاوشیں اپنے والد بزرگوار کی حیات تک ہی محدود رہیں۔ ان کے ان پڑھ شوہر اور مسلسل صدمات نے ان کی تخلیقی آنچ کو بہت مدھم کر دیا۔ بہر حال وہ براہوئی زبان کی اولین ادیبہ، شاعرہ، اور مرثیہ نگار ہیں!

مولانا عبدالباقی درخانی

مولانا محمد عبد اللہ درخانیؒ کے صاحبزادے ہیں جو ۱۹۱۴ء (۱۳۳۲ھ) میں عالم وجود میں تشریف لائے۔ موصوف ایک عالم فاضل اور درویس صفت انسان ہیں اور ان کے عظیم و جلیل خاندان کی علمیت و فضیلت اب انہی میں مرکوز ہے۔ وہ کئی کتب کے بھی مصنف ہیں۔ مثلاً 'خطباتِ درخانی' مطبوعہ ۱۹۴۰ء، 'مجربات درخانی'، 'تاج التعزیرات' مطبوعہ ۱۹۳۲ء (۱۳۵۱ھ)، 'ناصر البلوچ'، 'کشف الصدور'، 'کشف الخصائل' 'کاغذات درخانی'، 'خاکسارنا' 'غلط مذہب' وغیرہ۔ 'عملیات درخانی'، 'آخری منزل' اور دیگر ہنوز مسودات کی شکل میں ہیں۔ مولانا عبد الباقی بہت اچھے حمد گو، نعت نگار اور نغمہ پرداز ہیں۔

مولانا عبد الحیؒ کے صاحبزادے مولانا ابوبکر تھے جن کے صاحبزادے مولوی عبد الغفور درخانی بقید حیات ہیں اور براہوئیات کے ناشر ہیں!

ان اکابرین کے علاوہ درخان پور اور بندہ دین پور کے چشمہ علم و معرفت سے بیسیوں اصحاب سیراب و فیض یاب ہوئے جنھوں نے اپنی اپنی جگہ براہوئی علم و ادب کی آبیاری کی۔ حاجی مولوی عبد الحکیم صاحب، مصنف 'نصیحت نامہ مولوی عبدالحکیم'، مطبوعہ ۱۹۰۱ء لاہور[1]، مولانا عبد الکریم مینگل جن میں حضرت شمس تبریزؒ کی مستی تھی[2]، مولوی محمد اشرف، ملا گہرام، تاج محمد شاہوانی، مّلا روشن دین مینگل باران زئی اور صوفی گل محمد صاحب نوشکوی انہی بزرگان کرام میں سے تھے[3]!

فیوضِ مولانا درخانی

غرضیکہ مولانا محمد فاضل درخانیؒ کی ذات بابرکات بجائے خود ایک ادارہ اور ایک تحریک تھی اور مدرسہ درخان براہوئی علم و ادب میں آمد بہار کا نقیب تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ عربی فارسی کی بجائے براہوئی اور بلوچی خصوصاً اول الذکر کو ذریعۂ

۱- ثقافت و ادب وادی بولان میں۔ ''براہوئی ادب''۔ از عبد الرحمان کرد۔ ص۔ ۲۳۔
۲- ایضاً ص۔ ۲۲۸۔
۳- ایضاً ص۔ ۲۲۸ تا ۲۲۹۔

تعلیم بنایا ۔ اس سے براہوئی اتنے خود آسنا ہو گئے کہ عیسائی مبلغین کی تبلیغات دھری کی دھری رہ گئیں ۔ اسی کی وجہ سے براہوئی تحریری ادب کے انبار لگ گئے ۔ تفسیر و فقہ، حدیث و شریعت، تاریخ و سیر، اخلاق و نصائح نظم و نثر اور علم و ادب کے گونا گوں اور ادق سے ادق مضامین براہوئی زبان میں ادا کیے جانے لگے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مدرسہ درخان کے تحت پیدا ہونے والا ادب اصلاحی، مقصدی اور تعمیری تھا اس لیے اس میں فکری بے راہ روی، دماغی عیاشی اور الّلے تللے کا کوئی امکان نہ تھا اور سنجیدگی اور متانت اس کے طغرائے امتیاز تھے ۔ اس کا اثر یہ ضرور ہوا کہ اپنے جذبات آزاد کا اظہار دب گیا، لیکن تحریک پر تنقید کرتے وقت نہ ان حالات و خطرات کو بھولنا چاہیے جو اس تحریک کے حاملین کو درپیش تھے اور نہ ان عظیم مقاصد کو جو انہوں نے اپنے سامنے رکھے ۔ مدرسہ درخان کا مقصد نہ تو براہوئیوں کے قدیم ترین ماضی کا احیا تھا اور نہ ہی براہوئی لوک ادب کا تحفظ، بلکہ انگریزی تمدنی و اعتقادی یلغار کو بھانپ کر اس کے خلاف سینہ سپر اور صف آرا ہونا تھا ۔ دوسرے لفظوں میں براہوئیوں میں خالص اسلامی رنگ کی نشاۃ الجدیدہ کو پیدا کرنا مقصود تھا اور اپنے اس مقصد میں یہ مدرسہ بے حد کامیاب رہا ۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی وجہ سے براہوئیوں میں جو خود شناسی کا جذبہ پیدا ہوا، زندگی کی جو تڑپ اور لگن ظہور میں آئی، وہی جذبہ اور لگن دیگر تخلیقی کارناموں کے بھی محرک ہوئے !

ویسے تخلیمی اعتبار سے بھی یہ دور خالی نہ تھا ۔ ناجل، جن کا ذکر ہم دوسرے دور میں کر آئے ہیں، اس دور میں بھی شعر آفرین و نغمہ پرداز رہے ۔ مثنوی 'ماہ گل'، جس کی طرف دوسرے دور میں اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ اسی دور میں تخلیق آشنا ہوئی ۔ خود درخانی تحریک کے بعض علمبردار بھی تخلیقی جوہر کا ثبوت دیتے رہے مثلاً عبد المجید چوتوئیؒ اور علامہ محمد عمر دین پوری ۔ مولانا عبد المجید کے تین شعروں کا ترجمہ درج ذیل ہے :

ترجمہ : اے سانپ جیسی زلفوں اور خمار آلود آنکھوں والی محبوبہ !
میری آنکھیں تیرے انتظار میں اشکبار ہیں ۔
اے شرابی ہونٹوں اور گلابی رخساروں والی محبوبہ !
آ کہ میں جل رہا ہوں تو کیوں نہیں آتی اور میرے ساتھ گفتگو نہیں کرتی؟
تو میرے دل کو جلا رہی ہے اور میری آنکھیں تیرے لیے اشکبار ہیں ۔

علامہ محمد عمرؒ کا شعر ہے :

پنتیاں خختے تینتو نفیس   بینگ کننگان فارغ کرنیس[۱]

۱۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان اکتوبر ۱۹۶۶ء "حضرت علامہ محمد عمر دین پوری" از عبد الرحمان براہوئی ۔ ص ۳۵ ۔

یعنی جب سے تجھے دیکھا ہے تو تو نے میری آنکھیں دوسروں کی طرف سے بند کر دی ہیں اور مجھے کھانے پینے سے بے نیاز کر دیا ہے ۔ یعنی میں فنا فی المحبوب ہو گیا ہوں ۔

تاج بانو کی درج ذیل لوری قابل داد ہے ۱ :

قربان ای مر یوخن نانا	میں میری آنکھوں کے صدقے
نور اس خنتاک درد انا	اے دردانہ ! تو میری آنکھ کا نور ہے
رحمت تی بس اللہ نا	خدا کے فضل سے تو (عالم وجود میں) آئی
زیبل رب نی دراجنگا عمر نسے	زیبل ! تجھے خدا عمر دراز دے !

ان کے علاوہ پیر محمد صاحب نیمرغی لہڑی بھی اس دور میں نغمہ سرا رہے ۔ وہ نمرغ تو کچھ علاقہ قلات کے باشندے تھے ۔ ان کا دیوان 'بازار حسن' ۱۹۴۸ء کراچی سے شائع ہوا ۔ نمونہ کلام یہ ہے :

تمام دنیائی چرنیگاٹ کرنا غمان جدائی نا
تیری جدائی کے غم سے تمام دنیا کا سفر کیا

متر آرام کنے جا گہین نا دردان جدائی نا
کہیں کہیں بھی مجھے آرام نصیب نہ ہوا

اماں دردان جدائی نا ، اماں دردان جدائی نا
تیری جدائی پر درد ہے ، تیری جدائی سے الامان ۲

شاعر بلوچستان مولانا محمد اسماعیل ذکر مینگل بھی اسی دور کی یادگار ہیں ۔ وہ 'شہادت شرف' مطبوعہ ۱۹۵۸ء اور 'جنگ محمد حنیف' کے مصنف ہیں ۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۳ :

اٹھو کہ برفباری کا موسم آ گیا
ہر گلی اور کوچے میں نالے بہنے شروع ہو گئے ہیں

چشموں کے پانی نے ہر درخت کو ہرا کر دیا
کشف و کشار شروع ہے اور مالداری کا موسم ہے ! (ترجمہ)

ان کے علاوہ نور احمد منگیجری اور میاں محمد عارف وغیرہ بھی اسی دور میں غزل سرا ہوئے ۔ ان میں سے اکثر جدید دور میں بھی زندہ و گوئندہ ہیں !

۱- ثقافت و ادب وادی بولان میں ''براہوئی ادب'' از عبد الرحمان کرد ۔ ص ۔ ۲۲۶ ۔
۲- ایضاً ص ۔ ۲۳۹ ۔
۳- ایضاً ص ۔ ۲۴۰ ۔

یورپی علماء فضلاء نے براہوئی زبان و ادب پر جو تحقیقی کام ۱۸۱۶ء میں شروع کیا تھا وہ بلا وقفہ اس دور میں بھی جاری رہا - ۱۸۸۲ء میں ریورینڈ جی شرٹ نے ''انڈین اینٹی کوئری'' کی جلد یازدہم میں ایک براہوئی نغمہ شائع کیا۱ - اور اسی سال لندن سے میک گریگر کی کتاب 'بلوچستان کی سیاحت' منظر عام پر آئی۲ -

ڈاکٹر تھیوڈور ڈوکا نے ۱۸۸۷ء میں ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ کی تالیف ''براہوئی گرامر'' کا ترجمہ انگریزی میں جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نیو سیریز جلد نوازدہم میں شائع کروایا۳ -

اسی سال امریکی پروفیسر جان ایوری نے اپنا مقالہ 'براہوئی زبان' 'دی امریکن اینٹی کوئیرئن اینڈ اورینٹل جنرل' جلد نہم میں شائع کروایا - اور براہوئی اور دراوڑ السنہ کی مشترک خصوصیات پر مدلل بحث کی۴ -

۱۹۰۲ء میں ایف ، ودربگ نے الہ آباد سے 'براہوئی کے مطالعہ کی گائیڈ' شائع کروائی۵ -

۱۹۰۶ء میں ڈاکٹر جی - اے گریئرسن نے کلکتہ سے 'لنگو اسٹک سروے آف انڈیا' شائع کی جس کی جلد چہارم کے صفحات ۶۱۹ تا ۶۳۲ پر براہوئی گرامر کا ذکر کیا اور قلات اور کراچی میں بولی جانے والی براہوئی زبان کے تین نمونے رومن حروف میں معہ انگریزی ترجمہ دیے ۶ -

۱۹۰۷-۶ء میں ریورینڈ - ٹی - جے - ایل میئر نے ''اے براہوئی ریڈنگ بک'' یا ایک براہوئی نصاب کی کتاب ، تین جلدوں میں لدھیانہ سے شائع کی - حصہ اول میں ۳۲ صفحات تھے اور ان سات کہانیاں ، پانچ مضامین اور چار منظومات درج تھے - جلد دوم ۴۸ صفحات پر مشتمل تھی - اور اس میں دس کہانیاں ، تین مضامین اور چار منظومات درج تھے - جلد سوم ۱۶ صفحات پر مبنی ایک براہوئی ناولچہ تھا ، جو پلاٹ زبان ، بیان اور کردار کے لحاظ سے خالص براہوئی تھا - تینوں جلدیں رومن حروف میں لکھی گئی تھی لیکن پہلی دونو کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دیا گیا تھا - میئر

۱- سالنامہ ماہ نو کراچی - مارچ - ۱۹۶۶ء ''براہوئی زبان و ادب'' از عبد الرحمان براہوی -
۲- ایضاً -
۳- ایضاً -
۴- ایضاً -
۵- ایضاً -
۶- ایضاً -

نے لیچ کی طرح براہوئیوں سے براہ راست رابطہ کے بعد یہ چیزیں حاصل کی تھیں اس لیے یہ لوک ادب کا نمونہ ہیں اور براہوئی غیر تحریری ادب میں اضافہ لیکن لیچ کے برعکس ان میں الجھاؤ زیادہ ہے ، نکتۂ نظر علمی نہیں بلکہ مذہبی اور تبلیغی ہے۔ اس لیے رطب و یابس بھی جمع ہو گیا ہے اور کہیں کہیں تو انہوں نے دل آزاری ، اہانت آمیزی اور باطل طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ جلد اول میں کہانی ''مہمان نوازی'' نہ صرف براہوئیوں بلکہ مسلمانوں کی روایات مہمان نوازی کی توہین ہے[۱] ۔ براہوئی میزبان کا مہمانوں کی موجودگی میں بیوی کو محض اس لیے مارنا کہ بچہ کیوں رو رہا ہے براہوئی معاشرے کے متعلق سراسر غلط بیانی ہے۔ دوسری کہانی ''امام جعفر'' میں آنحضورؐ کی زبان مبارک سے بے سروپا باتیں نکلوانا پادری صاحب کی صلیبی ذہنیت کا بدترین نمونہ ہے[۲] ۔ مزید برآں میئر نے بھی لیچ کی طرح ان مندرجات کے کسی راوی کا نام دینا گوارا نہیں کیا۔

۱۹۰۷ء میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے انجیل کا براہوئی ترجمہ شائع کیا ، تاکہ براہوئیوں کو عیسائی بنانے کا خواب پورا ہو سکے۔[۳] اسی سال رائے صاحب لالہ جمعیت رائے نے کوئٹہ سے 'نوٹس آن دی سٹڈی آف براہوئی لینگوئج' یعنی براہوئی زبان کے مطالعہ پر اشارات شائع کی[۴] ۔ ۱۹۰۹ء میں سر ڈینس برے نے اپنی مشہور و معروف کتاب 'براہوئی زبان' کا حصہ اول کلکتہ سے شائع کیا۔ برے بلا مبالغہ تمام یورپی علماء فضلاء سے سر برآوردہ تھے۔ انہوں نے سالہا سال کی محنت سے براہوئی زبان کے اسرار و غوامض سے واقفیت حاصل کی۔ اس حصہ میں انہوں نے براہوئی گرامر پر خوب تفصیل سے بحث کی ہے اور براہوئی کو حتماً دراوڑی ثابت کر دیا ہے۔ ان کی کتاب کی دوسری جلد ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ حصہ دوم براہوئی حسب و نسب ، زبان وغیرہ پر مجموعی تبصرہ تھا اور حصہ سوم براہوئی لغت پر مشتمل تھا۔ برے صاحب نے ہر لفظ کا اشتقاق معلوم کرنے کے لیے نہایت وسعت مطالعہ اور دقت نظر سے کام لیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک براہوئی کی سوانح حیات کے بھی مصنف ہیں ، جس میں انہوں نے مہد سے لحد تک ایک براہوئی اور اس کے آئینہ میں اس کے ماحول و معاشرہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے براہوئی لوک کہانیاں بھی

۱- ریورینڈ ٹی - جے - ایل - میئر ، اے براہوائی ریڈنگ بک ج ۱ ، - ص ۱۸ تا ۱۹ -
۲- ایضاً ص ۲۰ -
۳- اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ء ''براہوئی زبان و ادب'' از سید کامل القادری۔
۴- ایضاً ''براہوئی اور اردو'' ایضاً

بمعہ انگریزی ترجمہ شائع کروائیں ! ۱

۱۹۲۳ء میں ریورینڈ ڈنکن ڈکسی نے سو اوراق پر مشتمل 'انگلش براہوئی ڈکشنری' لکھی جس کا مسودہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ۲

۱۹۵۲ء میں فرانسیسی زبان کی کتاب 'لے لینگودو موند لے' کے نئے ایڈیشن کے صفحات ۴۸۸ تا ۵۰۳ پر براہوئی زبان و گرامر کے متعلق مفید معلومات بھی شامل کی گئیں۔ ۳

۱۹۵۵ء میں پروفیسر انور رومان نے ایک انگریزی مقالہ مغربی پاکستان کی بنیادی وحدت میں ، جو فروری ۱۹۵۶ء میں منعقدہ چھٹی آل پاکستان ہسٹری کانفرنس کراچی کو پیش کیا گیا اور اس کی کارروائی کے صفحات ۲۴۷ تا ۲۶۶ پر چھپا ۔ براہوئیوں کو تمدن و تہذیب انسان کے اولین بانیوں یعنی ہلال زرخیز کے سامیوں کا وارث قرار دیا ۔ اسی عرصے میں میں نے براہوئی لوک کہانیوں پر کام کیا ۔ لیچ کی دونو کہانیوں ، میئر کی تین کہانیاں اور لیچ اور میئر کے گیتوں کو آزاد اردو ترجمہ کا لباس پہنایا ۔ یہ ترجمے 'جگ بیتی' ، 'انتقام' براہوئی کے چار گیت ، چار دریچے 'بہادر خاں کی سرگذشت' 'آپ بیتی' اور 'واپسی' کے عنوانات کے تحت امروز لاہور کے دہ سالہ نمبر مارچ ۱۹۵۸ء ، استقلال نمبر ۱۹۵۸ء سنڈے ایڈیشن ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۸ ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء ، یکم فروری ۱۹۵۹ء اور ۲۹ مارچ ۱۹۵۹ء کو علی الترتیب شائع ہوئے ۔ اسی عرصے میں میں نے ایک طویل مقالہ انگریزی میں لکھا جو جرنل آف دی ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کے شمارہ جات اکتوبر ۱۹۵۹ء ، جنوری ۱۹۶۰ء اور اپریل ۱۹۶۰ء میں بہ عنوان ''دی براہوئیر آف کوئٹہ قلات ریجن'' چھپا اور بعد میں اسی سال سوسائٹی نے اسے ایک ایک کتابچہ کی صورت میں پیش کیا ۔ ۱۹۶۰ء کے استقلال نمبر امروز لاہور میں ایک مضمون ''براہوئیوں کی تاریخی اجنبیت'' بھی چھپا ۔

۱۹۵۷ء میں سید کامل القادری نے امروز لاہور کے سنڈے ایڈیشن ۱۷ نومبر میں ایک مضمون ''براہوئی قبیلہ اور اس کی زبان'' شائع کروایا جس میں انہوں نے براہوئی کی دراوڑی اصلیت اور اس پر آریائی زبانوں کی یلغار کے باوجود اس کی سخت جانی اور جوہر بقا کا ذکر کیا ۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں براہوئی نور محمد صاحب پروانہ پندراڑی کا مضمون ''وادیٔ سندھ کی تہذیب اور اس کے وارث'' امروز لاہور میں شائع ہوا ۔

غرضیکہ تیسرا دور علمی ، تخلیقی اور تحقیقی لحاظ سے براہوئی زبان و ادب کا پربہار اور امکان خیز دور تھا اور اس کے اکثر لکھنے والے ہی جدید دور کی زیب و زینت ہیں !

۱- سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء براہوئی زبان و ادب'' از عبدالرحمان براہوئی ۔
۲- ایضاً
۳- ایضاً

جدید دور (۱۹۶۰ء - ۱۹۷۰ء)

براہوئی زبان و ادب کا جدید دور اس وقت شروع ہوا جب نور محمد صاحب پروانہ، سید کامل القادری، پروفیسر انور رومان، پروفیسر خلیل صدیقی، پیر محمد پیرل زبیرانی، نادر قمبرانی و غیرہم نے چند ابتدائی اجلاس اور بحث تمحیص کے بعد ۴ نومبر ۱۹۵۹ء کو براہوئی ادبی بورڈ کی تشکیل کی جس کے فوری صدر نواب غوث بخش خان رئیسانی قرار پائے۔ اس کے اغراض و مقاصد کی تحصیل و تکمیل کے لیے ۲۴ فروری ۱۹۶۰ء کو مستونگ سے براہوئی کے پہلے ہفت روزہ اخبار ''ایلم'' کا اجرا ہوا، جس کی ادارت پروانہ صاحب نے کی۔ 'ایلم' جہاں براہوئی کے غیر تحریری و تحریری ادب کا حافظ و ناشر تھا وہاں نئے لکھنے والوں کے لیے اظہار و ابلاغ کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ براہوئی کا جدید رسم الخط جو اُردو رسم الخط سے بہت مشابہ ہے، اسی اخبار کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے براہوئی نشریات کے لیے علیحدہ وقت دے دیا اور ۱۹۶۰ء میں محکمہ قبائلی نشر و اشاعت کوئٹہ نے بلوچی ماہنامہ ''الس'' میں بھی براہوئی حصہ شامل کر دیا اور اس طرح براہوئی زبان و ادب کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقعہ ملا۔

مجموعی طور دیکھا جائے تو اس وقت غیر تحریری ادب کی روایت کے علاوہ تین مختلف النّوع لیکن متحد السّمت سکول کام کر رہے ہیں۔ یعنی درخانی روایت، تحقیقی اور تخلیقی۔

درخانی روایت کو مولانا عبدالباقی درخانی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی محمد یعقوب شرودی، عبدالحلیم خادمی نوشکوی فقیر زئی وغیرہ بھی انہی خطوط پر کام کر رہے ہیں۔ وہ براہوئی زبان کو اشاعتِ اسلام، تطہیر و تخلیق کردار، تزکیہٴ نفس، تذکرہ اکابرین اور اعلائے امدار اسلامیہ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۱۔ تحقیقی سکول میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایم۔ بی۔ ایمی نیو نے ۱۹۶۲ء میں 'براہوئی اور دراوڑی کی تقابلی گرامر' شائع کی ہے۔۲ ان کے علاوہ میک گل یونیورسٹی مانڑیال (کینڈا) کی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے امریکی نژاد نومسلم ڈاکٹر عبدالرحمان بارکر نے براہوئی زبان پر سر ڈینس برے کی لغت کی بنیاد پر کام شروع کر رکھا ہے جو ہنوز جاری ہے۔ وہ اب تک بہت سے مزید ایسے الفاظ دریافت کر چکے ہیں جو براہوئی اور دراوڑی السنہ میں مشترک ہیں جن کا اشتقاق برے صاحب متعین ہی نہ کر سکے تھے

۱۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ء ''براہوئی زبان و ادب'' از سید کامل القادری۔

۲۔ سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء ''براہوئی زبان اور ادب'' از عبدالرحمان براہوئی۔

یا جو سرے سے ان کی گرفت میں نہ آئے تھے (یاد رکھنا چاہیے کہ بڑے صاحب نے اپنی لغت میں صرف ۳۰۵ الفاظ کو براہوئی اور دراوڑی میں مشترک دکھایا ہے۔ پاکستان میں سید کامل القادری نے اس دور میں کافی تحقیقی کام کیا ہے، مثلاً براہوئی ضرب الامثال براہوئی لغت، براہوئی زبان و ادب اور براہوئی اور اردو وغیرہ طویل مقالے لکھے ہیں جو چھپ چکے ہیں۔۱ پروفیسر انور رومان نے اس دور میں ''ہماری ثقافت کیا ہے اور کہاں ہے؟۲'' ''کچھ اپنی ثقافت کے بارے میں۳'' ''سردلبراں ۴'' ، ''الفاظ۔آئینہ تاریخ۵'' ''براہوئی زبان اور اس کی لغت۶'' وغیرہ مقالات شائع کروائے ہیں اور ان دنوں وہ براہوئی، دراوڑ السنہ اور سامی خصوصاً عربی کے تقابلی مطالعہ میں مصروف ہیں۔اسی دور میں ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ 'کوئٹہ قلات کے براہوئی' کے عنوان سے ماہنامہ ثقافت لاہور جنوری تا مئی ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے شائع کروایا ہے اور ان کی 'براہوئی کی لوک کہانیاں' قلات پبلشرز مستونگ نے ۱۹۶۵ء میں کتابی صورت میں چھاپی ہیں۔ عین الحق فرید کوٹی نے 'وادی' سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات' آٹھ اقساط میں ایلم میں اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء اور 'پوٹھوہاری پر دراوڑی اثر' تین اقساط میں ۲۶ مئی تا ۱۰ جون ۱۹۶۵ء چھپوائے ہیں۔ ان کے علاوہ دراب براہوئی لاڑکانوی، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، عبدالرحیم مولائی شیدائی، میر عبدالقادر شاہوانی اورسردار غوث بخش رئیسانی وغیرہ اس سلسلے میں بہت اہم مضامین لکھ رہے ہیں۔ براہوئی نوجوانوں میں سے عبدالرحمان براہوئی خصوصاً بہت فعّال ہیں۔ 'براہوئی زبان ادب' مقالہ مطبوعہ سالنامہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۶ء کے علاوہ وہ اس نکتہ سے صرف براہوئی زبان و ادب کی عظیم شخصیتوں جیسے تاج محمد تاجل، علامہ محمد عمر دین پوری وغیرہ پر مضامین لکھ رہے ہیں بلکہ انہوں نے ہی مثنوی 'ماہ گل' بھی دریافت کی ہے جس نے براہوئیوں کی معاشرتی زندگی کے ایک بہت بڑے خلا کو پر کر دیا ہے۔ وہ ایک عظیم محقق بننے کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ محمد حسین عنقا، چورک جھلاوانی وغیرہ بھی مصروف تحقیق ہیں۔تخلیقی و

۱- ایلم ۱۹۶۱ء برائے براہوئی ضرب الامثال، ایلم ۱۹۶۲ء برائے براہوئی لغت و اورینٹل کالج میگزین لاہور، نومبر ۱۹۶۲ء برائے براہوئی زبان و ادب و براہوئی اور اردو۔

۲- امروز و جولائی ۱۹۶۱ء برائے ''ہماری ثقافت کیا ہے اور کہاں ہے''۔

۳- لیل و نہار، لاہور ۱۳ اگست ۱۹۶۱ء۔

۴- ایلم استقلال نمبر ۱۹۶۶ء۔

۵- نوائے وقت، لاہور یکم ستمبر ۱۹۶۶ء۔

۶- ایلم استقلال نمبر ۱۹۶۶ء۔

ادبی سکول میں مولانا محمد اسماعیل ذکر مینگل ، نور محمد پروانہ ، تراب لاڑکانوی ، پیر محمد زبیرانی ، محمد ابراہیم مینگل ، محمد اسحاق سوز ، ظفر میرزا ، رستم مینگل ، حکیم حاجی خدائے رحم ، امیر الملک مینگل ، حضور بخش مستانہ ، فیض اللہ مینگل ، حیات النسا براہوئی ، مہر دل پنڈراڑی ، نبی داد خان لانگو رئیس ، عبدالقادر شاہوانی ، عبدالغفور خارانی قلیل ، عبدالرحمن محمد شہی ، نادر قمبرانی ، میاں محمد عارف ، میر اکرم مینگل ، عسکر بلوچ ، عبدالرحمان کرد ، صوفی عبداللہ خان منیگجری ، محمد خان رئیسانی موسی طور ، حاجی گل محمد نوشکوی ، واحد بخش جمال ، ملک محمد رمضان ، ملک محمد پناہ ، مراد علی وغیرہ بیسیوں شعراء و ادبا معروف تحریر و تخلیق ہیں۔ یہ سکول براہوئی زبان و ادب کو واردات قلبی۔ تجربات حیات اور جذبات انسانیہ کے اظہار کا ذریعہ سمجھتا ہے گو مذہبی حقائق و اسرار اور اخلاق رموز و نکات کے لیے اس کے لیے اس دروازے بند نہیں ہیں ۱ ان میں سے عبدالرحمان کرد ترقی پسند رجحانات کے آئنہ دار ہیں اور پیرل ایک منفرد فنکار۔

ذیل میں ہم درخانی روایت اور تخلیقی سکول کے علمبرداروں کے نمائندہ اشعار پیش کرتے ہیں :

(۱) دن ہارے بلبل — بلبل یوں کہتی ہے
ہر درخت و ہر پھل — ہر درخت اور ہر پھول پر
داد یر و تر نمگل — بارش میں اور اولوں میں
دن بارہ اینو — آج یوں کہتی ہے
ازات ٹن اینو ، آزات ٹن اینو — ہم آج آزاد ہیں ، ہم آج آزاد ہیں۲

(فیض اللہ مینگل)

(۲) ہستم مخفے پھلنا نمٹی — کرے چیڑ چوٹی ٹغے گٹی
ملا باء گواڑخ کرے مخواس — کہ مخنگٹی پھلنا گھٹی۔ (پیرل زبیرانی)۳

ترجمہ : بہار نے پھول کی کلی کو ہنسا دیا اسے ہار باندھ کر بنایا سنوارا
لالے نے اس پر منہ کھولا اور مسکرا دیا کہ ہنسنے میں پھول کا زوال ہے!

۱- اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ء "براہوئی زبان و ادب" از سید کامل القادری
۲- ماہ نامہ الس فروری ۱۹۶۶ء
۳- ہفت روزہ ایلم مستونگ ۳ اپریل ۱۹۶۶ء

(۳) عمر گدرینگا ہنا بس انتظارٹی فقط   صد ٹکر مس است غمتان ، زوبرک دلدارنی ۱

ترجمہ : عمر فقط انتظار میں ہی کٹتی گئی اور دل تیرے غم میں پارہ پارہ ہو گیا
اس لیے اے میرے دلدار ! تو جلدی آجا !

(۴) قدم قدم رواں مبو ، دلبرہ پہلوان مبو   کشمیر نے زو آزاد کبو، جنت ٹی مہمان مبو ۲
قدم قدم رواں ہو جاؤ ، بہادر ہو جاؤ ، کشمیر کو جلد آزاد کراؤ
اور جنت نسبن ہو جاؤ (یاد رہے کہ کشمیر جنت نظیر مشہور ہے)
(نبی داد خان لانگوریئس)

(۵) خداوند ننے اینہ فتح نصرت   ننے اسلاف نا ایہ شان شرکت
(عبدالحلیم خامی) ۳

ترجمہ : یعنی اے اللہ! ہمیں فتح و نصرت عطا فرما اور ہمیں اسلاف کی
سان و شوکت بخش

(۶) مریں قربان اسلام کن پاکستان ننا ملکے   اریں آزادنن اینو کہ پاکستان ننا ملکے
(حاجی فیض) ۴

ترجمہ : یعنی ہم اسلام کے لیے قربان ہوں کہ پاکستان ہمارا ملک ہے ہم آج
آزاد ہیں اور پاکستان ہمارا ملک ہے۔

(۷) عشماں اربٹ نادر پدر   دین و دنیا غاں بے خبر   (حکیم خدائے رحیم) ۵

ترجمہ : یعنی عشق سے دربدر ہیں اور دنیا و دین سے بے خبر ہیں۔

(۸) او کنا محبوب ای تحفہ اس امر تروٹ   سنیقاں ای خاخارس پاتینا فکرانا مہار
یا منہ قصہ کہ غوسازنا آواز ٹی   یا کر پاوای شیر ٹی ہنوکا اسا سا نواز ۶
(محمد موسی طور)

ترجمہ : یعنی اے میرے محبوب! میں تجھے کون سا تحفہ پیش کروں ؟
میں اپنے سینے سے آگ پیش کروں یا اپنے تفکرات کا انبار؟

۱- ہفت روزہ ایام مستونگ ۱۷ جولائی ۱۹۶۶ء
۲- ایضاً ۲۶ ستمبر ۱۹۶۵ء
۳- ہفت روز ایلم مستونگ ۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء
۴- ایضاً ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء۔
۵- ایضاً ۱۷ اپریل ۱۹۶۶ء
۶- ثقافت اور ادب وادی بولان میں ''براہوئی ادب'' از عبدالرحمان کرد ص ۲۴۲

یا چند قصے جو ساز کی آواز میں پوشیدہ ہوں؟
یا ٹوٹے ہوئے دلوں کی آواز ؟

(۹) زمین آسمان ستارہ ٹی محمد سی محمد سی   ننا فکر و اشارہ ٹی محمد سں محمد سں
(مولانا عبدالباق) ۱

ترجمہ : یعنی زمین ، آسمان اور ستاروں میں محمد ہی محمد ہے اور ہمارے فکر و اشارہ میں بھی محمد ہی محمد ہے !

(۱۰) کنے آن ہننیانے دے دس درے   کنے نا حبائی گند کس کرے
(نور محمد پروانہ)

ترجمہ : یعنی اے دوست! مجھ سے تجھے کس نے چھین لیا ۔ میں نیری جدائی میں دیوانہ ہو رہا ہوں ۔

براہوئی نثر میں بھی اب دھڑا دھڑ مضامین لکھے جا رہے ہیں ۔ افسانوں کی طرف بھی توجہ ہو رہی ۔ ظفر میرزا اور امیر الملک مینگل نے افسانے لکھے ہیں ۔ غرضیکہ براہوئی نظم و نثر میں اب ہر قسم کے مضامین و خیالات اور جذبات و احساسات ادا کیے جا رہے ہیں ۔ ان میں مذہبی تعلیمات ، اخلاق اقدار ، عشقیہ جذبات ، وارداتِ قلبی ، عسکری رجحانات ، وطنی جذبات اور زندگی کے تجربات بیان کیے جا رہے ۔ نثر میں قومی اور قبائلی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق نگارشات ''ایلم'' اور ''الس'' کے صفحات پر نظر آ رہی ہیں ۔ براہوئی اردو سے خاصی متاثر ہورہی اور امید ہے کہ اردو بھی پاکستانی ماحول میں براہوئی سے لازماً متاثر ہوگی ۔

۱- ماہنامہ 'الس' فروری ۱۹۶۶ء

علاقائی ادبیات (جلد دوم) کا مجموعی جائزہ

اس جلد میں ہم نے مغربی پاکستان کی علاقائی ادبیات کا ذکر کیا ہے۔ شمال سے شروع کریں تو پہلے بلتی زبان و ادب کا نام آتا ہے۔ بلتی جیسا کہ ظاہر ہے بلستان کے لوگ کی زبان ہے۔ یہ علاقہ کوہ قراقرم کے جنوبی دامن میں دریائے سندھ کے ایک شمالی خطہ پر محیط ہے۔ یہ لوگ تاریخی لحاظ سے گم نام نہیں مگر ان کا ادب ابھی تک لوک ادب یعنی زبانی ادب کے دائرہ سے نہیں نکل سکا۔ لوک ادب ہمارے نزدیک کوئی حقیر چیز نہیں۔ بلکہ لوک ادب میں کسی معاشرے کے تمام خد و خال بڑی خوبی سے منعکس ہوتے ہیں اور اس کی مختلف اصناف میں اس معاشرے کا شعارِ زندگی اور اس کی اقدار پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ دقت یہ ہے کہ لوک ادب کو ہمارے ہاں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس لیے اسے محفوظ کرنا یا زیرِ تحریر لانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ ہمیں بلتی ادب کی نشاندہی کے لیے ثانوی مخارج و مصادر سے رجوع کرنا پڑا۔

اس کے بعد ہم نے سینا ادب سے بحث کی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے لیے یہ مقالہ ایک صاحبِ زبان ادیب نے لکھا ہے۔ مگر جیسا کہ اس مقالہ کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے اس زبان کا تحریری ادب موجودہ دور ہی کی پیداوار ہے۔ یہی حال بروشسکی ادب کا ہے۔ بروشسکی وہ زبان ہے جو ہنزہ اور نگر میں بولی جاتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں جلالت مآب جناب میجر جنرل امیر محمد جمال خان، والئی ہنزہ سے رجوع کرنا پڑا۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے وزیرِ تعلیم عزت مآب جناب قدرت اللہ بیگ صاحب کو اس کام پر مامور کیا۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے پاکستان کے اس دور افتادہ علاقہ کے رہنے والے بھائیوں کے معاشرہ اور ان کے ادب کا کسی حد تک کھوج نکال لیا ہے۔

اگلا مقالہ کھووار ادب سے متعلق ہے۔ کھووار علاقۂ چترال کی زبان ہے، جسے چترالی بھی کہا جاتا ہے۔ اس زبان کے ادب پر جو مقالہ لکھا گیا ہے وہ ہمارے ایک چترالی صاحبِ علم معاون نے تحریر کیا ہے۔ یہ صاحب پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ میں لیکچرار ہیں اور اس مقالہ کے لیے انہیں چترال میں کچھ ماہ صرف کرنے پڑے۔ انہوں نے چترالیوں کے معاشرے کی خصوصیات اچھی خاصی وضاحت سے بیان کر دی ہیں۔ مگر تحریری ادب وہاں بھی حال ہی کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد کشمیری ادب کی تاریخ آتی ہے۔ اس ادب کا خاکہ تیار کرنے کے لیے

ہم نے بہت سے کشمیری ادیبوں سے رجوع کیا اور پھر یہ مقالہ کشمیر کے مشہور صحافی اور ادیب جناب میر عبدالعزیز صاحب نے بڑی محنت سے تحریر کیا ۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ کشمیری ادب کا ذخیرہ وسیع ہے اور اس میں صدیوں کی فکری اور عملی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے ۔ چونکہ اس کا تحریری ادب جائزے کے لیے موجود ہے، اس لیے ہم کشمیری ادب سے زیادہ تفصیل سے بحث کر سکے ہیں اور اس مقالہ کے مطالعہ سے قارئین کو محسوس ہو گا کہ یہ بھی خالصتاً اسلامی ادب ہے اور اس کے اسالیب کسی اور ہند و پاکستانی ادب سے مختلف نہیں ۔

پانچویں مقالے میں آپ ہندکو ادب سے متعارف ہوں گے ۔ ہندکو پنجابی زبان کی وہ شاخ ہے جو لہندی سے مماثلت رکھتی ہے ۔ یہ ہزارہ، پشاور، کوہاٹ بلکہ ڈیرہ اسمعیل خان تک میں بولی جاتی ہے ۔ اس کی تاریخ بھی کافی قدیم ہے، اور جس معاشرہ کی یہ پیداوار ہے اس نے زمانے کا بہت کچھ سرد گرم دیکھا ہے ۔ اس ادب میں توانائی بھی ہے اور تنوع بھی ۔ اسے سرحد کے مشہور ادیب سید فارغ بخاری صاحب نے لکھا ہے ۔ ان کا انداز محققانہ بھی ہے اور ناقدانہ بھی ۔

چھٹی جگہ پر ہم نے سرائیکی ادب کو ترتیب دیا ہے ۔ سرائیکی ادب بہت وسیع ہے اور اغلباً سرائیکی دریائے سندھ کے طاس کی قدیم ترین زبان ہے ۔ اس کی چھوٹی بہن پنجابی نے غالباً زیادہ وسعت پائی مگر سرائیکی زبان بہت جاندار ہے ۔ اس کے اکثر شعراء وہی زبان استعمال کرتے ہیں جو پنجابی ادیبوں کی زبان ہے ۔ کہیں کہیں محاورے یا الفاظ ایسے استعمال ہو جاتے ہیں جو ملتان یا بہاولپور کے علاقوں سے مخصوص ہیں، ورنہ بادی النظر میں اس زبان اور پنجابی زبان میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا ۔ اس ادب سے مہر حسان الحیدری صاحب نے سیر حاصل بحث کی ہے ۔ اس ادب میں آپ بڑے بڑے صاحبِ نظر مصنفین سے متعارف ہوں گے ۔

سرائیکی کے بعد بلوچی ادب کا ذکر ہے ۔ اس ادب کے خاکہ پر بھی بہت سے محققین نے کام کیا اور یہ مقالہ ہماری درخواست پر پروفیسر عبدالمجید میمن صاحب نے لکھا جو اس زبان سے پوری طرح واقف ہیں ۔ بلوچی ادب کی شان بھی خاص ہے ۔ مگر چونکہ بلوچ قوم کی تاریخ میں ہمواری نہیں اور یہ قوم مختلف زمانوں میں بہت سی غیر اقوام کے ماتحت رہ چکی ہے اس لیے بلوچی ادب کے تحفظ کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ۔ ہمیں اس بات سے بہت خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے اس زبان و ادب کے کچھ کوائف محفوظ کر لیے ہیں ۔ اس ابتدا کے بعد امید ہے کہ بلوچی ادب کے ماہرین مزید نوادر اور شاہکاروں کا کھوج نکالیں گے ۔

آخر میں آپ بروہی ادب کا بیان پڑھیں گے - یہ مقالہ پرنسپل محمد انور رومان صاحب کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے - ہم ان کے ممنون ہیں - بروہی غالباً پاکستان کی سب سے قدیم زبان ہے - ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ بروہی کی دراوڑی زبانوں سے اس قدر مماثلت ہے کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ زبان وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کی باقیات میں سے ہے - اس کا ادب بھی ابھی تک تحریر میں نہیں آ سکا - مگر جیسا کہ اس مقالہ کے پڑھنے سے معلوم ہوگا ، بروہی لوک ادب کی روایات ویسی ہی وقیع اور مضبوط ہیں جیسی دیگر عوامی ادبیات کی -

یہ جلد اس قسم کی پہلی کوشش ہے اور اس میں بہت سی خامیاں ہوں گی مگر چونکہ ان زبانوں کی ادبیات پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا اور منابع اور مصادر باقاعدہ تحریر میں نہیں لائے گئے ، نہ ہی ان ادبیات کا ابھی تک فنّی لحاظ سے محاسبہ ہو سکا ہے ، اس لیے امید ہے کہ ہماری کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا - ہمارا مقصد یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے ان علاقوں کی جو ثقافتی اور ادبی روایات ہمارے ورثہ میں آئی ہیں انہیں ایک مربوط اور منظم شکل دی جائے اور معاشرے کے ان پہلوؤں کو پہچانا جائے جن کی ترجمانی ان ادبیات میں ہوئی ہے - یہ اس لیے ضروری ہے کہ پاکستانی قوم کے مختلف عناصر کی شناخت میں ہماری قوم کی آبرو مندی مضمر ہے اور انہیں ملی اجزاء سے اس قوم کا کردار اور اس کا کلچر صورت پذیر ہو سکتا ہے -

ایک اور بات شاید کہنا ضروری ہو اور وہ یہ کہ ان تمام ادبیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان و ہند کے مسلمان جہاں کہیں بھی آباد ہوں اور کیسے ہی جغرافیائی ماحول اور تاریخی حالات سے دو چار رہے ہوں ان پر اسلامی اقدار ، اعتقادات اور طرزِ حیات کا ایسا گہرا اثر پڑا ہے کہ جب ان کے عزائم اور خیالات ، امنگیں اور آرزوئیں ادب کے روپ میں ظاہر ہوئیں تو کائناتی مسائل سے لے کر روزمرہ کی جزئیات میں بھی ایک ہم آہنگی نظر آتی ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند ثقافتی لحاظ سے ایک ہی قوم ہیں اور اسلام ایک ایسا حبلِ متین ہے جس نے انہیں ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا ہے -

سید فیاض محمود

مدیر عمومی

صحت نامہ

علاقائی ادبیات (جلد دوم)

اندرونی سرورق کی آیت کی عبارت یوں ہے :

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	کسی	کئی
۵	۲۵	کہ کہ	کہ
۱۱	۲۵	کشمر	کشمیر
۲۳	۹	کہ	کو
۲۷	۷	مکمران	حکمران
۲۸	۱۷	۹۴۷ء	۱۹۴۷ء
۳۲	۲۳	بہاڑوں	پہاڑوں
۳۳	۷	پڑھ	پڑ
۳۹	۱۲	پت جڑ	پت جھڑ
۳۹	۳۰	۱۱۸۰ھ - ۱۸۸۰ء	۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ
۵۰	۷	Gegory	George
۶۱	۱	حھوٹے چھوٹے	چھوٹے چھوٹے
۶۱	۱۴	معصولات	محصولات
۶۸	۷	کاٹنے تک	کاٹنے
۷۳	۱	جہاں	یہاں
۷۵	۱۹	اعتیار	اعتبار
۷۷	۲	کہانیاں	کہانیوں

معذرت : پوری کوشش کی گئی ہے کہ اغلاط درست کر دی جائیں ۔ مگر تحقیقی کتب میں غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں ۔ امید ہے قارئین کرام ان اغلاط کو محض بشری فرو گذاشت پر محمول نہیں کرینگے ۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۷	۱۸ - ۱۹	گھڑا	گڑھا
۸۱	۲۹	جناچہ	چنانچہ
۱۱۵	۳۱	موضوں	موضوعات
۱۲۷	۲۲	معیار	معیاری
۱۳۰	۲۲	کوئی	کونی
۱۳۳	۲۲	Gaseteer	Gazetteer
۱۳۵	۱۶	ہیں	تھے -
۱۳۶	۱۵	علاوے	علاقے
۱۳۶	۲۱	کشیر	کشمیر
۱۳۷	۹	کیشر	کشمیر
۱۵۸	۳	میں مں	میں
۱۶۸	۱۲	للد دوم	جلد دوم
۱۶۹	۲۶	گے	گئے
۱۸۱	۲۳	۱۹۷۰ء/ ۱۳۲۵ھ	۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ
۱۸۸	۸	خوجہ سجان	خواجہ سجاں
۱۹۱	۱۲	پیشن گوئی	پیشین گوئی
۱۹۲	۱۶	جرأت ستدالہ	جرأت مندانہ
۱۹۷	۶	میں	ہیں
۲۰۰	۲۱	اس میں بھی	اس میں
۲۰۳	۱۵	کشر	کشمیر
۲۰۹	۳	پیدوار	پیداوار
۲۱۸	۲۱	ناگریر	ناگزیر
۲۲۶	۱۷	بیٹا	بیٹے
۲۳۴	۲۳	کہں	کہیں
۲۳۵	۲۵	ہند کوسے	ہندکو کے
۲۴۲	۲	پشاور	پشاور
۲۴۸	۱۹	۱۹۳۶ء	۱۹۳۴ء
۲۴۹	۲۴	۱۹۴۰ء	۱۹۲۵ء
۲۵۱	۲۴	عزل	غزل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵۴	۶	ہیں	ہوں
۲۵۴	۲۲	مشور	مشہور
۲۵۶	۳	جا رہی ہے	کی جا رہی ہے
۲۵۷	۳	زبانی	زبان
۲۵۷	۱۲	کی کی جگہ	کی جگہ
۲۶۲	۲۳	صو	صوفی
۲۶۷	۱	۱۰۰۵ء/۳۸۶ھ	۹۹۶ء/۳۸۶ھ
۲۶۸	۱۵	فارسی شاہ	فارسی گو شاعر
۲۶۸	۲۱	سترھویں صدی عسوی	تیرھویں صدی عیسوی
۲۶۹	فٹ نوٹ (۲)	خلاصہ الاحباب	خلاصتہ الاحباب
۲۷۵	فٹ نوٹ (۱)	۱۳۵۳ء/۶۵۲ھ	۱۲۵۴ء/۶۵۲ھ
۲۷۶	۱	شیرید	شیرینی
۲۷۷	۲۳	شیخ حسام الدین	شیخ حسام الدین کی خدمت
۲۷۹	۲۱	ہوگئی	ہوگی
۲۸۲	۷	۱۷۹۹ء/۱۱۲۱ھ	۱۷۰۹ء/۱۱۲۱ھ
۲۸۵	۵	اشعارات و تبشیہات	اشعارات
۲۸۵	۱۵	کفیت	کیفیت
۲۸۶	۲۳	۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ھ	۱۷۸۵ء/۱۲۰۰ھ
۲۸۶	۲۵	۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء	۱۷۸۸ء/۱۲۰۳ھ
۲۹۰	۲۲	(م - ۱۸۳۳ء/۱۲۸۴ھ)	(م - ۱۸۶۸ء/۱۲۸۴ھ)
۲۹۲	۲۱	افظ	حافظ
۲۹۷	۲	پکارو	پکاڑو
۳۰۱	۵	سرچالس بنیٹر	سرچارلس پنیٹر
۳۰۱	فٹ نوٹ (۲)	اللہ بخش	اللہ بخش
۳۰۳	۱۰	موروتی	موروثی
۳۱۱	۲	ڈیڑہ اسمعیل خان	ڈیرہ اسمعیل خان
۳۱۳	۲۰	صوئی	صوفی
۳۱۸	۲۱	احساس	حساس
۳۲۰	۲۶	۱۸۸۹ء/۱۳۰۹ھ	۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ھ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳۰	۱۷	پارسنگار	پارسنگھار
۳۳۲	۱۰	اس بعد	اس کے بعد
۳۳۴	۱۰	رہے ہیں	دے رہے ہیں
۳۳۹	۱	پکارو	پکاڑو
۳۳۹	۳	۱۹۳۰ء/۱۳۵۹ھ	۱۹۲۰ء/۱۳۵۹ھ
۳۴۷	فٹ نوٹ (۱)	چچ نامہ	چچ نامہ
۳۵۰	۲۰	قبضہ	قبضہ
۳۵۲	فٹ نوٹ (۳)	بلوحسان	بلوچستان
۳۵۴	۱۸	مزاچ	مزاج
۳۵۷	۲۷	ہو	جو
۳۶۴	۱۷	گزیٹر	گزیٹئر
۳۶۹	۶	جاتا جاتا	جاتا
۳۶۹	۲۶	محفوظ	محظوظ
۳۷۲	۱۶	عام طور	عام طور پر
۳۷۲	فٹ نوٹ (۱)	ــه	ہے
۳۷۴	۱	سسراس	سسرال
۳۷۴	۹	مقاطے	مقابلے
۳۸۰	۲۳	شیرلں	شیریں
۳۸۲	۱۴	پلوچی	بلوچی
۳۹۴	۹	اس بعد	اس کے بعد
۳۹۵	۵	۲	۱
۳۹۵	۸	کتاب امیں	کتاب میں
۳۹۶	۱۶	کجادوں	کجاووں
۴۰۲	۹	اگر	اگرچہ
۴۱۴	۵	نذتذب	تذبذب
۴۱۴	فٹ نوٹ (۱)	دوم دوم	دوم
۴۱۶	۱	وہ رہ	وہ
۴۲۰	۱۱	اس گرد	اس کے گرد

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۲۱	۷	پہت	بہت
۴۲۱	۱۱	براہوں	براہویوں
۴۲۵	۹	دے	دیے
۴۲۹	۷	اور اور	اور
۴۳۱	۱۳	پنسہاری	پسنہاری
۴۳۲	۸	یہہ	یہ
۴۳۴	۹	لکا	لگا
۴۳۹	۲۶	بیالس	بیالیس
۴۴۲	۱۰	کو اصلاحات	اصلاحات
۴۴۲	۲۲	براہوئی و	براہوئی
۴۴۳	۳	فوت میں	میں فوت
۴۴۴	۱۰	بھی	ہی
۴۴۶	۲۴ - ۲۳	اور اور	اور
۴۴۷	۱۹	زبادہ	زیادہ
۴۴۸	۳	۱۹۰۷	۱۹۰۷ء
۴۴۸	۱۸	بیدا	پیدا
۴۴۹	۱۵	۱۹۳۸ء (۱۳۷۸ھ)	۱۹۵۸ء (۱۳۷۸ھ)
۴۵۰	۱۲	نعہ پرداز	نغمہ پرداز
۴۵۱	۱۵	تعلیقی	تخلیقی
۴۵۲	۲	ہیں	ہیں
۴۵۴	۱	یورلی	یورپی
۴۵۶	۱۳	مجموعی طور	مجموعی طور پر
۴۵۷	۱۸	برا ہوئی ربان ادب	برا ہوئی زبان و ادب
۴۶۱	۲	بلتستان کے لوگ	بلتستان کے لوگوں
۴۶۳	۸	یہ	یہ